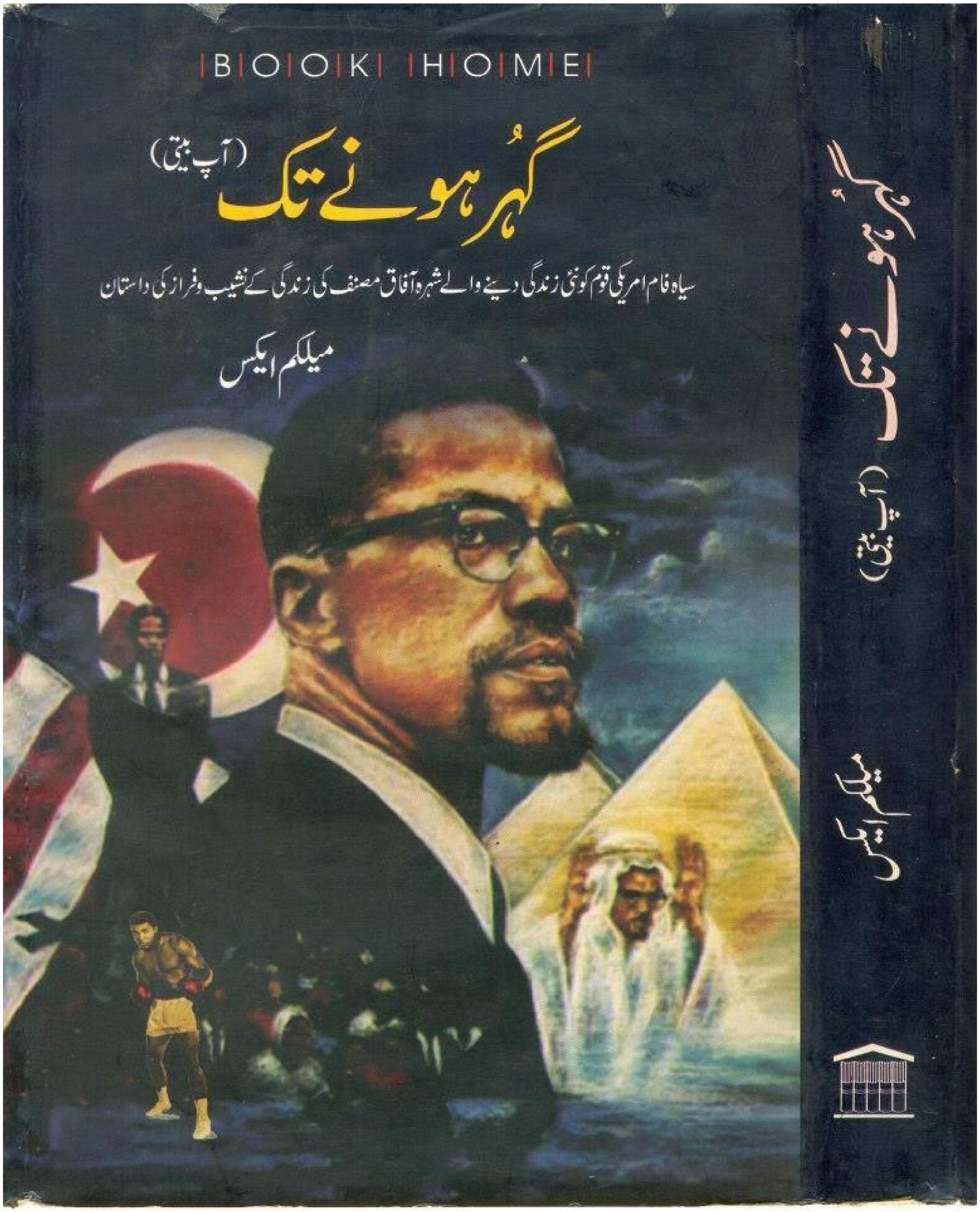

BOOK HOME

گھر ہونے تک (آپ بیتی)

سیاہ فام امریکی قوم کو نئی زندگی دینے والے شہرہ آفاق مصنف کی زندگی کے نشیب وفراز کی داستان

میلکم ایکس

گھر ہونے تک
(آپ بیتی)
میلکم ایکس

گہر ہونے تک

گھر ہونے تک

(آپ بیتی)

مصنف : میلکم ایکس

اردو ترجمہ: عمران الحق چوہان

https://www.facebook.com/ihchauhan

BOOK HOME

نوٹ:

اس کتاب کی ای بک (PDF File) مترجم محترم عمران الحق چوہان صاحب کی اجازت سے فیس بک گروپ "عالمی ادب کے تراجم" کے لیے بالخصوص اور تمام قارئین کے بالعموم بنائی گئی ہے۔ یہ کتاب گروپ میں upload کی گئی ہے۔ جسے گروپ میں Files پر جاکر ڈاؤن لوڈ کیاجاسکتا ہے۔ اس کتاب کے قارئین سے گزارش ہے کہ اپنی رائے گروپ پوسٹ پر یا براہِ راست مترجم کی فیس بک ای ڈی پر ضرور دیجئے گا۔

شکریہ

یاسر حبیب

فیس بک گروپ: عالمی ادب کے اردو تراجم

https://www.facebook.com/groups/AAKUT

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

غالبؔ

فہرست

پیش لفظ 12

باب1:

ڈراؤنا خواب 19

باب2:

ماسکوٹ (Mascot) 34

باب3:

گرائیں 45

باب4:

لارا 57

باب5:

ہارلم کا باسی 66

باب6:

ڈیٹرائٹ ریڈ 76

باب7:

اٹھائی گیرا 93

باب8:

شکار 107

باب9:

گرفتاری 113

باب10:

شیطان 128

باب11:

نجات یافتہ 146

باب12:

نجات دہندہ 168

باب13:

وزیر میلکم ایکس 187

باب14:

سیاہ فام مسلمان 209

باب15:

آئی کیرس (I Carus) 237

باب16:

برطرف 255

باب17:

مکّہ 281

باب18:

الحاج ملک الشہباز 304

باب19:

1965ء 325

باب: 20

"لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا" 342

پیش لفظ

”گُہر ہونے تک“ ایک آتش بجاں، شعلہ بیاں شخص کی خوں چکاں داستان ہے۔ وہ زندگی بھر سفر میں رہا قیام و قرار سے ناآشنا، سودوزیاں سے ماورائی، سراپا جستجو، سراپا تلاش، اندھیرے سے روشنی تک، گم راہی سے ہدایت تک، قطرے سے گُہر ہونے تک اس پہ وہ گزری جو منافقت پر قائم معاشرے کے دوہرے معیاروں سے ٹکرانے اور انہیں ٹھکرانے کی جرأت کرنے والوں پر گزرا ہی کرتی ہے۔

تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار

فیضؔ

لیکن یہی لوگ صبح کا ستارہ اور روشنی کا استعارہ ہوتے ہیں، وہ دارورسن کی آزمائش ہوتے ہیں، وہ عشاق کے اس حق گو اور بے باک قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کی فطرت میں روباہی نہیں ہوتی، جہاں مصلحت اندیشی خام ہونے کی دلیل ہے، جہاں سجدے میں سر قلم نہ ہونا کفر سمجھا جاتا ہے اور جان دے کر بھی سمجھا جاتا ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

گریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

نظیریؔ

دیکھنے میں آیا ہے کہ اللہ جن لوگوں کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے چُن لیتا ہے وہ لوگ معمول سے کچھ ہٹ کر ہوتے ہیں۔ ان میں قوتِ فکر، شدتِ احساس اور جرأتِ عمل کی سطح غیر معمولی ہوتی ہے۔

کبھی کبھی ہم ان لوگوں سے متعلق پڑھتے یا سنتے ہیں جو بہت اسفل اور قبیح زندگی گزار رہے تھے۔ پھر ایک روز کوئی لمحہ ایسا آیا کہ ان کی زندگی ایڑی پر گھوم گئی۔ انہوں نے یُو ٹرن (U-Turn) لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پیچھے آنے والوں کے لیے منارئہ نور بن گئے، چور سے قطب ہو گئے۔

ایسے منتخبِ زمانہ لوگوں پر غوروخوض کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ ہم جیسے عام آدمیوں کے برعکس صاحبانِ قول ہی نہیں، صاحبانِ عمل اور صاحبانِ حال بھی ہوتے ہیں۔ ان میں معاشرتی اور تاریخی، رواجوں اور روایتوں سے انحراف کا حوصلہ ہوتا ہے۔ وہ کہنہ نظاموں اور فرسودہ خیالات کو رد کرنے کی جرأتِ رندانہ رکھتے ہیں، یہ ضرور ہے کہ معاشرہ ایسے لوگوں کو نارمل (Normal) نہیں سمجھتا مگر وہ معاشرے کے مقررہ معیاروں سے بے پروا ہوتے ہیں۔

چوں یزداں از دو گیتی بے نیاز اند

دگر سرمایۂ اہلِ ہنر چیست

اقبالؒ

لیکن سوال یہ ہے کہ ایک آدمی کسی آسان راستے پر سیدھے سبھائو چلتے چلتے ایڑی پر کیوں گھوم جاتا ہے؟ خواہش، لوبھ اور طمع کی آتشِ سوزاں پر صبر و رضا کا پانی ڈال کر پہلے سے قطعی مختلف زندگی کیوں گزارنے لگتا ہے؟ مشرک سے موٗحد، بھکاری سے داتا اور قطرے سے دریا کیسے بن جاتا ہے؟ مقامِ فنا سے مرتبۂ بقا تک کس طرح پہنچ جاتا ہے؟

اے خضر! چشمۂ حیواں کہ بر آں می نازی

بود یک قطرئہ دردِ تہہِ پیمانۂ ما

بو علی قلندرؒ

اس کایا کلپ کی عقلی توجیہہ ممکن نہیں ہے۔ جس طرح گھاس کی نازک پتیوں پر پھدکنے والے ٹڈے کو شاہین کی بلندپروازی نہ صرف نصیب نہیں ہوتی بلکہ سمجھ بھی نہیں آتی اسی طرح ہم اپنے محدود تر علم و فکر کی بنیاد پر ان عظیم لوگوں کے سرِّ باطن کو سمجھنے کی کوشش بسیار کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قدرت اپنے مقاصد کی تکمیل و نگہبانی کے لیے اوسط درجہ کے لوگوں یعنی Mediocres سے کام نہیں لیتی، یہ شرف صرف بہترین یعنی Fittest کو حاصل ہے۔ روحانیت ہو یا نفسانیت، دونوں میں مرتبہ پانے کے لیے معاشرے کے مقررہ اور مروجہ اصولوں سے ٹکرائو لازم ہے۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ کسی کسی شخص کو قوتِ فکر، شدتِ احساس اور جرأت عمل سے مزین کرکے طمع و طلب کی کٹھالی میں ڈالا جاتا ہے اور جب یہ صفات، ہوس و مصلحت کی تپش سے جل کر راکھ نہیں ہو جاتیں بلکہ کندن بن کر چمکنے لگتی ہیں تو اللہ ایسے شخص سے جہاں داری و جہاں بانی کا کام لیتا ہے۔

عرب معاشرے میں نبی اکرم محمدؐ کی بعثت کی ایک وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ عربوں میں یہ اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے۔ اور اگر یہ خوبیاں موجود ہوں تو محض رخ بدل جانے سے قعرِ مذلت میں لوٹنے والے اوجِ ثریا سے آگے جا پہنچتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کفر و گم راہی میں غرق عربوں کا رخ تبدیل ہوا تو انہوں نے تاریخ کا رخ بدل دیا۔ اس بات کو طول دینے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ سبھی کو علم ہے کہ اسلامی انقلاب کے بعد عربوں کی باطنی اور ظاہری زندگی میں کیا تبدیلی آئی اور اس کے اثرات کہاں تک پہنچے۔

چوں آئینہ محو است یقیں ھاو گماں ھا

بیدلؔ

"گُہر ہونے تک" ایک ایسے ہی خجستہ پا کی آپ بیتی ہے جو ذلت، غربت اور گم راہی کے اندھیروں سے اٹھا اور بزمِ شبِ تار کو تہہ و بالا کرتے ہوئے لاکھوں تیرہ نصیبوں کو شہرِ خورشید کا راستہ دکھا گیا۔

میلکم ایکس، جن کا اسلامی نام "ملک الحاج الشہباز" تھا، کی آپ بیتی میں دوسرا اہم نام "ایلیا محمد" کا ہے۔ "ایلیا" دراصل عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ اسے انگریزی میں Elijah لکھا اور "ایلائی جا" بولا جاتا ہے۔ چند معلوم وجوہ کی بناء پر اردو صحافت میں اسے " عالی جاہ" اور "ایلی جاہ" لکھا جاتا رہا ہے۔ جس طرح Joseph کو یوسف، Jacob کو یعقوب، Jeruselam کو یروشلم اور Hellelujah کو ہیلے لویا، پڑھا جاتا ہے اسی طرح Elijah کو بھی ایلیا لکھنا پڑھنا چاہیے۔

ایلیا محمد۔ ڈبلیو ڈی فارڈ نامی شخص کو (نعوذباللہ) خدا اور خود کو (نعوذباللہ) پیغمبر کہتا تھا۔ اس کی جماعت ”نیشن آف اسلام“ نے سیاہ فاموں میں سفید فاموں کے خلاف جو نسلی شعور پیدا کیا اس کی تفصیل آپ اگلے صفحات میں پڑھیں گے۔ 1975 ء میں اپنی موت سے قبل، ایوب دور میں، اس نے پاکستان کا دورہ بھی کیا تھا۔

ایلیا محمد کی وفات کے بعد اس کا بیٹا والس محمد اس کا جانشین مقرر ہوا لیکن بعدازاں اس نے باپ کے عقائد ترک کر دیئے اور حضرت محمدؐ کی رسالت پر ایمان لاتے ہوئے اہلِ سنت کا مسلک اختیار کر لیا اور غیر سیاہ فاموں کو بھی اپنی جماعت ”ورلڈ کمیونٹی آف اسلام ان دی ویسٹ“(World Community of Islam in the West) میں شمولیت کی اجازت دیتے ہوئے اپنی جماعت کا نام”دی مسلم امریکن سوسائٹی“(The Muslim American Society) رکھ لیا۔ جس پر ایلیا محمد کے ایک دیگر پیروکار لوئیس فرخان، جس کا اسلامی نام عبدالحلیم فرخان تھا، نے ”نیشن آف اسلام“ کے نام سے الگ جماعت قائم کرکے ایلیا محمد کے نظریات پھیلانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ لوئیس فرخان ایک شدت پسند نسل پرست تھا۔ 1965 ء میں اس پر میلکم ایکس کو قتل کروانے کا الزام بھی لگا جسے اس نے رد کر دیا تھالیکن بعد میں تسلیم کیا کہ قتل کے لیے فضا سازگار بنانے میں اس نے معاونت کی تھی۔ اس قتل کے جرم میں تین سیاہ فاموں کو جیل بھیج دیا گیا تھا لیکن:

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

حافظؒ

نیویارک کے علاقے مین ہٹن میں ”میلکم شہباز شہید مسجد“ کے نام سے ایک اسلامی مرکز قائم کیا گیاتھا جو آج بھی کام کر رہا ہے۔ آگے چل کر والس محمد اور لوئیس فرخان کے مابین ترکے اور جانشینی کے لیے مقدمہ بازی بھی چلتی رہی جس میں لوئیس فرخان کو کامیابی حاصل ہوئی۔

16 اکتوبر1995 ء کو لوئیس فرخان کی تنظیم ”نیشن آف اسلام“ نے واشنگٹن ڈی سی میں ”ملین مین مارچ“ منعقد کیا۔ جسے کافی شہرت ملی، غالباً واشنگٹن میں ہونے والا یہ اب تک کا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ مارچ کے دوران سرِ عام اذان، تلاوت اور نماز کا اہتمام کیا گیا۔

جنوری 1996 ء میں لوئیس فرخان نے ایران، لیبیا اور عراق سمیت 20 ممالک کا "World Friendship Tour" کے عنوان سے دورہ کیا تو لیبیا کے معمر قذافی نے اسے خصوصی ایوارڈ اور اڑھائی لاکھ پاؤنڈ کا انعام دیا۔ بنگلہ دیش کے دورہ کے موقع پر اس کا استقبال کرنے والوں میں مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کے سیکرٹری مولانا شفیق الاسلام بھی شامل تھے۔ جس سے ”نیشن آف اسلام“ سے متعلق مسلمانوں کی لاعلمی اور غفلت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ماضی قریب میں اس نے پاکستان کے دورے کا اعلان بھی کیا تھا جسے علم ہونے پر راجہ ظفر الحق نے بر وقت منسوخ کر دیا۔

فروری 2002 ء میں والس محمد کی ”مسلم سوسائٹی آف امریکہ“ (Muslim Society of America) اور لوئیس فرخان کی ”نیشن آف اسلام“ کے درمیان اتحاد ہو گیا تھا اور لوئیس فرخان بھی ختم المرسلین حضرت محمد ﷺ کو آخری نبیؐ مان کر امتِ مسلمہ کے سوادِ اعظم میں شامل ہو گیا تھا۔

”گُہر ہونے تک“ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں آپ کو امریکی سیاہ فاموں کی زندگی، سفید فاموں کی نفسیات، اسلام کے خلاف ہونے والی ایک عظیم سازش اور امتِ مسلمہ کی بے عملی و بے حسی غرض بہت سے حیران کن اور تلخ حقائق جاننے کا موقع ملے گا۔ اس آئینے میں یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ مسلمان انفرادی اور اجتماعی طور پر ایک فعال اور بامقصد زندگی گزار رہے ہیں یا اقبالؒ کے لفظوں میں:

مثالِ کشتیٔ بے حس مطیعِ فرماں ہیں
کہو تو بستۂ ساحل رہیں، کہو تو بہیں

”میلکم شہباز“ اسی بے حسی اور اطاعت کے خلاف ردِ عمل کا نام ہے۔

ترجمہ بذاتِ خود ایک مشکل کام ہے کیونکہ مترجم کو اپنے محسوسات و جذبات پر مکمل قابو رکھتے ہوئے مصنف کے خیالات کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ نیز الفاظ کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ حتیٰ المقدور اس فضا کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کرنا ہوتی ہے جو محترم مصنف اپنی تحریر میں تخلیق کرتا ہے۔ اس مقام پر آ کر ترجمہ محض ایک صنف ہی نہیں ایک ہنر بھی بن جاتا ہے۔

لیکن ترجمے کے عیب و ہنر ایک طرف یہ کتاب فکر آفرینی اور چشم کشائی کے باعث بھی اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ”ٹائم میگزین“ نے اس کا شمار بیسویں صدی میں چھپنے والی ان دس Non-Fictional کتب میں کیا ہے جنہوں نے دنیا بھر میں ذہنِ انسانی کو متاثر کیا اور تبدیلیٔ فکر کا سبب بنیں۔ یہ آپ بیتی ”ایلکس ہیلی“ کی معاونت سے لکھی گئی تھی، جس نے بعد میں مصنف کے خیالات سے متاثر ہو کر اپنا شہرۂ آفاق ناول ”روٹس“ (Roots) لکھا تھا۔

ہمیں اس ترجمہ کی تکمیل میں پانچ برس لگے۔ ایک تو ہم اسے کاروباری نقطۂ نظر سے ترجمہ نہیں کر رہے تھے کیونکہ ہمیں ہرگز امید نہیں تھی کہ کوئی پبلشر اسے چھاپنے پر تیار بھی ہو گا۔ دوسرے مطالعہ کی عادت، عیاشی یا بیماری (آپ جو بھی کہہ لیں) نے ہمارے لکھنے کی رفتار کو بے حد متاثر کیا۔ تیسرے بطور وکیل پیشہ ورانہ مصروفیات آڑے آتی رہیں:

مپرس از جستجو و نارسائی ھائے مجنونے

چو آوازِ جرس ہر سو دویدو ہرزماں گم شد

بخاریؔ

یہ کتاب اگلے پانچ سال مزید بھی ”زیرِ ترجمہ“ ہی رہتی اگر ہمیں دو نہایت عزیز دوستوں کا تعاون حاصل نہ ہوتا ایک تو ہمارے حبیبِ لبیب مجی محمد طاہر صاحب اور دوسرے حافظ محمد یوسف ثانی صاحب۔ دونوں صاحبان نے اپنی بہت سی دلچسپیاں اور آرام ترک کر کے ترجمہ لکھنے کا فریضہ سرانجام دیا جس سے ترجمہ کرنے کی رفتار میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ ان کی محبت اور خلوص ہمارا سرمایۂ حیات ہے۔ اللہ انہیں اپنی رحمتِ بے پایاں سے نوازے۔ آمین۔

ان کے علاوہ سمیع اللہ پرجھ صاحب اور عامر علی صاحب کے تعاون کا شکریہ بھی لازم ہے۔

سب سے آخر میں برادرم رانا عبدالرحمن صاحب کے لیے اظہارِ تشکر۔ رانا صاحب لائقِ صد تحسین ہیں کہ وہ ہم ایسے بے نام شخص کی کاوش کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے پر تیار ہو گئے۔ اللہ انہیں خیرِ کثیر عطا فرمائے۔ آمین۔

کتاب کا مطالعہ کیجئے اور سر دھنیے کہ کیسے کیسے آشفتہ سر اور کج کلاہ زندگی کے ہفت خواں کس بے جگری و جواں مردی سے ہنستے کھیلتے طے کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ لوگ عشاق کے قبیلے کی آبرو ہیں، اہلِ دل کی ناموس ہیں:

از برِ حق می رسد تفضیل ھا

بازہم از حق رسد تبدیل ھا

مولانا رومؒ

والسلام!

عمران الحق چوہان

https://www.facebook.com/ihchauhan

باب: 1

ڈراؤنا خواب

ابھی میں ماں کے پیٹ میں تھا کہ ایک رات ”کوکلکس کلان“ (Kuklux Klan) کے مخروطی کنٹوپ والے چوغے پہنے گھڑ سواروں کا ایک گروہ ہمارے گھر آیا۔ تب ہم نبراسکا (اوماھا) میں رہتے تھے۔ (یہ بات میری ماں نے بعد میں مجھے بتائی) گھڑسواروں نے ہمارے گھر کا محاصرہ کر لیا اور رائفلیں اور شاٹ گنیں لہرا کر میرے والد کو گھر سے نکلنے کے لیے للکارنے لگے۔ میرے والدہ صدر دروازہ کھول کر باہر گئی اور انہیں بتایا کہ وہ اس وقت گھر میں تین بچوں کے ساتھ اکیلی ہے اور بچوں کا باپ تبلیغ کے سلسلے میں ”مِل واکی“ گیا ہوا ہے۔ کلان کے آدمیوں نے تنبیہی انداز میں دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ ”بہتر ہو گا کہ ہم علاقہ چھوڑ کر چلے جائیں کیونکہ ”اچھے سفید عیسائیوں“ کو یہ بات پسند نہیں کہ ہمارا باپ اوماھا کے علاقے کے کالوں کو ”مارکس گاروی“ کی تعلیمات پھیلاتے ہوئے ”افریقہ کو و اپسی“ کی تبلیغ کرتا پھرے۔“

میرے والد ”عزت مآب ارل لِٹل“ مارکس آرلئیس گاروی کی تنظیم یو این آئی اے (یونیورسل نیگرو امپروومنٹ ایسوسی ایشن) کے بپٹسٹ منسٹر اور نہایت مخلص منتظم تھے۔

مارکس گاروی، جس کا ہیڈ کوارٹر ہارلم، نیویارک سٹی میں تھا، افریقیوں میں نسلی پاکیزگی (Race purity) اور اپنے اجداد کی سرزمین یعنی افریقہ واپسی کا مبلغ تھا۔ جس نے اسے پوری دنیا میں انتہائی متنازع شخصیت بنا دیا تھا۔

کلان کے آدمیوں نے ہمیں دھمکیاں دیتے ہوئے گھر کے گرد چکر لگانا شروع کر دیئے، وہ مشعلیں لہراتے ہوئے بندوقوں کے بٹوں سے کھڑکیاں توڑ کر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

واپسی پر میرے والد یہ سب دیکھ کر سخت مشتعل ہوئے مگر انہوں نے میری پیدائش تک رُکنے اور پھر کہیں اور منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ پتہ نہیں انہوں نے یہ فیصلہ کیوں کیا۔ حالانکہ وہ عام کالوں کی نسبت بہت بہادر تھے۔ وہ چھ فٹ چار انچ قامت کے بے حد کالے انسان تھے۔ ان کی ایک آنکھ کسی حادثے میں، جس کا مجھے علم نہیں، ضائع ہو گئی تھی۔ وہ رینالڈز (جارجیا) کے رہنے والے تھے اور مارکس گاروی کی طرح پختہ یقین رکھتے تھے کہ آزادی، خودمختاری اور عزتِ نفس امریکہ میں رہنے والے کالوں کو کبھی حاصل نہیں ہو گی لہٰذا کالوں کو چاہیے کہ امریکہ گوروں کے حوالے کر کے اپنے اجداد کی سرزمین افریقہ چلے جائیں۔

میرے والد اس نظریہ پر اس لیے بھی قوی یقین رکھتے تھے کیونکہ انہوں نے اپنے چھ میں سے چار بھائیوں کو گوروں کے تشدد سے مرتے دیکھا تھا بلکہ ایک کو تو پھانسی دے کر مارا گیا تھا۔ ایک بات جو میرے والد نہیں جانتے تھے کہ بقیہ تین بھائیوں میں سے بھی (بشمول میرے والد) صرف ایک، میرے چچا، بستر پر طبعی موت مریں گے۔ ایک چچا سفید فام شمالی پولیس کی گولی کا نشانہ بنیں گے اور وہ خود بھی ایک گورے کے ہاتھوں قتل ہوں گے۔

مجھے خود یہ یقین ہے کہ میں بھی تشدد کے نتیجے میں غیر طبعی موت مروں گا...اور میں ہمیشہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار رہتا ہوں۔ میں بہن بھائیوں میں ساتویں درجے پر تھا۔ پہلی شادی سے بھی میرے والد کے تین بچے ایلائ، ارل اور میری تھے جو بوسٹن میں رہتے تھے۔ بعد میں میری والد سے شادی کے بعد وِلفرڈ“ پیدا ہوا اور میرے والدین فلاڈلفیا سے اوماھا آ گئے جہاں ہلڈا اور پھر فلبرٹ پیدا ہوئے۔ اس کا بعد میں دنیا میں آیا۔

یہ 19 مئی 1925ء کی بات ہے جب میری ماں نے اٹھائیس سال کی عمر میں اوماھا کے ہسپتال میں مجھے جنم دیا پھر ہم مِل واکی چلے آئے جہاں ریگی نالڈ پیدا ہوا۔ اسے پیدائشی طور پر ہرنیا کی تکلیف تھی جو ساری زندگی اس کے لیے ایک حد تک معذوری بنی رہی۔

میری ماں ”لوئی لٹل ” گرینیڈا (برطانوی ویسٹ انڈیز) میں پیدا ہوئی، سفید فام لگتی تھی، کیونکہ اس کا ”باپ“ ایک سفید فام تھا۔ ماں کے بال سیدھے سیاہ تھے اور اس کا لہجہ بھی عام کالوں سے نہیں ملتا تھا۔

اس نے کبھی اپنے باپ کو نہیں دیکھا تھا اور وہ زندگی بھر اس کے ذکر سے شرمندگی محسوس کرتی رہی۔ اسی لیے ہمیں اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ اور یقینا اسی وجہ سے میری جلد اور بالوں کا رنگ بھی سرخی مائل بھورا تھا۔ میں سب سے ہلکے رنگ کا تھا۔ (بعد میں بوسٹن اور نیو یارک میں میں نے ایسے لاکھوں کالے دیکھے جو ہلکے رنگ کو پاگل

پن کی حد تک سماجی افتخار کی علامت سمجھتے تھے۔ اور مجھے بہت خوش قسمت سمجھتے تھے لیکن مجھے اس عصمت دری کرنے والے کے خون کے ایک ایک قطرے سے نفرت تھی جو میری رگوں میں دوڑ رہا تھا)۔

ہم مِل واکی میں بھی تھوڑا عرصہ ہی رہے کیونکہ میرے والد ایسی جگہ رہنا چاہتے تھے کہ جہاں وہ نہ صرف اپنا کما سکیں بلکہ تھوڑا بہت کاروبار بھی جما سکیں۔ مارکس گاروی کی بنیادی تعلیم یہی تھی کہ خود کو گوروں کی ماتحتی سے آزاد کرو۔ اس کے بعد ہم "لانسنگ" مشی گن چلے گئے۔ وہاں میرے والد نے گھر خریدا اور حسبِ سابق مقامی کالوں کے بیپٹسٹ چرچ میں بلامعاوضہ عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی اس کے ساتھ ساتھ وہ ہفتہ بھر یہاں وہاں مارکس گاروی کی تعلیمات بھی پھیلاتے رہتے۔

ابھی انہوں نے دکان بنانے کے لیے پیسے اکٹھے کرنے شروع کئے ہی تھے کہ کچھ احمق مقامی "انکل ٹام نیگروز" نے ان کے انقلابی خیالات کے قصے بڑھا چڑھا کر گوروں تک پہنچانے شروع کر دیئے۔ اب کی بار علاقہ سے نکل جانے کی دھمکی ایک مقامی نفرت پسند سوسائٹی "دی بلیک لیجن" (The Black Legion) کی طرف سے آئی۔ وہ لوگ سفید کے بجائے کالے چوغے پہنتے تھے۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ میرے والد جہاں جاتے یہ لوگ وہاں پہنچ جاتے اور کہتے کہ "یہ کالا صرف اس لیے سیاہ فام آبادی سے باہر دکان بنانا چاہتا ہے تاکہ وہاں رہ کر اچھے نیگروز کو ورغلا اور بہکا سکے۔"

1929ء میں میری سب سے چھوٹی بہن "یوون" کی پیدائش کے تھوڑے عرصہ بعد ہی وہ خوفناک رات آئی جو ایک ڈراؤنے خواب کی طرح میرے ابتدائی یاد کا نمایاں حصہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک رات میں ہڑبڑا کر جاگا تو ہر طرف گولیاں چلنے کی آوازیں، چیخ و پکار، دھواں اور شعلے تھے۔ میرے والد نے ان دو گوروں کو گولی مار دی جو ہمارے گھر کو آگ لگا کر بھاگ رہے تھے۔ ہمارا گھر جل رہا تھا اور ہم جانے بچانے کے لیے ٹھوکریں کھاتے، ٹکراتے بھاگ رہے تھے۔ گھر زمیں بوس ہونے سے ایک لمحہ قبل ہماری ماں چھوٹی بہن کو سنبھالے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئی۔ سب بچے سرد رات میں نیم برہنہ، گلے پھاڑ کر رو رہے تھے۔ سفید فام پولیس اور آگ بجھانے والے آئے لیکن اردگرد کھڑے گھر کو جلتا دیکھتے رہے۔

والد نے ہمیں وقتی طور پر کچھ دوستوں کے ہاں رکھا پھر مشرقی لانسنگ کے مضافات میں دوبارہ رہائش حاصل کر لی۔ ان دنوں کالوں کو شام کے بعد مشرقی لانسنگ میں داخلے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ جنوری 1963ء میں اسی جگہ واقع مشی گن سٹیٹ یونیورسٹی میں میں نے طلباء کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے یہ واقعہ سنایا۔ وہیں بہت مدت بعد

میں اپنے چھوٹے بھائی رابرٹ سے ملا جو نفسیات میں پوسٹ گریجویٹ سٹڈیز کر رہا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہمیں اتنا خوفزدہ کیا گیا کہ ہمیں آبادی سے دو میل پرے گائوں میں جا کر رہنا پڑا۔ یہاں والد نے اپنے ہاتھوں چار کمروں کا گھر تعمیر کیا۔ یہیں سے میری یادوں کا واضح سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اسی گھر میں میں نے ہوش سنبھالنا شروع کیا۔

آتشزدگی کے بعد میرے والد کو بلا کر اس پستول کے پرمٹ کے متعلق پوچھ تاچھ کی گئی جس سے انہوں نے آگ لگانے والے گوروں کو مارا تھا۔ اس کے بعد پولیس اکثر ہمارے پستول کی برآمدگی کے لیے چھاپے مارتی رہی مگر پستول انہیں نہیں ملا۔ کیونکہ وہ ایک تکیے میں سِلا ہوا تھا۔ البتہ میرے والد کی 22 کی رائفل اور شاٹ گن سامنے ٹنگی رہتی تھیں کیونکہ انہیں پرندوں، خرگوشوں وغیرہ کے شکار کے لیے رکھنے کی عام اجازت تھی۔

میرے والدین کی آپس میں کبھی نہیں بنی بلکہ کبھی کبھی میرے والد، والدہ کو پیٹ بھی لیتے تھے۔ جھگڑے کی وجہ شاید میری ماں کا تعلیم یافتہ ہونا بھی تھا۔ یہ تو میں نہیں جانتا کہ اس نے تعلیم کہاں سے حاصل کی تھی مگر میرا خیال ہے کہ ایک پڑھی لکھی عورت کسی ان پڑھ مرد کی اصلاح کئے بغیر رہ نہیں سکتی۔ اور یہی بات وجہ تنازع تھی۔

میرے والد میرے سوا سب کے حق میں غصیلے تھے۔ اور کسی بھی خلاف ورزی پر مجھ سے بڑوں کو بری طرح پیٹ ڈالتے تھے۔ اور ایسا اکثر ہوتا کیونکہ ان کے اتنے اصول تھے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی کوئی نہ کوئی خلاف ورزی سرزد ہو جاتی تھی۔ مجھے جتنی بار مار پڑی ماں کے ہاتھوں پڑی۔ میرے ہلکے رنگ کی وجہ سے والد کو خوف رہتا تھا کہ کہیں گورے میری ذہنی تطہیر (Brain washing) نہ کر دیں غالباً اسی لیے وہ میرا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ یوں بھی ان دنوں سیاہ فام لوگ اپنے کم کالے بچوں سے نسبتاً زیادہ اچھا سلوک کرتے تھے۔ یہ رویہ غلامی کی روایت کی پیداوار تھا۔ کیونکہ “ملاٹو” (جن کے خون میں گورے کے خون کی آمیزش ہو) بظاہر گوروں سے زیادہ قریب نظر آتے تھے اسی لیے وہ دوسرے کالوں سے بہتر سمجھے جاتے تھے۔

اگرچہ میرا بڑا بھائی فلبرٹ گرجا جانے کا بہت شوقین تھا مگر میں کبھی گرجائوں میں دلچسپی پیدا نہیں کر سکا۔ جب والد اچھل اچھل کر بلند آہنگ میں خطاب کرتے اور پُرجوش سامعین دیوانہ وار دل و جان سے گاتے اور دعائیں کرتے تو میں حیران ہو کر انہیں دیکھا کرتا۔ اس کم عمری میں بھی مجھے حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کے عیسائی نظریے پر ہرگز یقین نہیں تھا۔ بیس سال کی عمر تک اور پھر جیل جانے تک مجھے مذہب کے نمائندوں سے سخت چڑ تھی۔

مبلغ بن کر والد کو لانسنگ کے سیاہ فاموں سے زیادہ سے زیادہ رابطہ کرنا آسان ہو جاتا۔ جن کی حالت اس وقت بہت خراب تھی۔ خراب تو اب بھی ان کی حالت ہے... مگر دوسرے انداز میں میرا مطلب ہے یہ متوسط طبقے کے وہ سیاہ فام ہیں جو گمراہی کی وجہ سے گورے رنگ کو باعثِ فخر اور گوروں سے یکجہتی کو لازمۂ حیات سمجھتے تھے۔

لانسنگ میں کامیاب سیاہ فام وہ لوگ سمجھے جاتے تھے جو یا تو ہوٹلوں میں بیرے تھے یا جوتے چمکاتے تھے اور کسی بڑی دکان پر دربان ہونا تو کامیابی کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ لانسنگ کنٹری کلب کے بیروں اور ریاست کے مرکزی دفتر کے جوتے چمکانے والوں کو اشرافیہ، بڑے لوگ یا کالوں کے نمائندے سمجھا جاتا تھا۔ اصل سیاہ فام امراء وہ تھے جو یا تو جوئے خانے وغیرہ چلاتے تھے یا وہ جو اپنے بھائی بندوں کا خون چوستے تھے۔ لیکن غالب آبادی یا تو بھیک خیرات پر گزارہ کرتی تھی یا بھوکی مرتی تھی۔

ایسے دن بھی آئے کہ ہم غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر ڈونٹ کا سوراخ تک کھانے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن پھر بھی ہم دوسروں سے بہتر تھے کیونکہ ہم اپنی روزی خود کماتے تھے جبکہ دوسرے سیاہ فام اس آسمانی خوان اور جنت کی امید میں سسک رہے تھے جو گوروں کو اسی دنیا میں میسر تھے۔

اگرچہ ہمارے گھر کا خرچ زیادہ تر والد کی تبلیغ کی آمدنی ہی سے چلتا تھا مگر والد اس کے علاوہ دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کر لیتے تھے۔ ہمارے والد کی پہچان، جس پر مجھے فخر تھا، مارکس گاروی کی تعلیمات پر مشتمل وہ شعلہ بار جنگجویانہ تقاریر تھیں جس کی وجہ سے میرے والد ایک سخت جان شخص کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک بار ایک بڑھیا نے مسکراتے ہوئے میرے والد سے کہا تھا “تم تو ان گوروں کو ڈرا ڈرا کر ہی مار دو گے۔”

والد کبھی کبھی مجھے یو این آئی اے کی مجلسوں میں لے جاتے جو مختلف گھروں میں خفیہ طور پر منعقد ہوتی تھیں۔ جن میں ایک وقت میں بیس سے زیادہ افراد نہیں ہوتے تھے۔ ان مجلسوں میں شرکاء کا رویہ گرجا کے رویے سے قطعی مختلف ہوتا۔ سب لوگ فکر مند ذہین اور باعمل نظر آتے اور میں خود بھی ایسا محسوس کرتا۔ موضوعِ گفتگو “افریقہ افریقیوں کے لیے” اور “جاگو ایتھوپیئنز” ہی ہوتا۔ میرے والد بڑے جوش سے کہتے کہ “وہ وقت دور نہیں جب افریقہ پر افریقیوں کی حکومت ہو گی، کالوں کی حکومت۔ یہ طوفان کسی بھی وقت برپا ہو سکتا ہے۔” والد کے پاس ہر وقت مارکس گاروی کی بہت سی تصاویر رہتی تھیں جنھیں وہ ان مجلسوں میں دستی تقسیم کرتے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ گاروی کے پیروکار صرف یونائٹڈ اسٹیٹس ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں ہیں۔ ان مجالس کا اختتام والد کے ان جملوں پر ہوتا۔ “اٹھو ایک عظیم نسل کے لوگو، جاگو، تم چاہو تو سب کچھ حاصل کر سکتے ہو۔” مجھے اس دور میں افریقہ کے

متعلق کوئی شعور نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ افریقہ برہنہ وحشیوں آدم خوروں، بندروں، شیروں اور بخاراتی جنگلوں کی سرزمین ہے۔

جب والد تبلیغ میں مصروف ہوتے تو والدہ گھر پر پکائی، دھلائی، صفائی وغیرہ میں یا ہم آٹھوں بہن بھائیوں کو ڈانٹ ڈپٹ میں مصروف رہتیں ان دنوں زیادہ تر والدہ کی والد کے ساتھ بول چال بند رہتی تھی اور گفتگو صرف لڑائی کے وقت ہوتی تھی۔ بہت سارے اختلافات میں سے ایک اختلاف خوراک پر بھی تھا۔ ہماری والدہ اس معاملے میں بہت سخت تھیں۔ وہ سؤر اور خرگوش کا گوشت نہ خود کھاتی تھیں نہ ہمیں کھانے دیتی تھیں۔ جبکہ والد ان دونوں کے بہت شوقین تھے۔ وہ جارجیا کے اصل سیاہ فاموں کی طرح اسے "روحانی غذا" قرار دیتے تھے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ میری والدہ کو جب بھی موقع ملتا میری پٹائی سے گریز نہیں کرتی تھیں۔ وہ مجھے پیٹتیں تو پڑوسیوں کو لگتا کہ گویا مجھے ذبح کر رہی ہیں کیونکہ جونہی وہ مجھے مارنے کا ارادہ کرتیں میں اس قدر زور زور سے چیخنا شروع کر دیتا کہ ساری دنیا سمجھتی کہ مجھ پر بے انتہا ظلم ہو رہا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ والدہ راہ گیروں اور پڑوسیوں سے گھبرا کر پٹائی کا ارادہ بدل دیتیں اور ہلکے پھلکے ہاتھ لگا کر چھوڑ دیتیں۔

میرا خیال ہے جس طرح والد میرے ہلکے رنگ کی وجہ سے مجھ سے زیادہ محبت کرتے تھے اس کے برعکس میری والدہ اسی وجہ سے مجھ سے زیادہ خار کھاتی تھیں۔ حالانکہ ان کا اپنا رنگ ہلکا تھا مگر وہ پیار زیادہ کالے بچوں سے کرتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ وہ مجھے زیادہ کالا کرنے کے لیے دھوپ میں کھڑا رکھتیں۔ اور مجھ میں رنگ کی برتری کا احساس پیدا نہ ہونے دیتیں۔ شاید انہیں اپنے ہلکے رنگ کے پس منظر پر شرمندگی تھی۔

یہ بات میں نے شروع میں ہی سیکھ لی تھی کہ احتجاجاً چیخنے چلانے سے کام جلد نکل آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے بہن بھائی اگر کبھی سکول سے واپسی پر بسکٹ وغیرہ مانگتے تو والدہ انہیں صاف انکار کر دیتیں۔ مگر میں اتنا شور مچاتا اور روتا کہ بسکٹ دیئے بنا نہ بن پڑتا۔ وہ مجھ سے کہتیں "آخر تم ولفرڈ (جو سب سے کالا تھا) کی طرح اچھے بچے کیوں نہیں بنتے؟" مگر مجھے پتہ تھا کہ اچھا بن کر صرف بھوکا رہا جا سکتا ہے۔ میرا تجربہ یہی ہے کہ اگر آپ نے کچھ حاصل کرنا ہے تو شور مچانا ضروری ہے۔

ہمارے گھر میں نہ صرف ایک بڑا سا باغیچہ تھا بلکہ ہم مرغیاں بھی پالتے تھے۔ میں نے والدہ کی اجازت سے اپنا علیحدہ قطعہ بنایا ہوا تھا جہاں میں بالخصوص مٹر بہت شوق سے اگاتا تھا۔ اور جب یہ مٹر پکتے تو مجھے بہت فخر محسوس ہوتا۔

مجھے زراعت سے بہت لگائو تھا میں ہاتھوں سے نلائی کرتا۔ جڑی بوٹیاں اکھاڑتا۔ کیڑے مکوڑے مارتا اور جب سب کچھ ٹھیک ہو جاتا تو میں کیاریوں کے بیچ چت لیٹ کر آسمان میں تیرتے بادلوں کو دیکھتا اور دنیا جہان کی باتیں سوچتا۔

پانچ سال کی عمر میں مجھے سکول داخل کروایا گیا جس کا نام ’پلیزنٹ گروو سکول” تھا۔ اور یہ شہر سے دو میل باہر تھا۔ ولفرڈ، ہلڈا اور فلبرٹ بھی یہیں پڑھتے تھے۔ چونکہ ہمارے علاوہ اور کوئی سیاہ فام یہاں داخل نہ تھا اس لیے ہمیں داخلہ دے دیا گیا کیونکہ دوچار سیاہ فام بچوں سے انہیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ سفید فام بچے ہمیں ”نگرّ، ڈارکی اور رسَٹس (زنگی) کہہ کر بلاتے مگر ہمیں برا نہیں لگتا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ ہمارے فطری نام ہیں اور سفید فام بچے بھی ہمیں ان ناموں سے بے عزتی کی غرض سے نہیں بلاتے تھے ان کا خیال تھا کہ ہمیں ایسے ہی بلانا چاہیے۔ 1931ء کی ایک سہ پہر کی بات ہے جب ولفرڈ، ہلڈا اور فلبرٹ اور میں گھر آئے تو والدین میں حسبِ معمول بحث جاری تھی گھر میں پہلے بھی ”بلیک لیجن“ کی دھمکیوں کی وجہ سے اک تنائو کی کیفیت تھی میرے والد نے ایک خرگوش اٹھایا اور والدہ کو پکانے کا حکم دیا۔ عام طور پر ہم یہ خرگوش سفید فاموں کو بیچنے کے لیے پالتے تھے لیکن گھر میں نہیں کھاتے تھے۔ میرا باپ بہت مضبوط ہاتھوں کا مالک تھا اسے مرغی یا خرگوش کی گردن اتارنے کے لیے چھری کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے خرگوش کی گردن اس کے جسم سے علیحدہ کی اور خونچکاں دھڑ والدہ کے قدموں میں پھینک دیا میری والدہ روتے ہوئے خرگوش کی کھال اتارتے ہوئے پکانے کی تیاری کرنے لگیں لیکن والد بہت غصے میں تھے انہوں نے زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھولا اور گھر سے باہر نکل گئے۔ والدہ میں ایک عجیب بات تھی انہیں کبھی کبھی بعض واقعات کا پہلے سے احساس ہو جاتا تھا اور میرا خیال ہے کہ ان کی یہ خوبی ان کے اکثر بچوں میں بھی موجود تھی جب کچھ ہونا ہوتا ہے تو مجھے بھی قبل ازوقت کچھ عجیب سا احساس ہونے لگتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میرے لیے کوئی بات بالکل ہی ناگہانی ہو سوائے ایک کے اور وہ یہ تھی کہ جب بہت سالوں بعد مجھے علم ہوا کہ جس شخص کی خاطر میں جان بھی دے سکتا ہوں اور جس پر میرا غیر متزلزل ایمان تھا وہ میرے تصور سے بالکل مختلف ثابت ہوا۔

میرے والد گھر سے بہت دور جا چکے تھے جب میری والدہ انہیں آوازیں دیتی اور روتی ہوئی ان کے پیچھے دوڑیں میرے والد نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔ ہاتھ ہلایا اور آگے چلے گئے بعد میں میری ماں نے مجھے بتایا کہ اس وقت انہیں یوں لگا کہ جیسے میرے باپ کا آخری وقت آ گیا ہے۔ ساری سہ پہر وہ پریشان ہو کر روتی رہیں۔ خرگوش پکا کر

اس نے ایک طرف رکھ دیا۔ جب رات گئے تک والد واپس نہ آئے تو ہماری والدہ ہم سب بچوں کو اپنے ساتھ لیٹا لیٹا کر رونے لگیں ہم ان کے اس غیر معمولی رویے پر بہت حیران تھے۔

مجھے یاد ہے کہ میں رات کو کسی وقت اپنی والدہ کی رونے کی آواز سن کر جاگا کمرے سے باہر آیا تو بہت سے پولیس والے میری ماں کو چپ کروانے کی کوشش کر رہے تھے ہم سب بچوں کو بغیر کسی کے بتائے یہ علم ہو گیا تھا کہ ہمارے والد کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔

میری والدہ پولیس کے ساتھ ہسپتال چلی گئیں جہاں ایک چادر کے نیچے میرے باپ کا جسم پڑا تھا۔ جسے دیکھنے کی میری والدہ میں ہمت نہ ہوئی میرے والد کی کھوپڑی ایک طرف سے بالکل کچلی گئی تھی۔ لانسنگ کے سیاہ فاموں کا کہنا تھا کہ پہلے میرے والد پر حملہ کیا گیا پھر ان پر سے ایک کار گزار دی گئی جس سے اس کے جسم کے تقریباً دو حصے ہو گئے۔ وہ اس حال میں بھی دو اڑھائی گھنٹے زندہ رہے۔ اس زمانے کے سیاہ فام بالخصوص جارجیا کے سیاہ فام آجکل کے سیاہ فاموں سے بہت زیادہ سخت جان تھے انہیں اپنی بقا کے لیے سخت جان ہونا پڑتا تھا۔

صبح کے وقت ہم بچوں کو پتہ چلا کہ ہمارے والد مر چکے ہیں۔ میں تب چھ سال کا تھا۔ ہمارے گھر میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے وہ سب رو رہے تھے اور غصے سے کہتے تھے کہ ”بلیک لیجن“ نے ہی ہمارے والد کو مارا ہے۔ ہماری والدہ حواس میں نہیں تھیں کچھ عورتیں انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ باوجود ہمارے والد کے مبلغ ہونے کے ان کا جنازہ چرچ میں نہیں پڑھایا گیا بعد میں ہمارے چار کمروں کے گھر میں مہمان ایک ہفتہ ٹھہرے ان میں سے اکثر کو میں گاروی کی مجلسوں میں دیکھ چکا تھا۔

والدہ کی نسبت ہم بچوں کی زندگی جلد معمول پر آ گئی کیونکہ ہمیں آنے والے مسائل کا اندازہ نہیں تھا۔ مہمانوں کے جانے کے بعد ہماری والدہ ان دو انشورنس پالیسیوں کی رقم کے لیے بھاگ دوڑ کرنے لگیں جو ہمارے والد نے اپنی زندگی میں لی ہوئی تھیں۔ ایک پالیسی کی رقم تو ہمیں سہولت سے مل گئی جو کہ چھوٹی رقم تھی۔ غالباً ہزار ڈالر پانچ سو ڈالر لیکن یہ سارے پیسے والد کی تجہیز و تکفین پر اٹھ گئے بڑی رقم کی انشورنس پالیسی کی ادائیگی میں کمپنی والوں نے حیل حجت شروع کر دی ان کا کہنا تھا کہ ہمارے والد نے خودکشی کی ہے ان کو یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ ہمارے والد اپنا سر کچل کر کسی کار کے آگے خود نہیں لیٹ سکتے تھے۔

ہماری والدہ چونیتس سال کی بیوہ تھیں جس کے آٹھ بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ زندگی کو کھینچ تان کر ایک معمول پر لے آئیں۔

ان حالات میں وِلفرڈ جواب کافی سمجھ دار تھا اپنی عمر سے زیادہ ذمہ دار اور سنجیدہ نظر آنے لگا اس نے سکول چھوڑ دیا اور قصبے میں کام کی تلاش میں چلا گیا اسے جو بھی کام ملتا وہ کرتا شام کو تھکا ہارا گھر آتا اور جتنی بھی آمدنی ہوتی والدہ کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ ھلڈا نے بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سنبھال لی۔ البتہ میں اور فلبرٹ کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ ہم ہر وقت لڑتے رہتے، گھر میں آپس میں اور سکول میں مل کر دوسروں کے ساتھ۔

ریگی نالڈ شروع ہی سے میرے زیر اثر تھا اور اسی لیے مجھ سے نسبتاً زیادہ قریب تھا۔ وہ چھوٹا تھا اور مجھ پر انحصار کرتا تھا اور یہ بات مجھے بھی اچھی لگتی تھی۔

میری ماں نے ادھار لینا شروع کر دیا۔ حالانکہ والد ادھار کے سخت خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ "ادھار قرض کی جانب پہلا قدم ہے جو آپ کو غلامی کی طرف لے جاتا ہے۔" والدہ لانسنگ میں سفید فاموں کے گھروں میں بھی کام کے لیے جانے لگیں۔ عام گوروں کے برعکس انہوں نے والدہ کے سیاہ فام ہونے پر اعتراض نہیں کیا مگر یہ تبھی تک ہو سکا جب تک انہیں یہ علم نہیں ہوا کہ ہماری والدہ کس شخص کی بیوہ ہیں۔ پھر اکثر والدہ نوکری چھن جانے پر آنسو روکنے کی ناکام کوشش کرتے گھر لوٹتیں۔ کچھ لوگ ان کے ہلکے رنگ سے دھوکہ کھا کر انہیں سفید فام سمجھ لیتے۔ ایک بار جب ہم میں سے ایک انہیں کام کے اوقات میں ملنے چلا گیا تو مالکوں کو علم ہوا وہ دراصل سیاہ فام ہیں اور انہیں کھڑے کھڑے برخاست کر دیا گیا۔ اس بار وہ گھر آئیں تو انہوں نے آنسو روکنے یا چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

پھر "ریاستی بہبود" کے کارکن ہمارے گھر آنے لگے۔ وہ ہزارہا سوال پوچھتے اور ہمیں یوں دیکھتے جیسے ہم انسان نہیں۔ یوں بھی ہم ان کی نظر میں "اشیاء" سے زیادہ کچھ نہیں تھے۔

پھر والدہ کو پینشن اور "ویلفیئر" کی رقم ملنے لگی جس سے کچھ پریشانی کم ہو گئی۔ مگر جب یکم تاریخ کو ہمیں رقم ملتی تو ساری ادائے قرض میں نکل جاتی۔ ہم تیزی سے غربت و پس ماندگی کی طرف جا رہے تھے۔ جسمانی سے زیادہ ذہنی طور پر۔ ہماری والد خوددار عورت تھیں انہیں خیرات لینا بہت کٹھن محسوس ہوتا اور وہ ہمیں اس کا احساس دلاتیں۔ وہ سبزی فروش سے جھگڑتیں کہ وہ قیمت سے زیادہ رقم وصول کرتا ہے۔ ریاستی بہبود کے کارکنوں سے الجھتیں کہ وہ

بار بار معائنہ کے بہانے ہمارے گھر کیوں آتے ہیں۔ لیکن امدادی رقم ان کا سب سے بڑا ہتھیار تھی ۔ وہ ایسی حرکتیں کرتے گویا وہ ہمارے مالک ہیں اور ہم ان کی ذاتی جائیداد ہیں۔ جب ان کارکنوں نے بڑے بچوں کو علیحدہ لے جا کر سوال پوچھنے شروع کیے اور انہیں والدہ اور دیگر بہن بھائیوں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا تو والدہ بے حد آگ بگولا ہوئیں۔ وہ ان سے امدادی اشیاء بھی لینا پسند نہیں کرتی تھیں کیونکہ اس سے غالباً عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچتی تھی۔

1934ء کا سال بہت تکلیف کا سال تھا۔ ہمارے جاننے والوں کے پاس بھی کھانے کو وافر نہیں تھا۔ کچھ پرانے احباب ملنے آتے تو ہمارے کھانے کے لیے بھی کچھ لے آتے اور والدہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ خیرات قبول کر لیتیں۔

ولفرڈ اور والدہ خوب محنت کرتے، جو کام بھی ملتا کرتے۔ لانسنگ میں ایک بیکری تھی جہاں سے ہم دو بچے ایک نکل کے عوض ایک دن پرانی ڈبل روٹیوں اور بسکٹوں سے بھرا تھیلا خرید لاتے جس سے ہماری والدہ انواع و اقسام کے کھانے تیار کرتیں۔ مگر ایسے دن بھی آتے جب ہمارے پاس ایک نکل بھی نہ ہوتا اور بھوک کے مارے ہمیں چکر آنے لگتے۔ والدہ ہماری حالت دیکھ کر کگروندے کے پتے توڑ کر پکا لیتیں اور ہماری بھوک کی کچھ تسکین ہو جاتی۔ مگر کچھ تنگ دل لوگوں کو یہ بھی برداشت نہ ہوتا اور ان کے بچے ہمیں ”گھاس خور“ کہہ کر چڑایا کرتے۔

میں اور فلبرٹ اب اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ آپس میں لڑنا ترک کر کے والد کی اعشاریہ 22 بور کی رائفل سے خرگوشوں کا شکار کھیلنے لگے تھے۔ یہ شکار ہم سفید فام لوگوں کو بیچ دیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ شکار صرف ہماری مدد کی غرض سے خریدتے تھے کیونکہ وہاں سب لوگ خود شکار کرنے کے عادی تھے۔

نفسیاتی انحطاط ہمارے گھر کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔ پہلے ہم ”امدادی اشیائ“ لینے سے انکار کر دیتے تھے پھر ہم نے یہ اشیاء قبول کرنا شروع کر دیں۔ پھر ایسا ہونے لگا کہ میں سکول سے گھر جانے کی بجائے لانسنگ چلا جاتا اور دکانوں کے باہر نمائشی پھلوں وغیرہ کے گرد منڈلاتا رہتا اور جونہی داؤ لگتا کوئی کھانے کی چیز اُڑا لیتا۔ یا میں ملنے والوں کے ہاں پہنچ جاتا اور یہ خیال رکھتا کہ ہمیشہ کھانے کے وقت جاؤں۔ انہیں بھی یہ بات معلوم تھی مگر اس کے باوجود انہوں نے کبھی برا نہیں منایا بلکہ خود سے کہہ کر کھانے کے لیے روک لیتے تھے اور میں خوب پیٹ بھر کر لوٹتا۔

میں جتنا گھر سے باہر رہتا۔ دوسروں کے گھروں میں جاتا یا چیزیں چراتا مجھ میں اتنا ہی غصہ پیدا ہوتا۔ میرے اندر صبر اور برداشت ختم ہوتے جا رہے تھے۔ میں ذہن کی نسبت جسمانی طور پر زیادہ تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے لوگوں کے رویے کا شعور بھی پیدا ہونے لگا تھا۔ جب میں اکثر چوری کے سلسلے میں پکڑا جانے لگا تو ”ریاستی

بہبود” کے کارکنوں نے میری نگرانی کرنا شروع کر دی۔ اسی دوران انہوں نے مجھے گھر سے دور لے جانے کی باتیں شروع کر دیں جس پر میرا والدہ نے طوفان برپا کر دیا کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش خود کر سکتی ہیں۔ انہوں نے غصے میں مجھے بھی پیٹا جس پر میں نے حسبِ عادت چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا لیکن ایک بات جس پر مجھے ہمیشہ فخر رہا ہے وہ یہ کہ میں نے کبھی اپنی والدہ پر جواباً ہاتھ نہیں اُٹھایا۔

گرمیوں کے موسم میں میں دوسرے بچوں کے ساتھ رات کے وقت چوری چھپے کھیتوں سے تربوز چرانے جایا کرتا تھا۔ سفید فام لوگوں کے نزدیک تربوزوں کی چوری صرف اور صرف کالوں سے ہی منسوب تھی اور اگر کبھی کوئی سفید فام بچہ چوری کرتا پایا جاتا تو اسے کالوں کی نقل قرار دے کر چھوڑ دیا جاتا۔ سفید فام لوگ اپنے بچوں کے برے افعال کی ذمہ داری عام طور پر کالوں کی صحبت کا نتیجہ قرار دیکر بری الذمہ ہو جاتے تھے۔ ہالووِن تہوار کی رات ہم سب بچے ملکر تربوز چرانے گئے ہم کھیت میں پچھواڑے سے داخل ہوئے لیکن کسان جسے ہمارے آنے کی پہلے ہی امید تھی نے ہمارے متوقع داخلی راستے میں گڑھا کھود کر اس میں گندہ پانی بھر دیا تھا۔ ہم سب ایک قطار میں اندر داخل ہوئے چونکہ سفید فام بچے ہر معاملے میں قیادت کرنا اپنا فطری حق سمجھتے تھے لہٰذا پہلے دونوں سفید فام بچے باڑ پھلانگتے ہی گردن گردن غلیظ پانی میں گر گئے جو کہ بے حد گندہ اور بدبو دار تھا۔

میں نے مختلف کام سیکھنا شروع کئے میں نے سٹر ابیریز چننا شروع کر دیں جس میں سارا دن کی مشقت کے بعد مجھے ایک ڈالر مزدوری ملی جو اس وقت کے اعتبار سے بہت بڑی رقم تھی۔ مجھے سخت بھوک لگی تھی اور میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ایک ڈالر سے کیا خریدوں راستے میں مجھے اپنے سے ذرا بڑا سفید فام لڑکا رچرڈ ڈکسن ملا۔ اس نے مجھے ٹاس کھیلنے کی دعوت دی وہ سکّہ اچھالتا تھا اور میں اپنی باری پر چت یا پٹ مانگتا اس کے پاس بہت ساری ریز گاری تھی چنانچہ آدھ گھنٹے کے اندر نہ صرف اس نے اپنی ریز گاری بچالی بلکہ میرا واحد ڈالر بھی جیت لیا اور میں سخت بھوک اور شرمندگی کے احساس کے ساتھ گھر واپس آ گیا لیکن اصل غصہ مجھے اس وقت آیا جب مجھے یہ علم ہوا کہ رچرڈ نے میرے ساتھ دھوکہ کیا تھا یہ میرا جوئے کے میدان کا پہلا سبق تھا کہ اگر آپ کسی کو مسلسل جیتتا دیکھیں تو یہ جان لیں کہ وہ جواء نہیں کھیل رہا بلکہ دھوکہ دے رہا ہے۔ بعد کی زندگی میں جب میں جوئے میں بہت دیر تک ہارتا تو اپنے مخالف کی حرکات کا بغور جائزہ لیتا یہی وجہ ہے امریکہ میں سیاہ فاموں کے مقابلے میں ہمیشہ گورا ہی جیتتا ہے کیونکہ وہ پیشہ ور جواری ہے اختیار سارے اس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور وہ سیاہ فاموں کو سر سے پاؤں تک چھینٹتا چلا جاتا ہے انہی دنوں سیونتھ ڈے ایڈوینٹسٹ مبلغوں نے ہمارے گھر آنا جانا شروع کر دیا اور ہماری والدہ کو

کتابچے اور رسالے مطالعے کے لیے دینے لگے ولفرڈ چونکہ مطالعہ کا بہت شوقین تھا لہٰذا وہ سکول سے آ کر انہیں پڑھتا رہتا ان لوگوں کی صحبت کی وجہ سے ہماری والدہ کھانے پینے کے معاملات میں اور بھی سخت ہو گئیں۔ یہ مبلغین "موسویؑ غذائی قوانین" پر عمل کرتے تھے ہم بچوں کو ان میں صرف اچھے کھانوں کی حد تک دلچسپی ہوتی تھی جو وہ لے کر آتے تھے سیاہ فاموں کے ساتھ ساتھ سفید فام لوگ بھی بہت بڑی تعداد میں ان کے واعظ کو سنتے تھے ان کا کہنا تھا کہ قیامت آنے والی ہے اور بہت جلد ہم سب ختم ہو جائیں گے ان سے زیادہ بااخلاق سفید فام میں نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھے تھے گھر آ کر ہم بچے ان کی باتیں کرتے ان کے پھیکے کھانوں اور جسموں سے آنے والی بدبو کا ذکر کرتے۔

اس دوران ریاستی فلاح و بہبود کے کارکن بھی ہمارے گھر آتے رہتے تھے جن کی موجودگی پر میری والدہ باآواز بلند ناپسندیدگی کا اظہار کرتی تھیں۔ انہوں نے ہم بچوں کے ذہنوں میں ایک دوسرے سے دوری کے بیج بونا شروع کر دیئے وہ ہم سے عجیب عجیب سوال کرتے مثلاً ہم میں سے زیادہ ذہین کون ہے؟ کس کا رنگ زیادہ کالا ہے یا میں اپنے بہن بھائیوں سے کیوں مختلف ہوں؟

جب میری والدہ نے اس پر احتجاج کیا تو انہوں نے میرے ذریعے والدہ پر دباؤ بڑھا دیا ان کا کہنا تھا کہ چونکہ میں چوریاں کرنے لگا ہوں لہٰذا ثابت ہوا ہے کہ میری والدہ میری درست تربیت نہیں کر رہیں اس لیے مجھے بہتر لوگوں کے حوالے کر دینا چاہیے۔ پتہ نہیں کب ریاستی فلاح و بہبود کے کارکنوں نے میری والدہ پر الزام لگایا کہ وہ اپنا دماغی توازن کھو رہی ہیں انہوں نے کھل کر الزام اس وقت لگایا جب ہماری والدہ نے ایک سیاہ فام پڑوسی سے سؤر کا گوشت لینے سے انکار کر دیا۔ یہ کارکن مکروہ گِدھوں کی مانند تھے انہیں ہماری والدہ کی عزت جذبات اور احساسات کا کوئی خیال نہیں تھا۔ انہوں نے کہا چونکہ تمہاری والدہ نے سؤر کا گوشت لینے سے انکار کیا ہے لہٰذا وہ پاگل ہیں۔ یہ وہ لمحہ تھا جب ہمارا گھر ٹوٹنا شروع ہوا میں جتنا بھی بُرا اور بے کار تھا اس کے باوجود مجھے اپنی والدہ سے بہت محبت تھی کارکنوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے گوھنّا خاندان کے حوالے کر دیا جائے اس بات پر میری ماں نے اتنا ہنگامہ کیا کہ ان لوگوں نے وقتی طور پر یہ موضوع دبا دیا۔

انہی دنوں ایک طویل القامت سیاہ فام آدمی ہمارے گھر آنے لگا جو غالباً ہماری والدہ کو کسی عزیز کے گھر پر مِل چکا تھا یہ تو معلوم نہیں کہ اس کا پیشہ کیا تھا کیونکہ 1935ء میں لانسنگ کے سیاہ فام کوئی ایسا کام نہیں کرتے تھے جسے عرفِ عام میں پیشہ کہا جا سکے لیکن یہ آدمی ہمارے والد سے بہت ملتا تھا وہ تنہا تھا اور میری ماں ایک چھتیس سالہ بیوہ

تھی اور ہماری تربیت کے لیے بھی ایک آدمی کا گھر میں ہونا بہت ضروری تھا دوسرے ریاستی کارکنوں سے گھر کو بچانے اور گھر کا خرچ چلانے کے لیے بھی ایک آدمی کی ضرورت تھی ہم یہ باتیں سمجھتے تھے اور ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ جب بھی گھر میں آتا والدہ صاف ستھرے کپڑے پہنتیں اور خوشگوار موڈ میں نظر آتیں۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک چلتا رہا اور 1936ء یا 1937ء میں اس آدمی نے اچانک ہماری والدہ سے لاتعلقی اختیار کر لی جہاں تک میں سمجھا ہوں وہ آٹھ بچوں کی کفالت کی ذمہ داری اٹھانے سے ڈر گیا تھا۔ اس واقعہ کا ہماری والدہ پر بہت برا اثر پڑا اور وہ چلتے پھرتے بڑبڑاتی رہتیں اور وقت کے ساتھ یہ عادت خطرناک حد تک بڑھتی چلی گئی۔ یہ دیکھ کر ریاستی کارکن مجھے والدہ سے چھیننے کے لیے پھر فعال ہو گئے وہ مجھے بتاتے کہ گوھنّا خاندان کتنا اچھا ہے اور مجھے ساتھ رکھ کر انہیں کتنی خوشی ہو گی میں بھی اس خاندان کو پسند کرتا تھا لیکن وِلفرڈ کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس کے علاوہ میرا بڑا بھائی تھا اور میری بہن ہلڈا تھی جو مجھے ماں کی طرح عزیز تھی اور فلبرٹ تھا جس کے ہر جھگڑے میں بھی محبت کا احساس رہتا تھا۔ خاص طور پر ریگی نالڈ جو ہرنیا کی وجہ سے بہت کمزور تھا اور ہر پریشانی میں میری طرف دیکھتا تھا ان کے علاوہ چھوٹے بچے یوون' ویزلی اور رابرٹ تھے ان سب کو چھوڑنا میرے لیے بہت مشکل تھا۔ میری ماں کی بیماری بڑھتی گئی اور وہ روزبروز ہماری دیکھ بھال اور ذمہ داریوں سے غافل ہوتی گئیں ان کی عدم توجہی کی وجہ سے گھر اور ہم گندے رہنے لگے کھانے پکانے کی ذمہ داری ہلڈا نے سنبھال لی تھی۔

ہم بچے گھر کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بے بسی سے دیکھ رہے تھے اور چاہنے کے باوجود اس کے بچاؤ کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے اور مدد کے لیے وِلفرڈ اور ہلڈا جو کہ سب سے بڑے تھے کی طرف بیچارگی سے دیکھتے تھے۔

جب مجھے بالآخر گوھنا خاندان کے پاس بھیجا گیا تو بظاہر ایک حد تک مجھے خوشی بھی ہوئی جب ریاستی کارکن مجھے گھر سے لے جا رہے تھے تو میری والدہ نے ان سے کہا "انہیں میرے بچے کو سؤر مت کھلانے دینا۔" گوھنا کے ہاں رہنا کئی لحاظ سے بہتر تھا بگ بوائے اور میں ایک ہی کمرے میں رہنے لگے گوھنّا کا خاندان بہت مذہبی تھا میں اور بگ بوائے باقاعدگی کے ساتھ گرجا جاتے ان کے گرجا کا ماحول ہمارے گرجا کے ماحول سے ہنگامہ خیز اور حیران کن تھا۔ وہ لوگ کبھی کبھی مچھلی کے شکار پر جاتے تو بگ بوائے اور میں بھی ان کے ساتھ چلے جاتے۔ میں نے اپنا سکول بدل لیا تھا اور اب میں لانسنگ ویسٹ جونیئر ہائی سکول میں آ گیا تھا جو سیاہ فام آبادی کے مرکز میں تھا اور جہاں سفید فام بچے بہت کم تھے لیکن بگ بوائے اور میں لڑکوں سے زیادہ گھلتے ملتے نہیں تھے مسٹر گوھنّا کبھی کبھی دوسرے دوستوں کے ساتھ خرگوش کے شکار کے لیے ایک خاص طرح سے منصوبہ بندی کرتے تھے۔ عام طور پر جب کتا

خرگوش پر جھپٹتا اور خرگوش نکل بھاگتا تو ہمیشہ خرگوش جبلّی طور پر ایک دائرے کے اندر بھاگتا اور دوبارہ اسی جگہ پر آتا جہاں سے بھاگا تھا۔ تمام بوڑھے چھپ کر بیٹھے رہتے کہ خرگوش پہلی جگہ پر واپس آئے تو اس کو نشانہ بنائیں میں نے کافی غور کے بعد ایک منصوبہ بنایا میں اور بگ بوائے ایسی جگہ چھپتے جہاں سے خرگوش بوڑھوں کے نشانے پر آنے سے پہلے گزرتا تھا۔ یہ منصوبہ تیر بہدف ثابت ہوا اور میں بوڑھوں سے پہلے ہی تین چار خرگوش شکار کر لیتا وہ میرے طریقۂ واردات سے بے خبر تھے اس لیے ہمیشہ میرے اچھے نشانے کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ تب میری عمر بارہ سال تھی میں روزبروز اپنی حکمت عملی کو بہتر بناتا گیا یہاں سے میں نے اپنی زندگی کا ایک اہم سبق سیکھا وہ یہ کہ جب بھی آپ اپنے کسی ہم پیشہ کو اپنی نسبت زیادہ کامیاب دیکھیں تو جان لیں کہ وہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہے جو آپ نے نہیں کیا ہوا... میں اکثر اپنی والدہ کو ملنے جاتا تھا کبھی کبھار بگ بوائے اور گوھنا بھی میرے ساتھ میرے گھر جاتے جس پر مجھے بہت خوشی ہوتی۔

اب ریاستی کارکنوں نے باقی بہن بھائیوں کو بھی والدہ سے علیحدہ کرنے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔ گھر میں ہر وقت سفید فام لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا نتیجۃً میری والدہ کے حواس بالکل جواب دے گئے اور عدالت کے حکم سے میری والدہ کو سٹیٹ مینٹل ہاسپٹل کالامازو میں داخل کروا دیا گیا۔ لانسنگ کا ایک جج ”میک کلی لین“ ہم بہن بھائیوں کا سرپرست مقرر ہوا اب ہم ریاست کی ملکیت تھے جج کو ہم پر ہر طرح سے پورا اختیار تھا سیاہ فام آدمی کے بچوں پر ایک سفید فام کی سرپرستی بظاہر جتنی بھی خوش نما ہو۔ درحقیقت غلامی کی جدید اور قانونی صورت ہی ہے۔

کالامازو کے ہسپتال میں ہماری والدہ چھبیس سال تک رہیں بعد میں جب میں مشی گن چلا گیا تو اکثر والدہ سے ملنے چلا جاتا تھا مجھے اپنی والدہ کی حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔ 1963ء میں ہم نے اپنی والدہ کو ہسپتال سے نکلوایا اور اب وہ لانسنگ میں فلبرٹ اور اس کے گھر والوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ 1952ء میں میری والدہ سے آخری ملاقات ہوئی مجھے علم تھا کہ اس کے بعد میں والدہ سے نہیں مل سکوں گا تب میں ستائیس سال کا تھا۔ میرے بھائی فلبرٹ نے بتایا کہ والدہ اسے تھوڑا تھوڑا پہچانتی ہیں لیکن مجھے وہ بالکل نہیں پہچانتی تھیں۔ مجھے گھورتی رہتیں اور انہیں قطعاً یہ احساس نہ ہوتا کہ میں ان کا بیٹا ہوں ایسا لگتا تھا کہ ان کا دھیان کہیں اور رہتا ہے۔ جب میں نے ان سے بات کرنے کی کوشش میں پوچھا ”ماما آج کیا دن ہے؟“ تو انہوں نے خلاء میں دیکھتے ہوئے کہا ”سب لوگ چلے گئے ہیں“ میں اپنے احساسات بیان نہیں کر سکتا جو عورت مجھے اس دنیا میں لائی مجھے پالا میری تربیت کی مجھ سے اتنی محبت کی اب وہ مجھے نہیں پہچان رہی تھی۔ فلاح و بہبود، عدلیہ اور طبی اداروں نے مل کر ہمارے گھر کو تباہ کر دیا تھا اور یہ صرف ایک

ہمارے گھر کا ہی قصہ نہیں تھا۔ اپنی والدہ کی حالت دیکھ کر میرے اندر غصے کا الائو بھڑکنے لگتا ہے۔ میرے دل میں ایسے معاشرے کے لیے کوئی ہمدردی نہیں تھی جو لوگوں کو اس طرح کچل دیتا ہے اور پھر بوجھ تلے دبے لوگوں کو اپنے پائوں پر کھڑا نہ ہو سکنے پر سزا بھی دیتا ہے۔

میں کسی شخص سے اپنی والدہ کا ذکر کرنے سے عموماً کتراتا تھا کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اگر کسی نے نادانستگی میں بھی میری والدہ کے متعلق کوئی نامناسب رائے دے دی تو میں اس کا خون کر دوں گا۔

میں آپ کو اپنے گھر کی بربادی کی کہانی سنا رہا تھا۔ 1937ء میں فلبرٹ لانسنگ ہی کی ایک خاتون مسز ھیکٹ کو سونپ دیا گیا۔ ریگی نالڈ اور ویزلی ”ہماری والدہ کے ایک دوست گھرانے ’ولیمز“ کو دے دیئے گئے ’یوون اور رابرٹ ایک ریڈ انڈین خاندان ”میک گوائر“ کے حوالے کر دیئے گئے جبکہ ولفرڈ اور ہیلڈا کو بڑے ہونے کی وجہ سے ہمارے گھر میں ہی رہنے دیا گیا۔

جدا ہونے کے باوجود ہم ایک دوسرے سے رابطہ رکھتے، سکول اور باہر ایک دوسرے سے ملتے بھی رہتے تھے۔ اس مصنوعی فاصلے اور جدائی کے باوجود ہم جذباتی طور پر ہمیشہ ایک دوسرے کے قریب رہے۔

!

باب: 2

ماسکوٹ (Mascot)

27 جون 1937ء جولوئیس نے باکسنگ میں جیمز جے براڈک کو ناک آئوٹ کر کے عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن شپ جیت لی۔ دنیا بھر کے سیاہ فاموں کی طرح لانسنگ کے سیاہ فاموں نے بھی اس خوشی میں عظیم جشن منایا۔ ہر شخص نسلی تفاخر سے سرشار تھا۔ ہماری نسل کے لیے یہ پہلا فخر کا موقع تھا۔ ہر وہ سیاہ فام جو ٹانگوں پر کھڑا ہو سکتا تھا اگلا "Brown Bomber" بننا چاہتا تھا۔ فلبرٹ اپنے سکول کا اچھا بوکسر تھا وہ بھی انہی پرستاروں میں شامل تھا۔ میں البتہ باسکٹ بال کھیلتا تھا کیونکہ میں لمبا اور بے ہنگم سا تھا۔ اسی سال فلبرٹ نے امیچیور مقابلوں میں حصہ لیا جو لانسنگز پر ڈن آڈی ٹوریئم میں منعقد ہوئے۔ فلبرٹ کی کارکردگی کافی عمدہ رہی۔ میں روز شام کو اسے مشق کرتے دیکھنے جاتا اور شاید نامحسوس طور سے اس پر رشک بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ فلبرٹ ایک فطری باکسر تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایک ہی خاندان سے تعلق کے ناطے میں بھی اس کی طرح اچھا باکسر بن سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے بھی رنگ میں اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں شاید تیرہ سال کا تھا جب میرا پہلا مقابلہ ہوا لیکن اپنے قد کاٹھ کی وجہ سے میں نے اپنی عمر سولہ برس بتائی جو مقابلہ کے لیے کم از کم عمر تھی اور 128 پائونڈ وزن کی بنیاد پر مجھے بینٹم ویٹ میں رکھا گیا۔

پہلا مقابلہ ایک سفید فام لڑکے ”بل پٹرسن“ سے ہوا۔ مقابلے کے وقت میرے سب بہن بھائی اور تقریباً سبھی جاننے والے موجود تھے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ فلبرٹ کا بھائی کیسا باکسر نکلتا ہے۔

میں اکھاڑے میں اترا۔ باہمی تعارف ہوا۔ ریفری نے ہمیں قواعد و ضوابط سمجھائے۔ گھنٹی بجی، ہم اپنے کونوں سے نکل کر درمیان میں آ گئے۔ میں ڈرا ہوا تھا۔ بعد میں بل نے بتایا کہ وہ بھی مجھ سے ڈرا ہوا تھا۔ وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ اس نے میری مار سے بچنے کے لیے میری خوب دھنائی کی۔ میں علاقے میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا کیونکہ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کوئی کالا کسی گورے سے مار کھا کر سر اُٹھا کے جی سکے۔ خاص طور پر ان دنوں جب سیاہ فاموں کو سوائے کھیل اور شوبز کے کسی اور شعبے کے لائق نہیں سمجھا جاتا تھا اور باکسنگ کا اکھاڑہ واحد

ایسی جگہ تھی جہاں کوئی کالا بغیر پھانسی چڑھے کسی گورے کو پیٹ سکتا تھا۔ مجھے اتنی ذلت اٹھانا پڑی کہ میں نے کچھ کر دکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے زیادہ شرمندگی کا احساس مجھے ریگی نالڈ کے رویے سے ہوا جس نے کبھی اس مقابلہ کا تذکرہ تک نہیں کیا۔

اب کی بار میں نے خوب ڈٹ کر محنت کی۔ بالآخر بل پٹرسن سے دوبارہ مقابلہ کا اعلان ہوا۔ یہ مقابلہ اس کے علاقے الما، مشی گن میں ہوا۔ اس بار میرا کوئی عزیز مقابلہ دیکھنے نہیں آیا۔ خصوصاً ریگی نالڈ کی غیر موجودگی پر میں نے شکر ادا کیا۔

جونہی گھنٹی بجی میں نے ایک مکہ اپنی طرف آتے دیکھا۔ دس سیکنڈ بعد ریفری مجھ پر جھکا "دس" کہہ رہا تھا۔ شاید یہ تاریخ کا مختصر ترین مقابلہ تھا میں لیٹا گنتی سن رہا تھا مگر اُٹھ نہیں پا رہا تھا بلکہ سچ پوچھیں تو اُٹھنا چاہ بھی نہیں رہا تھا۔

یہ سفید فام لڑکا میری باکسنگ کا آغاز بھی تھا اور انجام بھی۔ آج مسلمان ہو کر میں اس مقابلے کو یاد کرتا ہوں تو اسی نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ میری شکست اللہ کی رضا تھی ورنہ آج میں نرا باکسر ہی ہوتا۔

شرارتوں کی وجہ سے مجھے سکول سے بھی نکال دیا گیا۔ سکول سے نکل کر میں نے جیب خرچ چلانے کے لیے کوئی کام ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ ایک روز ایک ریاستی کارکن آیا اور مجھے عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ وہاں مجھے "اصلاحی سکول" میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اس سے پہلے مجھے Detention Home میں رکھا گیا جو لانسنگ سے بارہ میل دور میسن مشی گن میں تھا۔ اس میں اِنگھم کاؤنٹی کے سب آوارہ لڑکے لڑکیاں اصلاحی سکول میں داخلے سے پہلے رکھے جاتے تھے بعد میں ان کا مؤقف سن کر فیصلہ کیا جاتا تھا۔ سفید فام ریاستی آدمی مسٹر مینرڈ ایلن ایک خوش مزاج اور بااخلاق آدمی تھا۔ گھر سے جاتے وقت مسز ایڈکاک اور بگ بوائے رونے لگے مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔ اپنے چند کپڑے بکس میں رکھے اور اس کے ساتھ میسن چلا گیا۔ دورانِ سفر مسٹر ایلن نے مجھ سے کہا کہ تمہارا تعلیمی ریکارڈ بتاتا ہے کہ اگر تم تھوڑے سے انسان بن جاؤ تو تمہارا مستقبل بہت روشن ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ اصلاحی سکول بہت اچھی جگہ ہے جس کی شہرت بلاوجہ خراب ہے اور یہ کے میرے جیسے لڑکے وہاں رہ کر اپنی غلطیوں پر غور کر کے ایک نئی اور شاندار زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ڈیٹنشن ھوم کی نگران مسز سورلین اور اس کا شوہر بہت اچھے لوگ ہیں۔

وہ واقعی بہت اچھے تھے مسز سورلین اپنے شوہر کی نسبت بہت بڑی، قوی ہیکل اور ہنسوڑ عورت تھی جبکہ اس کا شوہر دبلا، خاموش اور مہذب آدمی تھا وہ دونوں مجھ سے بہت شفقت سے پیش آئے۔ انہوں نے مجھے میرا رہنے کا کمرہ دکھایا اور یہ پہلا کمرہ تھا جس کا میں بلاشرکتِ غیرے رہائشی تھا۔ مجھے اس وقت خوشگوار حیرت ہوئی جب مسٹر اینڈ مسز سورلین نے مجھے اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ سفید فام لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر ایک ہی میز پر کھانا کھانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا سوائے گھر سے بھاگے ہوئے آوارہ اور بدقماش لڑکے لڑکیوں کے جنہیں لاک اپ میں رکھا جاتا تھا ہم سب بچے مسٹر اینڈ مسز سورلین کے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ ان کی باورچن بھی میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آتی یہاں آ کر مجھے ایک بار پھر احساس ہوا کہ سفید فام لوگوں کے کھانے ہم سیاہ فاموں کے کھانوں کی نسبت کتنے پھیکے سیٹھے ہوتے تھے۔ دوسرے سب سفید فام لوگوں میں سے ایک عجیب سی بو آتی تھی میں نے اپنے ذمہ ان کے گھر کی صفائی کا کام لے لیا میرے رویے سے خوش ہو کر انہوں نے مجھے اپنے گھر میں ہی رکھ لیا وہ میرے سامنے تمام گھریلو باتیں بلاجھجک کر لیتے وہ سینکڑوں مرتبہ گفتگو میں “نیگر” کا لفظ استعمال کرتے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اسے تحقیر کے لیے نہیں بلکہ عادتاً استعمال کرتے تھے مثلاً ایک دن باورچن کا شوہر آیا اور مسز سورلین سے کہنے لگا “مجھے سمجھ نہیں آتی یہ “نیگر” اتنے غریب ہونے کے باوجود اتنے خوش کیسے رہ لیتے ہیں ان کی گندی غلیظ جھونپڑیوں کے باہر چمکتی دمکتی کاریں کیوں کھڑی ہوتی ہیں۔” مسز سورلین نے جواب دیا کہ “نیگرز” ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی میری خبر گیری کے لیے میرا سرپرست جج بھی آتا اور میرا اس طرح معائنہ کرتا جیسے کسی اعلیٰ نسل کے بچھیرے کا معائنہ کر رہا ہو۔ ان لوگوں نے کبھی میری حساسیت دانشمندی اور ذودفہمی کو اس طرح تسلیم نہیں کیا جس طرح میری عمر کے سفید فام لڑکوں کی خوبیوں کو تسلیم کرتے تھے اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ باوجود ساتھ ساتھ رہنے کے کالوں کا وجود گوروں کے نزدیک عدمِ محض سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اور میں اپنے خوش گمان سیاہ فام دوست جنہیں نام نہاد آزاد خیال “گوروں” سے دوستی اور وفاداری کا جنون ہے، کُھل کر یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ سفید فام لوگ ہمیں اگر ظاہراً قبول کر بھی لیں تو دل سے ہمیں تسلیم نہیں کرتے۔ یہ لوگ کتنے بھی خوش اخلاق ہوں مگر آپ کو اس نظر سے نہیں دیکھیں گے جس نظر سے خود کو دیکھتے ہیں۔ یہ آپ کا ساتھ بھی دیں گے مگر ایک حد تک۔ یہ بات ان کے لاشعور میں بیٹھ چکی ہے کہ وہ سیاہ فاموں سے برتر نسل ہیں۔

لیکن نظر بندی کے دنوں میں مجھے ان باتوں کا اتنا احساس نہیں تھا۔ میں دل لگا کر اپنے روزمرہ کے کام سرانجام دیتا۔ میرے رویے کے پیشِ نظر مجھے ہفتے کی آخر میں لانسنگ جانے کی اجازت بھی مل جاتی تھی۔ اگرچہ میری عمر کم تھی

مگر میں دیکھنے میں بڑا لگتا تھا۔ اس لیے رات گئے سیاہ فام آبادی کی ان گلیوں میں بھی بلا جھجک چلا جاتا تھا جہاں عام طور پر لوگ جاتے ہوئے کتراتے تھے۔

اب ولفرڈ اور فلبرٹ اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ سکول کی رقص کی تقریبات میں لڑکیوں سے ملاقاتیں کرنے لگے تھے انہوں نے مجھے بھی چند لڑکیوں سے ملوایا مگر جن لڑکیوں نے مجھ میں دلچسپی ظاہر کی وہ مجھے پسند نہیں آئیں اور شاید ایسا ہی مسئلہ دوسری طرف تھا۔ نہ تو مجھے رقص کرنا آتا تھا نہ میں ان لڑکیوں پر اپنا پیسہ خرچ کرنا چاہتا تھا چنانچہ اکثر ویک اینڈز پر میں سیاہ فاموں کے شراب خانوں اور ریستورانوں میں گھوتا۔ جہاں اونچی آواز میں مشہور گلوکاروں کے گیت بجتے رہتے تھے جن میں "ارسکن ھاکن" کا "ٹکسیڈو جنکشن" اور "سلِم اینڈ سلیم" کا "فلیٹ فٹ فلوگی" بہت مقبول تھے۔ کبھی کبھی نیویارک سے کوئی مشہور گروپ آتا جس کی دھنوں پر رات رات بھر رقص ہوتا۔ کسی بھی گروپ کی کامیابی کے لیے یہ کافی تھا کہ وہ نیویارک سے آیا ہو۔ انہی دنوں میں نے پہلی بار "لکی ٹامسن" اور "مِلٹ جیکسن" کو سنا بعد میں میری ان سے "ہارلم" میں بڑی جان پہچان رہی۔

کئی لڑکے جو مجھ سے چھوٹے تھے اپنے اپنے وقت پر "اصلاحی سکول" بھیج دیئے گئے مگر مجھے جتنی بار بھی بلایا گیا میرے نگرانوں نے ان کے پیغام کو نظرانداز کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ مسز سورلین کی مہربانی ہے اور میں تہہ دل سے ان کا شکر گزار تھا۔ انہی کی مہربانی سے مجھے "میسن جونیئر ہائی سکول" میں داخل کروا دیا گیا۔ میں پہلا لڑکا تھا جسے "ڈٹینشن ہوم" میں رہتے ہوئے سکول میں داخل کروایا گیا۔ مجھے ساتویں درجہ میں داخل کیا گیا۔ میرے علاوہ ایک اور سیاہ فام گھرانے "لائنز" کے بچے بھی وہیں پڑھتے تھے۔ یہ ایک معزز گھرانہ تھا۔ اس سکول کے بعض بچے بے حد دوستانہ مزاج کے تھے۔ میں اپنی جماعت میں بہت مقبول تھا۔ جس کی دو وجہیں تھیں ایک تو یہ کہ میں عام لڑکوں سے تھوڑا سا مختلف تھا شاید اسی لیے میری طلب بہت زیادہ تھی۔ دوسرے میری سرپرست مسز سورلین جیسی ہردلعزیز شخصیت تھی۔ میں اپنے سکول کی تمام غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہتا مباحثہ ہوتا یا باسکٹ بال کا میچ یا کوئی اور مقابلہ میں سب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ کچھ عرصہ بعد مسز سورلین نے مجھے ایک مقامی ریسٹورنٹ میں برتن دھونے کی نوکری دلوا دی۔ ریسٹورنٹ کا مالک میرے سفید فام ہم جماعت کا والد تھا۔ ہر جمعہ کی رات جب مجھے ہفتہ وار تنخواہ ملتی تو مارے خوشی کے مجھے یوں لگتا کہ میرا قد دس فٹ اور لمبا ہو گیا ہے۔ تنخواہ تو میری بہت تھوڑی تھی لیکن میرے لیے بہت تھی جونہی میرے پاس کچھ پیسے جمع ہوئے میں نے نئے جوتے خریدے۔ ایک سبز رنگ کا سوٹ سلوایا اور سکول میں بھی اپنے دوستوں کو دعوت کھلائی۔ جماعت میں انگریزی اور تاریخ کے مضامین مجھے

بہت پسند تھے میں انگریزی کے استاد کو بھی بہت پسند کرتا تھا جو ہمیشہ مجھے اچھی نصیحت کرتے تھے جب کہ تاریخ کے استاد ہمیشہ سیاہ فاموں کا مذاق اڑاتے اور ان کے متعلق لطیفے سناتے رہتے وہ سیاہ فاموں کی غلامی آزادی ان کی بے عملی اور کاہلی کا تمسخر اڑاتے تھے۔ میرا سب سے ناپسندیدہ مضمون حساب تھا میں بہت غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حساب ایک بہت عملی مضمون ہے جس میں بحث کی گنجائش نہیں ہوتی اگر آپ سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو آپ اسے محض دلائل سے نہیں چھپا سکتے۔

باسکٹ بال میں بہت اچھا کھیلتا تھا اور اکثر ٹیم کے ساتھ دوسرے شہروں میں بھی مقابلے کے لیے جاتا رہتا تھا۔ میرا چہرہ دیکھتے ہی سفید فام تماشائی میرے رنگ پر طنز آمیز غلیظ جملے کسنے لگتے لیکن میں نے اس کی شکایت کبھی اپنی ٹیم یا کوچ سے نہیں کی۔ دراصل آج کل کے سیاہ فام لوگوں کی طرح میرے ذہن میں بھی یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ میں بہت ترقی کر رہا ہوں۔ اس ذلت اور بے عزتی کے باوجود میرا معاشرے میں ایک مقام ہے باسکٹ بال کے مقابلوں کے بعد ہمیشہ سکول ڈانس ہوتا جب بھی ہماری ٹیم جم میں ڈانس کے لیے داخل ہوتی تو میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگتے جب سفید فام کھلاڑیوں نے دیکھا کہ میں ان کے ساتھ کم گھلتا ملتا ہوں تو انہوں نے بھی شاید سکون کا سانس لیا اور میں نے بھی آہستہ آہستہ اپنی عادت میں اتنی تبدیلی کی کہ لوگوں کو احساس دلائے بغیر محفل میں الگ تھلگ رہنے لگا۔ حتیٰ کہ سکول میں بھی اپنی تمام تر ہردلعزیزی اور شہرت کے باوجود اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کسی سفید فام لڑکی کے ساتھ رقص کر سکوں۔ یہ ایک طرح سے دوطرفہ رویہ تھا میں ایک طرف کھڑا دوستوں کے ساتھ سینڈوچز اور مشروبات سے لطف اندوز ہوتا، باتیں کرتا اور پھر کوئی بہانہ کر کے جلدی وہاں سے نکل آتا۔

ان دنوں ایک بات ایسی پیش آئی جس نے مجھے بہت حیران و پریشان کیا۔ میسن کے "ڈیٹینشن ھوم" کے بہت سے سفید فام لڑکے جن سے میری زیادہ بے تکلفی تھی بعض اوقات مجھے تخلیہ میں لے جاتے اور سفید فام لڑکیوں سے جنسی تعلقات قائم کرنے کی ترغیب دیتے اور اس سلسلہ میں میں بعض اوقات اپنی بہنوں تک کی پیش کش کر دیتے تھے۔ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان کے اپنے بھی سفید فام لڑکیوں سے تعلقات ہیں یہاں تک کہ وہ بہنوں کے ساتھ بھی جنسی اختلاط کی باتیں کیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ تھی جو کہ میں بعد میں سمجھا کہ وہ سازشی طور پر مجھے سفید فام لڑکیوں کے ساتھ ملوث کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ سکول کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے پر ان لڑکیوں کو بلیک میل کر سکیں اور اس کی آڑ میں اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کر سکیں۔ سفید فام لڑکوں کا خیال تھا کہ ایک سیاہ فام

ہونے کے ناطے فطری طور پر مجھ میں غیر معمولی جنسی صلاحیتیں ہیں اور میں جبلّی طور پر لڑکیوں کی نفسیات و خواہشات سے زیادہ واقف ہوں۔ ایک بات جو میں نے کبھی کسی کو نہیں بتائی وہ یہ تھی کہ فلبرٹ اور ولفرڈ کے حوالے سے میری کچھ لڑکیوں کے ساتھ جان پہچان ضرور تھی لیکن کبھی بہت قربت کے لمحوں میں بھی میں اخلاقی حدود کو نہیں توڑ سکا شائد میں اس حوالے سے بہت بہادر نہیں تھا۔ سیچر ڈے نائٹس میں کالوں کے علاقوں میں آوارہ گردی کر کے میں یہ بات جان چکا تھا کہ لانسنگ میں نسلی اختلاط معمول کی بات ہے لیکن حیران کن حد تک مجھ پر ان حالات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ علاقے کا ہر سیاہ فام جانتا تھا کہ سفید فام لوگ اپنی گاڑیوں میں آتے ہیں اور سیاہ فام لڑکیوں کو بٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ہمارے علاقے کے ساتھ ہی ایک پل کے دوسری طرف سفید فام لوگوں کا طبقہ امراء رہتا تھا اس پُل پر سفید فام امیر عورتیں سیاہ فام مردوں کی تلاش میں رہتیں جو خود بھی اسی مقصد کے لیے پل کے آس پاس رہتے تھے۔ یہ امیر عورتیں سیاہ فام مردوں کے تعاقب میں بہت مشہور تھیں میرا اپنا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہم سیاہ فاموں میں اتنی غیر معمولی جنسی صلاحیتیں نہیں ہیں جتنی عام طور پر گورے سمجھتے ہیں اور ہمارے علاقے میں کبھی اس حوالے سے دنگا فساد بھی نہیں ہوا میری طرح سب لوگ اسے معمول کی بات سمجھتے تھے۔

سکول میں ساتویں درجے کے دوسرے سمیسٹر کے دوران مجھے اپنی جماعت کا صدر منتخب کیا گیا جس پر لوگوں سے زیادہ خود مجھے حیرت تھی۔ لیکن اس کی وجہ میرا دوسروں سے منفرد اور تعلیمی اعتبار سے ممتاز ہونا تھا۔ مجھے صدر بننے پر بڑا فخر محسوس ہوا کیونکہ ان دنوں مجھے سیاہ فام ہونے کا خاص شعور نہیں تھا اور میں بھی دیگر سیاہ فام لوگوں کی طرح گورا ہونے کے لیے انتہائی جتن کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں آج بھی اپنے سیاہ فام لوگوں کو زور دے کر کہتا ہوں کہ وہ گورا نظر آنے کے لیے اپنا وقت برباد نہ کریں میں ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

میرے صدر بننے پر مسز سورلین اور ریاستی نگران بہت خوش ہوئے۔ جب میں اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے سرپرستوں سے ملنے گیا تو وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ ان دنوں صرف ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے مجھے ذہنی طور پر پریشان کیا وہ تھا لانسنگ میں فلم ”گون ود دی ونڈ“ کی نمائش۔ میں تھیٹر میں واحد سیاہ فام تماشائی تھا۔ بٹر فلائی میک کوئین کی اداکاری دیکھ کر میں شرمندگی سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ ہر ہفتے میں وِلفرڈ اور ہلڈا سے ملنے اپنے پرانے گھر جاتا ہلڈا گھر کو بہت صاف ستھرا رکھتی جو کہ آٹھ بچوں کی غیر موجودگی میں کافی آسان کام تھا وِلفرڈ ادھر ادھر کوئی نہ کوئی کام تلاش کر کے چار پیسے کما لیتا اور حسبِ عادت جو کتاب بھی اسے مطالعے کے لیے ملتی اسے اوّل تا آخر پڑھ

ڈالتا جبکہ فلبرٹ بھی بطور باکسر کافی شہرت حاصل کر چکا تھا ہر آدمی کو یقین تھا کہ ایک روز وہ بہت بڑا پیشہ و ر کھلاڑی بنے گا۔ ریگی نالڈ اور ویزلی سے ملاقات ہوتی رہتی تھی میں وقتاً فوقتاً انہیں جیب خرچ کے طور پر دو دو ڈالر بھی دے دیتا یوون اور رابرٹ بھی ویسٹ انڈین خاندان کے ساتھ اچھا وقت گزار رہے تھے۔ ہم اپنی گفتگو میں والد اور والدہ کے بارے میں بہت کم گفتگو کرتے ہم نہیں چاہتے تھے کہ لوگوں کو ان کے متعلق باتیں کرنے کا موقع ملے کبھی کبھار ہم اپنی والدہ کو ملنے کالا مازو بھی جاتے تھے ہم بڑے بالخصوص اپنی والدہ سے ملنے تنہا جانا پسند کرتے تھے کیونکہ بعض جذباتی کیفیات ایسی ہوتی ہیں جنہیں آپ دوسرے لوگ تو کجا اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ بھی نہیں بانٹ سکتے۔

میں ساتویں درجے کے آخر میں تھا کہ ہماری سوتیلی بہن جو ہم سب سے بڑی تھی بوسٹن سے ہمیں ملنے آئی ہمارے درمیان پہلے خط و کتابت ہو چکی تھی جب ہمیں اس کے آنے کی اطلاع ملی تو ہم بہت خوش ہوئے اس کے آنے پر جس بات نے کم از کم مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ تھی کہ اسے اپنے سیاہ فام ہونے پر کوئی شرمندگی نہیں تھی بلکہ میں نے اپنی زندگی میں پہلی ایسی عورت دیکھی جسے اپنے گہرے سیاہ رنگ پر فخر تھا اور ان دنوں بالخصوص لانسنگ میں یہ بات ناقابل یقین تھی ایک روز جب میں سکول سے لوٹا تو وہ گھر آ چکی تھی وہ بڑے محبت کے ساتھ مجھے گلے ملی پھر مجھے اپنے سے کچھ دور کھڑا کر کے سر سے پائوں تک میرا جائزہ لیا اس کے انداز میں حاکمیت کا عنصر غالب تھا جسمانی طور پر وہ مسز سورلین سے بھی زیادہ قد آور تھی اس کا رنگ سیاہ نہیں تھا بلکہ میرے والد کی طرح کالا سیاہ تھا اس کے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے اور گفتگو کے انداز میں ایک دبدبہ اور رعب محسوس ہوتا تھا ہر شخص لاشعوری طور پر اس کی اطاعت کرنے لگتا تھا وہ تھوڑی سی جائیداد کی بھی مالک تھی اور اس کا شمار کسی حد تک اپنے علاقے کے معززین میں ہوتا تھا اس نے بہت محنت کر کے پیسہ کمایا تھا جس سے اس نے بڑی مہارت کے ساتھ اپنی جائیداد بنا لی تھی اور اب اس کا ایک ہی کام تھا کہ وہ اپنے دوسرے بہن بھائیوں بھتیجوں بھانجوں اور کزنز وغیرہ کو بوسٹن بلائے میں اس سے بہت متاثر ہوا وہ دوسری شادی کر چکی تھی اس کا پہلا شوہر ایک ڈاکٹر تھا۔

ایلاء نے مجھ سے بہت سوالات کیے وِلفرڈ اور ہلڈا اسے میرے صدر منتخب ہونے کے متعلق پہلے ہی بتا چکے تھے اس نے مجھ سے میری تعلیمی قابلیت کے متعلق پوچھا جب میں نے اسے اپنے نتائج دکھائے تو وہ بہت خوش ہوئی میں نے اس سے اپنے سوتیلے بہن بھائی ارل اور میری کے متعلق پوچھا اس نے بتایا کہ ارل جمی کارلیٹن کے نام سے بوسٹن کے ایک بینڈ کے ساتھ بطور گلوکار وابستہ ہے یہ بات میرے لیے بہت خوش کن تھی جبکہ میری بھی اچھی گزر بسر کر

رہی تھی۔ ایلاء نے مجھے دوسرے رشتہ داروں کے متعلق بتایا جنہیں اپنے پائوں پر کھڑا کرنے میں ایلاء کا بہت ہاتھ تھا۔ ”ہم سب بہن بھائیوں کو اکٹھا رہنا چاہیے۔“ ایلاء کے منہ سے یہ سُن کر میں بہت خوش ہوا اس نے بتایا کہ ہمارے عزیز و اقارب چھوٹے موٹے کاروبار کر رہے ہیں اور ان میں سے اکثر اپنے ذاتی گھروں میں رہ رہے ہیں۔

ایلاء نے تجویز دی کہ ہم سب کو اکٹھے والدہ سے ملنے جانا چاہیے، ہمیں یقین تھا کہ اگر کوئی انسان ہماری والدہ کے تندرست ہونے اور انہیں دوبارہ گھر لانے میں معاون ہو سکتا ہے تو وہ ایلاء ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہم سب والدہ سے ملنے گئے۔

ہم سب کو ایک ساتھ دیکھ کر والدہ مسکرانے لگیں۔ ایلاء کو دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئیں اور اسے گلے ملیں۔ دونوں کے رنگوں میں بہت تضاد تھا، ملاقات کی باقی تفصیل مجھے یاد نہیں، لیکن اتنا یاد ہے کہ سارے معاملات ایلاء نے اپنے ہاتھ میں لے لیے اور ہم سب حالات میں بہتری کی امید کرنے لگے۔

ایلاء نے ہم سب کے سرپرست گھرانوں کا دورہ بھی کیا پھر کچھ دن رہ کر واپس لوٹ گئی۔ جانے سے پہلے اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اسے خط لکھتا رہوں گا۔ اس نے پیشکش کی کہ اگر میں چاہوں تو اس بار گرمیوں کی چھٹیاں بوسٹن گزار سکتا ہوں۔ جسے سُن کر میں خوشی سے اُچھل پڑا۔

1940ء کی گرمیوں کی چھٹیوں میں، اپنا سبز سوٹ پہنے گتے کا بنا ہوا سوٹ کیس اٹھائے میں بوسٹن جانے والی گرے ہاونڈ بس میں سوار ہوا اپنے حلیے کی وجہ سے میں کافی مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ میں بس کی پچھلی سیٹ پر شیشے سے ناک چپکائے آنکھیں پھاڑے سفید فاموں کے ملک امریکہ کو دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ مسافت تو ڈیڑھ دن کی تھی لیکن مجھے لگا گویا میں مہینہ بھر سفر کرتا رہا ہوں بوسٹن پہنچنے پر ایلاء مجھے گھر لے گئی اس کا گھر واہبیک سٹریٹ میں تھا یہ علاقہ بوسٹن کا ”ہارلم“ کہلاتا تھا میں ایلاء کے دوسرے شوہر سے ملا جو فوجی تھا اور اس کے گلوکار بھائی جمی اور اس کی بہن میری سے ملا جو ایلاء سے بہت مختلف تھی لیکن میں ذہنی طور پر ایلاء سے زیادہ قریب تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ہم دونوں بنیادی طور پر حاکمانہ مزاج رکھتے تھے جبکہ میری ایک نرم طبع اور شرمیلی لڑکی تھی ایلاء کی زندگی بہت مصروف تھی وہ بہت سارے کلبوں کی ممبر تھی اور ایک طرح سے سیاہ فام طبقہ کی نمائندہ تھی۔ میں اس شہر میں صبح شام ایسے لوگوں سے ملتا جن کی گفتگو اور شہری اطوار دیکھ کر میرا منہ حیرت سے کھلا رہ جاتا میں کوشش کے باوجود اپنی حیرت نہیں چھپا سکتا تھا وہ لوگ بلاتکلف شکاگو، ڈیٹرائیٹ اور نیو یارک کا ذکر کرتے ہفتے کی رات راکس بیری کے علاقے میں اتنے سیاہ فام لوگ اکٹھے ہوئے کہ میں حیران ہو کر سوچتا کہ کیادنیا میں اتنے سیاہ فام لوگ ہیں… یہ ایک

ہنگاموں سے پُرزندگی تھی نیون لائٹس، نائٹ کلبز، پول ہال بازار، گاڑیاں دیکھ کر میں اپنی آنکھیں جھپکنا بھول جاتا ریستورانوں سے سیاہ فاموں کے مخصوص کھانوں کی اشتہاء انگیز خوشبو باہر سڑک تک آتی اونچی آواز میں مشہور گلوکاروں کے گانے بجتے رہتے جن میں آرسکِن ہاکنز، ڈیوک ایلینگٹن، کوٹی ولیم اور بہت سے دوسرے مشہور گلوکار شامل تھے۔ اگر کوئی اس وقت مجھے یہ کہتا کہ ایک روز میں ان سب گلوکاروں سے ذاتی طور پر واقف ہو جاؤں گا تو میں کبھی یقین نہ کرتا ان جیسے بڑے بڑے بینڈ میساچوسٹس کے روز لینڈ سٹیٹ بال روم میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ایک دن سیاہ فاموں کے لیے مخصوص ہوتا اور ایک دن سفید فاموں کے لیے۔ پہلی بار میں نے گورے اور کالے جوڑے کو بانہوں میں بانہیں ڈالکر سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ اس علاقے میں کالوں کے اتنے بڑے بڑے گرجا گھر تھے کہ میسن کے گورے بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے تھے گوروں اور کالوں کے اندازِ عبادت میں بھی فرق تھا جہاں گورے عبادت کے دوران خاموشی اور سرگوشی کو ملحوظ رکھتے تھے وہاں کالے انتہائی جوش اور ولولے سے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر اونچی آواز سے چرچ سروس میں حصہ لیتے تھے۔

واپس میسن پہنچ کر میری طبیعت کی بے چینی کم نہیں ہوئی میرا دل بدستور بوسٹن میں ہی اٹکا رہا۔ میرے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ بوسٹن جاکر اپنے ہم رنگوں کے ساتھ زندگی گزاروں میری اس تبدیلی کو سبھی نے محسوس یا۔ میرے ہم جماعت سفید فاموں سورلین گھرانے اور ریستوران کے ملازموں نے جہاں میں کام کرتا تھا مجھ سے کئی بار پوچھا کہ "تمہارا رویہ بہت بدل گیا ہے کیا معاملہ ہے میلکم؟ لگتا ہے تم اپنے آپ میں نہیں رہتے" لیکن روز بروز میری بے چینی بڑھتی چلی گئی آٹھویں درجے میں داخلے سے ذرا پہلے وہ واقعہ پیش آیا جو کہ آگے چل کر میری زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوا۔

ایک روز مجھے اپنے انگریزی کے استاد کے ساتھ تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا وہ ایک فطری ناصح تھے اور اکثر لڑکوں کو پڑھنے، سوچنے اور کرنے سے متعلق مشورے دیا کرتے تھے۔ ہم لڑکے اکثر ان کا مذاق اُڑاتے کہ جو نصیحتیں ہمیں کرتے ہیں ان پر عمل کر کے وہ خود ترقی کیوں نہیں کر لیتے، میسن میں ہی کیوں پڑھا رہے ہیں۔ یہ مجھے پورا یقین ہے کہ اس روز بھی مجھ سے بات کرتے ہوئے ان کی نیت بالکل صاف تھی بس وہ سفید فام لوگوں کی فطرت سے مجبور تھے۔ انہوں نے کہا "میلکم اب تمہیں اپنے مستقبل کے متعلق سوچنا چاہیے۔ تم نے کبھی کیریئر کے بارے میں غور کیا ہے؟" سچ یہ ہے کہ میں نے کبھی اس پہلو پر نہیں سوچا تھا مگر جانے کیوں میں نے کہہ دیا "جی ہاں، میرا خیال ہے کہ میں وکیل بننا پسند کروں گا۔"

حقیقت یہ تھی کہ اس زمانے میں لانسنگ میں کوئی سیاہ فام وکیل تھا نہ ڈاکٹر جسے دیکھ کر میرے اندر یہ شوق پیدا ہوتا۔ مجھے صرف اتنا احساس تھا کہ وکیل بن کر مجھے ہوٹلوں میں برتن نہیں دھونے پڑیں گے۔

مسٹر اوس ٹرائوسکی نے حیرت سے مجھے دیکھا، کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ہاتھ سر کے پیچھے باندھ لیے اور مسکرا کر بولے ”میلکم‘ انسان کو زندگی میں حقیقت پسند ہونا چاہیے، مجھے غلط مت سمجھنا، تمھیں علم ہے کہ ہم سب تمھیں پسند کرتے ہیں۔ لیکن تمھیں ”کالا“ ہونے کا ادراک ہونا چاہیے۔ وکیل بننا کسی بھی ”کالے“ کے لیے حقیقت پسندانہ خواہش نہیں ہے تم کوئی ایسا کام سوچو جو تم کر سکو۔ تمھارے اندر ایک دستکار بننے کی عمدہ صلاحیت ہے، سب لوگ تمھارے بڑھئی پن کے معترف ہیں، تم بڑھئی کیوں نہیں بن جاتے؟ لوگ تمھیں پسند کرتے ہیں جس کی وجہ سے تمھیں کافی کام بھی مل جائے گا۔“

میں ان کی بات پر جتنا غور کرتا اتنا ہی پریشان ہوتا جاتا کیونکہ میرے برعکس مسٹر اوس ٹرائوسکی سفید فام طالبِ علموں کی پیشوں کے انتخاب میں بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ میں جیسا بھی تھا لیکن اپنی جماعت اور سکول میں سفید فام طلباء سے تعلیمی اعتبار سے ممتاز مقام رکھتا تھا۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر دُکھ ہوا کہ اپنی تمام تر لیاقت کے باوجود میں سفید فام لوگوں کی نظر میں اتنا کوڑھ مغز تھا کہ وکیل نہیں بن سکتا تھا۔

یہ وہ لمحہ تھا جب میں اندر سے تبدیل ہونے لگا۔

میں سفید فاموں سے دور رہنے لگا، صرف بلائے جانے پر جواب دیتا۔ خصوصاً مسٹر اوس ٹرائوسکی کی جماعت میں بیٹھنا میرے لیے دوبھر ہو گیا۔ پہلے میں ”نگّر“ کا لفظ سُن کر دھیان نہیں دیتا تھا اب میں مخاطب کو پلٹ کر گھورنے لگا۔ سب استاد اور طلبہ حیران تھے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے پتہ تھا کہ میں آج کل سکول میں موضوعِ گفتگو ہوں۔ آئندہ چند ہفتوں میں میرے اس رویے کو سَورلین خاندان اور ریستوران والوں نے بھی محسوس کر لیا۔

ایک روز میں گھر آیا تو بیگم سورلین کے ہمراہ ریاستی کارکن مینرڈ ایلن بھی موجود تھا۔ ان کے چہروں سے عیاں تھا کہ کوئی خاص بات ہے۔ بیگم سورلین نے تمہیدی انداز میں کہا کہ ”یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ اتنا اچھا تعلیمی ریکارڈ رکھنے، ریستوران، سکول اور گھر میں اتنا مقبول ہونے کے باوجود تم اپنے رویے سے ایسا کیوں ظاہر کرنے لگے ہو کہ گویا تم خوش نہیں ہو“ انہوں نے کہا کہ ان کے خیال میں مجھے ڈیٹنشن ہوم میں رہنے کی بجائے ”لائنز خاندان“ کے ساتھ رہنا چاہیے۔ بیگم سورلین نے کہا ”اور میلکم‘ میں سینکڑوں بار پوچھ چکی ہوں کیا تمھیں کوئی پریشانی

ہے؟" "نہیں ...بیگم سورلین" یہ کہہ کر میں کمرے میں گیا اور سامان لے کر نیچے آیا تو بیگم سورلین آنکھیں پونچھ رہی تھیں میں یہ دیکھ کر اداس ہو گیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور مسٹر ایلن کے ساتھ "لائنز" کے ہاں آ گیا۔

لائنز کے ساتھ دو ماہ کے قیام کے دوران ان سب نے بھی مجھے کریدنے کی کوشش کی لیکن میں چپ رہا۔ ہر ہفتے میں اپنے بہن بھائیوں سے ملنے جاتا اور ہر دوسرے دن ایلاء کو خط لکھتا۔ ایک روز بغیر وجہ بتائے میں ایلاء کو لکھا کہ میں بوسٹن آنا چاہتا ہوں۔

پتہ نہیں ایلاء نے کیا کیا مگر اس نے میری سرپرستی مشی گن سے میساچیوسٹس منتقل کروا لی اور جونہی میں نے آٹھویں پاس کی میں پھر گرے ہائونڈ میں بیٹھ کر بوسٹن روانہ ہو گیا۔

اگر میں مشی گن میں ہی رہتا تو ہو سکتا ہے میں وہیں کسی سیاہ فام لڑکی سے شادی کر لیتا یا ریاستی دارالخلافہ کی عمارت میں جوتے چمکا رہا ہوتا، یا لانسنگ کنٹری کلب میں بیرا ہوتا یا اسی طرح کی کوئی گھٹیا نوکری کر رہا ہوتا جو ان دنوں لانسنگ کے سیاہ فام کرتے تھے اور خود کو کامیاب تصور کرتا۔ بہت تیر مارتا تو بڑھئی بن جاتا۔

میں اپنی ہجرت کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے اس سے زیادہ اہم موڑ اپنی زندگی میں اور کوئی نظر نہیں آتا تب سے آج تک میں جو کام بھی کرتا ہوں کامیابی کے حصول کے لیے کرتا ہوں۔ اگر مسٹر اوس ٹرائوسکی میری حوصلہ افزائی کرتے تو شاید میں آج سیاہ فام بورژوا طبقے کا رکن ہوتا اور مجھے سیاہ فاموں کے مسائل سے کوئی غرض نہ ہوتی اور میں دوغلے سفید فام لوگوں سے دو لقمے حاصل کرنے کے لیے مشقت کرتا رہتا۔

اللہ کا شکر ہے کہ میں بوسٹن چلا گیا ورنہ آج میں بھی ایک دھلے ذہن (Brain Washed) کا کالا سیاہ فام عیسائی ہوتا۔

!

باب: 3

گرائیں

اپنے گنواروں والے حلیے کی وجہ سے میں دور ہی سے علیحدہ دکھائی دیتا تھا۔ انتہائی پینڈو انداز میں کٹے ہوئے سرخی مائل گھنگھرالے بال، کلائیوں سے اونچے بازوئوں کا سبز کوٹ، ٹخنوں سے تین تین انچ اونچی اٹنگی پینٹ، ایلاء نے بھی میری ہیئت کذائی کو محسوس کیا لیکن اس نے یہ کہہ کر میرا حوصلہ بڑھایا کہ مجھ سے قبل جارجیا سے آنے والے بعض دیہاتی رشتہ دار تو مجھ سے بھی زیادہ عجیب حلیے میں یہاں آئے تھے۔ ایلاء نے گھر کی بالائی منزل پر ایک کمرہ میری رہائش کے لیے تیار کر دیا۔

ایلاء صحیح معنوں میں جارجیا کی حبشی عورت تھی۔ وہ کھانا کھلا کر بہت مسرت محسوس کرتی اس کی خواہش ہوتی کہ مہمان کی پلیٹ خالی نہ ہونے پائے۔ اس کے گھر میں ہر کھانے کے وقت ایسا لگتا تھا گویا یہ ان کا آخری کھانا ہے۔

ایلاء ہمیشہ کی طرح منہ پھٹ اور تنومند تھی اور میری آمد سے دو ہفتے قبل اپنے دوسرے شوہر سے بھی طلاق حاصل کر چکی تھی۔ دراصل ایسی کسی بھی عورت کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل ہے جسے اپنے اردگرد موجود ہر شخص اور ہر چیز پر حکمرانی کی عادت ہو۔ میری آمد کے دوسرے دن ایلاء نے مجھ سے کہا کہ ”ابھی تمہیں کام تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شمال میں آنے والے دیگر سیاہ فام رشتہ داروں کی طرح کچھ دن راکس بیری کی سیر کرو، یہاں وہاں گھومو...بسوں اور ریل گاڑیوں میں سفر کرو اور بوسٹن سے واقفیت پیدا کرو۔ کیونکہ جب تم ایک بار کام شروع کر دو گے تو پھر تمہیں اس شہر کو دیکھنے اور جاننے کا موقع نہیں ملے گا۔“ اس نے یہ بھی کہا کہ جب مجھے کام کرنا ہو گا وہ خود بتا دے گی!

چنانچہ میں علاقہ دیکھنے نکل پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ راکس بیری کے سیاہ فام دوسرے سیاہ فاموں سے مختلف انداز و اطوار رکھتے تھے۔ یہ لوگ نسبتاً کافی خوش حال تھے، اپنے آپ کو "چارسو" کہتے تھے جو غالباً ان کی کُل آبادی تھی۔ اور قریبی کچی بستیوں کے سیاہ فاموں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور انہیں گنوار سمجھتے تھے... میری سوتیلی بہن میری بھی اسی کچی بستی میں رہائش پذیر تھی۔

راکس بیری کے یہ سیاہ فام ذرا اونچے طبقے کے خوشحال، تعلیم یافتہ اور اہم لوگ تھے جو اچھی نوکریوں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ان کے گھروں کے سامنے خوبصورت باغیچے تھے۔ جب یہ لوگ کام پر یا گرجا جانے یا کسی کو ملنے کے لیے نکلتے تو ان کے چہروں پر رعونت واضح نظر آتی تھی۔ لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ جس طرزِ زندگی نے مجھے اتنا متاثر کیا ہے وہ لانسنگ کے جوتے چمکانے اور دربانی کرنے والے "کامیاب" لوگوں کی "بڑے شہر" والی قسم ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بڑے شہر کے سیاہ فام چھوٹے شہر کے سیاہ فاموں کی نسبت زیادہ " Brain Washed" تھے۔ وہ اپنے آپ کو غریب سیاہ فاموں کی نسبت زیادہ مہذب اور شائستہ سمجھتے تھے۔ اور سفید فاموں کی نقل کرنے کی ہر وقت کمر توڑ کوشش کرتے رہتے تھے جو سیاہ فام خاندان بھی بوسٹن میں ذاتی گھر بنانے میں کامیاب ہو جاتا وہ "اشرافیہ" میں شمار ہونے لگتا۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں اخراجات پورے کرنے کے لیے کچھ کمرے کرائے پر اٹھانے پڑتے۔ طبقہ اشرافیہ بھی دو حصوں پر مشتمل تھا۔ پرانے "نیو انگلینڈرز" جن کی پیدائش یہیں ہوئی تھی بعد میں آنے والے مہاجرین، جن میں ایلاء بھی شامل تھی، کو حقارت سے دیکھتے تھے... حالانکہ زیادہ آبادی انہی نووارد مہاجروں پر ہی مشتمل تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جنوب سے آئے اور ویسٹ انڈین سیاہ فام، جنہیں "لوکل" لوگ "سیاہ یہودی" کہتے تھے، زیادہ خوش حال اور آسودہ تھے اور ان میں سے اکثر دو گھروں کے مالک تھے جن میں سے ایک کرائے پر اُٹھا دیا جاتا تھا۔

میرے خیال کے مطابق دس میں سے آٹھ سیاہ فام، جن کے متعلق کہا جاتا کہ بہت اعلیٰ عہدوں پر ہیں، دراصل گھٹیا درجے کے ملازم تھے۔ مثلاً اگر کسی کے متعلق یہ کہا جاتا کہ "وہ بنکنگ سے وابستہ ہے" یا "سیکیورٹیز میں ہے۔" تو بظاہر یوں محسوس ہوتا گویا کسی بنک کے دربان یا دفتر محصول کے قاصد کا نہیں بلکہ راک فیلر یا میلن کا ذکر ہو رہا ہے۔

"ایک قدیم گھرانے سے وابستہ " ہونے کا مطلب کسی سفید فام گھرانے میں باورچی یا نوکر ہونا تھا۔ لاتعداد چالیس پچاس سالہ افراد روزانہ سفراء کی طرح سیاہ سوٹ اور سفید کالر لگا کر شہر کے مرکز میں "سرکار، یا خزانے یا قانون

کے ادارے میں" کام کے لیے جاتے تھے۔ مجھے تب بھی اور اب بھی اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ ان سیاہ فاموں کو اس خود فریبی پر شرم کیوں نہیں آتی؟

میں راک بیری کے بعد بوسٹن کو دریافت کرنے نکل کھڑا ہوا، جو یادگاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک روز میں نے بوسٹن یونیورسٹی دیکھی، اگلے روز کیمبرج اور پھر ہارورڈ یونیورسٹی کیمپس، میں نے اس سے قبل ہارورڈ کا نام سن رکھا تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ بیس سال بعد میں ہارورڈ لاء سکول فورم میں خطاب بھی کروں گا۔

میں بوسٹن کے شمالی اور جنوبی ریلوے اسٹیشن اور بسوں کے اڈوں پر گھومتا اور لوگوں کو آتے جاتے دیکھتا رہتا۔ میں نے بندرگاہ کا علاقہ بھی دیکھا۔ یہ سارے مشاہدات میں لانسنگ میں قیام پذیر ولفرڈ، ہلڈا، فلبرٹ اور ریگی نالڈ کو خط میں تحریر کرتا۔ میں نے انہیں یہاں کے گنجان گھروں، بل کھاتی تنگ گلیوں اور سفید فاموں کی ملکیت بڑے بڑے ریستورانوں کے متعلق بھی بتایا۔ اس کے علاوہ میں نے فیصلہ کیا کہ میں یہاں کے عمدہ اور ایئر کنڈیشنڈ تھیٹر میں لگنے والی ہر فلم ضرور دیکھوں گا۔

میساچوسٹس ایونیو پر لوزسیٹ تھیٹر کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا روزلینڈ سٹیٹ بال روم تھا جس کے باہر ہمیشہ قومی سطح کے مشہور بینڈز کے پوسٹر لگے رہتے تھے جب مجھے وہاں پہلی بار جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں پر گلین ملر کا شو ہو رہا تھا۔ میسن ہائی سکول کے دنوں میں ہم رات رات بھر گلین ملر کے گانوں پر رقص کیا کرتے تھے چنانچہ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ گلین مِلر کو روبرو سننا کتنا ہیجان انگیز ہو گا۔

ایلاء نے اب مجھے اشاروں کنایوں میں کوئی کام کرنے کے لیے کہنا شروع کیا۔ دوسرے وہ چاہتی تھیں کہ میں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ اُٹھا بیٹھا کروں لیکن مجھے اپنے ہم عمر لڑکے بچے لگتے تھے۔ ہفتے کے آخر پر جب میں واپس میسن جاتا تو ولفرڈ اور فلبرٹ کے دوستوں کے ساتھ سیاہ فاموں کی بستی میں گھومتا پھرتا۔ اگرچہ وہ سب مجھ سے کئی سال بڑے تھے لیکن میں قد کاٹھ سے ان سے بھی بڑا دکھائی دیتا تھا۔

ایلاء کے کہنے پر میں نے نوکری کی تلاش میں قصبے میں جانا شروع کر دیا۔ یہ علاقہ مجھے دو وجہ سے زیادہ پسند آیا ایک تو یہاں سیاہ فاموں کی اکثریت تھی دوسرے ان میں رعونت نہیں تھی اگرچہ میں بھی امراء کے علاقے میں رہائش پذیر تھا لیکن پھر بھی میں نے خود کو کبھی دوسرے سیاہ فام سے برتر نہیں سمجھا۔ قصبے میں آ کر میرا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا یہاں تفریحی مقامات پر لڑکے عمدہ کپڑے پہنے موج میلہ کرتے نظر آتے مجھے ان کے سفید فام

لوگوں جیسے سیدھے اور چمکیلے بالوں پر بہت حیرت ہوتی۔ ایلاء نے مجھے بعد میں بتایا کہ بال سیدھے کروانے کے عمل کو ”کانک“ کہا جاتا ہے اس سے پہلے میں نے نہ تو کبھی شراب چکھی تھی نہ کبھی سگریٹ منہ سے لگایا تھا لیکن یہاں دس بارہ سال کے چھوٹے بچے بھی تاش کھیلتے لڑتے جھگڑتے اور منشیات کا استعمال کرتے بعض اوقات وہ اپنے سے بڑی عمر کے جواریوں کے ذریعے جواء بھی کھیلتے ان بچوں کی زبان بے حد گندی تھی اور وہ گفتگو میں مخصوص روزمرہ استعمال کرتے مثلاً ”گھوڑا، بلّا، چوزہ، کُول اور ھِپ“ وغیرہ جو میرے لیے بالکل نئے تھے میں رات کو بستر میں لیٹ کر انہیں ذہن میں دُہراتا۔ یہاں شام کے بعد سفید فام لڑکیاں سیاہ فام لڑکوں کی بانہوں میں بانہیں ڈالے عام گھومتی نظر آتیں۔ وہ لانسنگ کی سفید فام لڑکیوں کے برعکس اسے چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتی تھیں۔

میری خواہش تھی کہ میں خود ہی کوئی نوکری ڈھونڈ کر ایلاء کو حیران کر دوں۔ ایک سہ پہر میں ایک پُول روم کے باہر کھڑا کھڑکی سے اندر جھانک کر خوش لباس ”بلوں (Cats)“ کو پُول میز کے اردگرد کھڑے شرطیں لگاتے اور گیندیں سوراخوں میں ڈالتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ اندر جا کر پول میز پر گیندیں ترتیب سے رکھنے والے لڑکے سے ملا جائے۔ سب لوگ اسے ” ”شارٹی“ کہتے تھے۔ کچھ روز پہلے میں اسی طرح باہر کھڑا تھا کہ ”شارٹی“ پُول روم سے نکلا اور مجھے ”ہائے ریڈ“ (سرخ بالوں کی وجہ سے) کہہ کر بلایا جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ یار باش آدمی ہے۔“

میں نے اندر داخل ہو کر ایسا تاثر دینے کی کوشش کی جیسے میں پہلے بھی یہاں آتا رہتا ہوں۔ بعد میں شارٹی نے مجھے بتایا کہ ”تمہیں دیکھ کر میں نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا کہ یہ کوئی دیہاتی بلّا ہے۔ کیونکہ اس بلّے کی ٹانگیں لمبی جبکہ پینٹ اتنی چھوٹی تھی کہ گھٹنے نظر آ رہے تھے اور سر سرخ لکڑی کا بنا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

میں نے اس سے کوئی کام دلوانے کی درخواست کی۔ اس نے کہا کہ ”سرِدست تو یہاں اور دیگر پول رومز میں کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ ویسے تم کیا کیا کر لیتے ہو“ میں نے جواب دیا کہ میں میسن کے ریستوران میں برتن دھوتا رہا ہوں۔“

شارٹی کے ہاتھ سے پائوڈر کا ڈبہ گر گیا ”ہاتھ ملائو“ اس نے جوش کے ساتھ کہا ’تم تو میرے گرائیں ہو، میں لانسنگ سے ہوں“ نہ میں نے کبھی شارٹی کو بتایا نہ اسے خود احساس ہوا کہ وہ مجھ سے تقریباً دس سال بڑا ہے۔ اس نے مجھے ہمیشہ ہم عمر ہی سمجھا وہ گذشتہ چھ سال سے راکس بیری میں رہ رہا تھا لیکن جب میں نے لوگوں اور جگہوں کے نام لیے تو وہ اکثر کا شناسا نکلا۔ بہت جلد ہم گہرے دوست بن گئے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ایک اجنبی جگہ پر ایک

مددگار (Hip) مل گیا۔ ”اس علاقے میں سمجھدار آدمی کے لیے بہت مواقع ہیں۔“ اس نے کہا ”میں تمہیں ترقی کے گُر سکھاؤں گا۔“

میں پاگلوں کی طرح منہ کھولے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ ”اب تمہیں کہیں جانا تو نہیں، میرے فارغ ہونے تک یہیں ٹھہرو۔“ وہ یہ سن کر خوش ہوا کہ میری بہن مجھ سے رہائش کا کوئی خرچہ وصول نہیں کر رہی اور نہ مجھے نوکری کرنے پر ابھی مجبور کر رہی ہے۔ دو سال قبل شارٹی نے جوئے میں ایک دو نمبر جیت کر خاصی رقم کمائی تھی جس سے اس نے سیکسو فون خرید لیا تھا وہ ہمیشہ سیکسو فون اپنے پاس رکھتا اور شام کو اس کا سبق باقاعدگی سے لیتا۔ اس کی خواہش تھی کہ ایک روز وہ اپنا بینڈ بنائے گا۔ اسے دیکھ کر مجھے بھی موسیقی سے دلچسپی پیدا ہوئی اور میرا جی چاہا کہ میں بھی سیکسو فون (جسے شارٹی ہارن کہتا تھا) بجانا سیکھوں۔ تمام سہ پہر شارٹی مجھے معلومات دیتا رہا۔ پول میز کے اردگرد زیادہ تر بے فکرے لفنٹر اکٹھے رہتے جن میں سے زیادہ تر منشیات کے دھندے میں ملوث تھے ان میں سے بعض حال ہی میں جیل سے واپس آئے تھے۔ شارٹی نے مجھے بتایا کہ وہ روزانہ ایک ڈالر سے جُوا کھیلتا ہے جس دن بھی اس کے ہاتھ کوئی بڑی رقم لگ گئی وہ یہ کام چھوڑ کر اپنا نیا بینڈ بنا لے گا میں نے اسے شرمندگی کے ساتھ بتایا کہ میں نے آج تک کبھی جواء نہیں کھیلا لیکن شارٹی نے ہنس کر میری کوتاہی معاف کرتے ہوئے کہا ”کوئی بات نہیں، تمہارے پاس داؤ لگانے کے لیے کچھ تھا بھی تو نہیں جونہی تمہیں کوئی نوکری ملے گی تم جواء کھیلنا شروع کر دینا۔“ اس نے مجھے کچھ بڑے جواری اور دلال دکھائے اور بتایا ”کہ ان میں سے کچھ سفید طوائفیں بھی سپلائی کرتے ہیں اور جھوٹ کیوں بولوں میں خود سفید فام ”چوزے“ کے لیے انہیں دو ڈالر ادا کرتا ہوں۔ رات کے وقت ان کا دھندا عروج پر ہوتا ہے۔“ میں نے اسے بتایا کہ یہ سب کچھ میرے علم میں ہے جس پر اس نے حیران ہو کر کہا ”صرف علم میں ہی ہے۔“ لیکن پھر اس نے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا کہ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ”میں تو لانسنگ میں ہی سفید فام ”چوزوں“ کا مزہ لے چکا ہوں۔ یہاں زیادہ تر اطالوی اور آئرش چوزے ملتے ہیں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ سفید فام طوائفیں کہیں کی بھی ہوں سیاہ فام ”گھوڑوں“ کو بے حد پسند کرتی ہیں۔“

ساری سہ پہر شارٹی مجھے لوگوں اور کھلاڑیوں سے متعارف کرواتا رہا۔ وہ کہتا ”یہ میرا گرائیں ہے اگر کہیں کوئی نوکری کی جگہ خالی ہو تو بتانا۔“ ان سب نے تعاون کرنے کی حامی بھر لی۔

شام کو جب شارٹی کام سے فارغ ہوا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ سیکسو فون سیکھنے جائے گا لیکن جانے سے پہلے اس نے اپنی اس شام کی آمدنی چھ سات ڈالر جو اُسے ٹپ کی شکل میں ملے تھے ہاتھ پر رکھ کر میرے آگے کر دیئے۔ لیکن

میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس دو ڈالر ہیں جو میرے لیے کافی ہیں لیکن اس نے مجبور کر کے مجھے تین ڈالر اور دے دیئے۔ اس نے مجھے اپنا سیکسو فون بھی دکھایا جو سبز کمخواب کے ڈبے میں چمک رہا تھا۔ ”حوصلہ رکھو“ اس نے مجھ سے کہا ”کل پھر آنا کوئی نہ کوئی ”بلّا“ تمہاری نوکری کا انتظام کر دے گا۔“

میں گھر پہنچا تو ایلاء نے بتایا کہ شارٹی نامی کسی آدمی کا فون آیا تھا اس نے پیغام چھوڑا ہے کہ روزلینڈ سٹیٹ بال روم کا جوتے چمکانے والا لڑکا اس اس رات چھٹی پر جا رہا ہے لہٰذا اس کی جگہ سنبھالنے کے لیے فوراً پہنچو۔ ایلاء کو یہ جوتے چمکانے والی نوکری کچھ زیادہ پسند نہیں آئی لیکن اتنے مشہور بینڈز کو قریب سے سننے کے شوق نے میری زبان گنگ کر دی تھی میں کھانا کھائے بغیر ہی بال روم پہنچ گیا۔ بال روم روشنیوں ے جگمگا رہا تھا اور بنی گڈمین بینڈ کے لوگ آنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے ہال میں جھانک کر دیکھا یہ بہت بڑا کمرہ تھا جس میں پالش شدہ فرش چمک رہا تھا۔ کمرے کے دوسرے کونے میں وہ مدھم رنگین روشنیوں کے نیچے اپنے آلاتِ موسیقی کو ترتیب دے رہے تھے۔

بالائی منزل پر ایک سیدھے بالوں اور گندمی رنگت والے سیاہ فام نے میرا استقبال کیا۔ یہ فریڈی تھا جس کی جگہ مجھے سنبھالنا تھی اس نے مجھ سے کہا تم شارٹی کے گرائیں ہو اس نے مجھے تمہارے متعلق بتایا تھا۔ میں نے اسے کہا ”سنا ہے تمہارا کوئی بڑا نمبر لگ گیا ہے اور تم کیڈیلاک کار خرید رہے ہو۔“ اس نے مجھ سے کہا ”کہ یہ تو میں نے گورے بلّوں کو جلانے کے لیے خود افواہ اڑائی ہے۔ اس نے مجھے موسیقی سے زیادہ کام پر توجہ دینے کی ہدایت کی اور وعدہ کیا کہ ایک دو روز میں وہ خود مجھے رقص کے لیے لے جائے گا۔ فریڈی نے چیزوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے کہا ”ہمیشہ جلدی آنا... جوتے چمکانے کے برش اور ٹاکیاں ادھر فٹ اسٹینڈ پر رکھی ہیں... پالش کی بوتلیں اور ڈبیاں اور سویڈ برش ادھر رکھے ہیں... ہر چیز جگہ پر رکھو۔ کتنی بھی بھیڑ ہو کام کا تسلسل نہ ٹوٹنے دو۔ برش زور سے رگڑو، اتنے زور سے کہ آواز سنائی دے۔ بس دوچار بار ”بلّے“ تمہاری محنت سے متاثر ہو کر زیادہ بخشیش دیں گے۔“ میں نے جوتے چمکاتے ہوئے ایک کام یہ سیکھا کہ بیت الخلاء سے نکلنے والے لوگوں کو اگر دوڑ کر چھوٹا سفید تولیہ پیش کر دیا جائے تو آپ کو ایک پینی کے تولیے کے بدلے کم از کم ایک نِکل (5 سینٹ کے برابر سکّہ) مل جاتا ہے۔

جونہی مرکزی کمرے سے موسیقی کی آواز ابھری یوں لگا جیسے کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔ فریڈی نے کہا ”لگتا ہے تم نے پہلے کبھی بڑی محفلِ رقص نہیں دیکھی؟... دوڑ کر جاؤ اور تھوڑی دیر دیکھ آؤ۔“

ابھی رقص باقاعدہ شروع نہیں ہوا تھا مگر لوگ بالخصوص سفید فام خوبصورت عورتیں، سفید فام ”بلّوں“ کے ساتھ آ رہی تھیں۔ میں واپس لوٹا تو فریدی چند گاہک بُھگتا رہا تھا۔ اسے جب بھی موقع ملتا مجھے کچھ نہ کچھ سکھانے کی کوشش

کرتا۔ ”اس دراز میں تسمے رکھے ہیں۔ انہیں تحفہ ہی سمجھو۔ یہ ایک نکل کی جوڑی آتی ہے۔ مگر دوگنی قیمت پر بک جاتی ہے۔“ ایک اور وقفہ میں فریڈی نے مجھے پھر اندر جانے کی اجازت دی۔ ”پیگی لی“ مائک پر گا رہی تھی۔ اس کی آواز بے حد سُریلی تھی۔ اس کا گانا ختم ہوا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

رقص کے خاتمے پر ہم نے دربانوں کے ساتھ ہال کی صفائی میں ہاتھ بٹایا اور کاغذ، سگرٹوں کے بٹ اور شراب کی خالی بوتلیں اُٹھا کر باہر پھینکیں۔ فریڈی اپنی سیکنڈ ہینڈ بیوک میں مجھے گھر چھوڑنے آیا۔ ”ایک بات اور۔“ اس نے مجھ سے کہا ”ہو سکے تو اپنے پاس دو درجن کے قریب ربڑز (Condoms) ہمیشہ رکھنا، رقص کے خاتمے پر تم نے چند ”بلّوں“ کو میرے پاس آتے دیکھا ہو گا۔ جب بھی وہ کوئی نیا ”چوزہ“ پھنساتے ہیں میرے پاس ربڑ لینے آتے ہیں۔ قیمت ایک ڈالر، بخشیش اس کے علاوہ، کچھ باتوں کی احتیاط کرنا۔ ”بلّے“ تم سے شراب مانگیں گے، منشیات طلب کریں گے لیکن جب تک تم پولیس والوں کو پہچاننے نہ لگو ربڑز کے علاوہ کچھ مت رکھنا۔ اگر حالات ٹھیک رہیں تو تم ہر رقص کے بعد دس بارہ ڈالر کما لو گے“ میرے گاڑی سے اترنے سے قبل اس نے کہا ”اور یہ مت بھولنا کہ دنیا مسائل کا گھر ہے۔ پھر ملیں گے۔“

اگلی بار جب فریڈی مجھے ملا تو وہ اپنی نئی کیڈ یلاک میں تھا۔ ”تم نے میری ساتھ خوب استادی کی۔“ میں نے طنزاً کہا تو وہ ہنسنے لگا کیونکہ مجھے کام پر دو چار دن میں ہی علم ہو گیا تھا کہ فریڈی کا اصل کام جوتے چمکانا نہیں بلکہ شراب اور منشیات بیچنا اور سفید فام گاہکوں کو سیاہ فام طوائفیں سپلائی کرنا تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ سیاہ فاموں کے ڈانس میں سفید فام لڑکیاں کثیر تعداد میں آتی ہیں۔ کچھ تو اپنے دلالوں کے ساتھ گاہک گھیرنے آتیں کچھ اپنے سیاہ فام دوستوں کے ساتھ آتیں۔ اور بعض تنہا صرف جذباتی سیاہ فاموں کے درمیان ہوس کی سستی تسکین کے لیے آتی تھیں۔

سفید فاموں کی رقص کی محفلوں میں کسی سیاہ فام کو داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ سیاہ فام طوائفوں کے دلالوں نے ایک نئے لڑکے کا انتظام کیا۔ جو رقص کے بعد جوتے پالش کروانے والوں کو سیاہ فام طوائفوں کے پتے اور فون نمبرز مہیا کرتا تھا۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ سفید فام بینڈ گروپ صرف سفید فام لوگوں کی محفل میں ہی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے صرف ایک سفید فام بینڈ ایسا تھا جس نے سیاہ فاموں کے لیے پرفارم کیا۔ یہ بینڈ چارلی بارنٹ کا تھا حقیقت یہ ہے کہ سفید فام لوگوں کی موسیقی ہم سیاہ فاموں کو ہمیشہ بے جان اور مردہ سی لگتی تھی لیکن چارلی بارنٹ کے کچھ گانوں پر ہم سیاہ فام دیوانے ہو گئے اور ان کے پروگرام پر ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی۔ بعض اوقات پروگرام شروع ہونے سے پہلے فنکار میرے پاس جوتے پالش کروانے

آتے ان میں ڈیوک ایلنگٹن، اکاؤنٹ بیسی، لائنل ہیمپٹن، کُوٹی ولیمز، جمی لانسی فورڈ چند ایسے نام ہیں جو دیگر فنکاروں کے علاوہ مجھ سے جوتے پالش کروانے آئے۔ بلکہ ڈیوک کے بینڈ کا سیکس مین (SAXMAN) جونی ہاجز آج بھی میرا مقروض ہے جس نے جوتے پالش کروا کر پیسے ادا نہیں کئے۔ الغرض میرے پاس سارے بڑے فنکار جوتے پالش کروانے آتے۔ ان کا واسطہ اس سے قبل کسی ایسے جوتے چمکانے والے سے نہیں پڑا تھا جو ان کا عقیدت کی حد تک پرستار بھی تھا۔ میں ان ساری ملاقاتوں کا احوال وِلفرڈ اور ہلڈا اور فلبرٹ اور ریگی نالڈ کو لکھ بھیجتا۔

جب سیاہ فام رقص میں جوبن پر ہوتے تو میری بخشیش کئی گنا بڑھ جاتی۔ سیاہ فاموں کے رقص میں شراب پانی کی طرح بہائی جاتی اور ہم بعد میں ہال سے درجنوں خالی بوتلیں سمیٹتے۔ جو عموماً اچھی شراب خصوصاً سکاچ کی ہوتی تھیں۔ جیساکہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ میں وقفوں میں پانچ دس منٹ کے لیے رقص دیکھنے ہال میں چلا جاتا تھا میں نے محسوس کیا کہ گوروں کا رقص مصنوعی سا ہوتا ہے جیسے باقاعدہ تربیت لی ہو۔ بایاں ایک دو، دایاں تین چار۔ بار بار ایک سے ہی انداز، جیسے کسی نے چابی بھری ہو... لیکن سیاہ فاموں کا رقص!... دنیا کا کوئی رقاص اس فطری رقص کی نقل نہیں کر سکتا جو جذبات کی اتنی واضح عکاسی کر سکتا ہو۔ دوران رقص میرے سیاہ فام بھائی اکثر گوریوں کے پیچھے لپکتے اور یہ بھی نہ دیکھتے کہ ان کی اس حرکت سے سیاہ فام لڑکیوں کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ لیکن اب وقت بدل گیا ہے اب تو کیا کالی کیا گوری سب عورتیں سیاہ فام مردوں کے پیچھے لپکتی ہیں۔

خیر میں رقص کے متعلق بتا رہا تھا کوئی کوئی جوڑا اتنا اچھا رقص کرتا کہ دوسرے لوگ ان کے لیے جگہ کُھلی چھوڑ دیتے تھے۔ خود میں نے اگرچہ کبھی رقص نہیں کیا تھا مگر مجھے رقص کی دھمک ہڈیوں تک اترتی محسوس ہوتی۔

رقص کا آخری گھنٹہ ”شو ٹائم“ کہلاتا تھا۔ درجن دو درجن پُرجوش جوڑے ہال کے درمیان رہ جاتے باقی لوگ اردگرد کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے۔ لڑکیاں ذرا ہلکے پھلکے سفید ”سنیکرز“ (جوگر کی قسم کے جوتے) پہن کر میدان میں اترتیں۔ سازندوں، ناچنے والوں اور اردگرد کھڑے لوگوں کا جوش دیدنی ہوتا۔ موسیقی اتنی اونچی اور ہیجان انگیز ہوتی کہ لگتا ہال کی چھت اُڑ جائے گی۔ ہال پر ایسے جہاز کا گمان ہونے لگتا جو سمندری طوفان میں تھپیڑوں سے ڈول رہا ہو۔ سیاہ فام لڑکے لڑکیاں یوں ناچتے گویا پاگل ہو گئے ہیں۔ تماشائی ان کا حوصلہ بڑھاتے یہاں تک کہ ناچنے والے پسینے میں تر اور بے حال ہو کر بس کر دیتے۔ میں بھی تماشائیوں میں شامل دیوانہ وار اُچھل اُچھل کر داد دیتا۔ یہاں تک کہ مینجر کو مجھے آ کر بتانا پڑتا کہ چند گاہک میرا انتظار کر رہے ہیں۔

پہلا شراب کا گھونٹ، پہلا سگریٹ کا کش اور پہلی بار منشیات کا استعمال مجھے بالکل یاد نہیں۔ لیکن یہ سارے تجربے ان دنوں ہوئے جب میں شارٹی اور اس کے دوستوں کے ہمراہ جوئے اور تاش وغیرہ میں ملوث ہوا۔ شارٹی اب بھی میرے پینڈوپن کا مذاق اُڑا کر سب کو ہنساتا مگر مجھے خوشی تھی کہ ان لوگوں نے مجھے بطور دوست قبول کر لیا ہے۔ ہم بے دریغ بھرے ہوئے سگرٹوں اور شراب کا استعمال کرتے۔ سب کا کہنا تھا کہ میرے بال ذرا بڑھ جائیں تو انہیں کانک (سیدھا) کروا لیا جائے گا۔ میں نے شارٹی کو بتایا کہ میں نے نیا جوڑا سلوانے کے لیے کچھ پیسے بچائے ہیں۔ ”بچت؟“ شارٹی نے حیرت سے کہا۔ ”تم نے ابھی تک ادھار (Credit) کا نام نہیں سنا۔؟ یہاں پڑوس میں ایک بزاز کی دکان ہے جو میرا پرانا واقف ہے۔ تم یوں کرو کل علی الصبح اس کی دکان پر پہنچ جاؤ میں تمہیں وہیں ملوں گا۔“ اگلی صبح جب میں دکان پر پہنچا تو میری ملاقات ایک نوجوان یہودی سے ہوئی۔ ”تم شارٹی کے دوست ہو ناں؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کی تائید کی اور دل میں شارٹی کے تعلقات پر حیران ہونے لگا۔ اس یہودی نے میرا نام، روز لینڈ کلب کا پتہ اور میری سکونت کا پتہ ایک فارم پر لکھا۔ ”بحوالہ“ کے خانہ میں شارٹی کا نام لکھا۔ پھر مجھے بتایا کہ شارٹی ان کے بہترین گاہکوں میں سے ایک ہے۔ سیلز مین نے میرا ناپ لے کر مجھے انتہائی خوبصورت آسمانی رنگ کا سوٹ دکھایا۔ پتلون گھٹنوں پر تیس انچ کھلی تھی جو تکونی شکل میں گھٹتی ہوئی پائنچوں پر صرف بارہ انچ کھلی رہ گئی تھی۔ لمبا کوٹ کمر سے تنگ لیکن گھٹنوں کے پاس کافی کھلا تھا۔ سوٹ کے ساتھ مجھے دکان کی طرف سے ایک چمڑے کی پیٹی بطور تحفہ دی گئی جس پر میرے نام کا پہلا حرف جگمگا رہا تھا۔ پھر دکاندار کے مشورے پر میں نے ایک نیلا ہیٹ خریدا جس میں آرائشی پَر لگا ہوا تھا۔ اس پر مجھے دکاندار کی طرف سے ایک سنہری زنجیر کا تحفہ دیا گیا جو کوٹ پر سجائی جاتی تھی اور یوں میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خود کو ادھار (Credit) پر بیچ دیا۔

میں نے نیا سوٹ ایلاء کو پہن کر دکھایا تو اس نے چند قدم ہٹ کر میرا جائزہ لیا پھر بولی ”ہوں یہ تو ہونا ہی تھا۔“ میں نے نئے حلیے میں تین تصاویر کھنچوائیں۔ جن میں میں ہیٹ ترچھا کئے، گھٹنے جوڑے، پاؤں پھیلائے، زنجیر لٹکائے، لمبے کوٹ اور پنجابی پتلون میں کافی دلچسپ نظر آتا تھا۔ ایک تصویر میں نے اپنے دستخطوں کے ساتھ لانسنگ اپنے بہن بھائیوں کو بھیج دی تاکہ انہیں اندازہ ہو کہ میں کتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہوں۔ دوسری تصویر میں نے ایلاء کو دی جبکہ تیسری تصویر شارٹی کو جسے دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد شارٹی نے اعلان کیا کہ تمہارے بال اب اتنے بڑے ہو گئے ہیں کہ انہیں ”کانک“ (سیدھا) کروایا جا سکے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے ”کانک“ کرنے کا محلول بنانا سکھائے گا تاکہ حجام کے تین چار ڈالر بھی بچ جائیں۔

میں نے اس سے فہرست اجزاء بنوائی اور دکان سے جا کر ایک ”ڈبہ ریڈ ڈیول الکلی، دو انڈے، درمیانے حجم کے دو سفید آلو، ویزلین کا بڑا مرتبان، صابن کی بڑی ٹکیا، لمبے دندانوں والی کنگھی، ربڑ کی نالی جس کے سرے پر دھاتی فوارہ لگا تھا، ربڑ کے دو دستانے اور ایک ایپرن خرید لیا۔ دکاندار نے مجھ سے پوچھا ”پہلی بار کانک کروانے لگے ہو؟“ میں نے فخر سے جواب دیا ”ہاں۔“

شارٹی مجھے اپنے کزن کے اپارٹمنٹ میں لے گیا جہاں اس نے چھ ڈالر فی ہفتہ کے حساب سے کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ اس کا کزن زیادہ تر وقت اپنی محبوبہ کے ساتھ گزارتا تھا۔ ”اب مجھے دیکھتے جائو۔“ شارٹی نے کہا۔ اس نے آلو چھیل کر اس کی چھوٹی چھوٹی ورقیاں بنائیں اور ایک مرتبان میں ڈال کر لکڑی کے چمچ سے ہلانے لگا۔ اور وقفے وقفے سے اس میں ”الکلی“ بھی انڈیلتا جاتا۔ اس نے تقریباً آدھی مقدار اس میں ڈال دی ”کبھی دھات کا چمچ استعمال نہ کرو ورنہ الکلی کی وجہ سے کالا پڑ جائے گا۔“ جب یہ محلول جیلی کی طرح گاڑھا ہو گیا تو شارٹی نے اس میں دو انڈے ڈال دیئے اور تیزی سے پھینٹنے لگا۔ محلول زرد رنگ کی شکل اختیار کر گیا۔ ”مرتبان کو چھو کر دیکھو“ شارٹی نے کہا۔ میں نے ہاتھ مرتبان کو لگاتے ہی پیچھے کھینچ لیے۔ ”بالکل ٹھیک، یہ الکلی کی وجہ سے گرم ہے۔ جب میں اسے تمہارے بالوں میں لگائوں گا تو کافی جلن ہو گی۔ لیکن جتنی دیر تم اسے برداشت کر سکو گے اتنے ہی تمہارے بال سیدھے ہوں گے۔“

اس نے مجھے بٹھا کر نیا ایپرن میرے گلے میں باندھ دیا۔ اور میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔ پھر چلّو بھر ویزلین میرے سر پر ڈال کر مالش شروع کر دی۔ اس نے میری گردن، ماتھے اور کانوں پر بھی اچھی طرح ویزلین لگا دی۔ ”جب میں تمہارا سر دھوئوں تو کہیں ذرا سی بھی چبھن ہو تو فوراً بتا دینا۔“ شارٹی نے خبردار کیا۔ اس نے ہاتھ دھو کر دستانے پہنے اور اپنا ایپرن باندھ کر بولا ”اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا اگر اس محلول کا تھوڑا سا حصہ بھی سر میں رہ گیا تو جلد میں زخم پیدا کر سکتا ہے۔“

جونہی وہ محلول میرے سر میں لگایا گیا تو ابتدا میں مجھے گرم گرم لگا جب شارٹی نے بالوں میں کنگھی پھیرنی شروع کی تو ایکدم یوں لگا جیسے میرے سر میں آگ لگ گئی ہو۔ میں نے تکلیف برداشت کرنے کے لیے اپنے دانت بھینچ لیے اور میز کے کونوں کو سختی سے پکڑ لیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کنگھی میری جلد کو پھاڑ رہی ہے میری آنکھوں سے آنسو اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا چند ہی لمحوں میں درد میری برداشت سے باہر ہو گیا۔ میں نے شارٹی کو ایک طرف دھکا دے کر واش بیسن کی طرف دوڑ لگائی۔ میں سر دھوتا جاتا تھا اور شارٹی کو بے حساب غلیظ گالیاں دیتا جاتا تھا۔

شارٹی نے آگے بڑھ کر صابن سے میرا سر دھونا شروع کر دیا اس نے گیارہ بارہ مرتبہ میرا سر دھویا ہر دھلائی میں پانی کو بتدریج ٹھنڈا کرتا گیا اور بالآخر ٹھنڈے پانی سے میرا سر دھونے لگا جس سے مجھے کچھ سکون کا احساس ہوا۔
”تمہیں کہیں جلن کا احساس تو نہیں ہو رہا“ شارٹی نے پوچھا ”نہیں“ میں نے کہا۔

میرے گھٹنے بری طرح کانپ رہے تھے۔ ”شاباش بیٹھ جاؤ۔ میرا خیال ہے ہم کامیاب ہو گئے ہیں۔“ جب شارٹی تولیے سے میرا سر خشک کرنا شروع کیا تو مجھے دوبارہ جلن کا احساس ہوا میں مسلسل آہستہ آہستہ چلّاتا رہا۔ ”پہلی بار ہمیشہ بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے لیکن بعد میں عادت ہو جاتی ہے۔ تمہارے بال تو بہت شاندار طریقے سے کانک ہوئے ہیں۔“ شارٹی نے مجھے سمجھایا۔

جب میں نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو میرے بال بے جان ہو کر گیلی لٹوں کی شکل میں لٹک رہے تھے۔ ابھی تک میری کھوپڑی میں جلن ہو رہی تھی لیکن اب اس کی شدت پہلے سے کہیں کم تھی۔ اس نے میرے کندھوں پر ایپرن لپیٹا اور میرے بالوں میں ویزلین لگانی شروع کر دی۔ اس نے پہلے میرے بالوں میں کنگھی کی پھر اُسترے کے ساتھ میری گردن کے بال اور قلمیں ٹھیک کیں۔ کنگھی کے بعد جب آئینے میں اپنی شکل دوبارہ دیکھی تو ایک بار میں اپنی تکلیف بھی بھول گیا۔ آپ کانک دیکھنے کے کتنے بھی عادی ہوں لیکن پہلی مرتبہ اپنا کانک دیکھ کر ہمیشہ جھٹکا لگتا ہے۔ ہم دونوں پسینے میں شرابور اور مسرور تھے میرے سر پر گھنے چمکیلے سرخ سیدھے بال تھے۔ بالکل سرخ، گوروں کی طرح بالکل سیدھے بال۔ کتنا بے وقوف تھا میں احمقوں کی طرح آئینے کے سامنے کھڑا اپنے سیدھے بالوں کی خوبصورتی میں کھویا ہوا تھا اور خود کو تقریباً گورا سمجھ رہا تھا۔ میں نے خود سے عہد کیا کہ آئندہ کبھی کانک کے بغیر نہیں رہوں گا۔ اور کئی سال تک اپنے عہد پر قائم رہا۔

اپنی ذاتی تضحیک کی جانب یہ میرا پہلا بڑا قدم تھا۔ یہ تمام تکلیف برداشت کر کے، الکلی سے اپنی کھال کو جلا کر اپنے بالوں کو سیدھا کر کے میں ان لاکھوں سیاہ فام مردوں اور عورتوں میں شامل ہو گیا جن کے لاشعور میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ سیاہ فام نسلی اعتبار سے گھٹیا اور حقیر ہیں جبکہ سفید فام لوگ اعلیٰ اور برتر ہیں۔ چنانچہ ہم سیاہ فام اپنے جسموں کو گوروں کی طرح بنانے کی کوشش میں اللہ کے عطا کردہ رنگ و روپ کو بگاڑنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اپنے گردوپیش پر نظر دوڑائیں ہر جگہ آپ کو سیدھے بالوں والے سیاہ فام نظر آئیں گے۔ سیاہ فام عورتیں سبز، گلابی، جامنی، سرخ اور نقرئی وگیں لگائے مسرور پھرتی نظر آتی ہیں۔ میں انہیں دیکھ دیکھ سوچتا ہوں کہ کیا ہم سیاہ فام اپنی ذات اور نسلی تشخص کو بالکل فراموش کر چکے ہیں؟

خوش حال سیاہ فام بالخصوص فنکار طبقہ "کانک" کے بغیر کبھی نظر نہیں آئے گا۔ لائنل ھیمپٹن اور سڈنی پاٹیئر کو پسند کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے کبھی کانک نہیں کروایا۔ میں ہمیشہ ایسے سیاہ فاموں کا معترف رہا ہوں جنہوں نے کبھی کانک نہیں کروایا۔ اور دکھ کی بات یہ ہے کہ سمجھدار و باشعور متوسط اور بالائی طبقے کے سیاہ فام ہی نہیں بلکہ غریب اور جاہل سیاہ فام بھی ایک سی شدت سے "کانک" کے جنون میں مبتلا ہیں۔ اکثر غریب سیاہ فام اپنے کانک کو طوالت دینے کے لیے سر پر عورتوں کی طرح رومال باندھے نظر آتے اور صرف خصوصی مواقع پر اپنا کانک ظاہر کرتے اور اس میں دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ میں نے کبھی کسی سیاہ فام یا سفید فام عورت کو کانک کی تعریف کرتے نہیں دیکھا۔ بلکہ میرا خیال ہے کوئی بھی گوری عورت کسی کالے سے تعلق قائم کرنے سے پہلے کانک پر دھیان بھی نہیں دیتی جبکہ سیاہ فام عورتیں سیدھے یا گھنگریالے بالوں سے قطع نظر کسی کالے آدمی کے ساتھ چلنا بھی شرم کی بات سمجھتی تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ساری باتیں میں اپنے تجربے کی بناء پر بتا رہا ہوں۔ اگر ہم سیاہ فام لوگ اس توجہ کا جو ہم اپنے بالوں کو سیدھا کرنے پر دیتے تھے ، نصف بھی اپنی ذات پر دیتے تو شائد ہماری حالت موجودہ حالت سے ہزار گنا بہتر ہوتی۔

!

باب:4

لارا

شارٹی مجھے نئی نئی جگہوں پر لے جاتا جہاں بے حد خوبصورت لڑکیاں اور طرح دار لڑکے کثرت سے دکھائی دیتے۔ ان جگہوں پر جوانی، جوش اور مستی اپنے عروج پر ہوتی۔ ان جگہوں کی زبان روز مرہ کے اعتبار سے قطعی مختلف تھی اور نئے آدمی کے پلے بالکل نہیں پڑتی تھی۔ لیکن بہت جلد میں نہ صرف اس کا عادی ہوگیا بلکہ روانی سے بولنے بھی لگا۔ دیہات سے شہر آنے والے لاکھوں کالوں کی طرح میں نے بھی ان تمام فیشنوں کو اپنا لیا جو شہری زندگی کا لازمہ تھے مثلاً زوٹ سوٹ، کانک، شراب، سگریٹ اور منشیات، صرف ایک کام ایسا تھا جو میں چاہنے کے باوجود نہیں کر پاتا تھا۔ یعنی رقص۔

مجھے وہ خاص وقت یا رات تو یاد نہیں جب میں نے پہلی بار کسی "پیڈ پارٹی" میں رقص (Lindy-hopping) کیا اور مجھے یہ بھی صحیح یاد نہیں ہے کہ وہ شراب تھی یا "میری جوآنا" جس کی تپش نے میری سوئی ہوئی افریقی جبلت کو جگا دیا۔ کوئی تقریب تھی جہاں میرے علاوہ سب رقص کر رہے تھے کہ ایک لڑکی نے مجھے دبوچا اور میں بھیڑ میں رقص کر رہا تھا۔ لانسنگ میں گوروں کے ساتھ رہ کر اور ان کا رقص دیکھ کر میں سمجھتا تھا کہ رقص ایک ترتیب اور تنظیم کا نام ہے۔ جہاں آپ کو ہر قدم طے شدہ انداز میں اٹھانا ہوتا ہے۔ مگر یہاں اپنے ہم رنگ لوگوں کے درمیان میں نے دریافت کیا کہ رقص دراصل موسیقی کی دھن پر ہاتھ پائوں اور جسم کی آزادانہ اور فطری حرکات کا نام ہے اس کے بعد کوئی رقص کی تقریب میری شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔

میں فطرتاً نئے کام جلد سیکھ لیتا ہوں چنانچہ بہت جلد یہ نوبت آئی کہ لڑکیاں خود آکر مجھ سے ساتھی بننے کی درخواست کرنے لگیں۔ روزلینڈ میں کام کے دوران بھی میرے ہاتھ پائوں موسیقی کی دھن کے ساتھ حرکت کرتے رہتے گوروں کا یہ کہنا سو فیصد درست ہے کہ "کالے فطری رقاص ہوتے ہیں" حتیٰ کہ چھوٹے بچے بھی، اگر وہ

گوروں میں رہ کر اپنی فطرۃ نہ بھول چکے ہوں، بہترین رقص کرتے ہیں میری حالت چابی کے کھلونے جیسی تھی اور موسیقی سنتے ہی مجھ میں چابی بھر جاتی۔

میں نے روز لینڈ کے مینجر کو نوکری چھوڑنے کا نوٹس دے دیا کیونکہ میں رقص اور جوتے چمکانے کا کام بیک وقت نہیں کر سکتا تھا، ایلاء یہ اطلاع پا کر بہت خوش ہوئی کہ میں نے یہ گھٹیا کام چھوڑ دیا ہے۔ شارٹی نے سن کر کہا کہ اسے پہلے ہی پتہ تھا کہ میں جلد ہی یہ نوکری چھوڑ دوں گا۔ شارٹی کو رقص کی نسبت موسیقی سے زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ زیادہ تر سیکسو فون بجاتا یا دوسرے موسیقاروں کے ریکارڈ سنتا۔ وہ ڈیوک ایلنگٹن کے بینڈ کے فنکار "جونی ہاجز" سے بہت متاثر تھا۔

علی الصبح استعفیٰ دیتے ہی میں کپڑوں کی دکان پر پہنچ گیا۔ سیلز مین نے کھاتہ چیک کیا تو میرے ذمہ ایک ہفتہ کی ادائی کے علاوہ کوئی رقم نہ تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نوکری چھوڑ آیا ہوں۔ جس پر اس نے مجھے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں "تم چاہو تو مزید دو ہفتے بغیر قسط ادا کئے چل سکتے ہو۔"

میں نے غور سے ملبوسات کا جائزہ لیا اور اپنے لیے دوسرا جوڑا(Zoot) چنا۔ یہ سرمئی شارک سکن کا سوٹ تھا۔ پتلون کے پائنچے اتنے تنگ تھے کہ پتلون پہنتے اتارتے ہوئے جوتے اتارنا پڑتے تھے۔ سیلز مین کے کہنے پر میں نے نئی شرٹ، ہیٹ اور جوتے بھی لے لیے۔ جس سے میرے ذمہ رقم میں ستر اسی ڈالر کا اضافہ ہوگیا۔ میں نے پہلی بار حجام سے کانک کروایا۔ اس بار مجھے زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔ یہ سارا اہتمام اس لیے تھا کہ آج روز لینڈ میں "لائنل ہیمٹپن" آ رہا تھا۔ میں نئے کپڑوں میں روزلینڈ پہنچا تو بڑے "ہپسٹرز" میرے کپڑوں کو کن اکھیوں سے دیکھنے لگے۔ لڑکیاں بھی میری جانب مڑ مڑ کر دیکھنے لگیں۔ پہلے میں نے ایک جام لیا پھر بال روم کی طرف چلا۔ موسیقی شروع ہو چکی تھی اور کالے لڑکے لڑکیاں دیوانہ وار ناچ رہے تھے۔ اس سے قبل میں صرف تنگ کمروں میں ناچا تھا اب میرے سامنے ایک ہال تھا۔ شراب اور موسیقی کے گرمی دماغ کو چڑھی تو میں بے خود ہو کر ناچنے لگا۔ اردگرد کھڑی سینکڑوں لڑکیوں میں سے جسے چاہتا دبوچ لیتا۔ وہ سب بھی بہترین ڈانسرز تھیں۔ سیاہ، زرد حتیٰ کہ چند سفید فام لڑکیاں بھی میری شریک ہوئیں۔ میں انہیں دیوانہ وار اپنے کولہے، کندھے اور ہوا میں اچھالتا اور میری رقص میں مہارت پر سب دل کھول کر داد دے رہے تھے۔ گو ابھی میری عمر سولہ سال بھی پوری نہیں تھی مگر میں اپنے قد اور کاٹھی کے اعتبار سے اکیس سال کا لگتا تھا۔ میں ہر طرح کے رقص میں پیش پیش رہتا "سرکلنگ، ٹیپ ڈانسنگ، فلیپنگ ایگل، دا کینگرو اور دا سپلٹ" غرض کوئی رقص ایسا نہ تھا جہاں میری دھوم نہ ہو۔ ان جوشیلے رقصوں میں میری سب

سے بہترین ساتھی "لورا" نامی لڑکی تھی۔ میری اس سے ملاقات "ٹائونز اینڈ ڈرگ اسٹور" پر ہوئی جہاں میں "جوتے چمکانے" کی نوکری چھوڑ کر "سوڈا فائونٹین کلرک" کی نوکری کر رہا تھا۔ یہ نوکری مجھے ایلاء نے دلوائی تھی۔ ہر روز رات آٹھ بجے جب میں کام سے لوٹتا تو ایلاء میرا دل بڑھانے کے لیے کہتی "دیکھنا ایک روز یہاں تمہیں کوئی اچھا ساتھی ضرور ملے گا۔" مگر مجھے اس کی امید نہیں تھی یہاں آنے والے تمام چھوٹے بڑے سیاہ فام تنگ دست ہونے کے باوجود خود کو کروڑ پتی ظاہر کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ مجھے ان چھچھورے لوگوں سے سخت وحشت ہوتی۔ یہ سب لوگ تصنع سے بھرپور تھے، انہوں نے اپنے لہجے کو اس حد تک بگاڑ لیا تھا کہ اگر مخاطب سامنے نہ ہو تو سننے والا کبھی نہ جان پائے کہ یہ لہجہ کسی گورے کا نہیں سیاہ فام کا ہے۔

بہت جلد مجھے احساس ہوا کہ میں اس جگہ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی نہیں کر سکتا ایک رات میں تقریباً یہ نوکری چھوڑ ہی بیٹھا تھا اس رات میں نے پہلی بار شرط جیتی میں نے 60 ڈالر جیتے اور شارٹی کے ساتھ مل کر جشن منایا میری آرزو تھی کہ میں ہر روز انعام جیتوں تاکہ اپنے قرض ادا کر سکوں۔

لاراء کا گھر ڈرگ سٹور کے قریب ہی تھا میں نے اس کو آتے دیکھا تو جلدی سے بنانا سپلٹ بنانے لگا یہ اس کی پسندیدہ ڈش تھی وہ ہر روز سکول کے بعد باقاعدگی سے اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے آتی تھی۔ بہت جلد مجھے احساس ہوا کہ وہ دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف ہے بلکہ یوں کہیے کہ وہ اس علاقہ کی واحد لڑکی تھی جو میرے ساتھ دوستانہ اور تصنع سے پاک تھی۔ ہمیشہ اس کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ہوتی جس کا وہ بڑی توجہ سے مطالعہ کرتی۔ غور کرنے پر مجھے علم ہوا کہ وہ سب نصابی کتب ہوتی تھیں جو لاطینی اور الجبراء وغیرہ کی تھیں۔ اس کو پڑھتے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ میسن چھوڑنے کے بعد میں نے کبھی اخبار بھی نہیں پڑھا وہ بہت خاموش طبع تھی اور بہت مختصر گفتگو کرتی تھی لیکن اس کے باوجود دوسروں کی طرح اس میں دکھاوا نہیں تھا اور مجھے اس کی یہی بات اچھی لگی۔ ایک روز میں نے اس سے گفتگو کرنے کی کوشش کی موضوع تو جانے کون سا تھا لیکن لاراء بہت جلد بے تکلفی کے ساتھ مجھ سے باتیں کرنے لگی وہ ہائی سکول جونیر تھی اس کے ماں باپ میں عرصہ پہلے طلاق ہو چکی تھی اور اس کو اس کی دادی نے پالا تھا جو مذہبی اور پرانے رسم و رواج کی سخت پیروکار تھی لڑکوں سے دوستی تو ایک طرف وہ اسے کبھی فلم دیکھنے کی اجازت بھی نہیں دیتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے جانے کے بعد مجھے اپنی کم علمی پر احساس کمتری بھی ہوتا۔

خیر میں ہر روز سکول سے واپسی پر اس کا انتظار کرنے لگا میں نے اسے آئس کریم کی قیمت ادا کرنے سے منع کر دیا بلکہ اس کے لیے آئس کریم کی مقدار بھی بڑھا دی اس نے بھی واضح طور پر میرے سے اظہار پسندیدگی کیا اب اس نے کتابیں پڑھنا چھوڑ دی تھیں وہ جب بھی آتی آئس کریم کھاتی اور باتیں کرتی ایک روز میں نے اسے بتایا کہ میں وکیل بنا چاہتا ہوں تو اس نے خوش ہو کر کہا کہ میلکم ایسی کوئی وجہ نہیں کہ تم محنت کرو تو وکیل نہ بن سکو۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مجھے اس سلسلہ میں اپنی بہن ایلاء سے بھی مدد لینی چاہیے میں نے لاراء سے کبھی شارٹی کا ذکر نہیں کیا تھا یونکہ مجھے پتا تھا کہ وہ اس قسم کے لوگوں کو سمجھ نہیں پائے گی اور نہ وہ لوگ اسے سمجھ پائیں گے مجھے پورا یقین تھا کہ نہ تو کبھی اس نے شراب پی تھی نہ کبھی منشیات استعمال کی تھی اور نہ کسی نے اسے اب تک چھوا تھا۔

ایک رات میں نے اسے موسیقی کے پروگرام میں چلنے کی پیشکش کی جہاں کائونٹ بیسی نے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی اس نے ایسی تقریبات کے متعلق بہت سنا تھا اور وہ وہاں جانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی مگر اس کی دادی جسے شاید یہ سنتے ہی غش پڑ جاتا تھا۔ چنانچہ ہم نے پروگرام موخر کر دیا۔ لیکن پروگرام کی شام لاراء بہت خوش میرے پاس آئی اور کہا اس نے زندگی میں پہلی بار جھوٹ بولا ہے کہ اس کے سکول میں کوئی تقریب ہے اگر میں اسے جلدی گھر پہنچانے کا وعدہ کروں تو وہ میرے ساتھ چل سکتی ہے۔ میں نے ایلاء کو فون کرکے بتایا کہ میں ایک لڑکی کے ساتھ گھر آرہا ہوں چونکہ کسی لڑکی کو گھر لے کر آنے کا یہ پہلا موقع تھا اس لیے ایلاء نے اپنی حیرانی مجھ پر ظاہر نہیں ہونے دی لیکن بعد میں ایک مہذب اور تعلیم یافتہ لڑکی کو میرے ساتھ دیکھ کر ایلاء کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اپنائیت اور خلوص کے ساتھ ملیں۔ ان دونوں ایلاء اپنے تیسرے شوہر سے تعلقات منقطع کرنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔

میں نے اس رات اپنا شارک سکن کا سرمئی سوٹ پہننے کی بجائے نیلا سوٹ پہننے کا فیصلہ کیا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ میں روایتی اور مہذب نظر آئوں۔ میرے کپڑے تبدیل کرنے تک وہ دونوں گہری سہیلیاں بن چکی تھیں ایلاء نے نظروں ہی نظروں میں میرے نیلے سوٹ کی داددی اس شام میرے فخر اور خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا میں نے ایلاء پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ میں چاہوں تو کسی بھی پڑھی لکھی لڑکی کے ساتھ دوستی کر سکتا ہوں۔

اور پھر اچانک ہم روز لینڈ کے ہنگامے سے بھرپور برآمدے میں پہنچ گئے لوگ مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلانے اور احوال پوچھنے لگے۔

ہم دونوں نے کبھی مل کر رقص نہیں کیا تھا لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کوئی سے دو افراد جو لنڈی رقص کر سکتے ہوں وہ بڑی آسانی سے یہ رقص بھی کر سکتے ہیں۔ بہت جلد مجھے احساس ہوا کہ لاراء ایک اچھی رقاصہ ہے۔

بہت سال بعد جب ہارلیم میں مجھے ایک پمپ (دلال) سیمی نے بتایا کہ دوران رقص جب کوئی لڑکی رقص میں کھو جاتی ہے تو اس وقت اس کے چہرے پر اس کی حقیقی شخصیت کو بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے سیمی ایک مشہور دلال تھا جو بے شمار عورتوں کو عصمت فروشی کے دھندے میں لگا چکا تھا عورتوں کے متعلق اس کی رائے آخری ہوتی تھی لیکن اس رات لورا کے ہمراہ رقص کرتے ہوئے مجھے اس اصول کا علم نہیں تھا۔ تقریب کے آخر پر رقص کا مقابلہ ہوا جس میں صرف بہترین رقاص ہی فلور پر ٹھہر سکتے تھے۔ لڑکیوں نے اونچی ایڑی کے جوتے اتار کر ہلکے سفید جوتے پہن لیے کیونکہ لنڈی ہوپنگ میں اونچی ایڑی کے جوتے ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ آخر میں کاؤنٹ بیسی نے اپنی مشہور ہیجان خیز دھن بجائی باقی سب رقاص فلور چھوڑ کر ایک طرف ہوگئے اور مجھے رقص کی دعوت دی گئی۔ ایک میمی بی ولز نامی لڑکی جو ویٹرس تھی اور بہت کمال رقاص تھی دوڑ کر میری طرف آئی لوراء کی موجودگی میں اس کے ساتھ رقص کرنے سے ہچکچایا لیکن لورا خود ہی مجھ سے علیحدہ ہو کر میرا رقص دیکھنے کے لیے مجمعے کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ میمی ایک مضبوط اور اچھے ڈیل ڈول کی لڑکی تھی اور روز لینڈ کی تقریبات کی جان بھی وہ رقص کے دوران ہوش و حواس سے واقعی بے گانہ ہو جاتی لگتا کہ اس میں افریقاً جنگلی روح آگئی ہے پہلا رقص ختم کرکے جب ہم فلور سے اترے تو ہم دونوں پسینے میں تر تھے اور لوگ چیخ چیخ کر ہمیں داد دے رہے تھے۔

میں لورا کو گھر پہچانے کے لیے تقریب سے جلدی چلا گیا وہ چپ چپ تھی اور اگلا کے را۔۔۔ ہفتے جب بھی میری دکان پر آتی تو بہت کم بولتی اب تک مجھے یہ سمجھ آ چکی تھی کہ جب عورت کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہی ہو تو پوچھنے کے لیے اس پر دبائو ڈالنا نہیں چاہیے جب وہ کسی نتیجہ پر پہنچ جائے گی تو خودہی ہمیں بتا دے گی۔

ایلاء جب بھی مجھے دیکھتی تو اگر میں دانت بھی صاف کر رہا ہوتا تو وہ لورا کے بارے میں سوال کرنا شروع کر دیتی، لورا کو ملنے جا رہے ہو؟ "دوبارہ اسے گھر کب لا رہے ہو؟" "کتنی اچھی لڑکی ہے وہ!" وہ اپنی دانست میں اسے میرے لیے منتخب کر چکی تھی۔

لیکن جہاں تک میرا خیال ہے میں نے کبھی اس حوالے سے نہیں سوچا تھا۔ ذاتی معاملات میں میرا ذہن کام سے فارغ ہوتے ہی اپنا سوٹ پہن کر شارٹی اور دوسرے دوستوں کو ملنے کے لیے مضطرب ہو جاتا۔ رہی لڑکیاں سو سب کو پتہ تھا کہ میں ان سے سینکڑوں میل دور بھاگتا ہوں حتیٰ کہ جب لورا میرے پاس دوبارہ دکان پر آئی اور روز لینڈ میں

ہونے والے نیگرو ڈانس میں چلنے کی درخواست کی میں تب بھی اس کے متعلق کوئی جذبات نہیں رکھتا تھا۔ اس رات ڈیوک ایلنگ ٹن اپنے فن کا مظاہرہ کرنے جا رہا تھا لورا نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اسے گھر سے لے لوں۔ اگرچہ میں اس کی دادی سے ملنا نہیں چاہتا تھا لیکن پھر بھی چلا گیا اور دروازہ اس کی دادی نے ہی کھولا۔ وہ ایک اولڈ فیشن، جھریوں بھرے چہرے والی سیاہ عورت تھی جس کے سر پر گھنگرالے سرمئی بال تھے۔ اس نے صرف اتنا سا دروازہ کھولا جس میں سے میں بہ مشکل اندر داخل ہو سکوں۔ میں نے آج تک کسی کو اتنا خوف زدہ نہیں دیکھا مجھے وہ دھندلا کمرہ اب تک یاد ہے جس میں ہر طرف حضرت عیسیٰؑ کی پرانی تصویریں ٹنگی تھیں پردوں پر دعائیں کڑھی ہوئی تھیں مصلوب حضرت عیسیٰؑ کے مجسمے اور دوسرے بہت سی مذہبی چیزیں کارنس، شیلف میز دیواروں غرض ہر جگہ سجی تھیں۔ چونکہ دادی اماں نے مجھ سے بات نہیں کی لہٰذا میں نے بھی ان سے گفتگو کی کوشش نہیں کی۔ لیکن اب مجھے واقعتاً اس کے ساتھ ہمدردی محسوس ہوتی ہے آخر وہ میرے خاص سوٹ کونک اور کیسری جوتے دیکھ کر میرے متعلق کیا سوچ سکتی تھی۔ اگر وہ اس وقت مجھے دیکھ کر چیختی ہوئی پولیس کو بلانے دوڑ پڑتی تو مجھے کوئی حیرت نہ ہوتی کیونکہ آج میرے والے حلیے میں کوئی میرے دروازے پر آ کر دستک دے اور میری بیٹی سے ملنے کی خواہش ظاہر کرے تو میں یقیناً اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دوں گا۔

لورا اوورکوٹ پہنتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے چہرے سے غصہ اور پریشانی ہویدا تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی اس نے رونا شروع کر دیا۔ دادی سے پچھلی بار جھوٹ بولنے کا اسے بہت قلق تھا چنانچہ اس بار اس نے سچ بولنے کا فیصلہ کیا جس کے نتیجہ میں دونوں کے بیچ خوب جنگ ہوئی اور لورا نے دادی کو صاف صاف بتا دیا کہ وہ باہر جانا شروع کر رہی ہے اور اگر دادی نے اسے اس کی مرضی کے خلاف کہیں آنے جانے سے منع کیا تو وہ سکول چھوڑ کر نوکری کر لے گی اور علیحدہ رہنے لگے گی۔

جب ہم روز لینڈ پہنچے تو ابتداء میں ہم نے اکھٹے رقص کیا اور بعد میں پروگرام ختم ہونے تک دونوں نے مختلف پارٹنرز کے ساتھ بھی رقص کیا۔ لورا نے مجھے کہا کہ وہ بھی دوسری لڑکیوں کے ساتھ رقص کا مقابلہ کرنا چاہتی ہے کچھ میری شہرت اور کچھ لورا کے رقص کے بیلے انداز ہم بہت جلد سب کی نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ میں مسرت اور حیرانی کی انتہائوں پر تھا لورا کے بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ پسینے میں تر تھی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اس پر تھکاوٹ غالب آ رہی ہے تو میں اسے لے کر ایک طرف ہٹ گیا۔۔۔ کے کچھ لوگوں نے ہمیں تالیاں بجا کر داد دی لورا کو نوجوانوں نے گھیر لیا۔ میری نگاہ ایک سنہرے بالوں والی لڑکی پر پڑی جو پہلے آنے والی

سفید فام لڑکیوں میں کبھی نظر نہیں آئی تھی وہ مجھے بہت دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ان دنوں روکس بیری میں بلکہ پورے امریکہ میں کسی بھی کالی بستی میں کسی ایسی سفید فام طوائف کا جو پہلے سے عام نہ ہو میسر آنا کسی بھی حبشی کے لیے اول درجے کا سٹیٹس سمبل تھا اور اس وقت جو سفید فام لڑکی مجھے دیکھ رہی تھی وہ اتنی خوبصورت تھی کہ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ شانوں تک بال متناسب جسم مہنگے کپڑے یقیناً کسی کو ان کی بہت قیمت ادا کرنی پڑی ہو گی۔

یہ تسلیم کرنا اگرچہ بہت شرم ناک ہو گا لیکن کچھ دیر کے لیے میں لورا کو بالکل بھول گیا تھا۔ جب لورا پھر سے جان چھڑا کر لوٹی تو اس نے لڑکی اور میرے چہرے کے تاثرات کو غور سے دیکھا۔ میں اس لڑکی کے ساتھ ڈانس کرنے چلا گیا اس کا نام صوفیہ تھا وہ اچھی ڈانسر تو نہیں تھی کم ازکم حبشیوں کے معیار کے مطابق لیکن اس کی پرواہ کسے تھی۔ سب لوگ آنکھیں پھاڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہم باتیں کرنے لگے میں نے اس کے رقص کی تعریف کی میں جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ یہاں کیوں آئی تھی۔ زیادہ تر گوری عورتیں حبشیوں کے علاقے میں جس مقصد کے لیے آتی تھیں وہ میں اچھی طرح جانتا تھا لیکن اس طرح کی لڑکی وہاں شاید ہی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے میرے سوالوں کے مبہم سے جواب دیئے لیکن ہم دونوں نے طے کرلیا کہ میں لورا کو جلدی گھر چھوڑ کر ٹیکسی میں واپس آتا ہوں۔ صوفیہ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا بعد میں اس کے ساتھ ڈرائیو پر چلوں گا؟

میری خوش قسمتی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا میں ایک گھنٹے میں لورا کو چھوڑ کر واپس لوٹا تو صوفیہ باہر میرا انتظار کر رہی تھی۔

پانچ بلاک پیچھے اس کی گاڑی کھڑی تھی اسے اچھی طرح علم تھا کہ کہاں جانا تھا۔ بوسٹن سے باہر نکل کر اس نے گاڑی ایک بغلی سڑک پر ڈال دی اور پھر ایک سنسان گلی میں موڑ لی اس کے بعد اس نے لائٹیں بند کر لیں صرف ریڈیو چلتا رہا۔

اگلے کئی ماہ تک صوفیہ مجھے شہر لے جاتی اور میں اسے راکس بیری میں ہونے والی رقص کی تقریبات اور شراب خانوں میں لے جاتا۔ ہم ہر طرف گھومتے کبھی کبھی تو وہ پُو پھٹے مجھے ایلاء کے گھر کے باہر اتارتی۔ سب کالے اس کے دیوانے تھے اور وہ بھی سب کالوں کی دیوانی لگتی ہفتے میں دو تین راتیں ہم باہر گزارتے۔ اس نے تسلیم کیا کہ اس کے سفید فام لڑکوں کے ساتھ بھی تعلقات رہے ہیں لیکن اس نے قسم کھا کر کہا کہ اسے گورے مردوں نے کبھی "متاثر" نہیں کیا۔ ابتدا میں بہت عرصے تک مجھے اس بات پر حیرانی ہوتی رہی کہ اس نے پہلی رات مجھے اتنی بے باکی سے کیوں منتخب کیا میرا خیال تھا کہ اس کو مجھ سے قبل کسی کالے کا خوشگوار تجربہ ہوا ہو گا لیکن نہ میں نے کبھی

پوچھا نہ اس نے کبھی بتایا۔ کبھی کسی عورت سے دوسرے آدمیوں کے متعلق نہیں پوچھنا چاہیے یا تو وہ جھوٹ بولے گی اور آپ حقیقت نہیں جان پائیں گے اور اگر اس نے سچ بولا تو ممکن ہے کہ آپ کو سُننا اچھا نہ لگے۔

بہر حال وہ مجھ سے بری طرح مسحور تھی۔ میں نے شارٹی سے ملنا بھی کم کر دیا۔ جب کبھی وہ اور دوسرے دوست ملتے تو وہ کہتا "یار میں نے تمہارے بالوں کے گھونگھر ختم کرنے تھے لیکن تمہیں گوری سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ سچ تو یہ ہے چونکہ شارٹی نے ہی میری تربیت کی تھی لہٰذا میرے صوفیہ سے تعلق کی وجہ اس کے سٹیٹس میں بھی اضافہ ہوا۔ جب میں نے صوفیہ کو اس سے ملوایا تو وہ اس کو اس طرح گلے ملی جس طرح سگے بھائیوں سے ملتی ہے۔ شارٹی اس سے بہت متاثر ہوا۔ شارٹی کا طرۂ امتیاز چند سفید طوائفیں تھیں یا وہ چند مزدور پیشہ سفید عورتیں جو کارخانوں میں کام کرتی تھیں اور اتفاقاً کالوں کی "صلاحیتوں" سے آگاہ ہو جاتی تھیں۔ صوفیہ کی وجہ سے راکس بیری کے کالوں کے مرکزی علاقے میں میرے وقار میں حقیقی اضافہ ہوا۔ اب تک میں عام سیدھے بالوں اور مخصوص کپڑوں والا حبشی نوجوان تھا لیکن اب ایک خوبصورت سفید عورت کے ساتھ شراب خانوں میں گھومتا اس کے دیئے ہوئے پیسے خرچ کرتا جسے دیکھ کر اہم سیاہ فام بدمعاش اور بانکے نوجوان کلب منیجر مشہور جواری اور دوسرے میری پیٹھ ٹھونکنے لگے۔ ہمارے لیے خاص میز مہیا کی جاتی اور مجھے "ریڈ" کہہ کر بلاتے مجھے پتا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کیوں کرتے ہیں۔ وہ میری سفید فام محبوبہ چھیننا چاہتے تھے۔ مضافاتی جھونپڑ پٹیوں میں بھی سٹیٹس کے لیے اسی طرح کی حاسدانہ کوششیں کی جاتی تھیں۔ 16 سال کی عمر میں میرے پاس "کیڈلیک" خریدنے کے پیسے نہیں تھے لیکن صوفیہ کے پاس اپنی بہترین کار تھی جسے ہم اپنی زبان "رُبر" کہتے تھے اور میرے پاس صوفیہ تھی جو گاڑی سے بھی بہتر تھی۔

جب تک میں ڈرگ سٹور پر کام کرتا رہا تب تک لورا وہاں نہیں آئی اگلی بار جب میں نے اسے دیکھا تو وہ بالکل بدل چکی تھی اب وہ روکس بیری کے سیاہ فام علاقے کی بدنام ترین عورت تھی اور کئی بار جیل جا چکی تھی۔ اپنی دادی کا گھر چھوڑنے کے بعد اس نے شراب پینا شروع کر دی جو انجام کار اسے منشیات کی طرف لے گئی جن کے حصول کے لیے اسے اپنا جسم بیچنا پڑا اپنے گاہکوں سے نفرت نے اسے ہم جنس پرست بنا دیا۔ بہت سال تک میں اس شرمندگی میں رہا کہ اس سارے گناہوں کی وجہ میں تھا کیونکہ میں نے ہی اسے ایک گوری کے لیے نظرانداز کیا تھا لیکن میرے پاس سوائے گونگا بہرہ اور اندھا بننے کے کوئی چارہ نہ تھا۔

بہت جلد ایلاء کو میرے اور صوفیہ کے تعلقات کا علم ہو گیا۔

میں نے ڈرگ سٹور کی نوکری چھوڑ کر ایک نئی نوکری کر لی اور بوسٹن میں ایک ٹرین میں بیرا بن گیا۔ کچھ ہفتوں بعد ایک اتوار کی صبح میں دفتر بہت دیر سے پہنچا مجھے توقع تھی کہ آج مجھے نوکری سے نکال دیا جائے گا جب میں وہاں پہنچا تو سارا عملہ سخت پریشانی اور ہیجان میں مبتلا تھا معلوم ہوا کہ جاپانی جہازوں نے پرل ہاربر نامی کسی جگہ پر بموں سے حملہ کر دیا ہے۔

!

باب: 5

ہارلم کا باسی

ایلاء کی بہت خواہش تھی کہ میں کسی طرح بوسٹن اور صوفیہ سے جان چھڑوا لوں اور دوسرے نیگروز کی طرح فوج میں بھرتی ہوجاؤں لیکن سولہ سال کا ہونے کے باعث مجھے فوج میں بھرتی نہیں کیا گیا۔

میں کافی عرصے تک ریلوے میں ہی ملازمت کرتا رہا جس کی کچھ ذاتی وجوہ تھیں۔ مجھے عرصہ سے نیویارک دیکھنے کی خواہش تھی۔ جب سے میں راکس بیری آیا تھا میں نے فن کاروں، ملاحوں، سیلز مینوں، سفید فام گھرانوں کے شوفروں اور دوسرے افراد سے ”بڑے سیب“ (The Big Apple) کے متعلق بہت سنا تھا۔ بلکہ لانسنگ میں ہی میں نے نیو یارک بالخصوص ہارلم کے علاقے کا ذکر سنا تھا۔ ہمارے والد ہارلم کا ذکر بڑے فخر سے کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیں مارکس گریوی کے پیروکاروں کی لمبی لمبی پریڈز کی تصویریں بھی دکھائی تھیں۔ جب بھی ”جولوئیس“ کسی گورے کے خلاف لڑائی جیتتا کالوں کے روزنامے مثلاً شکاگو ڈیفنڈر (Chicago Defender) پٹس برگ کوریئر (Pittsburgh corier) اور ایفرو امریکن (Afro American) صفحۂ اول پر تصاویر چھاپتے۔ جس میں ہارلم کے سیاہ فاموں کا سمندر دکھایا جاتا جو ”ہارلم تھریسا ہوٹل“ کی بالکنی میں کھڑے ہاتھ ہلاتے "Brown Bomber" کو خراج تحسین پیش کر رہا ہوتا۔ نیویارک سے متعلق ہر بات کمال تھی۔ وہاں کے براڈوے کی روشنیاں، سیوی بال روم اور ہارلم کا ”اپالو تھیٹر“ جو بہت سے مشہور فن کاروں، معروف گیتوں اور پسندیدہ رقصوں کا سرچشمہ تھا۔

لیکن لانسنگ یا بوسٹن سے نیویارک جانا اتنا آسان نہیں تھا اس کے لیے رقم چاہیے تھی۔ اگر مجھے ریل میں مفت سفر کی سہولت نہ ملتی تو میں نیو یارک جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس دوران میری صوفیہ سے ملاقاتیں مسلسل جاری رہیں اگرچہ ایلاء کو ان کا علم نہیں تھا۔ شارٹی کو بھی میرے نیو یارک جانے کی خبر سے بہت خوشی ہوئی۔ مگر اسے ہر وقت فوج میں جبری بھرتی کا خوف رہتا اور سینکڑوں دوسرے سیاہ فاموں کی طرح وہ ایسی ادویات استعمال کرنے لگا

تھا جن کی وجہ سے طبی معائنہ کے وقت وہ دل کا مریض ظاہر ہو سکے۔ جنگ کے متعلق اس کے خیالات بالکل وہی تھے جو میرے اور دوسرے سیاہ فاموں کے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ ”گورا ہر چیز کا مالک ہے۔ وہ اپنی جگہ ہمارا خون بہانا چاہتا ہے، اسے خود لڑنے دو۔“ بہرحال میں نے بوسٹن سے نیو یارک جانیوالی ٹرین میں نوکری حاصل کر لی۔ کچھ عرصہ میں وہاں باربرداری کا کام کرتا رہا۔ وقتی طور پر مجھے برتن دھونے کی نوکری ”دی کلونئیل“ نامی ٹرین میں ملی جو واشنگٹن ڈی سی جاتی تھی۔ واشنگٹن پہنچ کر میں سیر سپاٹے میں مشغول ہو گیا اور یہ دیکھ کر میں بے حد حیران ہوا کہ کیپٹل ہل (Capital Hill) سے کچھ بلاک پرے ہزارہا سیاہ فام انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی حالت راکس بیری کے غریب ترین سیاہ فاموں سے بھی بدتر تھی۔ ان کی گلیوں کے نام (Pig a Lley) (کوچہ خنزیراں) اور (Godt a Lley) کوچہ بکریاں وغیرہ تھے۔ میں نے اس سے پہلے بہت غریبوں کی آبادیاں دیکھی تھیں مگر اس سے برے حالات کہیں اور نہ دیکھے تھے۔ طوائفیں، منشیات فروش، جیب کترے اور لٹیرے حس تعداد میں یہاں موجود تھے وہ میں نے کہیں اور نہیں دیکھے حتیٰ کہ نیم برہنہ کم عمر بچے آدمی رات کو بھی سڑکوں پر بھیک مانگتے نظر آتے۔ میرے دوستوں نے مجھے متنبہ کیا کہ اس علاقے میں ڈاکہ زنی چھری گھونپنا اور لڑائی جھگڑا معمول کی بات ہے اور یہ سب کچھ وائٹ ہاؤس سے صرف چند بلاک دور ہو رہا تھا۔ ان کے علاوہ میں نے کچھ سیاہ فام بہتر حالت میں بھی دیکھے جو پرانے متروکہ مکانات میں رہتے تھے یہ سیاہ فاموں کا متوسط طبقہ تھا۔ بہت سے سیاہ فام جو ہارورڈ یونیورسٹی کے سند یافتہ تھے مزدوری، دربانی، بار برداری، نگہبانی، ٹیکسی ڈرائیوری اور اس طرح کے دیگر کام کرتے تھے۔ ان سیاہ فاموں میں ڈاکیے کی نوکری بہت معزز سمجھی جاتی تھی۔ ایک روز میرے افسر نے بتایا کہ میں وقتی طور پر (Yankee Clipper) نامی نیویارک جانیوالی ٹرین میں کام کر سکتا ہوں۔

نیویارک پہنچنے پر آخری مسافر کے ٹرین سے اترنے سے قبل میں اپنا پسندیدہ ”زوٹ“ زیب تن کر چکا تھا۔ باورچی مجھے ٹیکسی میں ہارلم لے گیا سفید فام نیویارک کا حصہ میرے سامنے سے کسی فلم کے منظر کی طرح گزر رہا تھا۔ جب ہم سنٹرل پارک سے گزر کر ایک سو دسویں گلی (th Street110) پہنچے تو لوگوں کی رنگت تبدیل ہونے لگی۔

سمال پیراڈائیز کے سامنے Busy Seventh Avenue گزرتی تھی بوسٹن چھوڑنے سے پہلے دوستوں نے مجھے بتایا تھا کہ ہارلم میں شبانہ سرگرمیوں کے لیے یہ پسندیدہ جگہ ہے بلکہ ناگزیر ہے۔ اس سے قبل حبشیوں کے کسی اور کاروباری مرکز نے مجھے اتنا زیادہ متاثر نہیں کیا تھا تقریباً تیس چالیس خوشحال حبشی وہاں بار کے گرد بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ آج تک میں نے جہاں بھی حبشیوں کو شراب پیتے دیکھا تھا وہاں شور شرابا اور ہلا گلا لازمی جزو تھا لیکن یہاں سب

لوگ بہت دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے، گاہک آ جا رہے تھے بار ٹینڈرز شراب گاہکوں کو پیش کر رہے تھے ایک بوتل میرے سامنے بھی رکھ دی گئی۔ ہم حبشیوں کی عادت ہے کہ پیسے ادا کرتے وقت دکھاوا ضرور کرتے ہیں لیکن ہارلم کے حبشی بڑی خاموشی سے اپنی رقم ادا کر رہے تھے۔ ان کا رویہ کافی فطری محسوس ہوتا تھا اور وہ چھچھورے پن سے بالکل پاک تھے۔ میں بہت متاثر ہوا سال پیراڈیئز میں پانچ منٹ گزارنے کے بعد میں بوسٹن اور روکس بیری کو ہمیشہ کے لیے ترک کر چکا تھا۔

ابھی تک مجھے علم نہیں تھا کہ یہ معزز حبشی ہارلم میں رہنے والے دیگر حبشیوں سے بالکل برعکس ہیں بہت جلد مجھے علم ہوگیا ہارلم کے دیگر حبشی بھی عام حبشیوں کی طرح گنوار اور ہنگامہ خیز تھے۔ یہاں سے میں اپالو تھیٹر گیا(مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز جے میک شن کا بینڈ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا کیونکہ بعد میں اس بینڈ کا گلوکار والٹر براٹون میرا بہت اچھا دوست بنا) 7th Avenue پر میں نے ایک بڑا سرمئی رنگ کا تھریسا ہوٹل دیکھا۔ یہ اس زمانے میں واحد اچھا ہوٹل تھا جہاں کالے ٹھہر سکتے تھے۔ اس وقت تک شہر کے اچھے ہوٹلوں میں کالوں کو داخلے کی اجازت نہیں تھی (بعد میں تھریسا ہوٹل کو اس وقت شہرت ملی جب فیڈل کاسٹرو یونائیٹڈ نیشن کے دورے کے دوران یہاں ٹھہرے اور امریکہ کے سٹیٹ ڈپارٹمنٹ کو نفسیاتی طور پر ہلا کر رکھ دیا جو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کاسٹرو ہارلم کے علاقے میں ٹھہر کر کالوں کا دل جیت لیں گے)۔

بریڈ ڈوک ہوٹل اپالو کی پشت پر تھا اور اس کا شراب خانہ مشہور سیاہ فام شخصیتوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ میں وہاں گیا اور میں نے وہاں ڈیزی جلیسی، بلی اکسٹائن، بلی ہالی ڈے، ایلاء فٹزجیرالڈ اور دیناواشنگٹن کو دیکھا۔ جب دینا اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں سے جا رہی تھی تو میں نے سنا کہ وہ سیوائے بال روم جا رہی ہے جہاں لائنل ہمپٹن آ رہا تھا۔ دینا اس کے گروپ میں گلوکارہ تھی یہ بال روم بوسٹن کے مقابلے میں بہت اعلیٰ درجے کا تھا۔ میں نے ایک دو بار مقامی لڑکیوں کے ساتھ رقص بھی کیا وہاں پر کچھ گورے بھی آئے ہوئے تھے۔ جن میں سے زیادہ تر کالوں کا رقص دیکھنے آئے تھے لیکن چند گوروں نے رقص بھی کیا اور بوسٹن کی طرح کچھ سفید فام عورتوں نے بھی کالوں کے ساتھ رقص کیا۔ سب لوگ ہمپ سے تقاضہ کر رہے تھے کہ وہ اپنا مشہور گانا "Flyin' Home" گائے اور بالآخر اس نے وہ گیت سنایا(مشہور ہے کہ ایک بار اپالو میں ایک نشہ باز کالے نے یہ گانا سن کر یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ اڑ سکتا ہے دوسری منزل کی بالکونی سے چھلانگ لگا دی اور اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ بعد میں اس واقعہ پر ارل ہائنز نے ''سینڈ بالکونی جمپ'' کے نام سے دھن بنا کر اسے امر کر دیا) میں نے اس قسم کا آتش بجاں رقص پہلے کبھی نہیں دیکھا

تھا۔ ایک دو گیتوں کے بعد دینا واشنگٹن گیت گانے کے لیے آئی جب اس نے ”سالٹی پاپا بلیوز“ گایا تو محسوس ہوا جیسے سیوائے کی چھت اڑ جائے گی(کچھ عرصہ قبل جب دینا مری تو تقریباً بیس ہزار پرستاروں نے اس کا آخری دیدار کیا۔ ہم بہت اچھے دوست تھے)

جس رات کا تذکرہ میں کر رہا ہوں وہ روائیتی جمعرات تھی جس میں گھروں میں کام کرنے والی نوکرانیاں اور نوکر چھٹی مناتے تھے اسے "Kitchen Mechanics Night" کہا جاتا تھا۔ اس رات عورتوں کی تعداد مردوں سے دو گنا لگتی تھی نہ صرف گھریلو ملازم بلکہ فوج اور دفاع کے ملازموں کی بیویاں بھی بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ تنہا اور رفاقت کی متلاشی جب میں رقص گاہ سے باہر سڑک پر نکلا تو ایک طوائف کو تلخی سے یہ کہتے سنا کہ“ان اناڑیوں نے ہم پیشہ وروں کے کاروبار کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔“

”لی نکس“ اور سیونتھ اور ایٹتھ ایوے نیو کے آس پاس کا ہارلم ایک “ٹیکنی کلر بازار“ تھا۔ سینکڑوں کالے فوجی اور ملاح دکھائی دیتے تھے ان دنوں یہ علاقہ سرکاری طور پر گوروں کے لیے ممنوعہ تھا۔ کئی بار لوٹ مار کے واقعات ہو چکے تھے اور کئی گورے ملازم علاقہ میں مردہ پائے گئے تھے۔ پولیس ادھر آنے والے گوروں کی حوصلہ شکنی کرتی تھی مگر پھر بھی آنے والے آ جاتے تھے۔ ہر تنہا مرد طوائفوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا۔ دلال قریب آ کر سرگوشی کرتے“ہر طرح کی عورتیں مل سکتی ہیں جیک۔ کوئی سفید عورت چاہیے۔“ چل پھر کر چیزیں بیچنے والے گاہک کو گھیر لیتے۔“سو ڈالر کی انگوٹھی، اصلی ہیرا، چلو نوے ڈالر دو، ساتھ گھڑی بھی ملے گی ایک نظر دیکھ تو لیں۔ اچھا دونوں کے پچیس ڈالر دے دیں۔“

دو سال بعد میں ان سب کو سبق سکھا سکتا تھا مگر اس رات میں اس منظر سے مسحور ہوگیا تھا۔ میں اسی دنیا کے لیے بنا تھا۔ اس رات میں نے ہارلم کا باسی بننے کا آغاز کر دیا۔ میں نیویارک کے انتہائی بدکار Hustlers میں سے ایک بننے والا تھا۔ جو کچھ میں نے اس رات دیکھا سنا مجھے اس پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ میری آرزو تھی کہ ”ایلائ“ سے میرے تعلقات ذرا بہتر ہوتے تاکہ میں اسے یہ سب بتانے کی کوشش کرتا لیکن“شارٹی“ سے میں نے بات کی اور اسے ”بگ ایپل“ میوزک ورلڈ دیکھنے پر اکسایا۔ صوفیہ نے میری گفتگو سنی اور کہا کہ میں نیویارک کے علاوہ کہیں مطمئن نہیں رہ سکتا۔ وہ ٹھیک کہتی تھی ایک ہی رات میں نیویارک ہارلم نے مجھے نشہ سا کر دیا تھا۔

جس آدمی کی جگہ میں نے نوکری کی تھی اس کی واپسی کا امکان بہت کم تھا۔ میں ٹرین میں سنیڈوچز، کافی میٹھی گولیاں، کیک اور آئس کریم بیچتا، مجھے یہ بات سیکھنے میں ایک ہفتہ بھی نہیں لگا کہ اگر گوروں کے سامنے تھوڑا سا

دکھاوا کیا جائے تو وہ کچھ بھی خرید لیتے ہیں اور یہ بات وہاں ہر کالے کو علم تھی کہ تھوڑی سی مظلومیت ظاہر کرکے بڑی ٹپ(TiP) اینٹھی جا سکتی ہے۔

ہم ایک ایسی دنیا میں رہ رہے تھے کہ جہاں سب کالے نوکر ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر نفسیات بھی تھے۔ انہیں خبر تھی کہ گورے اتنے خود نگر اور خود پسند ہیں کہ وہ توجہ اور تفریح کے لیے بعض اوقات ضرورت سے زیادہ رقم بھی خرچ کر دیتے ہیں۔

ہارلم میں ہر رات میں کوئی ایک نئی جگہ دریافت کرتا۔ سب سے پہلے میں نے YMCA میں کمرہ کرایہ پر لیا کیونکہ یہ سمال پیراڈائیز کے قریب ہی تھا۔ پھر میں نے مسز فشرز میں ایک زیادہ سستا کمرہ لے لیا زیادہ تر ریلوے کے آدمی یہی ٹھہرتے تھے۔ میں نے ناصرف بارونق علاقے دیکھنے شروع کیے بلکہ ہارلم کے بہترین سے بدترین رہائشی علاقے بھی دیکھے۔ شوگر مل سے پولوگراؤنڈز تک بہت سے معروف لوگوں کی رہائشیں تھیں اور ان سے پرے غریبوں کی بستیاں تھی۔ جہاں غیر قانونی اور غیر اخلاقی چیزوں کی بھرمار تھی۔ گندگی کوڑے کرکٹ سے بھرے ہوئے ڈبے شرابی، نشہ باز، بھکاری گندے شراب خانے، گرجا گھر جن کے باہر دکانیں تھی اور گھر کے پکے کھانوں والے ریسٹورانز تھے۔ چیزیں گروی رکھنے والی دکانیں، دھوئیں سے بھری بیوٹی شاپس جہاں کالی عورتیں اپنے بال سیدھے کروانے آتیں اور کونک ایکسپرٹ حجام کی دکانیں تھیں۔ کبھی کبھی نئی اور سیکنڈ ہینڈ کیڈی لاکس بھی دوسری کاروں کے درمیان کھڑی نظر آتی تھیں یہ سب کچھ راکس بیری اور لان سنگ جیسا ہی تھا مگر اس سے ہزاروں گنا بڑا، چھوٹے تہہ خانے جنہیں ڈانس ہالز میں بدل دیا گیا تھا جن کے باہر "For Rent" لکھا ہوا تھا۔ لوگ چھوٹے چھوٹے کارڈز کے ذریعے "Rent Raising Parties" کی تشہیر کرتے۔ ایک مرتبہ میں بھی وہاں گیا تیس چالیس کالے چھوٹے سے کمرے میں ٹھساٹھس بھرے ہوئے تھے جو پسینہ میں تر، کھانے پینے ناچنے اور جوئے میں مصروف تھے ریکارڈ پلیئر پوری آواز سے بج رہا تھا۔ تلا ہوا مرغ آلوئوں کے سلاد وغیرہ کے ساتھ ایک ڈالر فی پلیٹ کے حساب سے مل رہا تھا اور بیئر کا ڈبہ یا شراب کا گلاس پچاس سینٹ میں، کالے اور گورے کنویسرز آپ کے ساتھ بیٹھے آپ کو "ڈیلی ورکر" خریدنے پر قائل کرتے۔ اس اخبار کے متعلق افواہ تھی کہ اس کا تعلق روس کے ساتھ ہے لیکن میرے بنجر دماغ کے لیے ان دنوں یہ باتیں غیر اہم تھیں۔

نیویارک میرے لیے جنت اور ہارلم جنت الفردوس تھا بہت جلد علاقے کے شراب خانوں والے مجھے پہچاننے لگے۔ جونہی میں دروازے سے اندر داخل ہوتا تو وہ میری پسندیدہ شراب "Bourbon" گلاس میں ڈالنا شروع کر دیتے۔

انہوں نے مجھے ریڈ کہہ کر بلانا شروع کر دیا جو میرے سرخ بالوں کی وجہ سے تھا۔ اب میں کونک کروانے کے لیے بوسٹن میں ایبٹ اینڈ فوگی نامی دکان پر جاتا تھا جو موسیقی کے شعبہ سے وابستہ میرے دوستوں کی رائے میں بہترین کونک شاپ تھی۔

اب میرے دوستوں میں "ڈیوک ایلنگٹن" کے بینڈ کا عظیم ڈرمر "سونی گریئر" اور وائلن کی عظیم شخصیت "رے نینسی" شامل تھے اور اسی طرح کے دیگر موسیقار میرے دوست بن گئے۔

وہ سینڈوچ مین جس کی جگہ میں کام کر رہا تھا واپس آیا تو اسے ایک دوسری ٹرین پر کام دے دیا گیا۔ اس نے سینئر ہونے کا دعویٰ کیا لیکن میرے سیل ریکارڈ نے افسروں کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کی شکایت کسی اور طرح دور کر دیں۔ بیرے اور باورچی مجھے سینڈوچ ریڈ کے نام سے بلانے لگے تھے۔ شروع شروع میں وہ آپس میں شرطیں لگایا کرتے تھے کہ میرے جیسا بدزبان، بدتمیز کالا زیادہ دیر نوکری میں نہیں ٹکے گا۔ میں گاہکوں کے علاوہ اپنے ساتھیوں سے بھی گالی گلوچ کرتا تھا۔ ایک بار نشے میں دھت ایک گورے نے میرا راستہ روک کر اونچی آواز میں کہا "او کالے میں تم سے لڑنا چاہتا ہوں" میں ہنسا اور اس سے کہا یقینا میں لڑوں گا لیکن تم نے کپڑے بہت زیادہ پہن رکھے ہیں۔ اس نے بڑا فوجی اوور کوٹ پہن رکھا تھا جو اس نے اتار دیا لیکن میں ہنستا رہا اور یہی کہتا رہا کہ اس نے اب بھی زیادہ کپڑے پہن رکھے ہیں وہ اپنے کپڑے اتارتا گیا حتیٰ کہ پینٹ سے اوپر اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہ رہا۔ ساری گاڑی کے لوگوں قہقہے لگا رہے تھے۔ کچھ دوسرے فوجیوں نے اسے میرے راستے سے ہٹا دیا۔ کاش میں اس گورے کو ذہن کے علاوہ جسمانی طور پر بھی سزا دے سکتا، اس زمانے کے وہ باورچی اور بیرے جو "نیوہیون لائنز" میں کام کرتے تھے آج بھی بوڑھے پیپی کزنز کو نہیں بھولے ہونگے۔ وہ ایک گورا تھا جو وسکی اور ہر شخص سے محبت کرتا تھا حتیٰ کہ مجھ سے بھی۔ بہت سے لوگوں نے اس سے میری شکایت کی مگر اس نے توجہ نہ دی صرف بوڑھے کالے ملازموں سے کہتا اسے سمجھائو" اسے کوئی نہیں سمجھا سکتا وہ جواباً کہتے۔

رات کو وہ مجھے راکس بیری میں صوفیہ کے ساتھ بہترین سوٹ پہنچے چہل قدمی کرتے دیکھتے جب میں کام پر پہنچتا تو حسب معمول شراب یا چرس کے نشے میں ہوتا اور لوگوں سے بدتمیزی کرتا۔ چھٹی کے بعد گرینڈ سنٹرل سٹیشن سے گزرتا تو بہت سے گورے میرے حلیئے اور "زوٹ سوٹ" کو دیکھ کر رک جاتے چھ فٹ سے زیادہ لمبا ہونے کی وجہ سے میں خود ہی سب میں نمایاں ہو جاتا تھا میرے کونک آتشی سرخ رنگ کے تھے میں یقینا ایک مسخرہ لگتا ہونگا لیکن تب اپنے آپ کو بہت خوبصورت محسوس کرتا تھا۔ میرے پائوں میں مالٹے رنگ کے شوز ہوتے تھے۔ (کچھ

کمپنیاں یہ مضحکہ خیز جوتے صرف کالوں کی آبادیوں میں بیچنے کے لیے بناتی تھیں۔ جہاں مجھ جیسے کالے اپنے آپ کو امیر ظاہر کرنے کے لیے انہیں مہنگی قیمت پر خریدتے تھے۔ اپنی بیس پچیس ڈالر ماہانہ تنخواہ کے اندر رہ کر جتنا ممکن ہوتا میں شراب پیتا۔ میری جوآنا کے سگریٹ پیتا دوستوں کے ساتھ موج مستی کرتا اور نوکری پر جانے سے پہلے کچھ گھنٹے سولیتا۔ میرا نوکری سے نکلا جانا ناگزیر تھا اس پر مستزاد ایک مسافر کا شکایتوں بھرا خط آیا جس کے ساتھ دوسرے کنڈیکٹرز نے بھی لگائی بجھائی میں اہم کردار ادا کیا۔ بلآخر جب نیوہیون لائن والوں نے میرا حساب کتاب صاف کیا تو میں نے لانسنگ میں اپنے بہن بھائیوں سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے دیکھ کر کسی کو بھی یقین نہیں آیا، میرا سب سے بڑا بھائی "ولفرڈ" اوہیو میں ولبر فورس یونیورسٹی میں تجارت پڑھ رہا تھا جبکہ فلبرٹ اور ہلڈا لانسنگ میں ہی کام کر رہے تھے۔

ریگی نالڈ جو مجھ پر بہت انحصار کرتا تھا کافی بڑا ہو چکا تھا اور مرچنٹ میرین میں داخلے کا سوچ رہا تھا یووون، وازلے اور رابرٹ سکول پڑھتے تھے۔ میرا کانک اور لباس اتنا عجیب و غریب تھا کہ میں مریخ کی مخلوق لگ رہا تھا۔ میری وجہ سے سڑک پر دوکاروں میں ہلکی سی ٹکر بھی ہوگئی جن لوگوں سے میں متاثر ہوتا تھا وہ مجھ پر رشک کر رہے تھے۔ ہر شخص میری قربت چاہتا تھا اور میرا دماغ ہوائوں میں تھا۔ کالا مازو سرکاری ہسپتال میں اپنی ماں سے ملاقات واحد واقعہ تھا جس سے میرا دماغ کچھ ٹھکانے آیا۔ میری ماں نے مجھے صحیح طور پر پہچانا ہی نہیں پھر میں شارٹی کی ماں سے ملنے گیا مجھے پتہ تھا شارٹی اس بات سے خوش ہوگا۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھی اور شارٹی کے متعلق سن کر بہت خوش ہوئی میں نے اسے بتایا کہ شارٹی ٹھیک ہے اور ایک روز وہ اپنے بینڈ کا عظیم لیڈر بنے گا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ شارٹی سے کہنا کہ کبھی کبھی خط لکھ دیا کرے اور اس کے لیے کچھ بھیجے۔

پھر میں مسز سوورلین سے ملنے کے لیے گیا جہاں میں نے اپنی نظر بندی کے دو سال گزارے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا میری گفتگو اور انداز سے وہ اتنی پریشان اور حیران ہوئی کہ رخصت کے وقت ہم دونوں نے سکون کا سانس لیا۔ میری واپسی سے ایک رات پہلے لنکن سکول جمنازیم میں رقص کی تقریب تھی۔ جب میں لانسنگ سے گیا تھا تو مجھے رقص کرنا نہیں آتا تھا لیکن اب جمنازیم کا فرش اور نوجوان لڑکیاں میرے رحم و کرم پر تھیں کبھی کبھی میرے رقص سے مسحور ہو کر بینڈ بجانے والے بینڈ بجانا بھول جاتے۔ سب لوگ پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے اس رات میں نے "ہارلم ریڈ" کے نام سے آٹو گرافز بھی دیئے۔ میں لانسنگ کو حیران پریشان چھوڑ کر چلا آیا۔

نیویارک آ کر میں نے دوبارہ ”سی بورڈلائنز“ میں نوکری کرلی۔ انہیں آدمیوں کی ضرورت تھی جب انہیں علم ہوا کہ میں نیوہیون میں کام کر چکا ہوں تو دو ہی دن بعد مجھے پیٹرابرگ اور میامی کے درمیان چلنے والی ٹرین سلور میٹیور میں نوکری دے دی گئی۔ وہاں بوگیوں کی صفائی اور گورے مسافروں کی خوشنودی سے اتنا ہی کما لیتا تھا جتنا کہ سینڈوچ بیچ کر کما لیتا تھا۔ بہت جلد ایک اسسٹنٹ کنڈیکٹر سے میرا جھگڑا ہوگیا اور میں نوکری چھوڑ کر نیویارک آگیا۔ اسی سہ پہر جب میں سمالز پیراڈائز میں داخل ہوا تو ایک بار ٹینڈر نے بتایا کہ اگر میں ریلوے کی نوکری چھوڑنا چاہوں تو ایک بیرے کی جگہ خالی ہے۔ پہلا ملازم فوج میں جانے والا تھا۔

بار کا مالک ایڈ سمال تھا ایڈ اور اس کا بھائی چارلی سمال کبھی جدا نہیں ہوتے تھے اور میرے خیال میں ان سے زیادہ قابل عزت شخصیتیں پورے ہارلم میں نہیں تھیں۔ چارلی سمال دفتر چلاتا تھا۔ چارلی نے مجھے نوکری کے اصول بتاتے ہوئے کہا ”دیر سے نہیں آنا سستی نہیں چلے گی، چوری سے پرہیز کرنا کسی گاہک سے سودے بازی کی کوشش مت کرنا بالخصوص وردی والے گاہک سے“ اور مجھے نوکری مل گئی یہ 1942ء کی بات ہے مجھے سترھواں سال لگا ہی تھا۔

چارلی سمال کو مجھ سے دیر سے آنے کی شکایت کبھی نہیں ہوئی کیونکہ میں ایک گھنٹہ قبل ہی کام پر پہنچ جاتا تھا۔ میں وہاں پہنچ کر صبح والے بیرے کی جگہ لیتا میرے اوقات کار میں بخششیں(TiP) کے امکانات بہت کم ہوتے۔ وہ بیرا رک کر مجھے کام سمجھاتا رہتا تاکہ میں نوکری سے نہ نکال دیا جاؤں۔

اس کا شکریہ میں نے بہت کم وقت میں ایسی بہت سی باتیں سیکھ لیں جو کسی نئے بیرے کے لیے بے حد نفع بخش ہو سکتی تھیں۔ گاہک مجھے نہ صرف اچھی طرح پہچاننے لگے بلکہ دوستانہ رویئے کا اظہار کرتے اور میں بھی ان کی دیکھ بھال میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔

بار ٹینڈر اور باورچی، جو میرے خیال میں اپنے کام کے انتہائی مشاق تھے کے علاوہ گاہک بھی کبھی فرصت کے لمحات میں مجھے بہت کچھ سکھاتے رہتے۔

میں یہ جان کر بے حد حیران ہوا کہ ”ہارلم“ ہمیشہ سے کالوں کی بستی نہیں تھی۔ پہلے پہل یہ جرمن آبادی تھی پھر یورپ بھر کے غریب، بھوکے اور مفلوک الحال مہاجرین بڑی تعداد میں یہاں آباد ہونے لگے۔ لیکن جرمن چونکہ پہلے آئے تھے اس لیے وہ آبادی پر غالب رہے۔ پھر آلوئوں کے قحط سے ڈرکر آئرش یہاں آئے تو جرمنوں کو بھاگتے بنی

اور آئرش ہارلم پر قابض ہوگئے۔ ان کے بعد اطالوی آئے تو انہوں نے آئرش قوم کو نکال باہر کیا۔ اطالویوں کے بعد یہودی آئے اور اطالوی چلے گئے۔

اب ان تمام اقوام کے مہاجرین کی اولادیں ان کالوں سے جنہوں نے ان کا سامان ہارلم تک ڈھویا تھا ہارلم بچانے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھیں۔

مجھے ایک پرانے باسی نے بتایا کہ جب یہاں اقوام کا میوزیکل چیئر ہو رہا تھا اس سے بھی بہت پہلے تقریباً 1683ء سے کالے نیویارک کی کچی بستیوں میں رہ رہے تھے۔ وہ پہلے پہل وال سٹریٹ کے علاقہ میں مقیم تھے پھر انہیں گرین وچ ویلج میں دھکیل دیا گیا۔ وہاں سے انہیں پنسلوینیا اسٹیشن کی طرف ہانک دیا گیا اور پھر ہارلم سے ایک سٹاپ پیچھے ففٹی سیکنڈ سٹریٹ میں کالوں کی آبادی رہی جس کی وجہ سے اس کا نام سونگ سٹریٹ(Swing Street) پڑا جو کالوں کے جانے کے بعد بھی اس کی وجہ شہرت رہا۔

1910ء میں کسی نہ کسی طرح ایک کالے رئیس اسٹیٹ ایجنٹ کی مدد سے دو تین سیاہ فام خاندان ایک یہودی کے گھر میں رہائش حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہودی کو وہ گھر چھوڑنا پڑا اور پھر وہ پورا بلاک ہی اور مزید سیاہ فام یہودیوں کے چھوڑے ہوئے گھروں میں آباد ہوتے چلے گئے اور پھر ایک وقت آیا کہ پورے ہارلم سے یہودیوں کو بستر لپیٹنا پڑا اور بہت کم وقت میں ہارلم پورا کا پورا سیاہ فام باشندوں سے آباد ہوگیا اور آج تک چلا آتا ہے۔

1920ء میں میوزک اور انٹرٹینمنٹ ہارلم کی صنعت کے طور پر ابھرنا شروع ہوئے جسے اردگرد کے گوروں کی سرپرستی حاصل تھی جو ہر رات ہارلم میں آتے تھے اور یہ سب کچھ اس وقت شروع ہوا جب نیو اور لینز سے لوئی ساچمو آرمسٹرانگ نامی آدمی نیویارک پہنچا اور فلیچر ہینڈرسن کے بینڈ میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ 1925ء میں سمال پیراڈائیز کھل چکا تھا 1926ء میں کاٹن کلب نے اپنا آغاز کیا جہاں ڈیوک ایلنگٹن نے اگلے پانچ سال تک اپنا جادو جگایا۔ 1926ء ہی میں سوائے بال روم کھلا جس کے ڈانس فلور پر ایک سو آدمیوں کے ناچنے کی گنجائش تھی۔

ہارلم کی شہرت اتنی پھیلی کہ رات کے وقت یہاں دنیا بھر کے گورے جوق درجوق پہنچتے سیاحوں کی بسیں آنے لگیں۔ کاٹن کلب صرف گوروں کے لیے تھا اور دیگر کئی کلب صرف گوروں کی خدمت کرتے تھے کونیزان، لی نوکس کلب، سیرنز، دی نیسٹ کلب، جمی چکن شیک اور منٹنز چند بہت مشہور کلب تھے جبکہ سوائے، دی گولڈن گیٹ اور ری نائیسانس میں ہمیشہ گاہکوں کی بھیڑ رہتی۔ دی سوائے والوں نے نت نئی دلچسپیاں متعارف کروائی۔ مثلاً تھرسڈے

کچن مکانکس نائٹس اور بیدنگ بیوٹی کونٹیسٹس جہاں ہر ہفتے کی رات ایک نئ کار انعام دی جاتی تھی ملک بھر کے بہترین بینڈز اپنے فن کا مظاہرہ کرنے یہاں آتے تھے۔

بہت جلد کالوں کی اس بستی میں گورے، دلال، طوائفیں، چل پھر کر سودا فروخت کرنے والے پولیس اور خفیہ اداروں کے ایجنٹوں کی بھرمار ہوگئی۔ کالے اس قدر جوش و خروش سے ناچتے کہ لگتا کہ اس سے قبل انہیں کبھی کہیں ناچنے کا موقع نہیں ملا۔ مجھے کئی شوقینوں نے بتایا کہ "سیوائے" میں انہوں نے زندگی کا پہلا "لنڈی ھوپ" رقص کیا جس کا آغاز 1927ء میں "لنڈ برگ" نے کیا تھا جو بعد میں فرانس چلا گیا۔ ایسے چھوٹے چھوٹے شراب خانے جن میں صرف پیانو رکھنے کی جگہ تھی ان میں بھی جیمز پی جانسن اور جیلی رول مورٹن جیسے کی بورڈ ماہر اور ایتھل واٹرز جیسے بڑے فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ صبح چار بجے جب تمام قانونی کلب بند ہو جاتے تھے تو سارے قصبے کے گورے اور سیاہ فام موسیقار ہارلم میں پہلے سے طے شدہ ایک خاص جگہ پر اکٹھے ہوتے اور اگلی صبح تک ملکر خوب ہنگامہ اور تفریح کرتے۔ جب1929ء میں سٹاک مارکیٹ کا کریش ہوا تو یہ ساری رونقیں ختم ہوگئیں۔ تب تک ہارلم پوری دنیا میں امریکی قصبہ (Americas' Casbah) کے طور پر مشہور ہو چکا تھا۔

میں ہر وقت اپنے گاہکوں سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کے لیے تیار رہتا جو وہ کبھی اعتماد کی وجہ سے اور کبھی نشے کی زیادتی سے سکھاتے رہتے۔ وہ مجھے دلالی منشیات کی فروخت اور ہر قسم کی چوری بشمول مسلح ڈکیتی کے متعلق گر بتاتے۔

!

باب:6

ڈیٹرائٹ ریڈ

ہر روز میں مختلف نمبروں پر جوا کھیلتا جس کی زیادہ سے زیادہ حد پندرہ سے بیس ڈالر تھی اس امید پر کہ ایک دن میں بہت بڑی رقم جیت لونگا۔ میں نے بہت سے لوگ دیکھے جو اچھا ہاتھ پڑنے پر خوشی سے دیوانے دیکھائی دیتے تھے۔ وہ عام سے لوگ ہوتے جو عموماً بڑے شراب خانوں میں نظر نہیں آتے جو اپنی گزر بسر کسی گورے کی ملازمت کر کے کرتے تھے۔ جیتنے کے بعد وہ بہترین کیڈیلک میں نظر آتے اور تین چار دن تک اپنے دوستوں کو مشروبات اور کھانے کی دعوتیں دیتے۔ میں ان کے لیے میزیں لگاتا اور جب بھی ٹرے لے کر ان کی میز پر جاتا تو مجھے دو تین ڈالر بخشش مل جاتی۔

ہزاروں سینکڑوں کالے سوائے اتوار کے ہر روز ایک پینی سے لیکر تین ہندسوں والی رقموں تک جوا کھیلتے۔

جوئے کا بھائو ایک چھ تھا اگر آپ ایک پینی کا جوا جیتتے تو آپ کو چھ ڈالر ملتے اور ایک ڈالر پر چھ سو ڈالر جبکہ پندرہ ڈالر کی جیت کا مطلب نوے ہزار ڈالر ہوتا۔ جیتنے کا امکان ہزار میں سے ایک ہوتا تھا بہت سارے کھلاڑی کسی تین ہندسوں والے نمبر کی تمام ممکنہ کمبینیشن پر جوا کھیلتے۔ مثلاً 840 نمبر کے ممکنہ کمبینیشنز 048,804,840,408,084 اور 480 ہو سکتے تھے، غربت کی ماری ہارلم کی کچی بستی کا ہر کالا ہر روز جوا کھیلتا تھا۔ تقریباً روز کوئی نہ کوئی جاننے والا جوا جیتتا تو سارے میں خبر پھیل جاتی اور اگر جیت کی رقم بڑی ہوتی تو پورے ہارلم میں سنسنی دوڑ جاتی۔ عام طور پر لوگ ایک ڈالر یومیہ کا جوا کھیلتے تھے۔ جیت کی رقم میں سے جوا کروانے والے کی 10٪ بخشش ادا کرنا ضروری تھا اور ہر جوا خانے میں لگ بھگ پچاس آدمی مالک کی زیر نگرانی جوا کروا رہے ہوتے۔ مالک کو جوئے کے کمیشن میں سے 5٪ ملتا تھا جو وہ بنک میں جمع کروا دیتا تھا۔ بنک یہ رقم کچھ تو پولیس کو ادا کرتے تھے باقی جواریوں ہی کو سود پر قرض دے دیتے تھے اور اس طرح اپنی خوشحالی میں اضافہ کرتے چلے جاتے۔ لوگ عجیب عجیب نمبروں پر جوا کھیلتے۔ کسی

گزرتی ہوئی کار کے نمبر پر کسی خط تار یا دھوبی کی رسید کے نمبر پر۔ غرض کسی بھی نمبر پر بازار میں ایک ڈالر مالیت کی ایسی کتابیں ملتی تھیں جو آپ کو بتاتی تھیں کہ کس خواب کا مطلب کس نمبر پر جواء کھیلنا ہے۔ ان کتابوں کو ڈریم بکس کہا جاتا تھا سادھو، مجذوب اور دیوانے نذرانہ لیکر جوئے میں کامیابی کے لیے دعا بھی کرتے تھے۔ حال ہی میں پوسٹ آفس کے نئے ذپ کوڈ کے آخری تین ہندسوں پر ایک جواری کو بہت بڑی کامیابی ملی جس سے ایک بینکر کا بھٹہ ہی بیٹھ گیا۔

سمال پیراڈائز کا ہر دن میرے لیے حیران کن تھا اور ہارلم کے نقطہ نظر سے مجھے اس سے بڑا تعلیمی ادارہ نہیں مل سکتا تھا۔ نیویارک کے چند بہترین ہسلرز مجھے پسند کرنے لگے تھے اور میری اصلاح کی ہمہ وقت کوشش میں رہتے۔ ایک روز ایک سیاہ فام کاروباری مجھ سے کہنے لگا ”ریڈ ایک لمحہ ٹھہرو“ وہ میرے قریب آیا اور فیتہ نکال کر میری پیمائش لینے لگا۔ اگلی سہ پہر جب میں کام پر آیا تو ایک بار ٹینڈر نے مجھے ایک پیکٹ دیا جس میں گہرے نیلے رنگ کا قیمتی سوٹ تھا۔ تحفے سے اس کے خلوص کے علاوہ ایک پیغام بھی واضح تھا۔

بارٹینڈر نے مجھے بتایا کہ ”یہ کاہک چالیس چوروں کے مشہور گروہ کے بڑوں میں سے ایک ہے“ یہ ایک منظم گروہ تھا جو آپ کے حکم پر ایک دن میں کسی بھی قسم کے کپڑے کا سوٹ مہیا کر سکتا تھا اور بھی بازار سے ایک تہائی قیمت پر۔

مجھے ان کے طریقہ کار کا بعد میں علم ہوا۔ ہوتا یوں تھا کہ گینگ کا کوئی خوش لباس رکن جس پر کسی کو شک نہ ہو، کسی مہنگی دکان میں دکان بند ہونے سے ذرا پہلے داخل ہو کر کہیں چھپ جاتا، ایسی وارداتوں میں پولیس گشت کے اوقات کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا۔ رات گئے وہ سلے سلائے قیمتی سوٹ تھیلوں میں بھرتا، برگلر الارم منقطع کرتا دکان کے فون سے اپنے ٹرک ڈرائیور کو فون کرتا اور سارا سامان ٹرک پر لاد کر یہ یہ جا وہ جا۔ اس گینگ کے بہت سے ارکان بعد میں میرے دوست بنے۔

سادہ کپڑوں والے سرکاری مخبروں کو میں بہت جلد پہچاننے لگا کیونکہ علاقے میں اچکوں اور لفنگوں کی بہتات کی وجہ سے سرکاری آدمیوں کی موجودگی بہت ضروری تھی۔ 1942ء کے آس پاس افواج کے شعبوں کے غیر سرکاری ملازم بھی معلومات اور اطلاعات کے لیے پائے جاتے تھے۔ ساحلی مزدور اکثر وہاں بندوقیں، کیمرے، خوشبوجات، گھڑیاں اور اس طرح کی چرائی ہوئی چیزیں بیچنے وہاں آتے۔ ان گورے ساحلی مزدوروں سے جو کچھ بچتا وہ کالے مزدوروں

کے ہاتھ لگتا۔ مرچنٹ بحریہ کے ملاح اکثر بیچنے کے لیے گنجا(Gunja) اور کسکا(Kisca) کے بنے ہوئے سگریٹ لاتے جو نشے کے اعتبار سے کمال ہوتے انہیں افریقہ اور ایران سے سمگل کیا جاتا تھا۔

دن کے وقت آنے والے گوروں کو بہت تکلفاتی اور کاروباری انداز سے بھگتایا جاتا جبکہ رات کے مستقل گاہکوں کو بہت تفریح اور دوستانہ ماحول مہیا ہوتا۔ سرکاری مخبروں کو جو کہ سرکاری ملازمین پر نگاہ رکھنے کے لیے وہاں آتے تھے ہر طرح سے مطمئن رکھنے کی کوشش کی جاتی۔ کسی بھی مشکوک شخص سے اس وقت تک زیادہ گفتگو نہ کی جاتی جب تک کوئی جاننے والا اس کے متعلق بے ضرر ہونے کی تصدیق نہ کر دے۔ اس ماحول کا پہلا اصول یہی تھا کہ اپنے حلقے سے باہر کسی پر اعتماد نہ کرو اور کسی کو دوست بنانے سے پہلے احتیاط کو مد نظر رکھو۔

بارٹینڈرز مستقل گاہکوں کے متعلق مجھے بتاتے رہتے کہ کون انڈر ورلڈ سے تعلق رکھتا ہے کون پولیس اور سیاستدانوں سے تعلقات رکھتا ہے کون باقاعدہ جواری ہے اور کون یونہی تکے باز۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کالے اچکوں اور کالے سپاہیوں کے درمیان آپس میں نہ لڑنے کا کوئی نادیدہ معاہدہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ دونوں کو یقین تھا کہ لڑنے کی صورت میں کسی نہ کسی کی موت یقینی ہے۔ ان کالے سپاہیوں میں کچھ انتہائی بدتمیز اور خود سر سپاہی بھی ہوتے تھے۔ ان میں سب سے برابر سبن نامی ویسٹ انڈین کالا تھا۔ ہارلم کے باسی اس کا راستہ کاٹنے سے احتیاط برتتے تھے۔ جب میں جیل میں تھا تو مجھے پتہ چلا کہ ایک نوجوان لڑکے نے جو بر سبن کے نام اور کام سے واقف نہیں تھا ایک روز اس سے خوفزدہ ہو کر اسے گولی مار دی۔

دنیا کے سب سے انوکھے دلال کا نام کیڈیلک ڈریک تھا۔ اس کا سر بالکل گنجا اور فٹ بال کی طرح گول تھا۔ اس کے پاس درجن بھر طوائفیں تھیں شام کے وقت کئی پرانے گاہک اس کا مذاق اڑاتے کہ اتنی بھدی طوائفیں اس کا پیٹ تو کجا اپنا پیٹ بھی نہیں بھر پاتی ہونگی۔ وہ جواباً قہقہہ لگاتا اور کہتا "بھدی عورتیں زیادہ محنتی ہوتی ہیں۔"

کیڈیلک کے بالکل برعکس نوجوان مہذب اور خود مختار دلال "سیمی" دلال تھا۔ وہ کاروبار کے لیے ڈانس ہال میں ناچنے والی لڑکیوں کے تاثرات دیکھ کر ان کا انتخاب کرتا۔ بعد میں سیمی اور میں بہت گہرے دوست بنے وہ بہت سمجھ دار اور ٹھنڈے مزاج کا مالک تھا اور کیڈیلک کی طرح وہ گوری اور کالی دونوں طرح کی عورتوں سے کاروبار کرتا تھا۔ لیکن سیمی کی عورتیں جو کبھی کبھی "سمالز" میں آتی تھیں وہ اتنی خوبصورت ہوتیں جتنا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس کی سب سے مشہور طوائف "ایلاء باباپیچ" نامی گوری عورت تھی وہ گوروں اور کالوں میں یکساں مقبول تھی۔ دو گلاس شراب کے بدلے وہ کسی کو بھی اپنی زندگی کی کہانی سنا دیتی کہ کس طرح شروع ہی سے اسے کالوں سے نفرت کی تربیت

دی گئی تھی لیکن بعد میں سکول میں بڑی عمر کی لڑکیوں نے اسے کالوں کی جنسی صلاحیتوں کے بارے میں ایسی دلچسپ کہانیاں سنائیں کہ اس کی نفرت تجسس میں بدل گئی۔ بالآخر اپنے ہی گھر میں جب دوسرے لوگ کہیں گئے ہوئے تھے تو اس نے ایک کالے کو راغب کرنے کی کوشش کی اور بصورت دیگر اس پر عزت لوٹنے کا الزام لگانے کی دھمکی دی۔ وہ کالا اس کے والد کا ملازم تھا جو ڈر کر نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔ سکول کی مدت ختم ہونے تک وہ بہت سے کالوں سے تعلقات قائم کر چکی تھی پھر کسی طرح وہ نیویارک آئی اور سیدھی ہارلم پہنچ گئی۔ ایک روز وہ سوائے میں کھڑی صرف رقص دیکھ رہی تھی کہ سیمی کی تیز نگاہ نے اسے شناخت کرلیا اور سیمی کے ہاتھ لگنے کے بعد اس کے سارے مسائل حل ہوگئے۔ وہ ہمیشہ کالے گاہکوں کو پسند کرتی تھی اس کا مقولہ تھا ”جتنے زیادہ اتنے اچھے۔“

اسی طرح ڈالر بل نامی دلال تھا ایک ”فیوکلا تھس“ نامی جیب کترا تھا جو رات کو گوروں کی جیب صاف کرتا تھا۔ بعد میں اسے گٹھیا کا مرض ہوگیا اور وہ شام کے وقت بار میں آ کر گاہکوں کو اپنے اچھے دنوں کے قصے سناتا جس سے خوش ہو کر گاہک اس کے کھانے پینے کا انتظام کر دیتے لیکن اس نے کبھی کسی سے بھیک نہیں مانگی تھی۔

کاش آپ نے ان دنوں اسے دیکھا ہوتا وہ ایک معزز شخص کی طرح مینیو پڑھتا اور آرڈر دیتا اور جب باورچی کو پتہ چلا کہ کھانا فیوکلا تھس کے لیے جانا ہے تو اس کے لیے خصوصی بہترین کھانا مہیا کیا جاتا اور میں اسے ایسے سرو کرتا جیسے وہ ایک کروڑ پتی ہے۔ ہم سب کالے سفید فام امریکہ کے سماجی نظام کا شکار تھے اور لاشعوری طور پر تحفظ دوستی اور سکون کے لیے ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نوجوان بھیڑیے جو اپنا شکار مار سکتے تھے ایک بوڑھے اور معذور بھیڑیے کے کھانے کا خیال بھی رکھتے تھے۔

اسی طرح جمپ سٹیڈی نامی ایک چور تھا جو باقاعدگی سے سمالز میں آتا تھا۔ اس سے ہم نے یہ سبق سیکھا کہ زندگی ماضی یا مستقبل کا نام نہیں بلکہ حال میں زندہ رہنے کا نام ہے اسے "Jump Steady" اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ گوروں کے رہائشی علاقے میں چھتیں پھلانگتا پاؤں کے انگوٹھوں سے بالائی منزلوں کی کھڑکیوں اور منڈیروں پر رینگتا ان کے کمروں میں داخل ہو جاتا۔ اگر وہ ایک بار بھی پھسل جاتا تو موقع پر مارا جاتا۔ وہ اتنا ماہر تھا کہ جب وہ ایک کمرے میں چوری کر رہا ہوتا تو ساتھ والے کمرے میں موجود لوگوں کو خبر بھی نہ ہوتی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایسے موقع پر اپنے آپ کو چست رکھنے کے لیے نشہ استعمال کرتا تھا اس نے مجھے کچھ ایسے گر سکھائے جو بعد کے سالوں میں جب میں نے اپنا چوری کا گروہ بنایا تو میرے بہت کام آئے۔

ایک بات پہ میں زور دوں گا کہ مندرجہ بالا گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ مت کیجیئے گا کہ "سمالز" مجرموں کا گڑھ تھا۔ اچکوں کا ذرا زیادہ ذکر صرف اس لیے ہوگیا کیونکہ میں خود ان سے بہت متاثر تھا ورنہ غالباً "سمالز" واحد جگہ تھی جسے نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ گوروں کے لیے محفوظ قرار دیتا تھا۔

ریل روڈ چھوڑنے کے بعد میں نے اپنا پہلا کمرہ800 بلاک سینٹ نکولس ایوینیو میں لیا۔ یہ بہت سے کمروں پر مشتمل بڑی عمارت تھی جس کے کمروں سے آپ کو فرکوٹ، قیمتی کیمرے، عمدہ خوشبوجات سے لے کر عورت اور مہنگی کار تک سب کچھ مل جاتا تھا یعنی کہ گرم برف(Hot Ice) بھی۔ اس عمارت میں مرد کرایہ دار بہت کم تھے زیادہ عورتیں تھیں جو عصمت فروشی کرتی تھیں جبکہ مرد اقلیت اچکوں منشیات فروشوں اور جواریوں پر مشتمل تھی اور میرے خیال میں اس عمارت کا ہر مکین کسی نہ کسی نشہ کا استعمال ضرور کرتا تھا اور یہ صرف اس عمارت کی بات ہی نہیں تھی ہارلم کا ہر باسی زندہ رہنے اور زندگی کی جنگ لڑتے رہنے کے لیے کسی نہ کسی نشے کے استعمال پر مجبور تھا۔

اس عمارت میں رہ کر میں نے عورتوں کے متعلق بہت کچھ سیکھا۔ ان پیشہ ور طوائفوں نے مجھے وہ باتیں سکھائیں جن کا ہر بیوی اور شوہر کو ضرور علم ہونا چاہیے۔ بعد کی زندگی میں طوائفوں سے زیادہ "شریف عورتوں" نے مجھے گمراہ کیا۔ طوائفوں کے مابین بہرحال ایک ضابطۂ اخلاق اور بہناپا ہوتا ہے۔ لیکن بہت سی "پارسا" عورتیں ان طوائفوں سے بھی بدتر نکلیں۔ جتنے مرد یہ طوائفیں پیسے لیکر بھگتاتیں اس سے کئی زیادہ شریف عورتیں بغیر پیسوں کے بھگتا لیتی تھیں میں کالی اور گوری دونوں عورتوں کی بات کر رہا ہوں۔ ان عورتوں کے شوہر سمندر پار جنگ لڑ رہے تھے اور ادھر یہ دوسرے مردوں سے اپنے بستر گرم کر رہی تھیں بلکہ اپنے شوہروں کی خون پسینے کی کمائی بھی ان پر لٹا رہی تھیں اور یہی نہیں بہت سی عورتیں جو کہ بظاہر مائیں اور بیویاں تھیں کہیں زیادہ بدتر طوائفی میں مصروف تھیں اپنے شوہروں اور بچوں کے نیویارک میں ہوتے ہوئے بھی۔

گوروں کی انڈر ورلڈ اخلاقیات کے بارے میں میرا پہلا سکول گوری عورتیں تھیں۔ جوں جوں میں اس گناہ کی زندگی میں اترتا گیا توں توں میں گوروں کے اخلاقی حالت سے زیادہ آگاہ ہوتا گیا بلکہ بعد میں تو میں گوروں کی "ضرورتیں" پوری کرکے بھی اپنی گزر اوقات کرتا رہا۔

میں نوجوان تھا بار میں ملازم تھا اور مجھے ان عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور غالباً وہ بھی مجھے چھوٹے بھائیوں کے جیسا سمجھتی تھیں۔ کبھی کبھار جب وہ فارغ ہوتیں تو میرے کمرے میں آ جاتیں نشے والے سگریٹ Reefer پیش کرتیں اور مجھ سے باتیں کرتیں ایسا عام طور پر صبح کی بھیڑ کے بعد ہوتا۔

رات کے وقت تو گورے اور کالے گاہکوں کی بھیڑ معمول کا حصہ تھی لیکن جس بھیڑ سے مجھے حیرانی ہوتی وہ صبح 6 بجے سے 7:30 بجے تک گاہکوں کا ہلہ ہوتا اور پھر تقریباً9 بجے تک میں گھر میں بالکل اکیلا رہ جاتا۔

یہ تمام وہ شوہر ہوتے جو دفتر جانے سے قبل یہاں آتے تھے۔ بعض گورے شہر کے مرکزی علاقے سے ٹیکسی لیکر بھی یہاں پہنچتے تھے۔ یہ ان بیویوں سے تنگ آئے ہوئے شوہر تھے جو حاکمانہ مزاج نت نئے تقاضوں اور شکایتوں سے اپنے شوہروں کو نفسیاتی طور پر نامرد بنا دیتی تھیں اور انہیں مجبوراً طوائفوں کے پاس پناہ لینا پڑتی۔ طوائفوں کا کہنا تھا کہ جوانی کے بیس سال گزارنے کے بعد مرد عام طور پر عورت سے صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے قربت چاہتا ہے۔ چونکہ بہت ساری عورتیں یہ بات نہیں سمجھتیں جس سے مردوں کی انا مجروح ہوتی ہے مرد میں ”مردانگی“ چاہے کتنی بھی کم ہو طوائف اسے یقین دلاتی ہے کہ وہ دنیا کا بہترین مرد ہے۔ اگر بہت سی بیویاں یہ بات سمجھ لیں کہ مرد کو مرد کہلوانا سب سے زیادہ پسند ہے تو بہت سے گھر خراب ہونے سے بچ سکتے ہیں۔

وہ عورتیں مجھے بہت کچھ بتاتیں۔ کالے اور گوروں کے درمیان فرق کی دلچسپ کہانیاں اور گاہکوں کی عجیب و غریب عادات گاہکوں کو تسکین طبع کے ساتھ ساتھ طوائفوں کے خیالات و احساسات جاننے کا بہت شوق ہوتا۔ یہ بات بھی مجھے ایک طوائف نے ہی بتائی کہ عورت کتنی بھی سخت ہو وہ اندر سے ہمیشہ نازک اور کمزور ہوتی ہے۔

کبھی کبھی صوفیہ بوسٹن سے آ جاتی اس کی شخصیت ہارلم کے دوسرے کالوں میں مجھے ممتاز کر دیتی۔ کالا کہیں کا بھی ہو آپ ایک گوری عورت اس کے قریب کھڑی کر دیں تو وہ فوراً کھل اٹھے گا۔ اسی طرح کالی عورت کو دیکھ کر گوروں کی آنکھ میں بھی چمک آتی ہے لیکن وہ اتنا ہوشیار ہے کہ اسے ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

صوفیہ عام طور پر سہ پہر کی ٹرین سے سیدھی سالز میں آ جاتی میں اس کا تعارف کرواتا اور چھٹی لے لیتا، وہ میرا طوائفوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی تھی لیکن جب میں نے اسے ایک دو طوائفوں سے ملوایا انہوں نے آپس میں گفتگو کی تو صوفیہ نے مجھ سے کہا کہ وہ تو بہت اچھی عورتیں ہیں۔ ہم دونوں بریڈک ہوٹل بار میں چلے جاتے وہاں اپنے موسیقار دوستوں سے ملتا وہ صوفیہ کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ”ہائے ریڈ! یہ ہمارا مہمان کون ہے؟“ مجھے کبھی صوفیہ کے لیے ایک گلاس بھی نہیں خریدنا پڑا کیونکہ شاید کالے موسیقاروں سے زیادہ گوری عورت کا پرستار دنیا میں اور کوئی کالا نہ ہو۔ شوبز کی دنیا کے لوگ عام لوگوں کے برعکس عموماً کم متعصب ہوتے ہیں۔

جب رات کو شہر کے مرکزی نائٹ کلبز بند ہو جاتے تو ہارلم گوروں سے بھر جاتا۔ یہ وہ گورے تھے جن کی روح سیاہ فام تھی اور وہ کالوں کو دیکھ کر مسحور ہو جاتے تھے۔ صرف ایک بات ایسی تھی جو گوروں کی برداشت سے باہر تھی یعنی کسی گوری کو کسی کالے کے ساتھ قریبی تعلق قائم کرتے دیکھنا۔ ہارلم میں کچھ نوجوان گورے بھی آتے تھے جن کو ہم "ہپیز" کہتے تھے۔ وہ ہم کالوں سے بھی زیادہ کالوں کے طرف دار تھے۔ ان میں سے ایک تو ایسا تھا کہ ذرا سا بھی نسلی فرق کرنے پر مرنے کٹنے پر تیار ہو جاتا تھا۔ وہ ہر وقت ہمارے قریب رہنے کی کوشش کرتا۔ ہماری طرح زوٹ سوٹ پہنتا۔ بالوں میں بہت زیادہ چکنائی لگاتا تاکہ بال کونک نظر آئیں گلے میں لمبی زنجیر پہنتا غرض ہر چیز وہ کبھی کالی عورت کے علاوہ کسی کے ساتھ نظر نہیں آتا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں دو کالی عورتوں کے ساتھ رہتا تھا پتہ نہیں وہ کیسے گزارہ کرتے تھے سیمی اس سے خواہ مخواہ چڑتا تھا۔ ایک روز صبح 3 یا 4 بجے میری اور صوفیہ کی ملاقات اس سے ہوئی وہ میری جوانا کے نشہ کی وجہ سے چہک رہا تھا۔ میں نے صوفیہ سے اس کو متعارف کروایا اور کچھ لمحوں کے لیے ایک دوسرے شخص سے ملنے گیا۔ جب میں واپس آیا تو صوفیہ کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ "کہ تم جیسی سفید فام اس کالے کے ساتھ کیوں اپنی زندگی برباد کر رہی ہے" "کرے اول بل" جونیو اور لنیز کا رہنے والا تھا میرا دوسرا اچھا دوست بنا۔ سمالز چھوڑنے کے بعد میں اس کے ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ یہ ہوٹل "کرے اول بل" نے اپنے گھر میں ہی بنا رکھا تھا لیکن ماحول اور خوراک کے معیار سے یہ ہارلم میں بہترین تھا۔ وہاں ہلکی موسیقی بجتی رہتی تھی ہر طرح کے مشروبات میسر تھے۔ بل کی سیاہ فام دوست اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ اگر بھیڑ زیادہ ہو جاتی تو بل کھانے کے برتن باہر لے آتا اور اپنی دوست جسے وہ پیار سے "براؤن شوگر" کہتا تھا، کے ساتھ گاہکوں کو ان کی میز پر جا کر ان کو پلیٹیں بھر بھر کر دیتا اور خود بھی گاہکوں کے درمیان بیٹھ کر کھانا کھاتا اس کے گاہک ہی نہیں وہ خود بھی اپنی پکائی کا شوقین تھا۔ وہ بیس بال کا پرستار تھا اور ہوٹل کی دیواروں پر میجر لیگ کے بڑے بڑے کھلاڑیوں کی دستخط شدہ تصاویر آویزاں تھیں۔ اس کے علاوہ ان مشہور سیاسی اور شوبز کی شخصیات کی تصاویر بھی آویزاں تھیں جو وہاں کھانا کھا چکے تھے۔

ایک بار میں نے صوفیہ کو بوسٹن میں فون کیا اس نے بتایا کہ وہ اگلے ہفتے تک فارغ نہیں ہے حال ہی میں اس کی ایک خوشحال گورے سے شادی ہوئی تھی جو کہ ملازمت پیشہ تھا اور چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا۔ صوفیہ میرے ساتھ تعلقات کو برقرار رکھنا چاہتی تھی جس پر مجھے بھی اعتراض نہ تھا میں سیمی کا شکر گزار تھا کہ اس نے مجھے کالے مرد اور گوری عورت کی نفسیات کے بارے میں پہلے ہی سے اچھی طرح بتا رکھا تھا اور میں صوفیہ کی شادی کے متعلق ذہنی طور پر مکمل تیار تھا۔ سیمی نے مجھے بتایا کہ سفید فام عورت بہت عملی ہوتی ہے وہ جانتی ہے کہ معاشرے میں سیاہ

فام کی کوئی حیثیت نہیں۔ گورا کالوں کو اپنی ایڑی کے نیچے دبا کر رکھتا ہے جبکہ سیاہ فام عورت آسائش پسند ہے اسے اپنے ہم نسل گوروں کی توجہ اچھی لگتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ "لطف" بھی چاہتی ہے۔ ان میں سے بعض عورتیں گورے مردوں سے صرف سہولت اور تحفظ کے لیے شادی کرتیں ہیں ضروری نہیں کہ انہیں کسی کالے سے محبت ہی ہو اسے صرف اپنی خواہش سے محبت ہوتی ہے۔ "ممنوعہ خواہش" سے۔

اگر ایک گورا سالانہ 40,30,20 یا 50 ہزار ڈالر کمائے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی کالا سالانہ 5 ہزار ڈالر بھی کما سکے تو یہ بہت غیر معمولی بات ہے۔

مجھے ہارلم میں رہتے ہوئے بہت زیادہ عرصہ ہوگیا تو مجھے "ریڈ" کے نک نیم سے پکارا جانے لگا وہاں میرے علاوہ بھی دو "ریڈ" تھے ایک تو "سینٹ لوئس ریڈ" تھا جو پیشہ ور مسلح ڈکیتیوں میں ملوث تھا جب میں جیل میں تھا تو وہ بھی ڈکیتی کے الزام میں سزا کاٹ رہا تھا دوسرا "شکاگو ریڈ" تھا اس سے مزاحیہ شخص پوری دنیا میں کہیں نہ ہوگا اب وہ قومی سطح کا سٹیج اور نائٹ کلب کامیڈین ہے۔ میرا نام "ڈیٹرائڈ ریڈ" رکھ دیا گیا اور یہی میری پہچان بن گیا۔ 1943ء کی ایک سہ پہر کی بات ہے کہ ایک سیاہ فام فوجی میری میزوں میں سے ایک پر بیٹھا شراب پی رہا تھا چوتھا یا پانچواں گلاس دیتے ہوئے میں میز صاف کرنے کے لیے جھکا اور اس کے کان میں آہستہ سے کہا کوئی عورت تو نہیں چاہیے؟ مجھے پتا تھا کہ یہ سمالز پیراڈائیز کا ہی نہیں بلکہ ہر شراب خانے کا طے شدہ اصول تھا کہ سرکاری ملازموں کو غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث کرنے کی کوشش کبھی نہیں کرنی چاہیے اور نہ انہیں ہاتھ کی صفائی دکھانے کی کوشش کرنی چاہیے ان باتوں سے کئی بار مسائل کھڑے ہو چکے تھے۔ کچھ لوگوں کو فوج نے علاقے سے نکال دیا تھا اور کچھ کے ریاستی یا شہری لائسنس ضبط ہو چکے تھے۔

اس فوجی نے میری پیشکش پر شکریہ کا اظہار کیا جس کے جواب میں میں نے اسے اپنی بہترین دوست طوائف کا فون نمبر دیا وہ فوج کا جاسوس تھا۔

مجھے گڑبڑ کا احساس تب ہوا جب وہ شخص مجوزہ طوائف تک نہیں پہنچا میں علم ہوتے ہی سیدھا چارلی کے دفتر پہنچ گیا۔ چارلی میں کچھ کر بیٹھا ہوں میں نے کہا "پتہ نہیں میں نے سب کیوں کیا؟"

اور اسے سب کچھ بتا دیا۔ چارلی نے میری طرف دیکھا "کاش تم یہ سب نہ کرتے ریڈ۔"

جب سادہ کپڑوں و الا ویسٹ انڈین مخبر ”جوبیکر“ آیا تو میں اس انتظار کر رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ جب ہم th Street135 کے تھانے پہنچے تو مجھے چند دیگر مخبروں نے بھی پہچان لیا۔ دو باتیں میری حمایت میں جاتی تھیں پہلی یہ کہ پولیس کو آج تک مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ دوسری یہ کہ جب ”جوبیکر“ نے مجھے ”ٹپ“ دی تھی میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ میں یہ صرف ہمدردی میں کر رہا ہوں۔

غالباً انہوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے صرف دھمکا کر چھوڑ دیا جائے ”جوبیکر“ مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ساتھ کے کمرے میں کسی دلال کی دھنائی ہو رہی تھی اور اس کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ (بعد میں جوبیکر نیوجرسی میں ایک دلال اور طوائف کو ہراساں کرنے کے الزام میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا)

مجھے ”سمالز“ سے نہ صرف نکال دیا گیا بلکہ داخلے پر پابندی بھی لگا دی گئی کیونکہ میں زیرِ نگرانی تھا اور سمال برادران کو اپنا کاروبار عزیز تھا۔

ان بُرے حالات میں ”سیمی“ میرا حقیقی دوست ثابت ہوا۔ اس نے مجھے اپنے پاس بلا لیا اور نئے دھندے کا فیصلہ کرنے سے قبل اس نے مجھے میری زندگی کے بہترین ”میری جوآنا“ پلائے۔

نمبروں کے دھندے میں آمدنی نہیں تھی۔ دلالی میرے بس کا کام نہیں تھا مجھے شک تھا کہ طوائفیں ڈھونڈتا ہوا فاقوں سے مر جائوں گا۔ بالآخر اتفاق رائے سے میں نے ”ری فرز“ (نشہ بھرے سگریٹس) بیچنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس میں تجربہ ضروری نہیں تھا اور آمدنی معقول تھی، سیمی اور میں چند ایسے افراد سے وابستہ تھے جو کچی میری جوآنا مہیا کر سکتے تھے۔ ان ری فرز کے سب سے بڑے اور مستقل گاہک موسیقی کے شعبہ سے وابستہ افراد تھے جن میں اکثر میرے دوست تھے۔ وہ زیادہ سخت نشہ بھی استعمال کرتے تھے۔ میں نے بعد میں وہ بھی مہیا کرنے کا ارادہ کیا گو اس میں خطرہ زیادہ تھا لیکن آمدنی بھی زیادہ تھی۔ ہیروئن اور کوکین کی فروخت سے سو ڈالر یومیہ تک آمدن ہو سکتی تھی لیکن اس کے لیے تجربہ اور تعلقات کا ہونا بے حد ضروری تھا۔

میں اپنے تجربہ کی بنیاد پر روز کے مخبروں اور سپاہیوں کو تو پہچان لیتا تھا مگر منشیات والوں کی پہچان مجھے نہیں تھی۔ کچھ مخبروں اور پولیس والوں سے میرے رابطے تو تھے لیکن اوپر تک میری رسائی نہیں تھی۔ سرِدست سیمی نے مجھے پچیس ڈالر دھندے میں لگانے کے لیے دیئے۔

بعد میں اسی شام میں نے اس کی رقم اسے لوٹا دی اور کہا کہ اگر وہ چاہے تو میں کچھ رقم اسے ادھار بھی دے سکتا ہوں۔ ہوا یوں کہ میں سیمی سے رقم لے کر اس کے بتائے ہوئے سپلائر کے پاس گیا۔ اور "میری جوآنا" خریدی، کاغذ لے کر ان میں میری جوآنا رکھ کر لپیٹی اور ماچس کی تیلیوں جیسی پتلی سلائیاں بنا لیں۔ ان سے مجھے کافی کمائی ہوئی۔ "بریڈ ڈوک" ہوٹل کے موسیقاروں کو سلائیاں بیچ کر میرے پاس اتنی رقم ہو گئی تھی کہ میں قرض ادا کر کے بھی کافی منافع میں رہا۔ موسیقار دوست مجھے دیکھ کر کھل اُٹھتے تھے۔

ہر بینڈ میں تقریباً نصف فن کار یہ "ری فرز" پیتے تھے۔ میں نام نہیں بتاؤں گا مگر ان میں وقت کے مشہور فن کار شامل تھے جن میں سے کچھ آج بھی مقبول ہیں۔ ان میں سے ایک فن کار مرغ کی ٹانگ کی ہڈی میں میری جوآنا بھر کر پیتا تھا۔

میرا منافع روز بروز بڑھتا گیا۔ میں اندھا دھند ری فرز بیچتا تھا مجھے سونے کی فرصت بھی نہ تھی۔ جہاں موسیقار اکٹھے ہوتے میں بھی وہی پہنچ جاتا۔ میں ہر روز کے پچاس ساٹھ ڈالر کما لیتا تھا جو ان دنوں ایک سترہ سالہ سیاہ فام کے لیے بہت بڑی رقم تھی۔ مجھے ایک آزادی کا احساس ہوتا جن پر میں رشک کرتا تھا وہ اب مجھ پر رشک کرتے تھے۔

انہی دنوں میں فلموں سے متعارف ہوا کبھی کبھی میں ایک دن میں پانچ پانچ فلمیں دیکھتا۔ مجھے ایکشن فلمیں بہت پسند تھی جیسے "ہمفرے بوگارڈ" کی "کاسا بلانکا" یا وہ فلمیں جن میں رقص و موسیقی ہوتی مثلاً "سٹارمی ویدر" اور "کیبن ان دی سکائی" فلموں کے بعد میں ریفرز بیچتا۔ دس ریفرز اکٹھے خریدنے والے کو دو اضافی ریفرز بھی دیتا۔ میں لک چھپ کر سگریٹ نہیں بیچتا تھا کیونکہ سارے گاہک میرے دوست تھے اکثر میں ان کے ساتھ ملکر بھی پیتا چونکہ میں اب اپنی مرضی کرنے کے لیے آزاد تھا اس لیے میں ایک روز بوسٹن چلا گیا ایلاء سے ملا اسے کچھ رقم دی۔ لانسنگ سے آتے وقت جو اس نے میری مدد کی تھی اس کے "شکریہ" کے طور پر لیکن وہ پہلے والی ایلاء نہیں تھی۔ اس نے اب تک مجھے لورا کی وجہ سے معاف نہیں کیا تھا۔ ہم دونوں نے خاندان میں آنے والی تبدیلیوں پر بات کی ولفرڈ اپنی پڑھائی میں اتنا اچھا ثابت ہوا کہ اسے ولبر فورس ہی میں بطور استاد نوکری کی پیشکش کی گئی تھی۔ ایلاء کو "ریگی نالڈ" کا کارڈ بھی آیا تھا جو مرچنٹ میرین میں چلا گیا تھا۔

شارٹی کے گھر سے میں نے صوفیہ کو فون کیا جو مجھے وہیں ملنے کے لیے آئی۔ میں اسے گھمانے باہر لے جانا چاہتا تھا لیکن شارٹی نے مجھے بتایا تھا کہ بوسٹن کے پولیس والے "Interracial" جوڑوں کو جنگ کا بہانہ بنا کر ہراساں کرتے تھے اور پھر صوفیہ کی شادی کی وجہ سے ہم زیادہ محتاط بھی تھے۔

صوفیہ کو گھر چھوڑنے کے بعد میں شارٹی کا بینڈ سننے چلا گیا۔ اب اس کا ایک بینڈ تھا اور وہ F-4 کلاسیفیکیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اس کا بینڈ مناسب ہی تھا اور چھوٹے چھوٹے کلبوں میں اپنی کارکردگی سے اچھا خاصہ کما رہا تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ میں ہم دونوں بیٹھے اگلی صبح تک باتیں کرتے رہتے۔ میں نے اسے ہارلم میں اپنی مصروفیات اور دوستوں کے بارے میں بتایا میں نے اسے سیمی دلال کے بارے میں بتایا۔

سیمی کنٹکی کا رہنے والا تھا وہاں اس نے ایک لڑکی کو حاملہ کر دیا۔ لڑکی کے والدین نے وہ ہنگامہ مچایا کہ سیمی کو بھاگ کر ہارلم میں آ کر بیرا بننا پڑا۔ ایک روز جب ایک تنہا عورت کھانا کھانے آئی اور سیمی کو پتا چلا کہ وہ نہ تو شادی شدہ ہے نہ کسی کے ساتھ رہتی ہے بلکہ مکمل تنہا ہے تو سیمی کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ اسے بہلا پھسلا کر اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچ جائے۔ وہاں جا کر سیمی نے اصرار کیا کہ وہ کھانا کسی قریبی ہوٹل سے لیکر آئے گا۔ باہر آ کر سیمی نے گھر کی چابی کی نقل بنوائی اور پھر لڑکی کی غیر موجودگی میں اس کے گھر میں داخل ہو کر ساری قیمتی اشیاء کا صفایا کر دیا۔ پھر سیمی نے اسے مدد کے طور پر کچھ رقم ادھار دی اور اسے آہستہ آہستہ جذباتی اور مالی طور پر اپنا محتاج بنا لیا حتیٰ کہ رفتہ رفتہ وہ سیمی کی حقیقی معنوں میں غلام بن کر رہ گئی۔

ہارلم میں نارکوٹکس سکوائر کے مخبروں نے بہت جلد پتا لگا لیا کہ میں ریفرز بیچتا ہوں اکثر اوقات میرا پیچھا کیا جاتا۔ بہت سارے منشیات فروش منشیات برآمد ہونے پر جیل جا چکے تھے۔ قانون کے مطابق اگر منشیات آپ کے قبضہ سے برآمد نہ ہو تو آپ کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ جوتے کی کھوکھلی ایڑی یا ہیٹ کا استر منشیات چھپانے کی پرانی جگہیں تھی۔ میں نے گرفتاری سے بچنے کے لیے ایک اور راستہ تلاش کیا۔

میں پچاس کے قریب سلائیاں پیکٹ بنا کر بغل میں دبا لیتا۔ جونہی مجھے خطرے کا احساس ہوتا میں موڑ مڑ کر، سڑک پار کر کے یا کسی دروازے میں داخل ہو کر بازو ڈھیلا چھوڑ کر پیکٹ گرا دیتا۔ رات کے وقت جو کہ میرا عمومی کاروباری وقت تھا یہ Trick کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ اگر مجھے محسوس ہوتا کہ یہ محض شک تھا تو میں جا کر دوبارہ اپنا پیکٹ اُٹھا لیتا تھا۔ اس طرح میری بہت سی سلائیاں ضائع بھی ہوئیں، لیکن اس چکمہ کی بدولت میں سزا سے بچا رہا۔

ایک صبح میں گھر آیا تو میرے کمرے میں دراندازی کے آثار نظر آئے۔ مجھے خبر تھی کہ یہ سرکاری مخبروں کی کارروائی ہے۔ اگر وہ ثبوت حاصل کرنے میں ناکام رہتے تو خودساختہ ثبوت آپ پر ڈال دیتے تھے۔ ثبوت ایسی جگہ چھپایا جاتا جو آپ کے سان گمان میں بھی نہ ہوتی۔ پھر وہ چھاپہ مار کر سب کے سامنے برآمدگی کر لیتے۔ اس صورتِ

حال میں مجھے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی میں نے اپنا تھوڑا بہت سامان سمیٹا اور پھر دوبارہ اس کمرے کا رخ نہیں کیا، اس رات میں ایک نئے کمرے میں سویا۔

انہی دنوں میں نے .25 کا آٹومیٹک پستول رکھنا شروع کر دیا۔ یہ میں نے چند ری فرز کے عوض خریدا تھا جو ایک نشے باز نے کہیں سے چرایا تھا۔ میں اسے کمر کے میں درمیان میں بیلٹ کے نیچے رکھتا تھا کیونکہ میں نے سنا تھا کہ پولیس والے معمول کی تلاشی میں اس جگہ کو نہیں تھپکتے۔ میں بھیڑ بھڑ کے والی جگہوں پر ناآشنا لوگوں کے ساتھ الجھنے سے ہمیشہ بچتا۔ نارکوٹیکس پولیس والے ایسی جگہوں پر یونہی آپ سے الجھ جاتے ہیں اور دورانِ تلاشی کچھ نہ کچھ آپ کی جیب میں ڈال دیتے ہیں۔ اسی لیے میں عموماً کھلی جگہوں پر کام کرتا تھا۔ اب مجھے یاد نہیں آتا کہ میں پستول کیوں اٹھائے پھرتا تھا۔ غالباً حفاظت خود اختیاری کے تحت تاکہ اگر کوئی مجھے پھنسانا چاہے تو میں بچ سکوں۔

میں نے ری فرز کی فروخت کافی کم کر دی کیونکہ احتیاط کا تقاضہ یہی تھا۔ ذرا سا بھی شک ہوتا تو میں کمرہ بدل لیتا۔ سوائے سیمی کے کسی کو میری رہائش کا علم نہیں ہوتا تھا۔

بہت جلد یہ بات مشہور ہو گئی کہ میں ہارلم کے نارکوٹیکس اسکواڈ کے خصوصی فہرست میں شامل ہو گیا ہوں۔ اور آئے دن وہ کہیں نہ کہیں مجھے گھیر کر تلاشی لینے لگے۔ لیکن میں فوراً اتنی بلند آواز سے کہ جسے دوسرے بھی سُن لیں کہتا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے اور میں نہیں چاہتا کہ مجھ پر کوئی ناجائز چیز ڈالی جائے۔ اس پر پولیس والے محتاط ہو جاتے کیونکہ ہارلم میں پہلے ہی قانون کو کوئی نہیں پوچھتا تھا اور پولیس مشتعل سیاہ فاموں کے کسی گروہ سے الجھنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ ہارلم کے سیاہ فاموں میں ایک تناؤ پیدا ہو رہا تھا اور محسوس ہوتا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے جو کہ جلد ہی ہو گئی۔

میرے لیے یہ سختی کے دن تھے، مجھے ری فرز چھپانے کے لیے نت نئی جگہیں ڈھونڈنا پڑتی تھیں۔ میں پانچ ری فرز کسی سگریٹ کی خالی ڈبی میں ڈال کر اسے کسی لیمپ پوسٹ یا کوڑے دان کے قریب گرا دیتا۔ گاہک سے کہتا کہ وہ پہلے پیسے ادا کرے پھر اسے بتاتا کہ کہاں سے ری فرز اٹھا لے۔ لیکن اپنے باقاعدہ گاہکوں کو اس کھکھیڑ میں نہیں ڈالتا تھا۔ میں نے کچھ ریڈ کراس کے پٹیوں والے ڈبے اکٹھے کر لیے تھے، جن کا استعمال کافی فائدہ مند رہا۔ مرکزی ہارلم کی نارکوٹکس فورس نے مجھے اتنا ہراساں کیا کہ مجھے اپنا علاقہ بدلنا پڑا اور زیریں ہارلم میں 110th Street منتقل ہو گیا۔ وہاں زیادہ نشہ باز تھے لیکن سب گھٹیا نشہ کرتے تھے یہ بدترین گھیٹو (کچی بستی) تھی جہاں غریب ترین لوگ رہتے تھے۔ وہ لوگ جو زندگی کے مسائل کو سہنے کے لیے نشے کا سہارا لینے پر مجبور تھے میں وہاں بھی زیادہ عرصہ نہیں رہا۔

وہاں میرے سرمائے کا کافی نقصان ہوا کچھ نشہ باز حیوانی جبلتوں کے مالک تھے۔ مجھ سے ریفرز خریدنے کے بعد انہوں نے میرا پیچھا کرنا شروع کر دیا اور بہت جلد میرے طریقہ کار سے واقف ہو گئے۔ میں جب بھی اپنا پیکٹ کہیں گراتا تو وہ کسی دروازے کے پیچھے سے نکلتے اور ری فرز کے پیکٹ پر ایسے جھپٹتے جیسے مکئی کے دانوں پر مرغی۔ جب آپ کسی Ghetto میں داخل ہوتے ہیں تو آپ خود بھی جانور اور گدھ بن جاتے ہیں، یہاں آ کر آپ کو صحیح معنوں میں Survival کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔

بہت جلد دوبارہ مجھے سیمی سے قرض لینے کی ضرورت پیش آ گئی۔ کبھی مجھے مال خریدنے کے لیے پیسے لینا پڑتے کبھی اپنے نشے کے لیے اور کبھی کبھی تو محض کھانا کھانے کے لیے بھی پیسے مانگنا پڑتے۔ سیمی نے مجھے ایک نیا خیال دیا کہنے لگا ”ریڈ تمہارے پاس ابتک ریل روڈ شناختی کارڈ ہے نا؟“ وہ میرے پاس تھا اور کمپنی نے اسے واپس نہیں لیا تھا۔ ”تم اسے استعمال کیوں نہیں کرتے جب تک معاملہ ٹھنڈا نہیں ہوتا کچھ دن ٹرین میں بھاگ دوڑ کر کے دیکھ لو“ وہ ٹھیک کہتا تھا تجربے نے مجھے سکھایا کہ اگر آپ ”ریل روڈ لائنز امپلائی آئڈنٹی فیکیشن کارڈ“ کنڈیکٹر کو اعتماد کے ساتھ دکھائیں تو وہ آپ کو نہ صرف ریل پر سوار ہونے کی اجازت دے دیتا تھا بلکہ آپ کو مفت سفر کی سلپ بھی دے دیتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس طرح میں ”ایسٹ کوسٹ“ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے بینڈز کے ساتھ آنے جانے والے دوستوں کو ریفرز بھی بیچوں گا۔ میرے پاس نیو ہیون کا شناختی کارڈ تھا۔ ایک دو ہفتے دوسری کمپنیوں میں کام کر کے میں نے ان کے شناختی کارڈ بھی حاصل کر لیے۔ نیویارک میں میں بڑی مقدار میں سلائیاں بناتا انہیں ایک مرتباں میں بند کرتا اور کنڈیکٹر کو قائل کرتا کہ میں اس کا ہم پیشہ ملازم ہوں اور گھر جانے کے لیے سفر کر رہا ہوں وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے سفر کی اجازت دے دیتے۔ بہت سے گورے یہ بات کبھی تسلیم نہیں کرتے کہ کسی کالے میں اتنی عقل بھی ہو سکتی ہے کہ وہ انہیں دھوکہ دے سکے۔

جس شہر میں میرے دوست اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں وہاں ریفرز فروخت کرنے پہنچ جاتا۔ آج تک کسی نے سفری منشیات فروش کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

میں کسی ایک بینڈ کے ساتھ وابستہ نہیں تھا جب میرے پاس مال ختم ہو جاتا تو میں نیویارک واپس آ جاتا اور مسلح ہو کر دوبارہ سفر پر نکل کھڑا ہوتا۔ کسی بھی اوڈی ٹوریم یا جمنازیم میں داخلے کے لیے میں چوکی دار سے کہتا کہ میں کسی فنکار کا بھائی ہوں بلکہ اکثر اوقات وہ مجھے فنکار ہی سمجھ لیتے تھے۔ میں اندر جا کر لنڈی ہوپنگ کا مظاہرہ کرتا۔ کبھی رات فنکاروں کے ساتھ ہی گزار لیتا کبھی ان کے ساتھ ہی اگلے قصبہ کو چلا جاتا کبھی تھوڑی دیر کے لیے نیویارک

واپس آ جاتا۔ معاملات ٹھنڈے پڑ چکے تھے افواہ یہی تھی کہ میں شہر چھوڑ چکا ہوں جس کی وجہ سے نارکوٹکس سکواڈ کافی مطمئن تھا۔ چھوٹے قصبوں میں لوگ بعض اوقات مجھے فنکار سمجھ کر گھیر لیتے اور آٹوگراف بھی لیتے۔

ایک روز جب میں نیویارک پہنچا تو میرا بھائی ریگی نالڈ میرا منتظر تھا۔ ایک روز پہلے اس کا مرچنٹ شپ نیو جرسی کی بندرگاہ پر پہنچا تھا۔ وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا سمالز پہنچا وہاں سے ایک بار ٹینڈر نے اسے سیمی کے پاس بھیج دیا۔ جس نے اسے مجھ سے ملوا دیا۔ اسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی چھوٹا سا بچہ ہے جو ہر وقت میرے پیچھے پیچھے پھرتا رہتا تھا۔ اب وہ تقریباً چھ فٹ لمبا تھا اس کا رنگ مجھ سے زیادہ کالا تھا آنکھیں سبزی مائل تھی اور بالوں میں ایک سفید لٹ تھی، میں نے ریگی نالڈ کو دوستوں سے ملوایا مجھے دیکھ کر بہت اچھا لگا کہ وہ اتنا سمجھدار ہوگیا ہے جتنا اس عمر میں میں نہیں تھا۔ میرے پاس اپنی رہائش تو نہ تھی لیکن کچھ پیسے تھے کچھ رقم ریگی نالڈ کے پاس تھی۔ چنانچہ ہم سینٹ نیکولس ہوٹل چلے گئے۔

ریگی نالڈ اور میں رات بھر لانسنگ میں گزرے سالوں کی اور اپنے گھر والوں کی باتیں کرتے رہے میں نے اسے ماں اور والد کے متعلق بتایا جو اسے کچھ زیادہ یاد نہیں تھا ریگی نالڈ نے مجھے باقی بہن بھائیوں کے متعلق بتایا، ولفرڈ اب تک ولبر فورس یونیورسٹی میں ٹریڈ انسٹرکٹر تھا۔ ہلڈا ابھی لانسنگ میں ہی تھی اور شادی کے متعلق سوچ رہی تھی اور فلبرٹ کے بھی کچھ ایسے ہی ارادے تھے۔ ہم دونوں سے چھوٹے یوون، ویزی اور روبرٹ ابھی سکول میں ہی تھے میں اور ریگی نالڈ فلبرٹ کو یاد کرکے بہت ہنسے جو بہت زیادہ مذہبی ہو چکا تھا۔

ریگی نالڈ کا جہاز غالباً انجن کی مرمت کے لیے ہفتہ تک رکنا تھا اس نے میری جدوجہد کی بہت تعریف کی۔ میں نے ایک دوست سے اسے ایک عمدہ اوور کوٹ اور سوٹ لے کر دیا اور اسے بتایا کہ میں نے زندگی سے یہی سیکھا ہے کہ کچھ حاصل کرنے کے لیے آپ کو یہی ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ گویا آپ کے پاس پہلے ہی سے کچھ ہے۔

ریگی نالڈ کی رخصتی سے پہلے میں نے اسے ترغیب دی کہ وہ مرچنٹ میرین چھوڑ کر ہارلم میں ہی کاروبار شروع کرے۔ شاید میرا خیال تھا کہ چھوٹے بھائی کا ساتھ میرے لیے بہتر ہوگا اس طرح میرے دو قابل اعتماد ساتھی ہو جائیں گے۔

ریگی نالڈ نے تحمل سے میری بات سنی اور رخصت ہوتے وقت صرف اتنا کہا "میں اس کے متعلق سوچوں گا۔"

ان دنوں میں دنیا بھر میں تین چیزوں سے ڈرتا تھا۔ جیل نوکری اور فوج اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ یہ 1943ء کی بات ہے بوسٹن ڈرافٹ بورڈ نے ایلاء کے پتہ پر مجھے خط لکھا۔ پھر نیویارک ڈرافٹ بورڈ کے ذریعے مجھے سیمی کی معرفت دس دن کے اندر (فوج میں جبری بھرتی کے لیے) انڈکشن سنٹر رپورٹ کرنے کا حکم ملا۔ ابھی وقت تھا لہٰذا میں نے ایک منصوبہ پر عمل کرنا شروع کیا۔ ہارلم میں آرمی انٹیلی جنس کے سیاہ فام مخبر مرکزی علاقہ کے گوروں کے لیے سن گن لیتے پھرتے تھے۔ میں نے جابجا آواز بلند میں کہنا شروع کر دیا کہ "میں تو فوج میں شامل ہونے کا دیوانہ ہوں۔ جاپانی فوج میں۔" جب مجھے یقین ہو گیا کہ میرے خیالات مخبروں تک پہنچ چکے ہیں تو میں نے نشئیوں اور دیوانوں والی حرکات شروع کر دیں۔ جوان دنوں ہارلم کے منشیات فروشوں کی عمومی حالت تھی اور آگے چل کر میری بھی ہونی تھی اور نشے کی بڑھتی ہوئی مقدار اور منشیات فروشی کی مشکل زندگی کا یہ منطقی نتیجہ تھی۔ میں سرکاری "مبارکباد" والا خط اونچی آواز میں پڑھتا تاکہ مخبر میرے صحیح نام سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ (اور یہ غالباً واحد موقع تھا جب ہارلم کے لوگوں نے میرا صحیح نام سنا)۔

جس روز مجھے حاضری کے لیے جانا تھا میں نے اداکاروں والے کپڑے پہنے۔ اپنے وائلڈ زوٹ سوٹ کے ساتھ پہلے "نوب ٹو" جوتے پہنے اور اپنے بال سرخ جھاڑی کی طرح کھڑے کر لیے میں ناچتا، مٹکتا استقبالیہ پر پہنچ اور گا گا کر انہیں اپنے متعلق بتایا۔ اگرچہ میرے متعلق پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی مگر پھر بھی انہوں نے مجھے انتظار گاہ میں بھیج دیا جہاں چالیس پچاس جبری بھرتی کیے جانے والے آدمی بیٹھے تھے۔ کمرے میں بے حد خاموشی تھی جبکہ میری زبان ایک منٹ فی میل کے حساب سے چل رہی تھی۔ میں Slang زبان میں شور مچا رہا تھا کہ "میں ہر محاذ پر لڑوں گا، اور ریٹائرمنٹ سے پہلے مجھے جنرل بنایا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔"

زیادہ تر لوگ سفید فام تھے جو ذرا کم عمر تھے وہ مجھ سے گھبرانے لگے۔ کچھ دوسرے مجھے حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جب کہ چند لوگ مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ کمرے میں دس بارہ سیاہ فام بھی موجود تھے لیکن ان کے چہروں پر کچھ ایسی سختی تھی گویا وہ ابھی کسی کا خون کر دیں گے یہ بھی امکان تھا کہ مجھ ہی سے نہ جھگڑ پڑیں۔

قطار حرکت کرتی رہی بہت جلد طبعی معائنہ والے کمرے میں افسران نے میرے کپڑے اتروا کر صرف نکر میں میرا معائنہ کیا۔ سارے ڈاکٹروں کی نگاہوں میں F-4 واضح تھا۔ اس کے بعد مجھے فوجی ماہر نفسیات کے پاس لیجایا گیا۔ استقبالیہ پر ایک سیاہ فام نرس موجود تھی جس کی عمر بیس کے لگ بھگ تھی اور دیکھنے میں کچھ ایسی بری بھی نہ تھی۔

وہ ان ”پہلے“ سیاہ فاموں میں سے تھے جو سرکاری شعبوں میں ملازمت کر رہے تھے۔ سیاہ فام ہی سمجھ سکتے ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ جنگ کے دوران سفید فام اپنے مسائل سے اس قدر خوفزدہ تھا کہ اس نے سیاہ فاموں کو بالٹی اور جھاڑو چھوڑ کر قلم کے استعمال کی اجازت دے دی تھی یا کسی دفتر میں کرسی پر بیٹھنے والی ملازمت۔ ماہر نفسیات کسی دوسرے شخص کے ساتھ مصروف تھا اور وہ سیاہ فام لڑکی مجھ سے پہلے ہی اتنی بے زار تھی کہ مجھے کسی ڈرامے کی ضرورت نہیں پڑی۔

بالآخر ڈیسک پر رکھی گھنٹی بجی وہ بجائے مجھے اندر بھیجنے کے خور اندر چلی گئی مجھے علم تھا کہ وہ ڈاکٹر کو میرے متعلق اپنی رائے دینے گئی ہے۔ آج بھی کالوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کالوں کا نام نہاد اعلیٰ طبقہ گوروں کی خوشامد میں اور خود کو باقی کالوں سے مختلف ثابت کرنے کے لیے اپنے ہم نسلوں کی تحقیر کرتے رہتے ہیں۔ انہیں احساس نہیں ہے کہ ان کے اس رویہ سے گورے ”تمام“ کالوں کے بارے میں منفی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ ماہرِ نفسیات نے مجھ سے معروضی اور پیشہ ورانہ گفتگو کی وہ اپنی میز پر بیٹھا نیلی پنسل سے کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہا اور تین چار منٹ تک میری پرجوش گفتگو سنتا رہا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ میں بھرتی ہونے کے لیے اتنا پر جوش کیوں ہوں؟ میں نے اس کا جواب ایک دم نہیں دیا۔ بات کو ادھر ادھر گھماتا رہا۔ بار بار دائیں بائیں شک بھری نظروں سے دیکھتا جیسے کوئی میری بات سن نہ لے۔ میں اچانک اپنی کرسی سے اٹھا اور جس دروازے سے اندر داخل ہوا تھا اس کے اور ایک دوسرا دروازہ جو غالباً الماری کا تھا کے نیچے جھانکا اور جھک کر اس کے کان میں کہا ”بات یہ ہے یہاں پر اس وقت ہم دونوں ہیں اور یہ بات باہر نہیں نکلنی چاہیے میں شمالی علاقے کا رہنے والا ہوں میری آرزو ہے کہ مجھے جنوبی علاقے میں بھیجا جائے وہاں جا کر میں کالے فوجیوں کو منظم کروں ٹھیک ہے؟ پھر کچھ بندوقیں چوری کروں اور اپنے مخالفوں کا قلع قمع کر دوں۔“

ماہر نفسیات کے ہاتھ سے نہ صرف نیلی پنسل ہی گر گئی بلکہ اس کے چہرے سے پیشہ ورانہ تاثرات بھی اڑ گئے۔ وہ مجھے ایسے گھور رہا تھا جیسے میں ایک ایساانڈہ ہوں جس میں سے سانپ نکلنے ہی والا تھا۔ وہ اپنی سرخ پنسل ڈھونڈنے لگا۔ مجھے پتہ تھا میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ جب میں سیاہ فام لڑکی کے پاس سے گزرا تو مجھے ڈاکٹر کی آواز سنائی دی جو لڑکی سے کہہ رہا تھا۔ ”آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“

ایکF-4 کارڈ مجھے بذریعہ ڈاک موصول ہوا اور دوبارہ کبھی کسی نے مجھ سے فوج کا ذکر بھی نہیں کیا۔

!

باب:7

اٹھائی گیرا

اگلے دو سالوں میں ہارلم میں میں نے کتنی چوری چکاری کی کچھ ٹھیک سے یاد نہیں۔ کیونکہ میں نے ٹرینوں میں ریفرز بیچنے کا کام ترک کر دیا تھا وجہ یہ تھی کہ ریلوے کے کالے ملازم اپنی گاڑی کے انتظار میں گرینڈ سنٹرل سٹیشن پر نچلے درجے کے بڑے لاکر روم میں جوا کھیلتے رہتے تھے یہ کام چوبیس گھنٹے جاری رہتا۔ بعض اوقات میز پر پانچ سو ڈالر تک کھیلتے۔ ایک روز بلیک جیک کھیلتے ہوئے ایک باورچی نے پتے بانٹنے میں ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی اور میں نے غصہ میں اپنا پستول نکال لیا۔

اگلی بار جب میں جوا کھیلنے گیا تو یونہی چھٹی حس کے تابع میں نے اپنا پستول پیچھے کرکے درمیان میں اڑس لیا۔ لیکن میری مخبری ہو چکی تھی دو بڑے اور موٹے آئرش سپاہی اندر آئے میری تلاشی لی اور خوش قسمتی سے میرا پستول برآمد نہ کر سکے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ آئندہ جب تک میرے پاس کہیں جانے کا ٹکٹ نہ ہو میں اسٹیشن پر نظر نہ آئوں چنانچہ میں نے دوبارہ کبھی ریل روڈ نوکری کی کوشش ہی نہیں کی۔

میں دوبارہ ہارلم آگیا اور دیگر بہت سے اچکوں اور اٹھائی گیروں میں شامل ہوگیا۔ میں ایک حقیقی اچکا تھا ”کسی بھی معزز کام کے لیے ناموزوں اور اناڑی“ اور میرا خیال تھا کہ میں اتنا چالاک ضرور ہوں کہ کسی کو بھی اپنا شکار بنا سکتا ہوں۔

آج بھی ہر بڑے شہر کی جھونپڑی میں ایسے سینکڑوں ہزاروں سکولوں سے بھاگے ہوئے کالے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے اٹھائی گیری کر رہے ہیں جس طرح میں کرتا تھا اور اس میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے اور غیر

قانونی غیر اخلاقی صورت حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ کل وقتی اٹھائی گیرے کے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کل کیا ہو گا؟ ہر جنگل کے باسی کی طرح ہر اٹھائی گیرہ عملی اور لاشعوری طور پر جانتا ہے کہ اگر وہ سست ہوا یا رکا تو دوسرے بھوکے بھیڑیے لومڑیاں اور گدھ اسے شکار بنانے میں ایک لمحہ ضائع نہیں کریں گے۔

اگلے سات آٹھ ماہ میں میں نے اپنی ابتدائی چھوٹی موٹی ڈکیتیاں شروع کیں۔ یہ کام میں ہمیشہ قریبی شہروں میں جاکر کرتا اور طوائفوں کی طرح اپنے حواس بجا رکھنے کے لیے پہلی بار میں نے سیمی کے مشورہ پر کوکین کا استعمال شروع کیا۔

عام طور پر احتیاط کے پیش نظر میں 0.25 آٹومیٹک پستول اپنے ساتھ رکھتا لیکن کام کے وقت0.32 یا 0.35 یا 0.45 استعمال کرتا تھا۔ جب میں اس پستول کی نالی کسی کی طرف سیدھی کرتا تو اس کا رنگ زرد پڑ جاتا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا اور وہ میرا ہر حکم بلاچون چرا مان لیتا۔

دھندے کے دوران نشہ مجھے بدحواس ہونے سے بچاتا۔ میں اکثر اوقات معمولی سے شک پر بھی اپنی رہائش تبدیل کر لیتا تھا۔ th147-150th سٹریٹ کا علاقہ ہمیشہ میرا پسندیدہ تھا۔

ایک بار سیمی کے ساتھ کام سے واپسی پر ہم پولیس سے بمشکل بچے شاید کسی نے ہمیں واردات کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا ہمیں سائرن سنائی دیئے ہم فوراً بھاگنا چھوڑ کر آہستہ قدموں سے چلنے لگے ایک پولیس کار نے ہمارے قریب زور سے بریک لگائی۔ ہم اس کی طرف گئے اور پولیس والوں سے راستہ پوچھنے لگے۔ شاید انہوں نے سوچا ہو گا کہ ہم انہیں کوئی معلومات دینا چاہتے ہیں ہمارے راستہ پوچھنے پر وہ ناراض ہوگئے اور ہمیں برا بھلا کہتے گاڑی بھگالے گئے۔ ان گوروں کے تصور میں بھی نہیں ہو گا کہ کوئی کالا انہیں اس طرح چکمہ دے سکتا ہے۔

میرا اصول تھا کہ ضرورت سے زیادہ کے لیے کبھی کاوش نہیں کرتا۔ ہمارے پیشے میں لالچ جیل جانے کا سب سے چھوٹا راستہ ہے۔ میں جگہیں اور مواقع اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا اور صرف اس وقت کام پر نکلتا جب میرا سرمایہ بہت کم رہ جاتا۔ کچھ ہفتے میں نمبروں پر بڑا بڑا جوا کھیلتا اکثر اوقات تیس چالیس ڈالر کی رقم جوا میں لگاتا اس امید پر کہ ایک روز میں بہت بڑی رقم جیتوں گا۔ لیکن میں نے کبھی بڑی رقم نہیں جیتی اور مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ اگر میں

دس ہزار یا بارہ ہزار ڈالر جیت بھی گیا تو ان کا کرونگا کیا بعض اوقات ذرا معقول رقم جیتتا تو بوسٹن فون کرکے صوفیہ کو بلا لیتا اور ہم ایک دو دن اکٹھے گزارتے۔

میں نے دوبارہ فلمیں دیکھنی شروع کر دیں اس کے ساتھ ساتھ میرے فنکار دوست جہاں کہیں پر فارم کر رہے ہوتے ہیں وہاں ضرور جاتا۔

ریگی نالڈ دوبارہ جہاز سے نیویارک آیا تو ہم دونوں اور قریب آگئے۔ ہم نے اپنے خاندان پر گفتگو کی اور سوچا کہ اگر ہمارا سب سے بڑا بھائی ولفرڈ جو کتابوں کا بہت رسیا تھا کسی بڑی یونیورسٹی میں ہوتا تو بہت آگے جاتا۔ اس کے علاوہ ہم نے وہ باتیں بھی کی جو ہم کسی اور سے نہیں کر سکتے تھے۔

ریگی نالڈ بھی موسیقی اور موسیقاروں کا پرستار ہوگیا جب اس کا جہاز اس کے بغیر واپس گیا تو اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ میں نے اسے موسیقی کی حیران اور دلچسپ دنیا سے مکمل متعارف کروا دیا تھا۔ منشیات فروشی کے دنوں سے میں نیویارک کے ہر مشہور سیاہ فام فنکار سے واقف تھا۔ ریگی نالڈ اور میں جہاں بھی سیاہ فام فنکار پر فارم کرتے وہاں ضرور جاتے عظیم “لیڈی ڈے” اور “بلی ہالیڈے” نے اسے گلے لگایا اور چھوٹا بھائی بھی کہا، ہزاروں دوسرے سیاہ فاموں کی طرح ریگی نالڈ بھی لائنل ہیمپٹن کا انتہائی پرستار تھا۔ میں نے اس کی ملاقات نہ صرف ہمپ سے بلکہ اس کی بیوی اور بزنس منیجر گلیڈیز ہیمپٹن سے بھی کروائی۔ ہمپ دنیا کے چند بے حد شائستہ آدمیوں میں سے ایک تھا اور اکثر ان لوگوں سے بھی فیاضی کا سلوک کرتا جنہیں وہ جانتا بھی نہیں تھا۔ اگر اس کے کاروباری معاملات گلیڈیز کے ہاتھ میں نہ ہوتے جو بے حد ذہین تھی تو اس کا کب کا دیوالہ نکل جاتا۔ عام طور پر کسی بھی بینڈ کو ہفتہ بھر کے لیے ایک مخصوص رقم کے عوض پرفارمنس کے لیے بک کیا جاتا تھا۔ لیکن دی اپالو تھیٹر کے مالک فریک شفمین سے گلیڈیز نے ہر شو کی آمدنی میں سے حصہ کا معاہدہ کیا جس کے نتیجہ میں ہمپ معمول کے چار شوز کی بجائے روزانہ آٹھ شوز ہونے لگے اور ہمپ کی آمدنی آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ گلیڈیز ہیمپٹن مجھ سے بہت باتیں کرتی تھی اسے میرے مزاج کی تیزی کا اندازہ تھا وہ مجھے نصیحت کرتی “ریڈ اپنے اندر تحمل پیدا کرو” وہ دیکھ رہی تھی کہ میں ایک برے انجام کی طرف بڑھ رہا ہوں۔

ریگی نالڈ کی دیگر باتوں کے علاوہ جو بات مجھے پسند آئی وہ یہ تھی کہ جب میں نے اسے اپنا کام شروع کرنے کے لیے کہا تو اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ ریگی نالڈ کے آنے کے بعد میں نے کام بڑھا دیا غالباً اپنا پہلا اپارٹمنٹ بھی میں نے اسی لیے خریدا کہ میرے بھائی کو رہنے کے لیے ایک “گھر” میسر آجائے۔ پہلا اپارٹمنٹ تین کمروں کا تھا جس کا

کرایہ سو ڈالر ماہانہ تھا۔ یہ کونونٹ اور سینٹ نکولس ایوینیوز کے درمیانth147 سٹریٹ کے ایک مکان کے تہہ خانہ کا سامنے والا حصہ تھا۔ اسی تہہ خانہ کے پچھلے حصہ میں بالکل ہماری پشت پر ہارلم کے کامیاب ترین منشیات فروشوں میں سے ایک رہتا تھا۔

اس اپارٹمنٹ کو ہیڈ کواٹر بنا کر میں نے ریگی نالڈ کو ہارلم کی خاص جگہوں سے متعارف کروانا شروع کیا۔ رات کو جب گوروں کے نائٹ کلب بند ہو جاتے تو میں اسے مختلف جگہوں پر لے جاتا اور اسے بتاتا کہ یہاں کیا کیا ہوتا ہے۔

ہر After Hours Spot میں داخل ہوتے ہی دھواں آنکھوں کو چبھتا تھا۔ سیاہ فاموں سے چار گناہ زیادہ گورے وہاں کافی کے کپوں میں وسکی پیتے اور تلا ہوا مرغ کھاتے۔ لال چہروں والے گورے اور غازے میں چہرہ چھپائے گوریاں ایک دوسرے کی کمر پر ہاتھ مار کر ہنستے اور موسیقی سے لطف اندوز ہوتے۔ کبھی نشے میں دھت کوئی گورا لڑکھڑاتا ہوا کسی کالے کی طرف جاتا اس سے ہاتھ ملاتا یا گلے لگانے کی کوشش کرتا اور کہتا میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس طرح کی مشہور جگہوں پر مقبول سفید فام اور سیاہ فام شخصیتیں ایک دوسرے کی صحبت سے محظوظ ہوتیں۔ جمیز چکن شیک یا ڈکی ویلز میں صبح ساڑھے چار بجے جو اجتماع ہوتا اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی۔ ایسے موقعوں پر "بلی ہولیڈے" کے اداس گانوں پر "ہیرل سکاٹ" پیانو بجاتا۔

کچھ عرصہ بعد ریگی نالڈ نے بھی Hustling شروع کر دی۔ میں نے اس کے لیے محفوظ میدان ڈھونڈنا شروع کیا تاکہ ماہر ہونے تک اسے کسی پریشانی کا سامنا نہ ہو۔ جو کام ریگی نالڈ نے شروع کیا وہ بہت آسان تھا۔ وہ گھٹیا قسم کی استعمال شدہ، شرٹس، انڈر ویئرز، نقلی انگوٹھیاں، گھڑیاں وغیرہ سستے داموں خریدتا اور پھر گھبراہٹ چہرے پر سجائے کسی نائی کی دکان یا بیوٹی پارلر یا میکدے میں چلا جاتا اور کوشش کرتا کہ کسی طرح گاہک ایک بار اس کے اشیاء بھرے تھیلے میں جھانک لے۔ چونکہ ہارلم میں چوری کا مال ہمیشہ سستے داموں بکتا تھا لہٰذا گاہک اس مال کو بھی چوری کا سمجھ کر خرید لیتے اس طرح ریگی نالڈ کو گھٹیا مال کے بھی معقول پیسے مل جاتے۔ اگر کبھی کوئی پولیس والا اسے روکتا تو وہ اسے نہ صرف پھیرے بازی کا لائسنس دکھا دیتا بلکہ چیزوں کی خریداری کا بل بھی دکھا دیتا۔ وہ صرف اس بات کا خیال رکھتا کہ اس کے گاہکوں کو علم نہ ہو کہ وہ قانونی پھیرے باز ہے۔

میرا خیال تھا کہ دوسرے سیاہ فاموں کی طرح ریگی نالڈ بھی سفید عورتوں کے پیچھے بھاگا پھرے گا میں نے اسے کچھ سفید فام عورتیں دکھائیں بھی اور انہیں پھانسنے کے کچھ گر بھی سکھائے لیکن اسے سفید عورتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ ایک بار جب وہ صوفیہ سے ملا تو اس نے اتنی سرد مہری کا مظاہرہ کیا کہ صوفیہ پریشان ہو گئی۔

ریگی نالڈ نے ایک تیس سالہ عورت سے تعلقات بنا لیے وہ ایک اعلی ریسٹورنٹ میں ویٹرس تھیں اور ایک نوجوان سا تھی ملنے پر بہت خوش تھی اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی۔ اسے کپڑے خرید کر دیتی کھانا بناتی کپڑے دھوتی غرض ہر طرح سے اس کا خیال رکھتی اسی طرح کی دیگر باتیں بھی تھی جس کی وجہ سے میری نظر میں ریگی نالڈ کی عزت بڑھتی جاتی تھی۔ وہ ابھی صرف سولہ سال کا تھا لیکن اس کا قد 6 فٹ تھا اور وہ اپنے ہم عمروں سے کئی گنا زیادہ سمجھدار بھی تھا۔

دوران جنگ ہارلم کی نسلی صورت حال کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ تناؤ بہت زیادہ تھا کچھ پرانے لوگوں کا کہنا تھا کہ 1935ء کے ہنگاموں کے بعد ایسی صورت حال پھر نہیں بنی۔

1935ء میں جب سفید فام تاجروں نے ہارلم ہی میں سیاہ فاموں کو ملازمت دینے سے انکار کر دیا تو ردعمل کے طور پر سیاہ فاموں نے دوران فسادات کروڑوں ڈالرز کا نقصان کیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میئر لاگارڈیا نے سرکاری طور پر سوائے بار روم بند کر دیا۔ سب کا کہنا تھا کہ اس بندش کا مقصد سیاہ فاموں کو گوری عورتوں کے ساتھ رقص سے روکنا تھا جبکہ ہمارا کہنا تھا کہ سفید عورتیں اپنی مرضی سے آتی ہیں۔ ایڈم کلیٹن پاول نے اس کا بھرپور مقدمہ لڑا اس سے قبل وہ Consolidated Edison اور نیویارک ٹیلیفون کمپنی میں بھی سیاہ فاموں کو ملازمت کا موقع دیا جانے کا مقدمہ جیت چکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ یو ایس نیوی اور یو ایس آرمی میں بھی سیاہ فاموں کے حقوق کے مقدمے لڑ چکا تھا لیکن اس بار وہ یہ مقدمہ ہار گیا۔ سٹی ہال والوں نے طویل عرصہ تک سوائے کو بند رکھا۔ یہ ”آزاد شمال“ کے ان اقدامات میں سے ایک تھا جن کی وجہ سے ہارلم کے باسی کبھی کسی سفید فام سے محبت نہیں کر سکے۔ ایک روز افواہ اڑی کہ بریڈک ہوٹل میں ایک گورے سپاہی نے ایک کالے فوجی کو گولی مار دی۔ تمام سیاہ فام یہ سنتے ہی اس طرف چل پڑے ان میں سے کچھ مسلح تھے۔ انہوں نے دکانوں کی کھڑکیاں توڑ دیں اور جو چیز بشمول فرنیچر، فوڈ، زیورات، کپڑے، وھسکی ہاتھ لگی لے کر چلتے بنے۔ لگتا تھا نیویارک کا ہر سپاہی ہارلم میں اکٹھا ہو گیا ہے۔ میئر لاگارڈیا اور NAACP کے مشہور سیکرٹری والٹر وہائٹ گاڑی میں لائوڈ اسپیکر پر مشتعل سیاہ فاموں کو پرسکون رہنے اور گھروں میں جانے کی درخواست کر رہے تھے۔

پچھلے دنوں میں 7th ایونیو پر ”شارٹی ہیڈرسن“ سے ملا ہم ان دنوں کو یاد کر کے بہت ہنسے ان ہنگاموں میں ایک سیاہ فام ”بایاں پائوں“ (Left Feet) کے نام سے مشہور ہوا۔ جس وقت سب سیاہ فام لوٹ مار کر رہے تھے وہ ایک جوتوں کی دکان میں داخل ہوا اور پانچ جوتے اٹھا لیے۔ جن میں سے ہر جوتا بعد میں بایاں پائوں نکلا۔ اسی طرح ہم

ایک خوف زدہ چینی کو یاد کر کے بھی بہت ہنسے جس کے ریسٹورنٹ کو کسی نے چھوا بھی نہیں کیونکہ مشتعل سیاہ فام اس کے دروازے پر لگے ہوئے اعلان کو پڑھ کر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے اس نے دروازے پر لکھ کر چپکایا ہوا تھا "میں بھی سیاہ فام ہوں" (Me colored Too) ۔

ہنگاموں کے بعد ہارلم کے حالات بہت سخت ہوگئے خصوصاً شب زندہ داروں اور ان پھیری بازوں کے لیے جن کی آمدنی کا دارومدار ہی سفید فاموں کی دولت پر تھا۔ 1920ء کی دہائی میں ہارلم میں جو دولت کمائی گئی تھی وہ 1935ء کے فسادات میں اس کا عشرِ عشیر بھی باقی نہیں بچا اور آجکل تو حالات اس سے بھی ابتر ہو گئے ہیں۔

آج کل جو سفید فام عورتیں ہارلم میں آتیں ہیں ان کی تعداد چند درجن سے زیادہ نہیں اور وہ بھی صرف ویک اینڈ پر سمالز پیراڈائیز عظیم باسکٹ بال چیمپئن چیمبر لین "Wilt the Stilt" نے خرید لیا تھا۔ جس کے نام کی شہرت کی وجہ سے بہت لوگ وہاں جاتے ہیں۔ زیادہ تو گورے ہارلم میں جسمانی خطرے کی وجہ سے نہیں آتے بلکہ سیاہ فام بھی اب اپنی راتیں ان جگہوں پر گزارنے لگے ہیں جہاں کسی زمانے میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والے سیاہ فام کو پاگل سمجھا جاتا تھا اور پولیس کے ذریعے اسے دھتکار دیا جاتا تھا، اور یہ سب کچھ بھائی چارے کے منافقانہ پروپیگنڈا کی وجہ سے ہے۔ جونہی کوئی نیا ہوٹل کھلتا ہے تو بھائی چارے کا مارا ہوا سیاہ فام رقص یا تقریبات کے لیے دوڑ پڑتا ہے حالانکہ اس کے اپنے پاس رہنے کے لیے چھپر تک نہیں ہوتا۔

ہارلم میں حالات اتنے خراب ہو گئے کہ چند ہسلرز کو مجبوراً کام کرنا پڑ گیا حتیٰ کہ کچھ طوائفوں کو بھی پیشہ چھوڑ کر گھریلو ملازمتیں اور رات کے وقت دفتروں کی صفائی کا کام کرنا پڑا۔ دلالی کا دھندا اتنا متاثر ہوا کہ سیمی کو بھی میرے ساتھ "کام" کرنا پڑا۔ ایک بار ہم دونوں دوران ڈکیتی بمشکل پکڑے جانے سے بچے۔ ہم ہمیشہ ان مواقع کا انتظار کرتے جنہیں عام لوگ "ناممکن" سمجھتے ہیں۔ ان اوقات میں لاشعوری طور پر چوکیدار اور محافظ زیادہ چوکنے نہیں رہتے، اور یہی وقت چوری اور ڈکیتی کے لیے سب سے مناسب ہوتا ہے۔ دوران "کار" ایک گولی سیمی کو چھوتی ہوئی گزر گئی خوش قسمتی سے وہ زیادہ زخمی نہیں ہوا ہم بمشکل فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔

پو پھٹنے سے پہلے ہی میں سیمی کے اپارٹمنٹ گیا اس کی نئی عورت جو ایک گرم مزاج لیکن خوبصورت سیاہ فام ہسپانوی تھی بری طرح رو پیٹ رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی چیختی ہوئی اپنے ناخنوں سے مجھ پر حملہ آور ہوئی میں نے سختی کے ساتھ اسے پرے دھکیل دیا اچانک میں نے دیکھا کہ سیمی نے اپنی پستول اٹھا لی اس کا خیال تھا کہ میں نے اس کی عورت پر ہاتھ اٹھایا ہے وہ عورت... بھی خطرہ محسوس کرتے ہوئے سیمی کی طرف دوڑی۔ اسے بھی میری طرح علم تھا

کہ جب آپ کا بہترین دوست آپ پر پستول تان لے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے جذبات پر مکمل اختیار کھو چکا ہے اور واقعی آپ کو گولی مارنا چاہتا ہے۔ اس عورت نے سیمی کو اتنی دیر مصروف رکھا کہ میں دروازے سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ سیمی نے تقریباً ایک بلاک تک میرا پیچھا کیا۔

بظاہر ہم دونوں میں پھر دوستی ہو گئی لیکن ایسے کسی شخص کے ساتھ کبھی تعلقات معمول پر نہیں آ سکتے جو آپ کو قتل کرنے کی کوشش کر چکا ہو۔

چھٹی حس کے تابع ہم نے کچھ عرصہ اپنا کام بند کر دیا یقینا پولیس نے ہمارا حلیہ تمام علاقے میں پھیلا دیا ہو گا۔ سیمی کی عورت والے واقعہ کے بعد میں اپنے بھائی ریگی نالڈ پر اور زیادہ انحصار کرنے لگا۔

میں نے دریافت کیا کہ ریگی نالڈ کاہل ہے وہ ہسلنگ مکمل طور پر چھوڑ چکا تھا۔ وہ میرا اپارٹمنٹ بھی چھوڑ چکا تھا جب وہ ہارلم میں ہوتا تو اپنی عورت کے ساتھ ہی رہتا۔

میں نے اسے ریل روڈ میں کام کر کے شناخت نامہ حاصل کرنے اور پھر مفت سفر کرنے کا گر بتایا۔ ریگی نالڈ سفر کا دیوانہ تھا وہ کئی بار اپنے بہن بھائیوں کو ملنے چلا جاتا جو اب دوسرے شہروں میں بکھرتے جا رہے تھے۔ بوسٹن میں ریگی نالڈ ایلاجو مجھے پسند تھی، کی بجائے دوسری بہن میری سے زیادہ قریب تھا وہ دونوں خاموش طبع اوراور ہم دونوں خارجیت پسند تھے۔ بوسٹن میں شارٹی بھی میرے بھائی کا بہت خیال رکھتا۔

اپنی شہرت کی وجہ سے میرے لیے نمبروں کا دھندہ شروع کرنا آسان تھا۔ میری ذمہ داری یہ تھی کہ میں بس میں سوار ہو کر جارج واشنگٹن پل تک جاتا جہاں ایک شخص میرا منتظر ہوتا۔ میں اسے شرط کے نمبروں والی پرچیوں کا تھیلہ تھما دیتا ہم نے کبھی بات چیت نہیں کی۔ میں گلی عبور کرتا اگلی بس پکڑتا اور ہالم آ جاتا۔ مجھے کبھی علم نہ ہوا کہ وہ آدمی کون تھا؟ نہ کبھی یہ علم ہوا کہ ان پرچیوں پر لگنے والی شرط کی رقم کون لے جاتا ہے؟ اس طرح کے دھندوں میں سوال نہیں کئے جاتے۔

میرے باس کی بیوی اور گلیڈی ہیمپٹن پورے ہارلم میں واحد عورتیں تھیں جن کی کاروباری سمجھ کا میں بہت احترام کرتا تھا۔ میرے باس کی بیوی کا مزاج اگر اچھا ہوتا تو وہ مجھ سے بہت مزے کی باتیں کرتی۔ اعلیٰ افسران سے لین دین، راشی پولیس والوں کو رشوت اور وکیلوں کے ذریعے پولیس اور سیاستدانوں سے تعلقات غرض وہ مجھے بہت کچھ بتاتی۔ وہ ذاتی تجربے سے جانتی تھی کہ جرم صرف اس حد تک موجود رہتا ہے جس حد تک قانون اس سے تعاون

کرتا ہے۔ اسی نے مجھے سمجھایا کہ ملک کے تمام تر سماجی، سیاسی اور معاشی ڈھانچے میں مجرم، قانون اور سیاست دان ناقابلِ تقسیم (Inseparable) ہیں۔

ان ہی دنوں میں نے نمبروں کے کام میں پرانے آدمی کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اسے میرے جیسے شخص کو کھونے کا دکھ ہوا لیکن وہ جانتا تھا کہ میں اپنے طور پر یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔ اب میں نے ویسٹ انڈین آرچی کے ساتھ شرطیں لگانا شروع کر دیں۔ وہ حقیقی معنوں میں ہارلم کا "برا" سیاہ فام تھا۔ میرے ہارلم آنے سے تھوڑا عرصہ قبل ہی اس نے "سنگ سنگ" میں کام چھوڑا تھا۔ میرے باس کی بیوی نے اس کا انتخاب اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ اسے عرصہ سے جانتی تھی، ویسٹ انڈین آرچی ایک طرح کی فوٹوگرافک یادداشت رکھتا تھا جو اسے اعلیٰ درجے کا نمبر رنر بتاتی تھی۔

وہ کبھی آپ کے نمبر لکھتا نہیں تھا۔ وہ سارے نمبر اپنے دماغ میں محفوظ رکھتا تھا اور صرف اس وقت ان کو لکھتا جب بینکر سے اپنی رقم لینا ہوتی تھی۔ اس خوبی کی وجہ سے وہ ایک مثالی رنر تھا کیونکہ پولیس والے اسے کبھی شرط والی پرچیوں کے ساتھ نہیں پکڑ سکتے تھے۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ آرچی جیسے لوگ اگر کسی دوسرے معاشرے میں ہوتے تو ان کی غیر معمولی حسابی صلاحیت شاید بہتر طور پر استعمال ہو سکتی۔ لیکن ان کا جرم کالا ہونا تھا۔

بہرحال آرچی کا گاہک ہونا بڑی عزت افزائی کی بات تھی کیونکہ وہ صرف بڑے شرط بازوں کو ہینڈل کرتا تھا۔ وہ اعتماد اور محفوظ قرض کا متقاضی تھا یہ ضروری نہیں تھا کہ آپ جتنا کھیلیں اتنی ہی ادائیگی کریں آپ ہفتہ وار ادائیگی بھی کر سکتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنی جیب میں ایک دو ہزار ڈالر رکھتا اگر کوئی گاہک آرچی کے پاس آتا اور اس سے کہتا کہ وہ پچاس سینٹ یا ایک ڈالر کے نمبر کمبی نیشن پر جوا کھیلنا چاہتا ہے تو آرچی اسے پانچ چھ سو ڈالر دے دیتا اور بعد میں اپنی رقم بینکر سے وصول کر لیتا میں اسے ہر ویک اینڈ پر ادائیگی کرتا تھا جو پچاس سے سو ڈالر تک ہوتی تھی۔

ہارلم کی ایک "میڈم" نے مجھے ہارلم کی شبانہ زندگی کے ایک خاص پہلو سے متعارف کروایا جو فسادات کی وجہ سے وقتی طور پر معطل ہو گیا تھا۔ یہ تھی مقفل دروازوں کے پیچھے کی دنیا جہاں سیاہ فام پیسوں کے عوض سفید فام لوگوں کی عجیب وغریب جنسی اشتہائوں کی تسکین کرتے تھے۔

فسادات نے سفید فام گاہکوں کو پریشان کر دیا تھا۔ جن سفید فام لوگوں کو میں جانتا تھا وہ سیاہ فاموں کے ساتھ گھلنا ملنا پسند کرتے تھے۔ یہ دوسرے سفید فام ہارلم میں اپنی آمدورفت کو خفیہ رکھنا چاہتے تھے۔ انہیں حالیہ ہنگاموں کی وجہ سے کالوں کے غصہ سے ڈر آتا تھا لہٰذا میڈم نے مجھے گاہکوں کی رہنمائی کے لیے نوکری کی پیشکش کی۔

جنگ کے دوران ٹیلی فون کا حصول بے حد مشکل تھا۔ ایک روز میڈم نے مجھے کہا کہ میں کل صبح اپنے گھر ٹھہروں۔ اس نے کسی شخص سے بات کی اور اگلے روز دوپہر سے پہلے میں اپنے ٹیلی فون سے میڈم کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ یہ فون ان لسٹڈ (Unlisted) تھا یہ میڈم اپنے کام کی ماہر تھی اگر اس کی لڑکیوں میں سے کوئی گاہک کے لیے جگہ کا انتظام نہ کر سکتی تو میڈم مجھے ہارلم میں کسی اور اپارٹمنٹ میں بھیج دیتی جہاں گاہک کی مطلوبہ ضرورت پوری ہو سکتی۔

میری نوکری ایسٹر ہوٹل کے باہر سے گاہکوں کو لینا تھی جو ایک مصروف جگہ تھی، میں ٹریفک میں ہی مطلوبہ ٹیکسی، کار یا لیموزین کو پہچان لیتا جس میں سے مضطرب سفید چہرے ایک ایسے لمبے سیاہ فام کو ڈھونڈ رہے ہوتے جو گرے رنگ کے سوٹ یا برساتی میں کالر پر سفید پھول سجائے ان کا منتظر ہوتا۔ اگر وہ ذاتی کار میں ہوتے تو میں خود گاڑی چلا کر انہیں مطلوبہ جگہ لیجاتا لیکن اگر وہ ٹیکسی میں ہوتے تو میں پہلے ڈرائیور کو اپالو تھیٹر چلنے کے لیے کہتا کیونکہ نیویارک شہر کی ٹیکسیوں میں بعض اوقات ڈرائیور کی جگہ پولیس کے لوگ ہوتے تھے۔ وہاں پہنچ کر ہم کسی سیاہ فام کی ٹیکسی میں بیٹھتے اور میں ڈرائیور کو صحیح پتہ سے آگاہ کرتا۔

گاہک کو منزل پر پہنچا کر میں میڈم کو فون کرتا وہ عام طور پر مجھے دوبارہ ایک خاص وقت پر اپنے مخصوص مقام پر پہنچنے کے لیے کہتی، وقت کی پابندی ان معاملات میں بہت اہم تھی۔ مجھے کبھی پانچ منٹ سے زیادہ گاہک کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میں سادہ لباس اور وردی والے پولیس اہل کاروں سے بچنے کے لیے ایک جگہ زیادہ دیر کھڑا نہیں ہوتا تھا۔

میں ایک رات میں اگر دس گاہکوں کو منزل تک پہنچاتا تو پچاس سے سو ڈالر تک بخشیش کما لیتا تھا۔ میں نے اپنے گاہکوں کی شناخت سے کبھی غرض نہیں رکھی۔ مگر چند ایک کو میں پہچاننے لگا تھا۔

ان کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے تھا۔ سماجی راہ نما، سیاستدان، ٹائی کونز، بڑے سرکاری اہل کار تھیٹر اور ھالی ووڈ کی شخصیات، کھیلوں کے ستارے وغیرہ وغیرہ ہارلم ان کے گناہوں کا اڈہ تھا۔ وہ چھپ کر سیاہ فاموں سے ملتے۔ اس وقت وہ اپنے احترام اور عظمت کے “اینٹی سیپٹک” نقاب اتار دیتے جو سفید فاموں کے بیچ پہنے رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض اپنی عجیب عجیب “اشتہائوں” کے لیے بڑی بڑی رقمیں بھی خرچ کرتے تھے۔

“میڈم” کے اپارٹمنٹ سے پرے مین سٹریٹ پر ہی ایک انتہائی سیاہ فام مضبوط لڑکی کی رہائش تھی۔ وہ بیل کی طرح توانا تھی۔ اس کے پٹھے مزدوروں کی طرح سخت تھے۔ اس کے گاہکوں میں ساٹھ ستر سالہ بوڑھوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کی خصوصیت “جسمانی تشدد” تھی وہ ان اذیت پرست بوڑھوں کو چوٹی کی طرح گندھے ہوئے ہنٹر سے اتنا

مارتی کہ ان کے جسم سے خون بہنے لگتا۔ وہ لڑکی اپنے جسم کو تیل لگا کر چمکا لیتی تاکہ اس کے پٹھے زیادہ نمایاں ہوں۔ کچھ گاہک مجھے اضافی رقم بھی دیتے تاکہ میں اس منظر کو دیکھوں کہ کس طرح وہ گھٹنوں کے بل رینگ رینگ کر اس سے رحم کی بھیک مانگتے ہیں۔

میں اس منظر کی تفصیل نہیں بتا سکتا لیکن بعد میں جیل کے ایام میں میں اکثر سوچتا کہ ماہر نفسیات اس کی توجیہ کیا کرے گا: ایسے بہت سے گاہکوں میں اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے والے تھے جو دوسروں پر اپنی طاقت یا اختیار استعمال کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔

جیل میں ہی مجھے پتہ چلا کہ جن مخصوص گوروں کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ صرف اور صرف "کالوں" کے طالب تھے اور ان کا کہنا تھا "جتنا کالا اتنا اچھا۔" اور یہ بات پہلے سے میڈم کے علم میں تھی اور وہ صرف سیاہ لڑکیوں کو اپنی سرپرستی میں رکھتی تھی۔ ہارلم کے تمام عرصہ میں ایک گورا بھی ایسا دکھائی نہیں دیا جو سفید فام طوائف کو چھونا بھی پسند کرتا ہو۔ کچھ سفید فام لڑکیاں بھی ہارلم کی خاص جگہوں پر دھندہ کرتی تھیں اور گاہکوں کی درخواست پر سیاہ فام مردوں سے تعلقات کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ شاید سفید فام اپنے گہرے خوف کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ ایسے موقعوں پر بعض سفید فام مرد اپنے ساتھ سفید فام عورتیں بھی لے آتے تھے۔ بعض سفید فام عورتیں ایک سفید فام ہم جنس پرست سے رابطے کے لیے آتی تھیں جو کہ میڈم کی دیگر Specialities میں سے ایک تھی۔

یہ ہم جنس پرست ایک خوبصورت سفید فام تھی جس نے سیاہ فام مرد ملازم رکھے ہوئے تھے جو وہ سفید فام عورتوں کو سپلائی کرتی تھی۔ ایک بار میں نے اسے کچھ ری فرز دیئے جو اسے بیحد پسند آئے اس کے بعد وہ کبھی کبھی مجھے بلا لیتی مجھ سے ری فرز لیتی اور مجھ سے باتیں کرتی۔

وہ ایسٹ سائیڈ کے بیوٹی سیلون میں کام کرتی تھی، اس کا سابقہ ایسی خوش حال سفید فام عورتوں سے پڑتا جو سفید فام مردوں سے "غیر مطمئن" ہونے کی وجہ سے بور زندگی گزار رہی تھیں۔ اس نے انہیں سیاہ فام مردوں کے متعلق سنی ہوئی باتیں بتائیں تو وہ بہت حیران اور خوش ہوئیں۔ ان کی دلچسپی دیکھ کر اس نے اپنے فلیٹ پر ان کی ملاقات ہارلم کے چند سیاہ فام آدمیوں سے کروائی۔ آگے چل کر اس نے ہارلم میں تین اپارٹمنٹ کرائے پر حاصل کر لیے جہاں پہلے سے وقت لے کر سیاہ فام مردوں سے ملا جلا سکتا تھا۔ اس کی گاہکوں نے اپنی سہیلیوں کو بتایا۔ اس نے بیوٹی سیلون کی نوکری چھوڑ دی اور پیغام رسانی کے ادارے کی آڑ میں ٹیلی فون پر اپنا دھندہ شروع کر لیا۔ وہ رنگ کے متعلق

بہت احتیاط کرتی تھی کیونکہ اس کی گاہکوں کا بنیادی تقاضہ "سیاہ فام" تھا اور کبھی کبھی تو "اصلی سیاہ فام" یعنی بھورے، سرخ یا ہلکے رنگ کا سیاہ فام نہیں۔

کچھ سفید فام عورتیں، سیاہ فام مردوں کو گھر پر بلالیتیں جہاں وہ سیاہ فام "پیغام رساں" کے حلیے میں جاتے اور مطلوبہ ضرورت پوری کرتے۔

اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ سفید فام عورتیں کالے مردوں کی اتنی ہی عزت کرتی تھیں جتنی کہ گورے مرد ان کالی عورتوں کی کرتے تھے جنہیں وہ غلامی کے دور سے "استعمال" کرتے آ رہے تھے۔ اور اس کے جواب میں کالے مردوں نے بھی اپنی ہم بستر سفید فام کی کبھی عزت نہیں کی۔ میں جانتا ہوں کہ صوفیہ کے متعلق میرے احساسات کیا ہیں جو اب بھی میرے بلانے پر نیویارک آ جاتی ہے۔

یہ منافق سفید فام ہمیشہ سیاہ فاموں کی "پست اخلاقی حالت" کا ذکر کرتے ہیں لیکن میں نے گوروں سے زیادہ "پست اخلاقی حالت" کسی اور کی نہیں دیکھی۔ حال ہی میں نیویارک کے مضافاتی علاقے میں گھریلو عورتوں اور بوڑھی مائوں کے "کال گرل" حلقہ کی تفصیلات شائع ہوئی ہیں۔ بعض کیسوں میں گھریلو عورتیں اپنے شوہروں کے تعاون سے یہ پیشہ کرتی پائی گئی ہیں۔ نیویارک سٹی کے ایک بڑے اخبار کے مطابق ایسے ہی ایک حلقے سے سولہ لیجرز اور کتابیں قبضہ میں لی گئیں جن میں دو سو کے قریب سماجی، سیاسی اور معاشی شخصیات کے نام ھائے نامی درج تھے۔

میں نے حال ہی میں ایک ایسے سفید فام گروہ کے متعلق پڑھا ہے جس میں شوہر اپنے گھروں کی چابیاں ایک ھیٹ میں ڈال دیتے ہیں پھر آنکھوں پر پٹی باندھ کر چابی چنی جاتی ہے جس کے ہاتھ جس گھر کی چابی لگتی ہے وہ اس گھر کی عورت کے ساتھ رات گزارتا ہے۔ اس طرح کی حرکت غلیظ ترین اور بدترین علاقوں میں رہنے والے سیاہ فاموں نے بھی کبھی نہیں کی۔

ہارلم کے اکثر شراب خانے یہودیوں کی ملکیت تھے جنہیں بظاہر سیاہ فام چلاتے تھے۔ کیونکہ لائسنس کے حصول کے لیے "سٹیٹ لیکر اتھارٹی" میں واقفیت ضروری تھی اور یہودی اپنے ہم مذہبوں کی وجہ سے "ایس ایل اے" میں کافی رسائی رکھتے تھے۔ ایک روز ہلکے رنگ کا سیاہ فام ایسے ہی شراب خانے میں داخل ہوا اور بار ٹینڈر اور منیجر کو لوٹ لیا۔ اس کا حلیہ ہر طرف پھیلا دیا گیا۔ میں صبح صبح اپنے دھندے سے فارغ ہو کر گھر پہنچا ہی تھا کہ چند غنڈے دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے اور پوچھ گچھ شروع کر دی کیونکہ لٹیرے کا حلیہ مجھ سے ملتا تھا۔ میں نے انہیں اپنی گذشتہ

شب کی کارگزاری بتا کر یقین دلانے کی کوشش کی چونکہ ان کے پاس کچھ دیگر مشکوک اشخاص کی فہرست بھی تھی اس لیے بچت ہو گئی اور وہ چلے گئے۔ میں نے فوراً کپڑے پہنے، رقم جیب میں ڈالی اور میڈم اور سیمی کو فون کیا اور بتایا کہ میں فلبرٹ سے ملنے مشی گن جا رہا ہوں۔ کچھ رقم میڈم نے مجھے دے دی۔ میں نے سیمی کو رابطے کے لیے فون نمبر دیا تاکہ حالات بہتر ہوتے ہی مجھے اطلاع کر دے۔

یہ سردیوں کا موسم تھا، مشی گن پہنچ کر میں نے اپنے بالوں میں "کونگولین" لگائی سر دھونے کے لیے ٹونٹی کھولی تو پتہ چلا کہ پائپوں میں پانی جم چکا ہے۔ سر کی کھال کو جلنے سے بچانے کے لیے میں نے اپنا سر بیت الخلاء کے "کاکوس" میں ڈال کر فلش چلا چلا کر یہ جلتا ہوا مواد دھویا۔

مشی گن کے یخ ماحول میں ایک ہفتہ گزرا تھا کہ سیمی کا تار آ گیا کہ ایک اور سرخ سیاہ فام پکڑا گیا ہے اور اس نے اعتراف جرم بھی کر لیا ہے۔ اس طرح میں دوبارہ ہارلم آنے کے قابل ہوا لیکن پھر میں میڈم کے پاس نہیں گیا بس دل ہی نہیں چاہا۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ میں ہمہ وقت بیمار رہنے لگا۔ مجھے ہر وقت نزلہ رہتا اور میری ناک سے بہتا رہتا۔ میں نے نشے کی مقدار بڑھا دی تھی اور کچھ سفید فام دوستوں کے ساتھ افیون کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا۔ اب میں ماچس کی تیلیوں جیسے پتلے پتلے ریفرز نہیں پیتا تھا بلکہ ایک وقت میں اونس بھر میری جوآنا استعمال کرنے لگا تھا۔

کچھ عرصے بعد میں نے ایک یہودی کی نوکری شروع کر دی۔ اس کا نام "ہائی می" تھا اور وہ ایسے بارز اور ریسٹورنٹس خریدتا تھا جن کا کام ٹھپ ہو چکا ہو۔ وہ ان جگہوں کی نئی تزئین کرتا۔ نئے افتتاح کے لیے بہترین تقریب کا اہتمام کرتا جس میں بڑے بڑے بینرز پر "نئی انتظامیہ کے ساتھ" تحریر ہوتا جس سے متاثر ہو کر دیگر یہودی سرمایہ کار آگے آتے اور عموماً ہفتے کے اندر اندر وہ جگہ منافع پر آگے بک جاتی۔

ہائی می مجھے پسند کرتا تھا میں اس کو پسند کرتا تھا۔ وہ بولنے کا شوقین تھا میں سننے کا رسیا۔ اس کی نصف گفتگو یہودیوں اور کالوں کے متعلق ہوتی جن یہودیوں نے اپنے نام انگریزانہ کر لیے تھے ان سے اسے بے حد نفرت تھی۔ ان میں ایسے مشہور لوگوں کے نام بھی تھے جن کے متعلق عام آدمیوں کو شک بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ یہودی ہیں۔

وہ مجھ سے کہتا "ریڈ! میں یہودی ہوں تم سیاہ فام، یہ غیر یہودی ہم دونوں کو پسند نہیں کرتے۔ اگر یہودی ان غیر یہودیوں سے زیادہ ہوشیار نہ ہوتے تو یہ ہمارے ساتھ بھی تم سے بدتر سلوک کرتے۔"

جب تک میں نے اس کے ساتھ کام کیا اس نے مجھے اچھا معاوضہ دیا بعض اوقات دو تین سو ڈالر ہفتہ میں اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ لیکن میری اصل ذمہ داری ہائی می کے فروخت کردہ شراب خانوں کو اس ناجائز شراب کی ترسیل تھی جو ہائی می سپلائی کرتا تھا۔ میں اور ایک دیگر شخص "لونگ آئی لینڈ" جاتے، جہاں ناجائز وہسکی کی مشین لگی ہوئی تھی۔ ہمارے پاس جائز شراب کی خالی بوتلوں کے ڈبے ہوتے جو شراب خانے والے ناجائز طور پر بچا لیتے تھے۔ ہم پانچ گیلن غیر قانونی وہسکی خرید کر بوتلوں میں بھر لیتے اور ہائی می کی ہدایت کے مطابق اس کی ترسیل کر دیتے۔ بڑے بڑے مے شناس اپنی پسند کی شراب اور اس ہفتہ پرانی شراب کا فرق نہیں بتا سکتے تھے۔ میں نے ہائی می کی اجازت سے ناجائز شراب کی تھوڑی سی مقدار ہارلم کے علاقے میں بیچنی شروع کر دی۔ ایک ویک اینڈ پر لونگ آئی لینڈ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن میں سٹیٹ لیکر اتھارٹی، کرپشن اور غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث پائی گئی کسی اندر کے آدمی نے اطلاع دی کہ اس سلسلہ میں ہمارا نام بھی لیا جا رہا ہے ایک روز ہائی می مقررہ جگہ پر مجھ سے ملنے نہیں آیا اور نہ ہی پھر کبھی اس کے متعلق کچھ سنا۔

برونکس میں ایک اور سیاہ فام اطالوی غنڈوں سے الجھ پڑا۔ اس سیاہ فام کا حلیہ بھی پچھلے سیاہ فام کی طرح تھا یعنی "قد لمبا اور رنگ کم کالا" چہرے پر نسوانی جراب اوڑھے ہوئے اس واقعہ نے میرے متعلق شکوک کو دوبارہ ہوا دے دی۔

میں پولو گرائونڈ میں پہاڑی پر واقع فیٹ مینز بار میں ٹیلی فون بوتھ کے اندر داخل ہوا مجھے جین پارکس کو فون کرنا تھا جو ہارلم کی سب سے حسین عورت تھی اور اچھا گاتی تھی۔ ہم دونوں اچھے دوست تھے اور جب بھی میں کوئی شرط جیتتا تو ہم ملکر اس کا جشن مناتے۔ اس روز بھی میں نے اسے اسی مقصد کے لیے فون کیا تھا جسے سن کر وہ بہت خوش ہوئی۔

جونہی میں نے فون رکھا مجھے دو دبلے لیکن سخت جان اطالوی نظر آئے جو مجھے گھور رہے تھے۔ صورت حال سمجھنے کے لیے کسی چھٹی حس کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے پاس اس وقت پستول بھی نہیں تھا۔ میری جیب میں صرف سگریٹ کیس تھا۔ میں نے انہیں چکر دینے کے لیے ہاتھ جیب میں ڈالا۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر بوتھ کا دروازہ کھولا اور کہا "باہر نکلو ابھی فیصلہ کرتے ہیں" عین اسی لمحے ایک سپاہی اندر داخل ہوا اسے دیکھ کر دونوں غنڈے بھاگ گئے۔ مجھے ساری زندگی کسی سپاہی کو دیکھ کر اتنی خوشی نہیں ہوئی۔

جب میں سیمی کے اپارٹمنٹ پہنچا تو ابھی تک کانپ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ تھوڑی ہی دیر پہلے ویسٹ انڈین آرچی مجھے ڈھونڈتا ہوا آیا تھا۔

سچ پوچھیے تو بعض اوقات جب میں گزرے دنوں کو یاد کرتا ہوں تو سمجھ نہیں آتا کہ میں آج تک زندہ کیسے ہوں شاید لوگ ٹھیک کہتے ہیں ”بچوں اور بیوقوفوں کا اللہ نگہبان ہوتا ہے“ اکثر مجھے خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری نگرانی کر رہے تھے کیونکہ پچھلی ساری زندگی اگر میں جسمانی طور پر نہیں تو ذہنی طور پر ضرور مردہ تھا۔ مجھے اپنی خبر ہی نہ تھی۔

بہرحال وقت گزاری کے لیے میں نے اور سیمی نے کچھ کوکین استعمال کی۔ ویسٹ انڈین آرچی کا مجھے تلاش کرنا کچھ خاص اہم نہ لگا کم از کم اس وقت۔

!

باب:8

شکار

دروازے پر دستک ہوئی اور سیمی نے بستر پر لیٹے لیٹے پوچھا ”کون؟“ جب ویسٹ انڈین آرچی نے جواب دیا تو سیمی نے شیو کرنے کا آئینہ جس پر ابھی کچھ کوکین پاؤڈر بلکہ اس کے کرسٹلز لگے تھے۔ بستر کے نیچے کھسکا دیا۔ میں نے دروازہ کھولا۔

”ریڈ! مجھے اپنی رقم چاہیے“ ایک ”.32-20“ کے پستول کا رخ میری طرف تھا۔ یہ ایک دلچسپ پستول ہے۔ یہ .32 سے بڑا ہے لیکن .38 کے پستول سے چھوٹا ہے۔ میں بہت سے سیاہ فام لوگوں سے بھڑ چکا تھا مگر آرچی سے وہی لڑ سکتا تھا جسے اپنی زندگی عزیز نہ ہو۔

میں انتہائی خوف زدہ تھا اور مجھ سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ ”آخر مسئلہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا دراصل میں نے اس سے شرط لگانے کے لیے تین سو ڈالر لیے تھے حساب کتاب میں گڑ بڑ کی وجہ سے وہ سمجھ رہا تھا کہ میں نے جن نمبروں کا کلیم کیا تھا ان کے بجائے میں نے شرط کسی اور نمبروں پر لگائی تھی۔ ”تم پاگل ہو گئے ہو“ میں نے جلدی سے کہا میں نے کن اکھیوں سے سیمی کا ہاتھ تکیے کے نیچے رینگتے دیکھا جہاں اس کا .45 کا فوجی پستول پڑا تھا۔ ”آرچی تم ایک ذہین آدمی سمجھے جاتے ہو کہیں تم کسی ایسے شخص کو رقم تو نہیں دے بیٹھے جو شرط جیتا ہی نہ ہو؟“

.32-20 سیمی کی طرف مڑا اور سیمی وہیں جم گیا۔ ”میں تمہارا بھیجا اڑا دوں گا۔“ آرچی نے سیمی سے کہا پھر میری طرف مڑا ”سو میری رقم تمہارے پاس نہیں ہے؟“ شاید میں نے نفی میں سر ہلایا ”میں تمہیں کل دوپہر بارہ بجے تک کی مہلت دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

یہ ہسلرز کے ضابطۂ کار میں ایک مشکل صورتِ حال تھی۔ مسئلہ رقم کا نہیں تھا ابھی میری جیب میں دو سو ڈالر موجود تھے۔ سیمی خود سے یا اپنی عورت سے رقم لے کر مجھے دے سکتا تھا۔ بلکہ خود آرچی بھی سود پر مجھے قرض دے سکتا تھا۔ ہسلرز کی زبان میں بات صرف "چہرے" (Face) اور "عزت" (Honor) کی تھی۔ جب کوئی ہسلر کسی دوسرے کو نیچا دکھا دیتا تو یہ خبر سارے میں پھیلا دی جاتی۔ کسی ہسلر کے لیے یہ بات ڈوب مرنے کی ہوتی کہ کسی نے اسے دھوکہ دے دیا، دھمکی سے ڈرا دیا یا وہ مضبوط اعصاب کا مالک نہیں ہے۔ آرچی بھی جانتا تھا کہ کوئی نوجوان ہسلر صرف اس وقت اپنا مقام بنا سکتا ہے جب وہ کسی پرانے ہسلر کے دانت کھٹے کر دے۔ اور آرچی کو شک تھا کہ میں اسے نیچا دکھانے کی کوشش میں ہوں۔ مجھے علم تھا کہ اپنا مرتبہ قائم رکھنے کے لیے اس دھمکی کی تشہیر بھی کرے گا۔ اب مسئلہ میری اور سیمی کی حیثیت کا تھا۔ میں ایسے درجن بھر ہسلرز کو جانتا تھا جو شرمندگی کی وجہ سے ہارلم چھوڑ گئے تھے۔ میں درجن بھر ایسے واقعات سے بھی آگاہ تھا جن میں عزت بحال کرتے ہوئے ایک فریق مردہ خانے جبکہ دوسرا قتل کے جرم میں جیل یا برقی کرسی تک پہنچ گیا۔

ایک بار خبر پھیل جانے کے بعد ہمارے لیے واپسی کی صورت کوئی نہیں تھی۔ ہمیں اس کو پھیلنے سے پہلے روکنا تھا۔

سیمی نے اپنا .32 کا پستول مجھے دیا کیونکہ میرے والا گھر رکھا تھا۔ میں نے پستول جیب میں ڈالا اور باہر نکل گیا۔ یہ ضروری تھا کہ میں اپنے معمول کے مقامات پر حسب معمول نظر آئوں۔ شکر ہے ریگی نالڈ شہر میں نہیں تھا ورنہ وہ مجھے بچانے کی کوشش کرتا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ آرچی کی گولی کا نشانہ بنے۔ میں کچھ دیر موڑ پر مُبہم سی کیفیت میں جیسی کہ نشہ کرنے والوں کی ہوتی ہے، کھڑا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آرچی نے مجھ سے مذاق تو نہیں کیا! لیکن ہارلم کے اس جنگل میں لوگ بھائیوں کو معاف نہیں کرتے۔ نمبروں پر جواء کھیلنے والے عام طور پر نشہ بازوں کی نیچا دکھانے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ نشے میں انہیں یاد نہیں رہتا تھا کہ جو شرط وہ جیتے ہیں انہوں نے اسی نمبر پر جواء کھیلا تھا یا نہیں۔

ہو سکتا ہے ویسٹ انڈین آرچی درست کہتا ہو اور مجھے نشے میں صحیح نمبر بھول گیا ہو۔ جس بات پر آپ مکمل یقین رکھتے ہوں اگر دوبارہ کوئی اس میں شک ڈال دے تو آدمی خواہ مخواہ دبدھا میں پڑ جاتا ہے۔

اس وقت مجھے جین پارکس کے ساتھ ہونا تھا۔ میں نے سوچا فون کر کے کوئی عذر کر لیتا ہوں لیکن اس صورت حال میں فرار بدترین چیز تھی چنانچہ میں نے جین کو لیا اور ہم اونکس کلب چلے گئے جو ٹھساٹھس بھرا تھا۔ وہاں "بلی ہالیڈے" اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے میری پسند کا گیت شروع کیا جس کے بول تھے "تم

عشق کو نہیں جان پاؤ گے جب تک تم بے خواب آنکھوں سے ہر صبح نہ دیکھو۔ جب تک تم اس محبت کو کھو نہ دو جس کے کھونے سے تمہیں نفرت ہے۔"

گانا مکمل کر کے بلی ہماری میز پر آ گئی۔ وہ مجھ سے اس حد تک واقف تھی کہ اس نے میرے چہرے سے پریشانی کا اندازہ لگا لیا اور وجہ پوچھنے لگی۔ میں نے اپنی بازاری زبان میں اسے بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

کلب کے فوٹو گرافر نے ہم تینوں کی تصویر بنائی۔ یہ آخری موقع تھا جب میں نے اسے دیکھا۔ وہ مر چکی ہے۔

شکستگی اور نشے نے ایک کشادہ دل کی دھڑکن کو خاموش کر دیا۔ جس کی آواز اور انداز کی نقل آج تک کوئی کامیابی سے نہیں کر سکا۔ اس کی آواز میں سیاہ فام لوگوں کے صدیوں پرانے جبر اور غم کی روح تھی۔ کاش یہ خوبصورت، نازنین سیاہ فنکارہ وہاں ہوتی جہاں سیاہ نسل کی حقیقی عظمت کے معترف لوگ ہوتے۔

اونکس کلب کے مردانہ کمرے میں میں نے سیمی سے لی ہوئی تھوڑی سے کوکین سونگھی۔ واپسی پر جین نے مجھے مشورہ دیا کہ 147th سٹریٹ اور سینٹ نیکولس ایونیو کے موڑ پر لامار چیری جا کر ایک ڈرنک لیتے ہیں۔ میری پستول میرے پاس تھی اور کوکین نے مجھے بہادر بنا رکھا تھا۔ ڈرنک لینے کے بعد میں اتنی ہوا میں تھا کہ میں نے جین کو ایک ٹیکسی لیکر گھر جانے کے لیے کہا۔

اس روز کے بعد میں نے جین کو بھی دوبارہ نہیں دیکھا۔

احمقوں کی طرح میں بار میں ہی بیٹھا رہا۔ میں کافی دیر دروازے کی طرف پشت کیے ویسٹ انڈین آرچی کے متعلق سوچتا رہا۔ اس دن کے بعد آج تک میں دروازے کی طرف پشت کر کے نہیں بیٹھا اور نہ کبھی بیٹھونگا۔ لیکن اس روز کا فائدہ بھی ہوا کیونکہ اگر میں آرچی کو دیکھ لیتا تو یقینا اسے گولی مار دیتا۔

اگلے ہی لمحے پستول میری طرف تانے آرچی میرے سامنے کھڑا مجھے گالیاں دے رہا تھا اس نے مجھے برا بھلا کہا اور دھمکایا۔ وہ لوگوں پر اپنا اثر ڈالنا چاہتا تھا۔ ہر شخص اپنی جگہ پر ساکت تھا صرف جیوک باکس پر موسیقی بج رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت دوسرے اٹھائی گیروں کی طرح آرچی بھی نشہ کیے ہوئے ہے کافی تیز نشہ۔

میں سوچ رہا تھا کہ میں آرچی کو قتل کر دوں میں صرف اس کی پہل کا منتظر تھا۔ میرا 0.32 کوٹ کے نیچے میری بلٹ میں پسلیوں کے پاس موجود تھا ایسا لگا جیسے آرچی نے میرا ذہن پڑھ لیا ہو۔ وہ کہنے لگا "تم مجھے قتل کرنے کے

بارے میں سوچ رہے ہو ریڈ! تمہیں ایک بات بتائوں میں ساٹھ سال کا بوڑھا آدمی ہوں اپنی زندگی گزار چکا ہوں چاہو تو مجھے مار دو ہر صورت میں تمہیں جیل ہی جانا پڑے گا۔“

میں اب تک یہی سوچ رہا تھا کہ آرچی صرف اپنی عزت اور شاخت بچانے کے لیے مجھے خوفزدہ کر کے بھگانا چاہتا ہے۔ انجام کا تو مجھے علم نہیں لیکن اگر اس وقت آرچی دروازے سے باہر نکل جاتا تو مجھے اصولاً اس کے پیچھے جانا پڑتا اور گلی میں اپنا فیصلہ کرنا پڑتا۔

لیکن آرچی کے کچھ دوست آ گئے اور نرمی سے اسے سمجھانے لگے وہ اس کو ایک طرف لے گئے وہ مجھے گھورتا ہوا ان کے ساتھ پچھلے حصے میں چلا گیا۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا اس کے بعد اپنا بل ادا کر کے بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے باہر آ گیا۔ باہر آ کر میں ہاتھ جیبوں میں ڈالے تقریباً پانچ منٹ تک کھڑا رہاجب آرچی باہر نہیں آیا تو میں بھی چل دیا۔

صبح کے پانچ بجے ہونگے جب میں نے اپنے ایک سفید فام اداکار دوست کو اس کے ہوٹل جا کر جگایا۔ مجھے نشے کی ضرورت تھی اگلے چند گھنٹوں میں جتنا نشہ میں نے استعمال کیا وہ ناقابل یقین تھا۔ میں نے اس دوست سے افیون لی گھر آ کر اسے پیتا رہا اگر میرے کان میں مچھر کی بھنبھناہٹ بھی آتی تو میں پستول نکال لیتا اسی دوران مجھے سفید فام لیزبیئن کا فون آیا اسے اپنے اور اپنی دوست کے لیے پچاس ڈالرز کی ریفرز چاہیے تھے۔ میرے باتھ روم میں بنزیڈ رائن ٹیبلٹس کی بوتل پڑی تھی۔ میں نے اس میں سے کچھ گولیاں حواس بحال کرنے کے لیے کھا لیں افیون سے میرا سر پہلے ہی گھوم رہا تھا دونشوں نے ملکر میرے دماغ کو مخالف سمتوں میں کھینچنا شروع کر دیا۔

میں نے اپنے کمرے کی پشت پر واقع اپارٹمنٹ پر دستک دی۔ منشیات کے ڈیلر نے ادھار پر میری جوانا دے دی جب اس نے مجھے نشے میں دیکھا تو ریفرز بنانے میں میری مدد کرنے لگا۔ ہم نے سو سلائیاں بنائیں اور انہیں بناتے ہوئے ہم ریفرز پیتے بھی رہے۔ یعنی اب میں افیون بنزیڈ رائن اور ریفرز کے نشے میں تھا۔

راستے میں میں سیمی کے پاس رکا اس کی سیاہ فام ہسپانوی عورت نے دروازہ کھولا اب تک سیمی نشہ میں بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ وہ بستر میں لیٹا تھا اور محسوس ہوتا تھا کہ اس نے مجھے نہیں پہچانا۔ اس نے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا شیونگ آئینہ نکالا جس پر ہمیشہ کوکین کے کرسٹلز پڑے رہتے تھے اس نے مجھے بھی کوکین استعمال کرنے کا اشارہ کیا اور میں انکار نہ کر سکا۔

ریفرز کی ترسیل کو جاتے ہوئے میں نے اس قسم کی سنسنی اپنے اندر محسوس کی جیسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس ساری کیفیت کو صرف ایک لفظ سے بیان کر سکتا ہوں وہ ہے... "Time lessness" پورا دن پانچ منٹ میں سمٹ آتا یا آدھا گھنٹہ پورے ہفتہ پر پھیل جاتا۔

جب میں ہوٹل پہنچا تو دونوں سہیلیوں نے مجھے دیکھتے ہی بستر پر لٹا دیا اور میں گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

اس رات جب مجھے جگایا گیا تو آرچی کی ڈیڈ لائن گزرنے میں ابھی بہت دیر تھی، بعد میں جب میں باہر نکلا تو خبر عام ہو چکی تھی میرے جاننے والے مجھ سے کترا رہے تھے کوئی شخص بھی کراس فائر میں ملوث ہونا نہیں چاہتا تھا لیکن کچھ نہیں ہوا۔ نہ ہی اگلے روز کوئی واقعہ پیش آیا۔ میں مسلسل نشے میں رہا۔

بار میں ایک کم عمر ہسلر نے مجھ سے الجھنے کی کوشش کی اور میں نے اس کا منہ سینک دیا۔ وہ استرا لیکر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں اسے گولی مارنے ہی والا تھا کہ کسی نے مجھے پکڑ لیا اور اسے لوگ باہر لے گئے وہ مجھے گالیاں دیتا اور قتل کی دھمکیاں دیتا رہا۔

چھٹی حس نے مجھے بتایا کہ مجھے پستول سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے۔ میں نے ہسلر کو اشارہ کیا تاکہ یہ پستول اسے دے دوں عین اسی وقت ایک سپاہی بار میں داخل ہوا اس کا ہاتھ اپنی پستول کے دستے پر تھا۔ وہ میرے اور آرچی کی خبر سے آگاہ تھا اور اسے یقین تھا کہ میں مسلح ہوں۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف آیا میں جانتا تھا کہ اگر میں چھینکا بھی تو وہ مجھے گولی مار دے گا۔ اس نے کہا ”اپنا ہاتھ جیب سے باہر نکال لو ریڈ۔ بہت احتیاط کے ساتھ“ جب اس نے دیکھا کہ میں خالی ہاتھ ہوں تو وہ مطمئن ہو گیا اور مجھے اپنے آگے چل کر باہر نکلنے کا اشارہ کیا جہاں اس کا ساتھی پٹرول کار کے پاس اس کا منتظر تھا۔ میں نے ان سے پوچھا آپ لوگ کیا تلاش کر رہے ہیں کیونکہ تلاشی میں انہیں پستول نہیں ملا تھا۔ ”ریڈ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ تمہارے پاس پستول ہے۔“

”ایک تھا“ میں نے کہا ”لیکن میں نے اسے دریا میں پھینک دیا“ ان میں سے جو بار میں آیا تھا اس نے کہا ”تمہاری جگہ اگر میں ہوتا ریڈ تو یہ شہر چھوڑ دیتا۔“

میں واپس بار میں آ گیا پستول پھینک دینے کے بہانے کی وجہ سے انہوں نے میرے اپارٹمنٹ جانے کا خیال ترک کر دیا ورنہ انہیں وہاں سے اتنا مواد مل جاتا جو دس پستولوں پر بھاری ہوتا۔ اس سے نہ صرف میری سزا بڑھ جاتی بلکہ ان کی ترقی بھی یقینی تھی۔

ویسٹ انڈین آرچی پستول لیے میرے پیچھے تھا اطالوی میرا پیچھا کر رہے تھے وہ خوفزدہ ہسلر نوجوان جسے میں نے مارا تھا مجھے دھمکی دے چکا تھا اور پھر یہ پولیس والے لگتا تھا میرے گرد پھندا تنگ ہوتا جا رہے۔ گزشتہ چار سال سے آج تک میں جیل جانے یا گرفتار ہونے یا کسی مشکل میں پڑنے سے محفوظ رہا تھا لیکن مجھے علم تھا کہ اب کسی بھی لمحہ کچھ ہونیوالا ہے۔

میں سینٹ نیکولس ایونیو پر جا رہا تھا کہ میں نے ایک پولیس کار کاہارن سنا میرے خواب میں بھی نہیں تھا کہ یہ ہارن میرے لیے بج رہا ہے"ہوم بوائے" کسی نے کہا میں جھٹکے سے مڑا اور گولی چلانے ہی والا تھا کہ مجھے شارٹی نظر آیا وہ بوسٹن سے پہنچا ہی تھا اسے دیکھ کر میں بہت خوش ہوا اس نے مجھے بتایا کہ سیمی نے اس کو فون کیا تھا اور میری صورت حال بتائی تھی کہ میرا ہارلم میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں اور شارٹی اپنے بینڈ کے پیانو بجانے والے کی کارادھار مانگ کر میلوں کا سفر کرکے نیویارک آیا تھا۔ اس خلوص کے لیے کئی بار میرا جی چاہتا ہے کہ کاش میں سیمی کا شکریہ ادا کر سکتا۔ مجھ ہارلم چھوڑنے میں کوئی اعتراض نہ تھا شارٹی میرے اپارٹمنٹ کی نگرانی کرتا رہا اور میں ضرورت کی چیزیں اس کی کار کی ڈگی میں بھرتا رہا، وہ پچھلے چھتیس گھنٹے سے سویا نہیں تھا پھر بھی ہم نے فوراً واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

!

باب:9

گرفتاری

ایلاء کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں کتنا لادین اور کتنا غیر مہذب ہو چکا ہوں۔ میرا ایمان تھا کہ آدمی کو وہی کچھ کرنا چاہیے جو کچھ وہ عمدگی اور جرأت کے ساتھ کر سکے اور یہ کہ عورت ضرورت کی ایک چیز کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ میرا ایک ایک لفظ بے ادبی کا حامل تھا اور یقینا اس زمانے میں میرا ذخیرہ الفاظ دو سو سے زیادہ نہیں تھا۔

حتیٰ کہ شارٹی بھی جس کے ساتھ میں ایک بار پھر رہ رہا تھا میرے خیالات اور طرز زندگی کو دیکھ کر پریشان تھا جیسے میں کوئی خون خوار جانور تھا۔

پہلے پہل میں ہر وقت سویا رہتا تھا کیونکہ ابتدائی دو سالوں میں میرے دن کا زیادہ وقت سونے میں گزرتا جب میں جاگتا تو ریفرز پینے شروع کر دیتا۔ شارٹی نے ہی مجھے میری جوانا سے واقف کرایا تھا لیکن اب میری مقدار دیکھ کر وہ بھی حیران تھا۔

شروع میں میں زیادہ بات نہیں کرتا تھا جب آنکھ کھلتی تو ریکارڈز سننے لگتا، ریفرز نے مجھے بہت شانت کر دیا تھا میں گھنٹوں تک خلا میں تیرتا پھرتا کھلی آنکھوں خواب دیکھتا اور نیویارک کے موسیقار دوستوں کے ساتھ تصوراتی گفتگو کرتا۔ دو ہفتوں کے اندر اندر میں ہارلم کے دو مہینوں کی نیند سے زیادہ سو چکا تھا اور جب میں راکس بیری کی گلیوں میں نکلا تو مجھے ”برف“ یعنی کوکین بیچنے والے کو تلاش کرنے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگے۔

کوکین پینے والا جب اس کے پائوڈر نما سفید کرسٹلز سونگھتا ہے تو کوکین اس کے اندر اعلیٰ ترین شخصیت ہونے کا تصور پیدا کرتی ہے اور جسمانی اور ذہنی طور پر فلک بوس خود اعتمادی دیتی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کسی بھی ہیوی ویٹ چیمپئن کو چت کر سکتے ہیں اور یہ کہ آپ ہر شخص سے زیادہ ہوشیار ہیں اور ان سب کے ساتھ ساتھ Time lessness کی کیفیت اپنی جگہ ہے مزید آپ کبھی کبھی برسوں پرانے واقعات کو حیران کن صفائی کے ساتھ یاد کر سکتے ہیں۔

شارٹی بوسٹن میں مختلف جگھوں پر ہفتے میں تین چار راتیں اپنے بینڈ کے ساتھ فن کا مظاہرہ کرتا۔ جب وہ کام پر گیا ہوتا تو صوفیہ آ جاتی اور میں اسے اپنے منصوبوں کے متعلق بتاتا۔ شارٹی کے آنے تک وہ واپس چلی جاتی اور میں صبح ہونے تک شارٹی کے کان کھاتا رہتا۔

صوفیہ کے شوہر نے فوج چھوڑ دی تھی اور وہ اب کسی قسم کا سیل مین تھا جس کے لیے اسے ویسٹ کوسٹ کی جانب بہت زیادہ سفر کرنا پڑتا۔ میں نے کبھی سوال تو نہیں کیا لیکن صوفیہ اکثر اشارہ دیتی تھی کہ اس کے تعلقات اپنے شوہر کے ساتھ اچھے نہیں ہیں۔ لیکن مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی کیونکہ اس کا شوہر میرے وجود سے ہی لاعلم تھا۔ ایک سفید فام عورت غصہ میں اپنے شوہر پر چیخ سکتی ہے چلا سکتی ہے اسے برا بھلا کہہ سکتی ہے۔ اس کی بے عزتی کے لیے غلیظ ترین زبان استعمال کر سکتی ہے اس کی ماں اس کی دادی کو گالی دے سکتی ہے لیکن ایک کام کبھی نہیں کر سکتی اپنے شوہر کو یہ بتانا کہ وہ ایک سیاہ فام سے ملتی ہے یہ سیدھا سادا موت کا نشان ہے اور سفید فام عورت یہ بات اچھی طرح جانتی ہے۔

صوفیہ ہمیشہ مجھے پیسے دیتی رہتی تھی حتیٰ کہ تب بھی جب میری جیب میں سینکڑوں ڈالرز ہوتے۔ وہ ہارلم آتی تو واپسی کے کرائے کے علاوہ میں اس سے ساری رقم لے لیتا۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کچھ عورتیں استحصال پسند کرتی ہیں اور اگر ان کا استحصال نہ کیا جائے تو وہ مرد کا استحصال شروع کر دیتی ہیں۔ بہرحال مجھے لگتا ہے کہ یہ رقم اس کے شوہر کی ہوتی تھی کیونکہ صوفیہ خود کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ میرے تقاضے بڑھتے گئے اور وہ مزید رقم لانے لگی۔ اکثر اوقات میں اس کے ساتھ سختی کا سلوک کرتا تاکہ اس کا دماغ ٹھکانے آ جائے، یہ بھی ہر عورت کی اہم ضرورت ہے۔ بعض اوقات جب شارٹی کام پر گیا ہوتا تو میں صوفیہ کو مارنے پیٹنے بھی لگا وہ روتی مجھے گالیاں دیتی اور قسم کھاتی کہ وہ دوبارہ ملنے نہیں آئے گی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔

صوفیہ سے میرے تعلقات کی سب سے زیادہ خوشی شارٹی کو تھی۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا کہ میں نے زندگی بھر شارٹی سے زیادہ سفید فام عورت کا خواہش مند نہیں دیکھا اور جب سے اسے میں جانتا ہوں اس نے بہت سی سفید عورتوں سے تعلقات بنائے لیکن کوئی تعلق بھی دیرپا ثابت نہیں ہوا کیونکہ وہ ان کے ساتھ بہت شائستگی سے پیش آتا تھا اور عورت کالی ہو یا گوری وہ نری شائستگی سے بے زار ہو جاتی ہے۔

ایک رات صوفیہ اپنے ساتھ اپنی سترہ سالہ بہن کو بھی لے کر آئی جس وارفتگی سے شارٹی اور وہ ایک دوسرے سے ملے وہ میرے لیے زندگی کا پہلا موقع تھا۔ شارٹی کے لیے وہ صرف ایک سفید فام لڑکی نہیں تھی بلکہ "نوجوان" سفید فام لڑکی تھی اور اس کے لیے شارٹی صرف کالا نہیں تھا بلکہ ایک سیاہ فام "موسیقار" تھا۔ دیکھنے میں وہ صوفیہ جیسی ہی خوبصورت تھی جسے لوگ مڑ مڑ کر دیکھتے تھے میں ان دونوں لڑکیوں کو سیاہ فاموں کے ان علاقوں میں لے جاتا جہاں شارٹی اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا ہوتا۔ سفید فام لڑکیوں کو دیکھ کر سیاہ فام لوگوں کی باچھیں کھل جاتی تھیں۔ وہ آ کر ہماری میز یا بوتھ کے اردگرد کھڑے رالیں ٹپکاتے۔ شارٹی کا حال بھی ان سے کم نہ ہوتا وہ دوران کارکردگی صوفیہ کی بہن کو ہاتھ ہلاتا آنکھ مارتا اور جونہی اس کا گیت پورا ہوتا تو وہ عملی طور پر لوگوں کو روندتا ہوا ہماری میز پر پہنچ جاتا۔

میں نے لنڈی ہوپ کرنا چھوڑ دیا تھا جیسا کہ اب میں نے زوٹ سوٹ پہننا بھی چھوڑ دیا ہے۔

میں دوبارہ لورا سے ملا ہم ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے وہ مجھ سے بہت مشابہہ تھی ایک خوش وقت لڑکی وہ اپنی عمر سے کافی بڑی دکھائی دیتی تھی وہ کسی ایک مرد سے وابستہ نہیں تھی اپنی دادی کو چھوڑ چکی تھی ہائی سکول مکمل کرنے کے بعد اس نے کالج میں تعلیم کا خیال دل سے نکال دیا تھا جب بھی میں اسے ملتا وہ ہمیشہ نشے میں ہوتی ہم ملکر بھی ریفرز پیتے۔

تقریباً ایک ماہ "بے جان" یعنی بے کار پڑے رہنے کے بعد میں نے اٹھائی گیری شروع کرنے کا پھر فیصلہ کیا لیکن ایک ہسلر کو کام شروع کرنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے صوفیہ جو کچھ مجھے دے سکتی تھی وہ میں نے اس سے لے لیا اور جون ہیوز کے جوا خانے میں جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔

جب میں روکس بیری میں رہتا تھا تو جون ہیوز اتنا بڑا جواری تھا کہ مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا تھا لیکن ہارلم کی شہرت مجھ سے پہلے یہاں پہنچ چکی تھی اور نیویارک کا جادو میرے ساتھ تھا کیونکہ ہسلنگ کی دنیا میں نیویارک کے ہسلر کو جو پرشکوہ مقام حاصل ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ جنگ کے سالوں میں جان ہیوز نے ہسلر کے پیشے سے اتنا کمایا تھا کہ اپنا جوا خانہ کھول لیا۔

ایک رات میں اور جون ایک ہی کھیل کھیل رہے تھے پہلے دو پتے تقسیم ہونے کے بعد مجھے اپنے پتوں میں اکا نظر آیا، میں نے دوسرا کارڈ دیکھا تو وہ بھی اکا تھا میں نے پہلی چال چلنے کے بعد دوسرا ہاتھ خالی جانے دیا جس سے یہ

ظاہر ہوتا تھا کہ میرے اکے کے نیچے کوئی ایسا پتا نہیں ہے جس پر رقم لگانے کا رسک لیا جائے۔ مجھ سے اگلا کھلاڑی اس پھندے میں آگیا اور کافی بڑی رقم داؤ پر لگا دی اور اس سے اگلے نے اسے مزید بڑھا دیا غالباً ان سب کے پاس چھوٹے جوڑے تھے یا وہ صرف مجھے خوفزدہ کرنا چاہتے تھے۔ جب ہاتھ جون تک پہنچا تو اس نے بیگم شو کرتے ہوئے سب سے زیادہ رقم لگا دی جون کے پتوں کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا وہ ایک ذہین جواری تھا اور نیویارک کے کسی بھی بڑے جواری کے مقابلے میں کھیل سکتا تھا۔ دوبارہ میری باری آئی مجھے ان سب سے بڑھنے کے لیے بہت زیادہ رقم چاہیے تھی۔ یقینا میرے ساتھیوں کے پاس اچھے پتے تھے لیکن مجھ سے بہتر نہیں تھے۔ میں نے کافی دیر غور کرنے کے بعد ہچکچاہٹ کا تاثر دیتے ہوئے پھر ہاتھ خالی جانے دیا، سلسلہ اسی طرح چلتا رہا جب آخری پتا بانٹا گیا تو میرے پاس تیسری بار بھی اکا آیا۔ جون نے ایک اور بیگم شو کی اور جوے کی رقم بڑھا دی۔ باقی سب نے یہ دیکھ کر اپنے ہاتھ کھینچ لیے سوائے میرے۔ اگر میرے پاس رقم ہوتی تو میں پانچ سو ڈالر یا اس سے بھی زیادہ رقم داؤ پر لگا دیتا اور جان کو ساری زندگی یقین نہ آتا کہ میں نے واقعی جوا جیتا ہے یا اسے کوئی دھوکا دیا ہے۔

میں نے اپنے پتے دکھائے جون کے پاس تین بیگمیں تھیں میں جوا جیت چکا تھا جو بوسٹن میں میری سب سے بڑی جیت تھی۔ جون میز سے اٹھا اس نے اپنے ہاؤس مین سے کہا ”ریڈ جب بھی یہاں آئے اسے جو بھی چاہیے ہو اسے مہیا کیا جائے میں نے کسی نوجوان کو اپنے پتے اتنی عمدگی سے کھیلتے نہیں دیکھا۔“

میری جوے کی مہارت نے روکس بیری میں میری شہرت کو ہر طرف پھیلا دیا۔ ایک اور واقعہ جو جون کے جوے خانے میں پیش آیا اس سے یہ چرچا عام ہوگیا کہ میں پستول نہیں رکھتا بلکہ کئی پستول رکھتا ہوں۔ جان کا اصول تھا کہ جب بھی کوئی جواری آئے وہ اپنا پستول جمع کروا دے۔ میں ہمیشہ دو پستول جمع کرواتا۔ ایک روز کسی جواری نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں نے کاندھے والے ہولسٹر سے تیسرا پستول نکال لیا اس واقعے نے میری شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔

اب مڑ کر دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان دنوں میں عقل سے کچھ پیدل ہی تھا۔ میں منشیات کو غذا کے مترادف سمجھتا تھا۔ میرے دل میں کیسی خواہش تھی کہ جتنا ممکن ہو سکے انسان کو اتنی ہی شدت سے مرنا چاہیے اور اس کے لیے اسے ہر وقت تیار رہنا چاہیے اور میں تو احمقانہ حد تک مرنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔

مثلاً ایک بحری فوج کا ملاح جو میرا جاننے والا تھا ایک روز بار میں ایک پیکٹ اٹھائے ہوئے آیا اس نے مجھے اپنے پیچھے مردانہ کمرے میں آنے کا اشارہ کیا وہاں اس نے ایک چوری شدہ مشین گن مجھے بیچنے کے لیے دکھائی میں نے کہا

”مجھے کیا پتہ یہ کام بھی کرتی ہے کہ نہیں“ اس نے اس میں کارتوس بھرا اور مجھے تھما کر کہا کہ تم نے صرف ٹریگر دبانا ہے میں نے بندوق اس کے ہاتھ سے لی معائنہ کیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا میں نے اس کی نال اس کے پیٹ سے لگا دی اور کہا کہ میں تمہارے پرخچے اڑا دوں گا وہ الٹے قدموں کمرے اور بار سے نکل کر بھاگ گیا اسے علم تھا کہ میں اس کی جان لے سکتا ہوں۔

میں اتنا احمق تھا کہ میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ بھی جواباً مجھے قتل کر سکتا ہے تقریباً ایک ماہ مشین گن شارٹی کے پاس رکھنے کے بعد میں نے اسے بیچ دیا۔

ریگی نالڈ روکس بیری آیا تو میرے ہارلم کے واقعات سن کر بہت پریشان تھا میں نے کچھ وقت اس کے ساتھ گزارا وہ میرے لیے اب بھی چھوٹا سا بھائی تھا جو مجھے باقی سب سے زیادہ عزیز تھا حتیٰ کہ ایلاء سے بھی جو مجھے بے حد عزیز رکھتی تھی میں کبھی کبھی ایلاء سے ملنے جاتا، مگر وہ میرے بدلے ہوئے حالات سے کبھی سمجھوتہ نہ کر سکی۔ وہ مجھے کہتی کہ ایک دن میں کسی بڑی مشکل میں ضرور مبتلا ہو جاؤں گا لیکن مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوتا کہ کہیں دل میں ایلاء دنیا کے خلاف میری بغاوت کی معترف بھی ہے وہ اپنی نسوانیت کی وجہ سے مجبور تھی ورنہ وہ کئی مردوں سے زیادہ باحوصلہ اور جرات مند تھی۔

اپنی ذات کی حد تک میں صرف جوئے کو روز گار کی حد تک اختیار کر سکتا تھا اس واسطے کہ جان ہیوز کے جوا خانہ میں ایسے نوجوان جواری آتے رہتے تھے جن کی آمد سے کوئی اچھا جواری بڑی اچھی گزر بسر کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ جان ہیوز نے مجھے نوکری کی پیشکش بھی کی لیکن میں نے انکار کر دیا، میں کوئی ایسا کام کرنا چاہتا تھا جس سے شارٹی کو بھی فائدہ ہو۔ اس سلسلہ میں ہم نے بات چیت بھی کی۔ مجھے اس سے بہت ہم دردی تھی۔ موسیقی کے گلیمرس پیشے سے اسے اتنی آمدنی ہوتی تھی کہ مکان کا کرایہ ادا کرنے کے بعد اس کے پاس صرف کھانے، ریفرز خریدنے اور ضرورت کی اشیاء خریدنے کے پیسے بچتے تھے۔ قرض اس پر مستزاد۔ میں نے بڑے بڑے فنکاروں کے ساتھ وقت گزارا ہے مگر شہرت کے باوجود ان سب کو خالی جیب ہی پایا۔ ہزاروں ڈالر کا لین دین کرنے کے باوجود خود میرے پلے کچھ نہیں تھا۔ کوکین کی عادت کی تسکین کے لیے مجھے روز تقریباً بیس ڈالر خرچ کرنا پڑتے تھے۔ مزید پانچ ڈالر ری فرز اور سادہ سگرٹوں کے شامل کر لیں جن کی میں روزانہ تقریباً چار ڈبیاں پی جاتا تھا۔ آج آپ میری رائے لیں تو میں اتنا ہی کہوں گا کہ ”تمباکو کسی بھی شکل میں ہو دوسرے منشیات کی طرح ایک نشہ ہے۔“

میں نے نئے دھندے کے لیے شارٹی کو تیار کرنے کے لیے اس سے بات کی کہ کیوں نہ ہم گھر لوٹنے کا کام شروع کریں۔ میری توقع کے برعکس شارٹی فوراً تیار ہوگیا حالانکہ اسے چوری، نقب زنی کا کچھ علم نہیں تھا۔ شارٹی نے اپنے دوست روڈی کو بھی شامل کرنے کے لیے کہا۔ روڈی کی ماں اطالوی اور باپ حبشی تھا۔ اس کی پیدائش بوسٹن میں ہی ہوئی تھی۔ وہ پست قد اور ہلکے رنگ کا خوش نما لڑکا تھا۔ وہ ایک ایجنسی کی طرف سے اعلیٰ تقریبات میں بیرہ گیری کرتا تھا۔ ہفتے میں ایک دن وہ ایک ارسٹو کریٹ کے گھر جاتا جو ایک بوڑھا شخص تھا۔ وہ اپنے اور اس کے کپڑے اتار کر بوڑھے کو گود میں اٹھا کر بستر پر لٹاتا اور اس پر ٹالکم پاؤڈر چھڑکتا۔ جس سے بوڑھے کو جنسی تسکین حاصل ہوتی۔ میں نے روڈی اور شارٹی کو ہارلم کے جنسی رجحانات سے آگاہ کیا۔ نیویارک میں یہ کام منظم سطح پر نہیں تھا۔ انفرادی سطح پر گوروں نے اپنی اپنی تسکین کے لیے سیاہ فام لوگوں سے رابطے قائم کر رکھے تھے جو ان کے گھروں میں شوفر، نوکرانیاں، بیرے وغیرہ بن کر آتے جاتے تھے۔ نیویارک کی طرح یہاں بھی بے حد امیر بوڑھے جو ہر لحاظ سے "اذکار رفتہ" تھے، تسکین طبع کے نت نئے راستے تلاشتے رہتے تھے۔

روڈی نے مجھے ایک گورے کے متعلق بتایا کہ وہ ایک سیاہ فام جوڑے کو صرف اس لیے رقم دیتا تھا کہ وہ اس کا بستر استعمال کریں، ایک اور گورا صرف اس کمرے کے باہر کرسی پر بیٹھنے کے لیے رقم دیتا تھا جہاں کوئی سیاہ فام جوڑا "مصروف عمل" ہو۔ وہ سارا لطف اپنے تصور سے کشید کرتا تھا۔

"نقب زنی" میں جاسوس کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ فائنڈر (Finder) وہ ہوتا ہے جو منافع بخش جگہیں تلاش کرتا ہے دوسری اہم ضرورت مطلوبہ جگہ کا عملی خاکہ بنانا ہوتی ہے مثلاً محفوظ داخلی راستہ اور بہترین راہِ فرار وغیرہ۔ روڈی اگر کسی گھر میں ملازمت کے لیے جاتا تو اسے سفید کوٹ میں گھومتے پھرتے دیکھ کر کوئی شک نہیں کر سکتا تھا کہ وہ نقب زنی کے لیے گھر کا جائزہ لے رہا ہے۔

روڈی کو جب منصوبے کے متعلق بتایا گیا تو اس کے چہرے پر تاثر یہی تھا گویا پوچھ رہا ہو "کام کب سے شروع کرنا ہے؟" مگر میں اپنے تجربے اور دوسروں کی نصیحت کی روشنی میں یہ کام اندھا دھند شروع نہیں کرنا چاہتا تھا اس کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔ کیونکہ سوچی سمجھی نقب زنی میں خطرہ اپنی جگہ لیکن کم سے کم رسک میں کامیابی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اور اگر آپ اہل خانے سے سامنا ہوئے بغیر اپنا کام مکمل کر لیں تو اس کے دو فائدے ہیں ایک تو حملے یا قتل کے امکانات کم ہو جاتے ہیں دوسرے اگر بعدازاں آپ پکڑے بھی جائیں تو چشم دید گواہ کوئی نہیں ہوتا۔

نقب زنی کے میدان کا تعین اور اس سے وابستگی بھی بنیادی ضرورت ہے۔ نقب زنوں کے اپنے مخصوص رجحان یا میدان ہوتے ہیں بعض اپارٹمنٹس میں نقب لگاتے ہیں اور بعض گھروں میں، کچھ دکانوں اور گوداموں کو پسند کرتے ہیں اور کچھ تجوریوں وغیرہ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

رہائشی علاقوں میں نقب زنی میں بھی تقسیم کار پائی جاتی ہے۔ دن میں نقب لگانے والے۔ کھانے اور تھیٹر کے اوقات کے نقب زن اور رات کو کام کرنے والے اور میرے خیال میں کسی بھی شہر کی پولیس آپ کو بتا سکتی ہے کہ کوئی نقب زن اپنے انداز سے ہٹ کر کبھی نقب زنی نہیں کرتا مثلاً ہارلم کا "جمپ سٹیڈی" رات کے وقت اپارٹمنٹس میں نقب زنی کا ماہر تھا اگر دن کے وقت کوئی کروڑ پتی اپنے گھر کے دروازے کھلے چھوڑ کر بھی چلا جائے تو وہ ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا۔

اپنے رجحان کے ساتھ ساتھ دن میں کام نہ کرنے کی میرے پاس ایک خاص وجہ اور بھی تھی۔ یعنی اپنی قامت اور حلیہ۔ دن کے وقت میں دور سے پہچانا جاتا تھا۔ لوگ کہتے "وہ چھ فٹ سے لمبا، بھورا سرخ، کالا۔"

اپنے منصوبے کو بے عیب بنانے کے لیے میں نے دو وجوہ سے سفید لڑکیوں کو ساتھ ملایا۔ نمبر ایک تو روڈی چند مخصوص جگہوں کے علاوہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ نمبر دو یہ کہ امراء کے رہائشی علاقوں میں سیاہ فام زخمی انگوٹھے کی طرح الگ دکھائی دیتا تھا جبکہ سفید فام لڑکیاں ہر جگہ آسانی سے پہنچ سکتی تھیں۔

مجھے بیک وقت اتنے لوگوں کی شمولیت پر اعتراض تھا لیکن شارٹی اور صوفیہ کی بہن اور صوفیہ اور میں پرانے واقف تھے جبکہ روڈی بھی ہمارا اہم رکن تھا اور ہم سب ایک گھر کی طرح تھے۔ مجھے یقین تھا کہ صوفیہ میرا کہا اور صوفیہ کی بہن صوفیہ کا کہا کبھی نہیں ٹالے گی۔ جب میں نے صوفیہ اور اس کی بہن کو اپنے منصوبے کے متعلق بتایا تو وہ فوراً تیار ہوگئیں صوفیہ کا شوہر ان دنوں اپنے کاروباری دورے پر تھا۔

میں جانتا تھا کہ زیادہ تر نقب زن دوران کار نہیں بلکہ لوٹ کے سامان کو بیچتے ہوئے پکڑے جاتے ہیں ہم نے مال کی فروخت کے لیے ایک خریدار بھی تلاش کر لیا جس کے شہر میں بہت سے گیراج اور گودام تھے۔ اس نے براہ راست معاملات طے کرنے کی بجائے اپنے نمائندے کے ذریعے شرائط طے کیں جن کے مطابق کسی بھی نقب زنی سے پہلے میں نے اس کے نمائندے کو ہوشیار کرنا تھا اور اسے لوٹ کے مال کے متعلق کچھ آئیڈیا دینا تھا اور اس نے ہمیں بتانا تھا کہ ہم نے مال کس گیراج یا گودام میں پہنچانا ہے۔ مال کی ترسیل کے بعد نمائندے نے چوری شدہ اشیاء کا جائزہ

لے کر تمام شناختی علامات مٹاتا تھیں پھر اس کے بعد اصل خریدار کو بلایا جاتا جو مال کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتا۔ اگلے روز پہلے سے طے شدہ جگہ پر نمائندہ مجھے ملتا اور مسروقہ اشیاء کی نقد ادائی کرتا ایک اور اہم بات یہ کہ یہ خریدار ہمیشہ نئے اور کرارے نوٹوں میں رقم ادا کرتا۔ جس کا ہم پر بہت نفسیاتی اثر پڑتا۔ جیب میں کھڑکھڑاتے ہوئے سبز نوٹ ڈال کر گھومنا ایک خوش کن کام تھا۔ ہمیں اپنے آپریشنز کے لیے ایک بیس چاہیے تھا جو روکس بیری میں نہ ہو، سو لڑکیوں نے ہارورڈ سکوائر میں ایک اپارٹمنٹ کرایہ پر لے لیا جو زمینی منزل پر تھا اور جہاں ہم رات گئے بغیر کسی کی توجہ لیے بلا روک ٹوک آ جا سکتے تھے۔

کسی بھی تنظیم میں ایک نہ ایک باس کا ہونا ضروری ہے حتیٰ کہ اگر آپ اکیلے بھی ہوں تو آپ کو خود اپنا باس بننا پڑتا ہے۔

ہم نے اپارٹمنٹ میں اپنے گروہ کی پہلی میٹنگ میں اپنے طریقہ کار پر گفتگو کی، جس کے مطابق لڑکیوں کو گھنٹی بجا کر کسی بھی گھر میں بطور سیلز وومن، سروے کرنے والی کالج کی لڑکیاں، اعداد و شمار اکٹھے کرنے والی یا کوئی بھی مناسب بہانہ بنا کر داخل ہونا تھا اور بغیر شک ڈالے گھر کا جائزہ لینا تھا پھر واپس آ کر بتانا تھا کہ کون کونسی قیمتی اشیاء کہاں کہاں پڑی ہیں۔ وہ شارٹی، روڈی اور میرے لیے خاکہ بناتیں، عام طور پر ہم تینوں ہی نقب زنی کے لیے جاتے۔ ہم میں سے دو کام کرتے اور تیسرا گاڑی کا انجن سٹارٹ رکھتے ہوئے نگرانی کرتا یہ بات طے تھی کہ جب تک کوئی خصوصی فائدہ نہ ہو لڑکیوں کو نقب زنی میں استعمال نہیں کیا جائے گا۔

منصوبہ سازی کرتے ہوئے میں ارادتاً ان سے ہٹ کر بستر پر جا بیٹھا اچانک میں نے اپنی گن نکالی اور اس کی پانچوں گولیاں نکال دیں، پھر میں نے سب کو دکھا کر صرف ایک گولی سیلنڈر میں ڈالی اور نال اپنے سر سے لگاتے ہوئے کہا "میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم سب کتنے حوصلہ مند ہو" ان سب کے منہ کھلے ہوئے تھے میں ہنسا اور ٹریگر دبا دیا۔ کلک کی آواز آئی میں نے کہا "میں ایک بار پھر کرتا ہوں" وہ مجھے روکنے کے لیے منتیں کرنے لگے شارٹی اور روڈی مجھے پکڑنا چاہتے تھے۔ اس مرتبہ پھر گولی نہیں چلی اور صرف کلک کی آواز آئی لڑکیاں سخت خوفزدہ تھیں شارٹی اور روڈی مجھے روکنے کے لیے منتیں کر رہے تھے میں نے تیسری بار پھر گھوڑا دبا دیا اور کہا "میں تمہیں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ میں موت سے نہیں ڈرتا کبھی ایسے شخص کو دھوکا مت دینا جو موت سے نہ ڈرتا ہو آئو اب کام شروع کریں۔"

اس واقعہ کے بعد مجھے ان سے کبھی شکایت نہیں ہوئی صوفیہ کی بہن مجھے ہمیشہ "مسٹر ریڈ" کہہ کر بلاتی۔ روڈی اور شارٹی بھی پہلے والے نہ رہے ان کا خیال تھا کہ میں پاگل ہوں اور وہ مجھ سے خوفزدہ تھے۔

اس رات ہم نے اپنی پہلی واردات کی اسی آدمی کے گھر جس کے جسم پر روڈی ٹالکم پاؤڈر چھڑکنے پر ملازم تھا۔ ہر کام بڑی صفائی اور عمدگی کے ساتھ ہوا۔ ہمارا خریدار بے حد مطمئن تھا اور اس نے اپنے اطمینان کا ثبوت کھڑ کھڑاتے ہوئے نئے نوٹوں سے دیا۔ بہت جلد ہم نے نقب زنی کو سائنس بنا دیا۔ اگر لوگ گھر پر نہ ہوتے تو ہم عام دروازوں کے تالے کھولنے کے لیے پاس کی (Pass Key) کرتے اور اگر تالا مضبوط ہوتا تو ہم لوہے کی سلاخ استعمال کرتے یا بعض اوقات ہم حفاظتی کھڑکی یا چھت کو داخلے کے لیے استعمال کرتے۔ لڑکیاں جب کسی گھر میں داخل ہو کر گھر کی قیمتی اشیاء کی تعریف کرتیں تو سادہ لوح عورتیں انہیں شوق ہی شوق میں سارا گھر دکھانا شروع کر دیتیں۔ اس کے بعد چھوٹی سی ٹارچ کی روشنی میں مطلوبہ اشیاء تک پہنچنا ہمارے لیے بالکل آسان ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات اہل خانہ سو رہے ہوتے تھے گھر میں داخل ہو کر ہم سب سے پہلے انتظار کرتے اور سونے والوں کی سانس کی آواز سننے کی کوشش کرتے خراٹوں کی آواز سے ہمیں محبت تھی کیونکہ ان کے بعد ہماری فکر آدھی بھی نہیں رہتی تھی۔ جرابیں پہنے ہوئے ہم سیدھے خواب گاہ جاتے سایوں کی طرح خاموشی اور تیزی کے ساتھ ہم کپڑے گھڑیاں، بٹوے، ہینڈ بیگز اور زیورات کے ڈبے سمیٹ لیتے۔

کرسمس کا موسم ہمارے لیے "سانتا کلاز" ثابت ہوا۔ گھروں میں ہر طرف قیمتی تحفے بکھرے ہوتے اور لوگوں نے بنکوں سے غیر معمولی رقوم نکلوائی ہوتیں۔ ان دنوں ہم ایسے گھروں میں بھی گھسنے کا خطرہ مول لے لیتے جن کے متعلق پہلے سے معلومات حاصل نہ ہوتیں اگر پردے گرے ہوتے بتیاں بند ہوتیں اور لڑکیوں کی گھنٹی پر کوئی باہر نہ آتا تو ہم ضرور کوشش کرتے۔

اگر آپ نقب زنوں کو گھر سے دور رکھنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو ایک بہت اچھا ٹپ دے سکتا ہوں۔ ایک جلتا ہوا بلب تحفظ کا واحد بہترین ذریعہ ہے اور کسی غسل خانے کی بجلی رات بھر جلتی چھوڑ دینا مثالی طریقہ ہے کیونکہ غسل خانہ واحد ایسی جگہ ہے جہاں کوئی بھی شخص رات کے کسی بھی پہر کتنی بھی دیر کے لیے موجود ہو سکتا ہے اور رات کے سناٹے میں ہلکی سی آواز بھی سن سکتا ہے۔ ایسی صورت میں کوئی بھی نقب زن گھر میں گھسنے کی جرأت نہیں کرے گا، یہ سب سے سستی ممکنہ حفاظت ہے اور رہا بجلی کا خرچ تو وہ آپ کی قیمتی اشیاء سے زیادہ اہم نہیں ہے۔

ہم زیادہ ماہر ہوتے گئے بعض اوقات ہمارا خریدار بھی لوٹ مار کی اچھی جگہوں کی نشان دہی کرنے لگا۔ انہی دنوں میں ہم نے مشرقی قالینوں میں تخصیص حاصل کرلی مجھے ہمیشہ شک رہتا کہ ہمارا خریدار انہی لوگوں کو وہ قالین دوبارہ بیچ دیتا جن سے ہم انہیں چراتے تھے۔ ہمیں ان کی قیمت کا کچھ اندازہ نہیں تھا ایک بار ایک چھوٹے سے قالین کا معاوضہ ہمیں ایک ہزار ڈالر ملا جس سے آپ خریدار کی آمدنی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہر نقب زن کو علم ہے کہ اس کا خریدار اسے ان لوگوں سے بھی زیادہ بدتر طریقے سے لوٹتا ہے جنہیں نقب زن لوٹتے ہیں۔

پولیس سے ہمارا صرف ایک بار سامنا ہوا جب ہم نقب لگا کر نکل رہے تھے۔ ہم تینوں اگلی نشست پر بیٹھے تھے جب کہ پچھلی نشست پر سامان بھرا ہوا تھا اچانک ہم نے سامنے سے پولیس کار آتے دیکھی جو قریب سے گزر گئی وہ معمول کی گشت پر تھے لیکن عقبی آئینہ (Rear View Mirror) میں ہم نے انہیں یوٹرن لیتے دیکھا اور ہمیں علم ہوگیا کہ انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے اور انہیں اچھی طرح علم ہے کہ اس علاقے میں اتنی رات گئے کسی سیاہ فام کا کوئی کام نہیں۔ ان دنوں ڈکیتیاں بھی زیادہ ہو رہی تھیں اور بہت سارے گروہ مصروف کار تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمیں روکتے میں نے روڈی کو گاڑی روکنے کے لیے کہا اور وہی کیا جو ایک بار پہلے کر چکا تھا میں اتر کر ان کی گاڑی کی طرف گیا۔ انہوں نے گاڑی روکی تو میں نے ایک پریشان سیاہ فام کی اداکاری کرتے ہوئے ان سے روکس بیری کا ایک پتہ پوچھا۔ انہوں نے مجھے پتہ سمجھایا اور دونوں گروہ اپنے اپنے راستے پر چل دیئے۔

ہم بہت اچھے جا رہے تھے کافی رقم کماتے اور اسے ختم ہونے تک معمول کی زندگی گزارتے شارٹی اپنے بینڈ کے ساتھ کام کرتا روڈی اپنے حساس بوڑھے کو باقاعدگی سے ملتا یا خاص خاص دعوتوں میں بیرا گیری کرتا اور لڑکیاں اپنے گھریلو معمولات بھگتاتیں۔

کبھی کبھی میں لڑکیوں کو ان جگہوں پر لے جاتا جہاں شارٹی اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا ہوتا۔ ہم کھل کر دولت خرچ کرتے لڑکیاں زیورات اور قیمتی پوستینیں پہنے ہوتیں جو ہماری لوٹ کا حاصل تھے۔ کبھی کبھی ہم سب مل کر ریفرز پیتے اور موسیقی سنتے اگرچہ یہ بتانا کافی شرم کی بات ہے لیکن شارٹی سفید لڑکیوں کا اتنا دیوانہ تھا کہ اگر بجلی بند بھی ہوتی تو وہ چلمن ہٹا کر گلی کے بلب کی روشنی میں ان کے سفید گوشت کو دیکھنا پسند کرتا۔

اکثر رات کے پہلے پہر میں ”میساچوسٹس ایونیو“ پر واقع ”سیوائے“ نائٹ کلب چلا جاتا صوفیہ بھی مجھے وہاں باقاعدگی سے فون کرتی حتیٰ کہ دھندے پر جانے سے پہلے بھی میں وہاں ضرور جاتا اور کام ختم کرتے ہی وہاں پہنچ جاتا۔ وجہ

واضح تھی کہ اگر کسی وقت ضرورت پڑے تو لوگ تصدیق کر سکیں کہ واردات کے وقت میں وہاں تھا، کیونکہ پولیس تفتیش کے دوران زیادہ تر سیاہ فام کسی خاص وقت پر کسی خاص جگہ اپنی موجودگی ثابت کرنے میں ناکام رہتے۔

ان دنوں بوسٹن میں دو سیاہ فام جاسوس ہوا کرتے تھے جب سے میں روکس بیری واپس آیا تھا۔ ان میں سے ایک جاسوس جس کا نام ٹرنر تھا کو مجھ سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور کچھ ایسا ہی حال میرا بھی تھا۔ وہ اکثر لوگوں کو کہتا پھرتا کہ وہ کسی روز مجھ سے دو دو ہاتھ کرے گا میں بھی اپنا جواب افواہوں کی صورت میں فوراً پھیلا دیتا۔ سب جانتے تھے کہ میں ہر وقت مسلح ہوتا ہوں اور ٹرنر بھی سمجھتا تھا کہ اگر اس کا سابقہ مجھ سے پڑا تو میں اس بات سے قطع نظر کہ وہ سراغ رساں ہے یا نہیں بے دریغ اسلحہ کا استعمال کروں گا۔

ایک شام میں اپنے مخصوص وقت پر "سوائے" میں بیٹھا ہوا تھا کہ بوتھ میں فون کی گھنٹی بجی عین اس لمحہ داخلی دروازے سے ٹرنر اندر آیا۔ میں فون سننے کے لیے اٹھ ہی رہا تھا لیکن وہ مجھ سے پہلے بوتھ میں داخل ہوا اور فون اٹھالیا۔ میں نے اسے ہیلو ہیلو، ہیلو کہتے سنا مجھے علم تھا کہ صوفیہ نے اجنبی آواز سنتے ہی فون رکھ دیا۔ "کیا یہ کال میرے لیے نہیں تھی؟" میں نے ٹرنر سے پوچھا جس کا اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا "پھر تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" اس نے مجھے ایک سخت سا جواب دیا میں جانتا تھا کہ وہ مجھے پہل پر اکسانا چاہتا ہے۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں وہ ایسی کوئی بات نہیں کہنا چاہتا تھا جس پر اسے بعد میں پچھتانا پڑے اور میں ایسی کوئی بات نہیں کہنا چاہتا تھا جو ایک پولیس والے کو دھمکانے کے زمرے میں آتی ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں، تاکہ بار میں لوگ بھی سن لیں ٹرنر سے کہا "تمہیں پتا ہے ٹرنر... تم کوئی کارنامہ دکھانا چاہتے ہو لیکن شاید تمہیں علم نہیں کہ اگر مجھے تنگ کرو گے تو تم خود تاریخ کا حصہ بن جائو گے کیونکہ تمہیں مجھے جان سے مارنا پڑے گا۔"

ٹرنر نے مجھے دیکھا اور میرے قریب سے ہو کر باہر چلا گیا وہ ابھی تاریخ بنانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ مجھے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے میں ہر وقت کندھوں پر اپنا تابوت اٹھائے پھرتا ہوں۔

جرائم کی دنیا کا اصول ہے کہ ہر مجرم اپنے پکڑے جانے کی توقع رکھتا ہے اور اس ناگزیر حقیقت کو جب تک ممکن ہو ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔

منشیات، پکڑے جانے کا خوف میرے ذہن سے ہٹائے رکھتیں۔ نشہ میری زندگی بن چکا تھا اور میں اس مقام پر آ گیا تھا جہاں اپنی پریشانیاں اور دبائو دور کرنے کے لیے میں روزانہ ریفرز یا کوکین یا دونوں کافی زیادہ استعمال کرنے لگا تھا لیکن اب ابتدائی دنوں کے برعکس یہ اتنا آسان نہیں رہا تھا کہ میں نشہ استعمال بھی کروں اور کسی کو محسوس بھی نہ ہو۔

ایک ہفتے جب ایک بڑی واردات کے بعد ہم غیر مصروف تھے میں نشے کی حالت میں کلب پہنچا تو بار ٹینڈر کے "ہیلو ریڈ" کہتے ہی میں سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میرا اصول تھا کہ اس طرح کی صورتحال میں کبھی خود سوال مت کرو بتانے والا جو ضروری ہو گا خود بتا دے گا۔ لیکن شاید بار ٹینڈر کو اس کا موقع نہیں ملا جب میں نے سٹول پر بیٹھ کر مشروب کا حکم دیا تب میں نے انہیں دیکھا۔

اندر رقص گاہ کے پاس صوفیہ اور اس کی بہن ایک سفید فام آدمی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔

مجھے نہیں علم کہ میں نے اتنی بڑی غلطی کیسے کی مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ سفید فام کون ہے اور اگر تھی بھی تو میں بعد میں صوفیہ سے پوچھ سکتا تھا لیکن کوکین نے قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ وہ صوفیہ کا شوہر تو نہیں تھا بلکہ اس کا قریب ترین دوست تھا جو اس کے ساتھ جنگ میں رہ چکا تھا۔ اس رات وہ صوفیہ اور اس کی بہن کو کھانا کھلانے باہر لے گیا تھا اور واپسی پر سیاہ فاموں کے علاقے میں یونہی رک گیا تھا۔ دونوں بہنوں نے اس کا خیال تبدیل کرنے کی بہت کوشش کی کیونکہ وہ دونوں روکس بیری میں اچھی طرح پہچانی جاتی تھیں لیکن وہ نہیں مانا۔ دونوں بہنیں سنجیدہ چہرہ بنائے اجنبی سی بن کر کلب میں داخل ہوئیں ان کا اشارہ سمجھ کر سارے بار ٹینڈرز اور بیرے بھی اجنبی سے بن گئے۔ اتنے میں میں آ گیا میں نے انہیں بے بی کہہ کر بلایا دونوں بہنوں کے رنگ سفید اور ان کے دوست کا رنگ سرخ ہو گیا۔

اسی رات اپنے کمرے میں میری طبیعت کافی خراب ہو گئی یہ کوئی جسمانی تکلیف نہیں تھی۔ میں اپنے بستر میں نیم خوابیدہ تھا جب میں نے دروازے پر دستک سنی۔ مجھے فوراً گڑبڑ کا احساس ہوا کیونکہ ہم سب کے پاس اپنی اپنی چابیاں تھیں اور کوئی بھی دروازے پر دستک نہیں دیتا تھا۔ میں فوراً بستر کے نیچے لڑھک گیا میں اتنا نشے میں تھا کہ میز سے اپنی گن اٹھانا بھی بھول گیا۔

میں نے چابی گھومنے کی آواز سنی اور مجھے جوتے اور پینٹ کے پائنچے اندر آتے دکھائی دیئے آنے والا کمرے میں ادھر ادھر چلتا پھرتا رہا آخر اس نے بستر کے نیچے جھانکا وہ صوفیہ کے شوہر کا دوست تھا۔ اس کے چہرے پر بہت سنجیدگی تھی۔

"ہا ہا۔ تمہیں کیسا بیوقوف بنایا ہے ناں؟" میں نے ہنس کر کہا حالانکہ ہنسنے والی کوئی بات نہ تھی۔ میں بستر کے نیچے سے نکل آیا اور کھسیانی ہنسی ہنستا رہا وہ مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی سانپ تھا۔ میں نے اس سے کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ پہلے ہی سب کچھ جان چکا تھا اور لڑکیوں کی چیزیں کمرے میں اور الماری میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ لڑکیاں اس وقت یہاں نہیں ہیں اس کے بعد وہ چلا گیا۔ جس چیز نے مجھے بعد میں زیادہ پریشان کیا وہ گن کے بغیر بستر کے نیچے چھپنا تھا۔ مجھ سے واقعی غلطیاں ہونے لگی تھیں۔

میں نے ایک چرائی ہوئی گھڑی کا شکستہ کرسٹل ایک جوہری کو تبدیل کرنے کے لیے دیا تھا دو دن بعد جب میں گھڑی واپس لینے گیا تو سارا معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔ یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ گن میرے لباس کا ایک حصہ تھی۔

مسروقہ گھڑی چونکہ بہت قیمتی تھی چنانچہ اس کے مالک نے اس کی تفصیل مع شکستہ کرسٹل سارے میں پھیلا دی تھی اور سارے بوسٹن کے جوہری ہوشیار تھے۔

اس یہودی نے گھڑی میرے حوالے کرنے سے پہلے مرمت کی رقم مجھ سے وصول کی۔ اس کے بعد اس نے اشارہ کیا اور میرے پیچھے ایک آدمی نمودار ہوا جس نے ایک ہاتھ جیب میں ڈال رکھا تھا میں سمجھ گیا کہ وہ پولیس والا ہے۔ اس نے مجھے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا عین اسی لمحے ایک بے گناہ سیاہ فام دکان میں داخل ہوا۔ سراغ رساں اسے میرا ساتھی سمجھ کر اس کی طرف بڑھا سراغ رساں کی پشت میری طرف تھی وہ دوسرے سیاہ فام کے ساتھ مصروف گفتگو تھا اور میں مسلح تھا۔ آج میں سوچتا ہوں کہ شاید اللہ کو میری زندگی بچانا تھی اس لیے میں نے اسے گولی مارنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا نام سلیک تھا میں نے اپنے ہاتھ کھڑے کئے اور اس سے کہا "پہلے میری گن لے لو۔"

گن لیتے وقت وہ اس بات پر بے حد حیران تھا کہ میں نے اسے قتل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ میری گن لے کر اس نے اشارہ کیا اور دو اور چھپے ہوئے سراغ رساں اپنی جگہ سے باہر نکل آئے "اگر میں کوئی غلط قدم اٹھاتا تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا" یہ سوچنے کے لیے جیل میں مجھے بہت لمبی فرصت ملنے والی تھی۔

اگر میں اس روز وہاں گرفتار نہ ہوتا تو شاید اگلے روز جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ صوفیہ کے شوہر کے دوست نے صوفیہ کے شوہر کو میرے متعلق بتا دیا تھا اور جس وقت مجھے تھانے لے جایا گیا اس وقت صوفیہ کا شوہر پستول لیے میرے اپارٹمنٹ میں مجھے تلاش کر رہا تھا۔

مجھے مارا پیٹا نہیں گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے سراغ رساں کو قتل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

انہوں نے تلاشی کے دوران ملنے والے کاغذات سے میرا پتہ معلوم کر لیا۔ بہت جلد لڑکیاں بھی پکڑی گئیں۔ شارٹی اسی رات مظاہرہ فن کے دوران گرفتار کر لیا گیا۔ لڑکیوں نے روڈی کی نشاندہی بھی کر دی لیکن جانے کیسے روڈی کو پہلے سے خبر مل گئی اور وہ بوسٹن سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور کبھی ان کے ہاتھ نہیں آیا۔

میں ہزار بار سوچ چکا ہوں کہ میں ایک دن میں دو بار موت کے منہ سے کیسے بچ نکلا اسی لیے مجھے یقین ہے کہ سب کچھ پہلے سے لکھا ہوا ہے۔

پولیس والوں کو میرے اپارٹمنٹ سے فرکوٹس، زیورات اور دوسری چھوٹی موٹی اشیاء کے علاوہ ہمارے پیشے سے متعلق دیگر اوزار مثلاً تالا توڑنے کی سلاخ، شیشہ کاٹنے کا آلہ، پیچ کس، چھوٹی فلیش لائٹس اور میرے پستولوں کا ذخیرہ بطور ثبوت مل گیا۔

لڑکیوں کو معمولی ضمانت پر رہا کر دیا گیا اس لیے کہ وہ نقب زن تھیں یا جو بھی تھیں وہ سفید فام تو تھیں اور ان کا بدترین جرم سیاہ فاموں کے ساتھ ملوث ہونا تھا۔ شارٹی اور مجھے دس ہزار کے مچلکے داخل کرانے کا حکم ہوا، جس کا انہیں یقین تھا کہ ہم کبھی نہ کر سکیں گے۔

سماجی کارکن ہماری اصلاح پر تُل گئے ان کی اصل پریشانی کالوں اور گوروں کا اشتراک تھا اور یہ چیز قانون اور سماجی کارکن دونوں کے لیے پریشانی کا باعث تھا، ہم کب کیسے اور کہاں ملے؟ کیا ہم اکٹھے سو چکے ہیں؟ وہ سب یہی سوال پوچھتے تھے کسی کو ڈکیتیوں سے کوئی غرض نہیں تھی انہیں صرف یہی غصہ تھا کہ ہم نے سفید فام عورتوں کو اپنے ساتھ کیوں ملایا تھا۔ حتیٰ کہ عدالتوں کے منشی اور بیلفس انہیں بے چاری شریف سفید فام لڑکیاں اور ہمیں لعنتی سیاہ فام کہہ کر بلاتے تھے، اور یہی سلوک ہمارے ساتھ عدالتوں میں سرکاری وکیل کرتے تھے۔ میں نے جج کے آنے سے پہلے اپنے وکیل سے کہا "لگتا ہے ہمیں ان لڑکیوں کی وجہ سے سزا ضرور ہو جائے گی۔" وہ یہ سن کر گردن تک سرخ ہو گیا اور کاغذ الٹتے ہوا بولا "تمہیں لڑکیوں سے کوئی غرض نہیں رکھنی چاہیے۔"

بعد میں جب مجھے سفید فام لوگوں کے متعلق مزید حقائق کا پتہ چلا تو میں نے جانا کہ اول درجے کی نقب زنی (جیسا کہ ہم کرتے رہے تھے) کی سزا اوسطاً دو سال تھی لیکن ہمیں یہ اوسط سزا نہیں ملی کیونکہ ہمارا اصل جرم دوسرا تھا۔

بات آگے بڑھانے سے پہلے میں یہ وضاحت کر دوں کہ اپنے تلخ اور گھناؤنے ماضی کی تفصیل میں نے کسی سے بیان نہیں کی اور نہ اب کسی تکبر کی وجہ سے میں یہ بتا رہا ہوں کہ میں کتنا برا تھا، لیکن لوگ اندازہ لگاتے رہتے ہیں کہ جیسا میں اب ہو ایسا کیوں ہوں؟ کسی آدمی کو سمجھنے کے لیے اس کی زندگی کا پیدائش کے وقت سے جائزہ لینا ضروری ہے۔ ہمارے تمام تجربات ہماری شخصیت کا حصہ بنتے ہیں جو کچھ ہمارے ساتھ پیش آتا ہے وہ ہمارا جزو بن جاتا ہے۔

آج جب میرے پاس وقت بہت کم ہے میں ایسی کتاب لکھنے پر وقت صرف نہیں کر سکتا جس کا مقصد قارئین کو محض خوش کرنا ہو، میں اپنی کہانی اس واسطے تفصیل کے ساتھ بتا رہا ہوں تاکہ آپ دیکھ اور سمجھ سکیں کہ میں امریکہ کے سفید فام معاشرے میں ذلت کی کن پستیوں میں رہ رہا تھا۔ لیکن جلد ہی جیل میں مجھے اللہ اور دین اسلام سے آگاہی حاصل ہوئی اور اس نے میری زندگی کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا۔

!

باب: 10

شیطان

کسی نہ کسی طرح شارٹی کی ماں نے لانسنگ سے بوسٹن تک کا کرایہ اکٹھا کر لیا۔ بیٹے سے ملتے ہوئے وہ باربار کہتی ”بیٹے کتابِ الہام پڑھو اور خدا سے دعا کرو“ یہ بات ایک بار اس نے مجھ سے بھی کہی۔ شارٹی گھٹنوں کے بل جھک کر دعا کے انداز میں بائبل کے صفحات الہام پڑھتا۔

ہم میڈل سکس کائونٹی کورٹ میں جج کے فیصلے کے منتظر تھے۔ ہم پر چودہ اقسام کے جرائم کا الزام تھا۔ شارٹی کی ماں بیٹھی سر جھائے اپنے ”جیزز“ کی عبادت کر رہی تھی ایلاء اور ریگی نالڈ بھی پاس بیٹھے تھے سب سے پہلے شارٹی کو سزا سنانے کے لیے کھڑا کیا گیا۔

”جرم ایک۔ آٹھ سے دس سال۔

جرم دو۔ آٹھ سے دس سال۔

جرم تین.........“

اور آخری جملہ ”تمام سزائیں بیک وقت شروع ہونگی۔“

شارٹی پسینے میں شرابور تھا اس کو لفظ بیک وقت کی سمجھ نہیں آئی تھی اور وہ اپنی دانست میں سو سے زیادہ سال بنائے بیٹھا تھا۔ وہ بری طرح رونے لگا اور گر گیا۔ بیلفس نے اسے پکڑا اور سہارا دیکر کھڑا کیا۔

اگلے آٹھ سے دس سیکنڈ میں میری ہی طرح شارٹی مذہب سے منحرف ہو کر دہریہ ہو چکا تھا۔

مجھے دس سال سزا ہوئی۔

لڑکیوں کو ایک سے پانچ سال سزا دی گئی اور انہیں میساچیوسٹس میں فریمنگم کے مقام پر ویمن ریفارمیٹری میں رکھا گیا۔

یہ فروری 1946ء کی بات ہے میں پورا 21 سال کا بھی نہیں ہوا تھا اور ابھی میں نے شیو بنانی بھی شروع نہیں کی تھی وہ مجھے اور شارٹی کو اکٹھے ہتھکڑیاں لگا کر "چارلس ٹاؤن" کی سرکاری جیل میں لے گئے۔

اگرچہ جیل میں آپ کا نمبر ہی آپکی شناخت ہوتا ہے اور ہر شخص آپکو نام کی بجائے اسی نمبر سے پکارتا ہے آپکے کپڑوں اور آپکی ہر چیز پر یہی نمبر چھپا ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ نمبر آپکے دماغ پر چھپ گیا ہے لیکن حیرانی اس بات پر ہے کہ مجھے اپنا جیل نمبر بالکل یاد نہیں ہے۔

جو شخص بھی انسانی ہمدردی کا دعویدار ہو اسے دوسرے لوگوں کو سلاخوں کے پیچھے پنجرے میں رکھنے پر ووٹ دینے سے پہلے کافی دیر سوچنا چاہیے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جیل ہونی ہی نہیں چاہئیں بلکہ یہ سلاخیں نہیں ہونی چاہئیں ان سلاخوں کے پیچھے آج تک کوئی شخص نہیں سُدھرا۔ آدمی کے ذہن سے ان سلاخوں کی یاد کبھی محو نہیں ہوتی جب وہ باہر آتا ہے تو اس تجربے کو اپنے ذہن سے مٹانا چاہتا ہے لیکن نہیں مٹا سکتا۔ میں نے بہت سے سابق قیدیوں سے پوچھا ہے لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ایام جیل کی تفصیلات بھول چکے تھے لیکن سلاخوں کا خیال ان کے ذہن سے کبھی دھندلا نہیں ہوا۔

بطور "مچھلی" (جیل میں نئے قیدی کے لیے معروف لفظ) میری جسمانی حالت کافی بودی تھی اور میں ایک سانپ کی طرح بدمزاج تھا جس کی وجہ اچانک منشیات کی معطلی بھی تھی جیل میں آب رسانی کا انتظام نہ تھا۔ یہ جیل 1805ء میں تعمیر ہوا تھا یعنی نپولین کے دور میں۔ اس گندی اور تنگ جیل کی کوٹھری میں میں اپنی چارپائی پر لیٹ کر دونوں دیواروں کو چھو سکتا تھا۔ رفع حاجت کے لیے ایک ڈھکی ہوئی بالٹی تھی کوئی کتنے ہی مضبوط اعصاب کا کیوں نہ ہو کوٹھری میں مسلسل غلاظت کی بدبو میں نہیں رہ سکتا تھا۔

جیل کا ماہر نفسیات مجھ سے گفتگو کے لیے آیا تو میں نے اسے غلیظ ترین گالیاں دی، یہی سلوک میں نے پادری کے ساتھ کیا۔ جیل میں مجھے پہلا خط ڈیٹرائٹ سے فلبرٹ کا موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ میرے لیے مقدس گرجا میں دعا کرائی جائے گی، میں نے اس کو جو جواب لکھا اس پر مجھے آج بھی شرمندگی ہے۔

میری پہلی ملاقاتی ایلاء تھی، وہ مجھے رنگ باختہ نمبر والی ڈانگری میں دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ کچھ لمحے ہم خاموش رہے، میری خواہش تھی کہ وہ یہاں نہ آتی۔ مسلح گارڈز ہمارے سر پر کھڑے نگرانی کر رہے تھے۔ ان گارڈز سے سب قیدیوں کو شدید نفرت تھی اور اکثر قیدی کہا کرتے تھے کہ جیل سے نکل کر اگر انہیں موقع ملا تو وہ ان کو ضرور قتل کر دیں گے۔

چارلس ٹاؤن میں پہلی بار میں نٹ میگ (خط استواء کے ایک درخت کا بیج) کے نشے پر لگا۔ میرا ساتھی قیدی ان سینکڑوں قیدیوں میں سے ایک تھا جو باورچی خانے کے ملازموں سے ایک پینی کے عوض ماچس بھر نٹ میگ (Nutmeg) خریدتے تھے۔ میں انہیں ٹھنڈے پانی کے گلاس میں ڈالتا، ہلاتا اور پی لیتا، ماچس بھر نٹ میگ کا نشہ تین یا چار ری فرز کے برابر ہوتا تھا۔

ایلاء کی بھیجی ہوئی رقم سے میں اس قابل ہو گیا کہ رشوت دے کر بہتر منشیات مثلاً ری فرز نمبیوٹل' بینزڈرائن وغیرہ خرید سکوں۔ قیدیوں کو منشیات کی فراہمی تمام محافظوں کا اضافی کاروبار تھا اور ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ بھی۔

میں سات سال جیل میں رہا، لیکن آج جب میں پہلے سال اور بعد کے سالوں کو الگ کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو سوائے نٹ میگ اور ثانوی منشیات کے اور چند دیگر دھندلی یادوں کے جیسے محافظوں سے بھڑے، چیزیں اُٹھا اُٹھا کر کوٹھڑی سے باہر پھینکنا، قطار میں اڑ جانا، کھانے کے کمرے میں طباق گرا دینا، اپنا نمبر پکارے جانے پر جواب نہ دینا اور بعد میں بھول جانے کا عذر کرنا وغیرہ کے علاوہ کچھ یاد نہیں آتا۔ اس رویے کی وجہ سے مجھے تنہا رہنا پڑا۔ میں اپنی کوٹھڑی میں گھنٹوں اس طرح چہل قدمی کرتا جیسے پنجرے میں بگھیاڑ اور اونچی آواز میں خود کو برا بھلا کہتا۔ میرے پسندیدہ اہداف انجیل اور خدا تھے۔ لیکن قیدِ تنہائی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ میرے بلاک کے قیدیوں نے میرے مذہب مخالف رویے کی وجہ سے میرا نام “شیطان” رکھ دیا۔ جیل میں پہلا شخص جس نے مجھ پر کوئی مثبت تاثر چھوڑا وہ “بمبی” نام کا قیدی تھا۔ میں اسے چارلس ٹاؤن میں 1947ء میں ملا تھا، وہ بھی میری طرح ہلکے رنگ کا حبشی تھا، قامت بھی میرے ہی جتنی تھی اور چہرے پر چھائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ایک پرانا نقب زن تھا اور بہت سی جیلوں میں رہ چکا تھا، ہم لائسنس پلیٹ کی دکان میں کام کرتے تھے وہ نمبروں کا ٹھپہ لگانے والی مشین پر کام کرتا تھا اور میں نمبروں پر رنگ پھیرنے والے پٹے پر مامور تھا۔

اکثر ہم اپنے کام کا کوٹہ مکمل کر کے بمبی کے گرد اس کی باتیں سننے کے لیے بیٹھ جاتے، عموماً سفید فام قیدی کسی مسئلے پر کسی سیاہ فام کی رائے پر کان نہیں دھرتے، لیکن سفید فام قیدی تو ایک طرف محافظ بھی کسی موضوع پر بمبی کی رائے سننے کے لیے قریب قریب کھسک آتے تھے۔

اکثر اس کے گرد لوگ اکٹھے ہوتے اور ایسے موضوعات پر گفتگو سنتے جن کے متعلق انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ انسانی نفسیات کا عمیق جائزہ لینے کے بعد ہم پر ثابت کرتا کہ قیدیوں میں اور آزاد لوگوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ لوگ پکڑے نہیں گئے۔ وہ تاریخی واقعات اور اعداد و شمار پر گفتگو کرنا پسند کرتا، جب اس نے ”کنکارڈ“ (جیل) کی تاریخ بیان کرنا شروع کی تو یوں لگتا تھا کہ وہ ”چیمبر آف کامرس“ کا کوئی ملازم ہے۔ وہ جیل کے کتب خانے کا سب سے بہترین گاہک تھا، جو چیز مجھے سب سے زیادہ متاثر کرتی تھی وہ اس کا اپنے علم کے ذریعے صرف باتوں کی بنیاد پر صاحب عزت ہونا تھا۔

بمبی مجھ سے شاذ ہی گفتگو کرتا وہ اکیلے شخص سے زیادہ گفتگو کرتا ہی نہیں تھا لیکن مجھے لگتا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ مجھے سب سے پہلے اس سے دوستی کی خواہش اس کے مذہبی خیالات کی وجہ سے ہوئی۔ میں خود تو لادینیت سے بھی آگے تھا یعنی شیطان لیکن بمبی نے میرے لادینی فلسفے کو کہنے کی حد تک ایک تنظیم اور ترتیب دے دی جس سے میرے شدید حملے معتدل ہو گئے۔ اس کے سامنے میرے دلائل بہت بودے محسوس ہوتے ، وہ کبھی سخت زبان استعمال نہیں کرتا تھا۔

ایک روز اچانک اس نے مجھے اپنی عادت کے مطابق سادہ سے لفظوں میں کہا کہ تم ذہین ہو اگر تم ذہن استعمال کرو۔ مجھے اس کی دوستی کی خواہش تھی اس کی نصیحت کی نہیں، اگر کوئی اور قیدی ہوتا تو میں اسے گالیاں بھی بکتا، لیکن کوئی شخص بمبی کو گالی نہیں دیتا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ مجھے جیل کے کتب خانے اور خط و کتابت کے ذریعے کورسز کی سہولت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میسن (مشی گن) میں آٹھویں پاس کرنے کے بعد میں نے اُچکے پن کے علاوہ کچھ نہیں سیکھا تھا اور جو کچھ آٹھویں درجے تک سیکھا تھا، سڑکوں نے اسے کب کا مٹا دیا تھا۔ میری بہن ہلڈا نے مجھے تجویز بھیجی کہ اگر جیل میں ممکن ہو تو مجھے انگریزی اور کتابت سیکھ لینی چاہیے۔ جب میں ری فرز بیچا کرتا تھا تب وہ بھی زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔

چنانچہ فراغت کو دیکھتے ہوئے میں نے بذریعہ ڈاک انگریزی کا کورس کرنا شروع کر دیا۔ جب جیل میں نقل شدہ فہرست کتب کوٹھڑی میں بھیجی جاتی تو میں بھی دلچسپ نام والی کتابوں پر نشان لگا دیتا۔

انگریزی کے کورس سے مجھے آہستہ آہستہ بھولی ہوئی گرامر یاد آنے لگی۔

تقریباً سال بعد میں اس قابل ہو گیا کہ ایک شائستہ اور پڑھا جاسکنے والا خط لکھ سکوں۔ انہیں دنوں بمبی کی الفاظ پر دسترس سے متاثر ہو کر میں نے لاطینی زبان سیکھنی شروع کر دی۔

بمبی کی سرپرستی میں ہی میں نے جیل میں کچھ اور کمالات بھی بہم پہنچا لیے تھے مثلاً میں ایک سگریٹ کی ڈبی کے لیے میں کسی کو بھی ڈومینوز میں ہرا سکتا تھا۔ میری کوٹھڑی میں سگرٹوں کے بہت سے ڈبے جمع رہتے جو جیل میں رقم کا بہترین متبادل تھے۔ میں لڑائیوں اور دوسرے کھیلوں میں سگرٹوں کی شرطیں لگاتا۔

مجھے اپریل 1947ء کے اس دن کی سنسنی کبھی نہیں بھولے گی جب جیکی رابنسن بروکلین ڈوجرز کی طرف سے کھیلا۔ میں اس کا دیوانگی کی حد تک پرستار تھا۔ میں ریڈیو سے کان لگائے اس کی ہر شاٹ پر نئے سرے سے اوسط نکالتا تھا۔

1948ء میں ایک روز فلبرٹ نے جو ہر وقت کچھ نہ کچھ نیا کرتا رہتا تھا، مجھے مطلع کیا کہ اس نے "سیاہ فام شخص کے لیے فطری مذہب دریافت کر لیا ہے۔" اب وہ بقول اپنے "نیشن آف اسلام" سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں "آزادی کے لیے اللہ سے دعا کروں۔" میں نے جواباً فلبرٹ کو جو خط لکھا وہ مقدس گرجا میں دعا والے جواب سے بھی زیادہ تلخ تھا۔ ان دنوں میں کنکارڈ جیل میں تھا۔ جب ریگی نالڈ کا خط آیا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بھی پہلے خط جیسا ہو گا۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ ریگی نالڈ اپنا زیادہ وقت ڈیٹرائٹ میں ولفرڈ، ہلڈا اور فلبرٹ کے ساتھ ہی گزار رہا ہے۔ ریگی نالڈ کا خط نہ صرف اطلاعی تھا بلکہ اس میں یہ نصیحت بھی تھی کہ "میلکم آئندہ سؤر مت کھانا اور سگریٹ مت پینا، میں تمہیں قید سے نکلنے کا راستہ دکھاؤں گا۔" میرا فطری خیال یہی تھا کہ اس نے افسران کو چکمہ دے کر مجھے نکالنے کا بندوبست کیا ہے۔ میں سوتے جاگتے یہی سوچتا کہ یا تو اس نے کوئی نفسیاتی عذر ڈھونڈا ہے جیسے میں نے نیویارک ڈرافٹ بورڈ میں ظاہر کیا تھا یا شاید کچھ عرصہ سؤر اور سگریٹ ترک کر دینے سے مجھے کوئی ایسی بیماری لاحق ہو جائے گی جو مجھے آزادی دلا دے گی۔ میں بہرصورت آزاد ہونا چاہتا تھا۔ میرا دل چاہتا میں اس مسئلہ پر بمبی سے بات کروں مگر پھر سوچتا یہ ایک بڑا مسئلہ ہے اسے خاموش ہی رہنے دو۔

سگریٹ چھوڑنا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں قید تنہائی میں سگرٹوں کے بغیر رہ چکا تھا۔ خط پڑھ کر میں نے کھلی ہوئی ڈبیا ختم کی اور آج تک دوبارہ سگریٹ نہیں پیا۔

تین چار روز بعد دوپہر کے کھانے میں سؤر کا گوشت دیا گیا۔ میں میز پر بیٹھا تو میرے ذہن میں سؤر کے گوشت کا تصور بھی نہیں تھا۔ جب کھانا دیا گیا تو میں ایک لمحہ ہچکچایا اور پھر کھانا آگے بڑھا دیا۔ میرا ساتھی حیران ہو کر میری طرف مڑا اور میں نے کہا "میں سؤر نہیں کھاتا۔" یہ بات اور اس پر ردعمل جس تیزی سے پھیلا وہ عجیب تھی کیونکہ جیل کے معمولات میں تبدیلی شاذ ہی آتی ہے اور اگر کبھی آئے تو اس سے کافی ہل چل پیدا ہو جاتی ہے۔ رات تک یہ بات سارے میں پھیل چکی تھی کہ شیطان نے سؤر نہیں کھایا۔

ایک طرح سے مجھے اس حرکت پر فخر بھی محسوس ہوا کیونکہ جیل کے اندر اور باہر مشہور تھا کہ کالے سؤر کھائے بنا نہیں رہ سکتے، دوسرے مجھے خوشی بھی ہوئی کہ اس بات سے گورے مجرم کچھ ہراساں سے ہوگئے۔

بعد میں جب میں نے اسلام کا زیادہ مطالعہ کیا تو جانا کہ لاشعوری طور پر قبل از قبول اسلام یہ میری پہلی اطاعت تھی۔ اسلامی حکم "اگر تم اللہ کی جانب ایک قدم بڑھاؤ گے تو اللہ تمہاری جانب دو قدم بڑھائے گا" کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔

ڈیٹرائٹ اور شکاگو میں میرے تمام بہن بھائی، فلبرٹ کے بیان کردہ "سیاہ فاموں کے لیے فطری مذہب" کو اختیار کر چکے تھے اور میرے دوران قید وہ میری تبدیلی کے لیے دعا کرتے تھے۔ فلبرٹ کو میرا خط ملنے پر وہ سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ آخر انہوں نے ریگی نالڈ جس نے تازہ تازہ مذہب بدلا تھا، کے ذریعے مجھ تک رسائی کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ میرے زیادہ قریب تھا۔

ان تمام باتوں کے علاوہ ایلاء مسلسل اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح مجھے نور فوک، میساچیوسٹس، پریزن کالونی، میں منتقل کروا سکے جو ایک تجرباتی اصلاحی جیل تھی۔ دوسری جیلوں کے قیدی اکثر یہ کہتے کہ اگر آپ کے پاس پیسے اور تعلقات ہوں تو آپ اس جیل میں منتقل ہو سکتے ہیں جہاں سزائوں کے اصول اتنے عمدہ ہیں کہ سن کر جھوٹ لگتے ہیں۔ جیسے تیسے کر کے ایلاء کی کوششوں سے میں 1948ء کے اواخر میں نورفوک منتقل ہوگیا۔

یہ کالونی کئی حوالوں سے نسبتاً جنت تھی۔ یہاں صاف بیت الخلاء تھے اور سلاخیں نہیں تھیں۔ دیواریں تھیں جن میں آپ زیادہ آزاد تھے۔ چونکہ یہ شہر سے باہر تھی اس لیے سانس لینے کے لیے تازہ ہوا بھی وافر تھی۔

اس میں چوبیس "گھریلو" اکائیاں تھیں، ہر اکائی(Unit) میں پچاس آدمی تھے گویا پوری کالونی میں کل بارہ سو آدمی تھے۔ ہر گھر کی تین منزلیں تھیں اور ہر شخص کا الگ کمرہ تھا۔ تقریباً پندرہ فیصد قیدی سیاہ فام تھے جن کی تعداد ہر گھر میں پانچ سے نو تھی۔

دوسری جیلوں کی نسبت جہاں لچر زبان، بدعادات، لوٹ کھسوٹ اور مشتعل محافظ ماحول کا لازمہ تھے یہاں ایک بالکل دوسری طرح کی ثقافت تھی۔ یہاں "دانشورانہ" سرگرمیاں مثلاً اجتماعی گفتگو اور مباحثوں وغیرہ کا انتظام بھی تھا۔ تعلیمی اصلاحی پروگراموں کے لیے، ہارورڈ اور بوسٹن یونیورسٹی اور دیگر علاقائی اداروں سے اساتذہ آتے تھے۔ ملاقات کے قوانین بھی دوسری جیلوں سے بدرجہا بہتر تھے، ملاقاتی تقریباً روز مل سکتے تھے اور عرصہ ملاقات بھی دو گھنٹے تھا۔ آپ کو ملاقاتی کے پہلو بہ پہلو یا روبرو دونوں طرح بیٹھنے کی اجازت تھی۔

نور فوک پریزن کالونی کا کتب خانہ اس کی نمایاں خصوصیت تھی۔ ایک کروڑ پتی پارک ہرسٹ جو غالباً اصلاحی پروگرام میں دلچسپی رکھتا تھا، نے اپنا کتب خانہ یہاں کے لیے ترکے میں چھوڑا تھا۔ تاریخ اور مذہب سے اسے زیادہ دلچسپی تھی، اس کی ہزاروں کتب شیلفوں پر رکھی تھیں اور جن کی جگہ نہیں بنی وہ ڈبوں میں بند پڑی تھیں۔ ہم اجازت لے کر کتب خانے میں جا سکتے تھے اور اپنی پسند کی کتاب تلاش کر سکتے تھے۔ بامقصد مطالعے سے قبل میں یونہی بے سمت مطالعہ کرتا رہا۔

یہاں آ کر کافی عرصہ میرا ریگی نالڈ سے رابطہ نہیں ہوا، جب میں نے یہاں آ کر بھی سگریٹ نہیں پیئے اور سوٴر کا گوشت کھانے سے انکار کر دیا تو تھوڑی سی حیرانی کا اظہار کیا گیا۔ پھر ریگی نالڈ کا خط آیا کہ وہ مجھے ملنے آ رہا ہے جب وہ ملنے آیا تو میں سوچ رہا تھا کہ اس کے پاس میری آزادی کا کون سا منصوبہ ہے۔

ریگی نالڈ کو پتہ تھا کہ میرا سڑک چھاپ ذہن کس رخ پر سوچتا ہے اس لیے اس نے نہایت موٴثر انداز میں بات کی۔ وہ پہلے بھی خوش لباس تھا مگر آج تو خاص تیاری سے آیا تھا۔ میں ترک سوٴر اور سگریٹ" کی پہیلی کا حل جاننے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ لیکن وہ گھر والوں کی باتیں کرتا رہا کہ آخری بار جب وہ ڈیٹرائٹ، ہارلم میں تھا تو کون کیا کر رہا تھا۔ کچھ پوچھنے کے لیے دوسرے کو مجبور کرنا میری عادت بھی نہیں تھی۔ لیکن جس طرح وہ ادھر ادھر کی ہانک رہا تھا اس سے لگتا تھا کہ کہنے کو کوئی بڑی بات ہے۔

اچانک ذہن میں خیال آنے والے انداز میں اس نے کہا"میلکم، اگر کوئی شخص ہر وہ بات جانتا ہو جس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے، تو وہ کون ہو گا؟"

ہارلم کے دنوں میں بھی وہ اسی طرح بالواسطہ گفتگو کا عادی تھا جس سے مجھے الجھن ہوتی تھی کیونکہ میں سیدھی بات کرتا تھا۔ "ہوں۔۔۔تو وہ کسی قسم کا خدا ہی ہو سکتا ہے۔"

ریگی نالڈ نے کہا "ایک آدمی ہے جو سب کچھ جانتا ہے۔"

میں نے پوچھا"کون ہے وہ؟"

"خدا وہ آدمی (ذات) ہے جس کا نام "اللہ" ہے۔

"اللہ" میرے ذہن میں فلبرٹ کے خط کا لفظ آیا اور مجھے پہلی بار دونوں میں ربط کا خیال آیا۔اس نے کہا اللہ 360 درجے کا علم رکھتا ہے اور 360 درجے علم کے کل میزان کی علامت ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔ آپ کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں کیسے مذہبی خیالات کے پس منظر میں اس کی گفتگو سن رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ مجھے کسی خاص نکتہ پر لانا چاہتا ہے اس لیے میں سنتا رہا اور اگر کوئی شخص آپ کو کہیں لانا چاہ رہا ہو تو آپ کو سننا چاہیے۔

"شیطان صرف 33 درجے کا علم رکھتا ہے جسے اس کے چیلے کہا جاتا ہے" ریگی نالڈ نے کہا، مجھے آج بھی اس کا جملہ یاد ہے کیونکہ بعد میں، میں نے بھی دوسروں کو تبلیغ میں اسے استعمال کرنا تھا کہ "شیطان دوسروں پر قابو پانے کے لیے اپنے چیلے""میسنریز" (Masonry)استعمال کرتا ہے۔"

اس نے بتایا کہ یہ خدا امریکہ میں آگیا ہے اور اس نے "ایلیائ" نامی شخص پر خود کو ظاہر کیا ہے۔"ایک سیاہ فام شخص… بالکل ہم جیسا۔" خدا نے ایلیا کو بتایا ہے کہ "شیطان کا وقت پورا ہو گیا ہے۔"

میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا اس لیے صرف سنتا رہا۔

"شیطان بھی دراصل ایک آدمی ہے" ریگی نالڈ نے کہا۔

"کیا مطب ہے تمہارا؟"

سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ اس نے سفید فام قیدیوں اور ان کے ملاقاتیوں کی طرف اشارہ کیا"وہ" اس نے کہا "گورا ہی دراصل شیطان ہے۔"

اس نے بتایا کہ تمام سفید فام جانتے ہیں کہ وہ شیطان ہیں خصوصاً "میسنز"(Masons)

میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میرے ذہن میں تمام واقف گوروں کے چہرے گھوم رہے تھے۔ لیکن مہربان یہودی "ھائی مائی" کا چہرہ میری نگاہوں میں ٹھہر گیا۔ ریگی نالڈ خود بھی میرے ساتھ ایک دوبار ھائی مائی کے لیے غیر قانونی شراب خریدنے لونگ آئی لینڈ جا چکا تھا۔

میں نے کہا"بلا استثنائ؟"

"بلا استثنائ"

"ہائی مائی کے متعلق کیا رائے ہے؟"

"اگر میں دس ہزار ڈالر کمانے کے لیے تمہیں پانچ سو ڈالر کا فائدہ پہنچاؤں تو اسے کیا کہو گے؟" ریگی نالڈ کے جانے کے بعد، میں سوچتا رہا، سوچتا رہا، سوچتا رہا، مجھے اس مسئلے کا کوئی سر پیر سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

اپنی پیدائش سے اب تک ملنے والے سفید فام مجھے یاد آنے لگے۔ گوروں کے ہاتھوں میرے والد کے قتل ہو جانے کے بعد سرکاری اہل کار ہر وقت ہمارے گھر میں گھسے رہتے تھے۔ وہ سفید فام لوگ جو میری ماں کو اس کے منہ پر میرے، میرے بھائیوں اور بہنوں کے سامنے "پاگل" کہتے تھے اور بالآخر یہی سفید فام اسے کالا مازو کے پاگل خانے لے گئے تھے۔ وہ گورا جج جس نے بچوں کو تقسیم کر دیا تھا۔ سوورلینز اور میسن کے دوسرے سفید فام، مکتب کے نوجوان سفید فام اور اساتذہ اور وہ جس نے مجھے آٹھویں میں بڑھئی بننے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ کسی سیاہ فام کے لیے وکیل بننے کا خواب دیکھنا بے وقوفی تھی۔

سفید فام لوگوں کے چہروں سے میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ بوسٹن میں "صرف گوروں کے لیے" اور لینڈ بال روم کے باہر جہاں میں ان کے جوتے چمکاتا تھا، پارک ہاؤس جہاں میں ان کی جھوٹی پلیٹیں اٹھا کر باورچی خانے تک لے جاتا تھا... ریلوے کے ملازم اور مسافر... صوفیہ... نیویارک سٹی کے سفید فام پولیس ملازم، گورے مجرم، سیاہ فاموں کی روح محسوس کرنے کے شوقین گورے جو سیاہ فاموں کے کلبوں میں اکٹھے ہوتے تھے... سفید فام عورتیں جو سیاہ فام

مردوں کی طلب گار تھیں... بوسٹن کا خفیہ خریدار... بوسٹن کے پولیس والے... صوفیہ کے شوہر کا دوست اور اس کا شوہر جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے متعلق بہت کچھ جانتا تھا... صوفیہ کی بہن... وہ جوہری جس نے مجھے پھنسایا تھا... سماجی کارکن... مڈل سیکس کنٹری کورٹ کے اہل کار... وہ جج جس نے مجھے دس سال سزا دی تھی... میرے واقف قیدی، محافظ اور سرکاری افسران...

نور فوک پریزن کولونی میں جون نامی ایک امیر اور مفلوج بوڑھا بھی تھا۔ وہ اپنے بچے کے "رحم دلانہ قتل" کے جرم میں بند تھا۔ وہ اکثر یاد دلاتا رہتا کہ وہ تینتیسویں درجے کا میسن ہے اور بقول اس کے میسنز (Masons) اتنے طاقت ور تھے کہ آج تک میسنز کے علاوہ اور کوئی امریکی صدر نہیں بنا تھا۔ ذرا سی پریشانی میں کوئی بھی میسن کسی جج یا اعلیٰ سرکاری افسر کو خفیہ اشارہ سے اپنی شناخت کروا سکتا تھا۔ یہ جج یا افسر بھی میسنز ہی ہوتے۔

میں ریگی نالڈ کی بتائی ہوئی باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ میں نے جون کو پرکھنے کا فیصلہ کیا وہ جیل کے سکول میں ایک آسان سی نوکری کرتا تھا۔ میں اس سے ملنے وہیں چلا گیا "جون" میں نے کہا "ایک دائرے میں کتنے درجے ہوتے ہیں؟"

اس نے کہا (360) تین سو ساٹھ۔"

میں نے ایک مربع شکل بنائی "اس میں کتنے درجے ہیں؟" اس نے کہا تین سو ساٹھ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا کسی بھی چیز کے زیادہ سے زیادہ درجے تین سو ساٹھ ہی ہوتے ہیں؟ اس نے کہا ہاں میں نے کہا "ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔ لیکن میسنز صرف تینتیس درجے تک کیوں رہتے ہیں؟" اس کے پاس کوئی اطمینان بخش جواب نہیں تھا۔ لیکن میرے پاس اس کا جواب یہ تھا کہ میسنز دراصل اسلام کا تینتیسواں درجہ ہیں جو پروجیکشن سے بھرپور ہے۔ میسنز اس کا انکار ضرور کرتے ہیں لیکن وہ اس کے وجود سے واقف ہیں۔

چند دن بعد ریگی نالڈ مجھے ملنے کے لیے آیا تو اس نے میرے رویے سے اپنی گفتگو کے اثر کا اندازہ لگایا۔ وہ بہت مطمئن تھا پھر وہ دو گھنٹے تک بہت سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے "سفید فام شیطان" اور "برین واشڈ سیاہ فام" سے متعلق گفتگو کرتا رہا۔

جاتے ہوئے وہ مجھے زندگی میں پہلی بار کچھ سنجیدہ باتیں سوچنے پر مجبور کر گیا۔ یعنی سفید فام۔ سیاہ فام دنیا کو دبانے اور اس کا استحصال کرنے کی طاقت بہت تیزی سے کھو رہا ہے اور یہ کہ سیاہ فام دنیا پہلے کی طرح دوبارہ دنیا پر حکومت

کرنے کے لیے بیدار ہو رہی ہے اور گورے لوگوں کی دنیا انحطاط پذیر ہے بلکہ ختم ہو رہی ہے "تمہیں یہ تک نہیں پتا کہ تم کون ہو؟" ریگی نالڈ نے مجھ سے کہا تھا"تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تم سے یہ بات گورے شیطان نے چھپا رکھی ہے کہ تم ایک قدیم تہذیب کے لوگوں کی نسل سے ہو اور دولت اور حکومتوں کے مالک تھے۔ تمہیں اپنے صحیح خاندانی نام تک کا علم نہیں، تم اپنی اصل زبان سنو گے تو اسے پہچان بھی نہیں پاؤ گے۔ سفید شیطان نے تمہیں اپنے آباء کے حقیقی علم سے کاٹ دیا ہے، تم اس وقت سے اس سفید شیطان کی بدی کا شکار ہو، جب اس نے تمہیں تمہارے اجداد کے نطفوں میں سے قتل اور زنا کے ذریعے تمہاری آبائی زمین سے چرا لیا تھا۔"

مجھے ہر روز ڈیٹرائٹ سے اپنے بہن بھائیوں کے کم از کم دو خط ملتے۔ میرا سب سے بڑا بھائی ولفرڈ خط لکھتا اور اس کی پہلی بیوی برتھا جو اس کے دو بچوں کی ماں تھی۔ برتھا کی موت کے بعد ولفرڈ نے موجودہ بیوی روتھ سے شادی کر لی تھی، فلبرٹ اور ہلڈا بھی مجھے خط لکھتے۔ ریگی نالڈ ڈیٹ رائٹ جانے سے پہلے بوسٹن میں قیام کے دوران مجھ سے ملنے آتا وہ سب مسلمان ہو چکے تھے۔ وہ اس شخص کا ذکر"عزت مآب ایلیا محمد" کے نام سے کرتے جو ایک چھوٹا اور شریف آدمی تھا۔ کبھی کبھی وہ اسے "اللہ کا پیغمبر" بھی کہتے اور اسے اپنا جیسا ایک سیاہ فام بتاتے وہ جارجیا کے ایک فارم پر امریکہ ہی میں پیدا ہوا تھا پھر وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ڈیٹرائٹ آگیا اور وہاں وہ "مسٹر والس ڈی فارڈ" سے ملا جس کے متعلق اس کا کہنا تھا کہ وہ "اللہ" ہے۔ مسٹر والس ڈی فارڈ نے "ایلیا محمد" کو "اللہ" کا پیغام ان سیاہ فام لوگوں تک پہنچانے کا کام سونپا جو اسلام کی گم شدہ اور باز یافتہ قوم سے تھے اور شمالی امریکہ کے اس ویرانے میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔

ان سب نے مجھے عزت مآب ایلیا محمد کی تعلیمات قبول کرنے پر اکسایا۔ ریگی نالڈ نے وضاحت کی کہ دین اسلام کے پیروکار سؤر کا گوشت نہیں کھاتے اور ترک سگریٹ ایلیا محمد کے مقلدوں کا اصول ہے کیونکہ وہ مضر اشیاء مثلاً منشیات، تمباکو اور الکحل وغیرہ استعمال نہیں کرتے۔ بار بار میں یہی پڑھتا سنتا رہا کہ "مسلمان کی کنجی اطاعت اور اللہ سے تعلق ہے۔"

اور جسے وہ "سیاہ فام کا اصل علم" قرار دیتے تھے وہ صرف عزت مآب ایلیا محمد کے مقلدوں کے پاس تھا جسے وہ میرے نام طویل خطوط اور مطبوعہ مواد کی شکل میں ارسال کرتے رہتے۔

"حقیقی علم" جس کی اصل صرف اتنی تھی کہ تاریخ کو سفید فام آدمی کی تاریخ کی کتابوں میں "سفید" کر دیا گیا ہے اور سینکڑوں سالوں میں سیاہ فام آدمی کی ذہنی تطہیر کر دی گئی ہے۔ اصل آدمی (ابتدائی آدمی) سیاہ تھا جو افریقہ میں تھا جہاں سے کرۂ ارض پر انسانی نسل کا آغاز ہوا۔

جس وقت سفید فام غاروں میں چوپایوں کی زندگی گزار رہا تھا تب اس حقیقی سیاہ آدمی نے بڑی بڑی سلطنتوں، تہذیبوں اور ثقافتوں کی داغ بیل ڈالی۔ تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ سفید فام شیطان نے اپنی شیطانی فطرت کے ماتحت ہر غیر سفید شخص کو لوٹا، قتل کیا، عزت سے کھیلا اور اس کا استحصال کیا۔

انسانی تاریخ کا سب سے بڑا جرم سیاہ فام انسانوں کی تجارت تھی۔ یہ سفید فام شیطان جب افریقہ پہنچا تو قتل کر کے اغواء کر کے زنجیروں سے جکڑ کر لاکھوں سیاہ فام آدمیوں، عورتوں اور بچوں کو جہازوں میں بھر کر مغرب لے آیا جہاں ان پر بطور غلام ظلم و تشدد کر کے ان سے کام کروایا گیا۔

اس شیطان سفید فام نے ان سیاہ فاموں کو ان کے آبائی علم سے محروم کر دیا۔ ان کو اپنے مذہب۔ زبان اور ثقافت کے علم سے اس طرح کاٹا گیا کہ امریکی زمین پر سیاہ فام دنیا کی واحد ایسی قوم بن گئے جنہیں اپنی حقیقی شناخت کے متعلق قطعاً کچھ علم نہیں تھا۔

سفید فام آقا نے سیاہ غلام عورتوں کی آبروریزی کر کر کے بالآخر ایک ایسی خانہ ساز اور برین واشڈ نسل پیدا کر لی جسے اپنے اصل رنگ یا اپنے اصل آبائی نام تک کا علم نہیں تھا۔ آبروریزی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نسل کو سفید فام آقا نے اپنا گھریلو نام بھی دے دیا یعنی "The Negro"

اس "نیگرو" کو بتایا گیا کہ اس کے آبائی افریقہ میں لادین، وحشی اور درختوں پر بندروں کی طرح جھولنے والے کالے رہتے تھے۔ "نیگرو" نے اپنے آقا کی بنائی ہوئی دیگر تعلیمات، جن کا مقصد سفید فام کی اطاعت اور عبادت تھا، کی طرح اسے بھی تسلیم کر لیا۔

دنیا میں جہاں ہر قوم اپنی شناخت کے لیے ایک ایسے خدا پر یقین رکھتی ہے جو اس قوم سے ملتا جلتا ہو وہاں اس آقا نے "نیگرو" کی رگوں میں عیسائی مذہب اتار دیا ہے "نیگرو" کو ایک ایسے اجنبی خدا کی عبادت سکھائی گئی جو اس کے آقا کی طرح سنہرے بال، زرد جلد اور نیلی آنکھیں رکھتا تھا۔

اس مذہب نے "نیگرو" کو سکھایا کہ "سیاہ" ہونا ایک لعنت ہے اور اسے بشمول اپنی ذات ہر سیاہ چیز سے نفرت کی عادت ڈال دی۔ اسے بتایا گیا کہ ہر سفید چیز اچھی اور قابل احترام، قابل تعریف اور قابل محبت ہے۔ 'نیگرو' کے ذہن میں یہ بٹھا دیا گیا کہ اس کے رنگ میں اپنے آقائوں والی سفیدی کی آلودگی اسی کے لیے برتری کا باعث ہے۔ اس سفید فام کے عیسائی مذہب نے "نیگرو" کو مزید دھوکہ دینے اور ذہنی تطہیر کرتے ہوئے اسے دوسرا گال پیش کرنے کے بعد مسکرا کر گال سہلانے اور سر جھکانے کی خو ڈالی۔ اسے عاجزی کے ساتھ آقا کا بچا کھچا کھا کر خوشی سے گانے اور خدا کا شکر ادا کرنے کی تعلیم دی اور اجر کے لیے آسمان کی طرف دیکھنے اور مرنے کے بعد اپنی جنت میں جانے کی عادت ڈالی۔ جبکہ اس کا سفید آقا اس کے سامنے دنیا میں ہی اپنی جنت کے مزے لوٹ رہا تھا۔

کئی بار میں ان باتوں پر اپنا ابتدائی ردعمل جانچنے کے لیے مڑ کر دیکھتا ہوں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک بار انجیل پڑھتے ہوئے میں نے پال کا واقعہ پڑھا جب وہ دمشق جا رہا تھا۔ حضرت عیسیٰ کی آواز سن کر وہ اس بری طرح چونکا اور حیران ہوا کہ گھوڑے سے گر پڑا، گو میں پال سے کوئی مشابہت تو نہیں رکھتا لیکن ان نئے خیالات کی حیرانی سے مجھے اس کے تجربے کی سمجھ آگئی۔

اس وقت میں نے سیکھا کہ سچ اسی وقت قبول کیا جا سکتا ہے جب کوئی گناہ گار تسلیم کرے کہ وہ گناہ گار ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ غلطی تسلیم کرنے والا ہی اصلاح قبول کرتا ہے۔ انجیل ہی میں فارسیوں کا واقعہ ہے جن کی حضرت عیسیٰ کوئی مدد نہیں کر سکے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انہیں مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اپنے ماضی کے شدید احساس جرم نے مجھے سچ قبول کرنے کے لیے تیار کیا۔ کئی ہفتوں تک میں بطور سیاہ فام اس سچ کا اطلاق براہ راست اپنی ذات پر نہ کر سکا ایسے لگتا تھا میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

ریگی نالڈ واپس ڈیٹ رائٹ چلا گیا۔ میں سارا وقت کمرے میں بیٹھا دیوار گھورتا رہتا کھانے کی میز پر مجھ سے کچھ نہ کھایا جاتا اور میں پانی پی کر اٹھ آتا، دوسرے قیدی پریشان ہو کر اور محافظ شک کی بناء پر پوچھتے کہ مسئلہ کیا ہے؟ مجھے ڈاکٹر سے ملنے کا مشورہ دیا گیا جسے میں نے قبول نہیں کیا۔ ڈاکٹر خود مجھے دیکھنے کے لیے آیا مجھے نہیں معلوم اس نے کیا تشخیص کی، شاید اس نے کہا ہو کہ میں کچھ کرنے کے چکر میں ہوں۔

میں کسی بھی انسان کے لیے مشکل ترین یا شاید عظیم ترین مرحلے سے گزر رہا تھا یعنی ایک ایسی چیز کو تسلیم کرنا جو آپ کے اندر اور ارد گرد پہلے سے موجود ہو۔

بعد میں مجھے علم ہوا کہ ڈیٹرائٹ میں میرے بہن بھائیوں نے پیسے جوڑ کر ہلڈا کو مجھ سے ملنے کے لیے بھیجا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ڈیٹ رائٹ میں عزت مآب ایلیا محمد نے ”میک کے“ سٹریٹ میں واقع ولفرڈ کے گھر پر قیام کیا تھا۔ ہلڈا مجھے ترغیب دیتی رہی کہ میں ایلیا محمد کو خط لکھوں کیونکہ ایلیا محمد بذات خود میلان (مشی گن) میں واقع وفاقی جیل میں جبری بھرتی سے گریز کے جرم میں پانچ سال سزا کاٹ چکا تھا اور سفید فام کی قید میں رہنے کی اذیت کو بخوبی سمجھتا تھا۔

ہلڈا نے بتایا کہ عزت مآب ایلیا محمد ڈیٹ رائٹ میں اپنے ٹیمپل نمبر 1 کو نئے سرے سے منظم کرنے آئے تھے جو ان کے عرصہ قید کے دوران غیر منظم ہوگیا تھا۔ وہ خود شکاگو میں رہتے تھے جہاں وہ ٹیمپل نمبر دو کی تعمیر و تنظیم میں مصروف تھے۔ ہلڈا نے مجھ سے کہا ”کیا تم جاننا چاہو گے کہ سفید فام کرۂ ارض پر کیسے وجود میں آیا؟“ اور پھر اس نے مجھے مسٹر ایلیا محمد کی تعلیمات کا کلیدی سبق سنایا، جو کہ ہر مذہب میں ”تاریخ یعقوب“ کے نام سے مشہور ہے۔ ایلیا محمد اپنے پیروکاروں کو بتاتا کہ سب سے پہلے چاند زمین سے الگ ہوا پھر پہلے انسان جو سیاہ فام تھے وجود میں آئے انہوں نے مقدس شہر مکہ کی بنیاد رکھی۔

اس سیاہ نسل میں چوبیس حکمائ(سائنسدان) تھے ان میں سے ایک حکیم (سائنس دان) نے دوسروں سے کسی اختلاف کی بنا پر غیر معمولی قوی گروہ تخلیق کیا جس کا نام ”شباز“ (Shabazz) تھا جس کی نسل سے امریکی نیگروز ہیں۔

تقریباً چھیاسٹھ سو سال قبل ستر فیصد لوگ مطمئن اور تیس فیصد لوگ غیر مطمئن تھے۔ ان غیر مطمئن لوگو میں ”یعقوب“ پیدا ہوا اس کی پیدائش کا مقصد مشکلات پیدا کرنا، امن برباد کرنا اور قتل و غارت تھا اس کا سر غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔

وہ چار سال کا ہو کر مکتب جانے لگا۔ اٹھارہ سال کی عمر تک یعقوب اپنی قوم کے تمام مکاتب اور جامعات سے فارغ التحصیل ہو چکا تھا۔ وہ ”بڑے سر والا حکیم“ کے نام سے معروف تھا۔ دیگر بہت سی چیزوں کے ساتھ ساتھ اس نے نسل کشی کا سائنسی طریقہ بھی سیکھ لیا تھا۔

اس بڑے سر والے یعقوب نے مکہ میں تبلیغ کرنا شروع کر دی حتیٰ کہ مکہ کے ارباب بست وکشاد نے گھبرا کر اسے جلا وطن کر دیا اور وہ اپنے 59,999 پیروکاروں کے ساتھ “پٹاس” نامی جزیرہ پر چلا گیا۔ جہاں بائبل کے مطابق جون کو پیغام الٰہی ملا تھا۔ جس کا ذکر عہد نامہ جدید کے باب الہام میں آیا ہے۔

اگرچہ وہ خود سیاہ فام تھا مگر اللہ سے ناراض ہو کر اس نے انتقاماً ایک شیطانی صفات کی حامل بے رنگ یعنی سفید نسل پیدا کرنے کا فیصلہ کیا۔

اپنے مطالعے سے وہ یہ جانتا تھا کہ سیاہ فام میں دو جرثومے ہوتے ہیں سیاہ اور بھورا۔ اور یہ بھورا جرثومہ کمزور ہونے کی بناء پر خفتہ رہتا ہے۔ یعقوب نے قانون فطرت کو درہم برہم کرنے کے لیے ایک منصوبہ۔ جسے آج ہم “جینیاتی ڈھانچے کی توڑ پھوڑ” کے نام سے جانتے ہیں۔ بنایا تاکہ سیاہ اور بھورے جرثوموں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے بھورے جرثومے کو پیوند کاری کے ذریعے مزید ہلکے رنگ کی سطح تک لایا جا سکے۔ اسے معلوم تھا کہ جوں جوں انسان کا رنگ ہلکا ہوتا جائے گا توں توں اس میں مکاری اور بدی کا رجحان ترقی کرتا جائے گا۔ اس طرح وہ بالآخر مطلوبہ شیاطین کی بے رنگ سفید فام نسل حاصل کر لے گا۔

اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سیاہ سے مکمل سفید کے حصول تک اسے کئی مدارج سے گزرنا ہوگا۔ یعقوب نے اپنے کام کا آغاز جزیرہ “یوجینیکس لا”(Eugenics Law) (انسانی جینز میں بہتری کے لیے صحت مند بچوں کی پیداوار کا علم) کا نفاذ کر دیا۔

مسٹر یعقوب کے 59,999 سیاہ فام پیروکاروں میں لگ بھگ ہر تیسرے بچے میں بھورا پن تھا۔ بالغ ہونے پر بھورے کو بھورے اور سیاہ کو صرف بھورے رنگ کے ساتھی سے شادی کی اجازت تھی۔

یعقوب کے قانون کی رو سے سیاہ بچے کی پیدائش پر دایہ یا نرس اس کے دماغ میں سوئی چبھو کر اس کی لاش جلانے والے کے سپرد کر دیتی، مرنے والے کو “طفل فرشتہ” قرار دیا جاتا اور اس کی ماں سے کہا جاتا کہ وہ جنت میں جا کر اس کے لیے جگہ تیار کرے گا۔ جبکہ بھورے بچے کی ماں سے کہا جاتا کہ اس کی نگہداشت اچھی طرح کی جائے۔

یعقوب نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے دیگر ماتحت بھی رکھے ہوئے تھے۔ جب یعقوب صاحب ایک سو باون سال کی عمر میں مرے تو ان لوگوں کے لیے اپنے اصول و قوانین چھوڑ گئے۔ ایلیا محمد صاحب کی تعلیمات کے مطابق

یعقوب نے چشم تصور کے سوا اپنے اصول و ضوابط اور طریقہ کار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے رنگ شیطانی نسل کو خود نہیں دیکھا تھا۔

جزیرہ پٹماس سے سیاہ فام آبادی کو مکمل طور پر ختم ہونے میں دو سو سال لگے حتیٰ کہ صرف بھورے لوگ باقی رہ گئے۔

اس بھوری نسل کو سرخ نسل بنانے میں اگلے دو سول سال صرف ہوئے جس کے نتیجے میں جزیرے پر کوئی بھورا شخص باقی نہ رہا۔ اگلے دو سو سالوں میں سرخ نسل سے زرد نسل پیدا کی گئی اور دو سو سال بعد بالآخر سفید نسل وجود میں آگئی۔

پٹماس کے جزیرے پر ان سنہرے بالوں، زرد جلد اور نیلی کانچ آنکھوں والے شیاطین کے علاوہ کوئی نہ بچا، یہ لوگ وحشی ، برہنہ اور بے حیا تھے ان کے جسموں پر جانوروں کی طرح بال تھے وہ چوپایوں کی طرح چلتے اور درختوں پر رہتے تھے۔

مزید چھ سو سال گزرنے کے بعد یہ لوگ فطری سیاہ فام لوگوں کے درمیان واپس آگئے۔

جناب ایلیا محمد اپنے پیروکاروں کو بتاتے تھے کہ چھ ماہ کے اندر اندر ان لوگوں نے جھوٹ کی بنیاد پر سیاہ فام لوگوں کو آپس میں لڑوا دیا اور اس شیطان نسل کی وجہ سے ایک پرامن جنت ارضی لڑائی جھگڑوں کے باعث جہنم بن کر رہ گئی۔

لیکن آخر کار حقیقی سیاہ فام لوگ یہ جان گئے کہ ان کی پریشانیوں کی جڑ یہ شیطان سفید نسل ہے جو یعقوب کی پیداوار ہے۔ انہوں نے انہیں گھیر لیا اور زنجیروں میں جکڑ دیا اور ان کی برہنگی کو ڈھانپ کر انہیں صحرائے عرب سے یورپ کے غاروں میں بھیج دیا۔

آج میسنری میں بھیڑ کی کھال اور رسی اسی بات کی علامت ہے کہ کس طرح سفید فام کی برہنگی کو تپتے ہوئے صحرا میں زنجیروں میں جکڑے گزرتے ہوئے ڈھانپا گیا تھا۔

ایلیا محمد مزید یہ بھی بتاتے کہ یہ شیطانی سفید نسل جو یورپ کے غاروں میں رہتی تھی بے حد وحشی تھی۔ جب جانوروں نے اسے مارنے کی کوشش کی تو غاروں کے باہر درختوں پر چڑھ گئے اور اپنے خاندانوں کو جنگلی درندوں سے بچانے کے لیے انہوں نے بیلچے (ہتھیار) بنا لیے۔

جب یہ شیطانی نسل غاروں میں دو ہزار سال گزار چکی تو اللہ نے حضرت موسیٰ ؑ کو ان کی تہذیب کے لیے بھیجا جو ان کو غاروں سے باہر لائے۔ آسمانی کتاب میں لکھا تھا کہ یہ شیطان سفید فام نسل چھ ہزار سال تک حکمرانی کرے گی۔

چونکہ حضرت موسیٰ کی کتابیں کھو چکی ہے اس لیے آج کوئی نہیں جانتا کہ یہ لوگ غاروں میں رہتے تھے۔

حضرت موسیٰ ؑ کی آمد پر جن شیاطین نے ان کی تعلیمات کو قبول کیا اور غاروں سے باہر آئے یہ وہی لوگ ہیں جنہیں آج ہم یہودی کہتے ہیں۔

تاریخ یعقوب کے متعلق تعلیمات کے مطابق جب انجیل کہتی ہے کہ "موسیٰ نے ویرانے میں سے ایک سانپ اٹھایا" تو یہ سانپ علامت ہے اس شیطان سفید نسل کی جسے موسیٰ ؑ نے یورپ کے غاروں سے نکالا اور تہذیب سکھائی۔

کتابوں میں یہ بھی لکھا تھا کہ یعقوب کی بے رنگ سفید نسل کے چھ ہزار سالہ اقتدار کے بعد۔ ہمارے دور میں... حقیقی سیاہ نسل میں ایک ایسا شخص پیدا ہو گا جس کی ذہانت، علم اور طاقت لا محدود ہو گی۔ یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ جدید دور میں سفید شیطان کی اصل فطرت کو بلاواسطہ سمجھنے کے لیے کچھ اصل سیاہ فام لوگ بطور غلام شمالی امریکا لائے جائیں گے۔

ایلیا محمد کا کہنا تھا کہ زمین پر ظاہر ہونے والے خداؤں میں عظیم ترین اور قوی ترین خدا "آقا ڈبلیو ڈی فارڈ" تھے۔ وہ مشرق سے مغرب آئے اور اس وقت شمالی امریکہ میں ظاہر ہوئے جب لکھی ہوئی پیش گوئی اور تاریخ کا ادراک لوگوں کو ہونے لگا۔ دنیا بھر میں غیر سفید فام بیدار ہونے لگے اور شیطانی سفید تہذیب اللہ کی لعنت کے سبب، اپنی شیطانی فطرت کے باعث خود کو ہی تباہ کرنے لگی۔

آقا ڈبلیو ڈی فارڈ نصف سیاہ اور نصف سفید تھے۔ اس رنگ میں ان کی تخلیق کا مقصد یہ تھا کہ انہیں امریکی سیاہ فام آسانی سے قبول کر لیں۔ دوسرے اس طرح وہ نمایاں ہوئے بغیر سفید فاموں کے درمیان رہ سکیں تاکہ وہ کالوں کے دشمنوں کو اچھی طرح سمجھ پرکھ سکیں۔

1931ء میں آقا ڈبلیو ڈی فارڈ، ڈیٹرائٹ، مشی گن میں بطور ریشم فروش ایلیا محمد سے ملے۔ اور انہوں نے ایلیا محمد کو "شمالی امریکہ کے ویرانے میں بھٹکتی" اسلام کی گمشدہ و نو دریافت نام نہاد نیگرو نسل کو بچانے کے لیے اللہ کا پیغام دیا۔

میری بہن ہلڈا "یعقوب کی تاریخ" سنا کر واپس چلی گئی۔ میں حیرت کے مارے اسے خدا حافظ بھی نہ کہہ سکا۔ بعد میں مجھے علم ہوا کہ ہلڈا کی بیان کردہ "تاریخ یعقوب" پر اہل مشرق کافی مشتعل ہوئے۔ جب میں مکہ گیا تو میں نے انہیں یاد دلایا کہ اس میں قصور مسلمانوں کا ہے جنہوں نے مغرب کو حقیقی اسلام سے روشناس کروانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ان کی خاموشی نے ایک ایسا خلاء پیدا کیا ہے جس سے فائدہ اٹھا کر کوئی بھی جعل ساز ہمارے لوگوں کو گمراہ کر سکتا ہے۔

!

باب :11

نجات یافتہ

میں نے ایلیا محمد سے خط و کتابت شروع کی ، ان دنوں وہ شکاگو میں 6116 سائوتھ مشی گن ایونیو پر رہتے تھے۔ پہلی باریک صفحی خط لکھنے سے قبل میں نے کم از کم پچیس بار اسے لکھ کر مٹایا۔ میں اسے قابل فہم اور قابل مطالعہ بنانا چاہتا تھا۔ عملی طور پر میں خود اپنا لکھا نہیں پڑھ سکتا تھا جسے یاد کر کے مجھے آج بھی شرم آ جاتی ہے۔ میرے ہجے اور گرامر میری تحریری سے بھی بدتر تھے بہر حال میں جہاں تک اظہار کر سکا میں نے یہی لکھا کہ میں نے اپنے بہن بھائیوں سے ان کے متعلق سنا ہے اور میں اپنی بدخطی پر معذرت خواہ ہوں۔

مسٹر ایلیا محمد نے جواباً مجھے ٹائپ شدہ خط بھیجا جس پر ”اللہ کا پیغمبر“ کے دستخط دیکھ کر مجھ پہ ایک برقی اثر ہوا۔ انہوں نے مجھے ”حقیقی علم“ کی دنیا میں خوش آمدید کہتے ہوئے میری توجہ سوچنے کی جانب مبذول کروائی۔

انہوں نے کہا ”سیاہ فام قیدی سفید معاشرے کے اس جرم کی علامت ہے کہ کس طرح انہیں مجبور محروم، جاہل اور اچھی ملازمتوں سے دور رکھ کر مجرم بنایا جا رہا ہے۔“

انہوں نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے خط میں پانچ ڈالر کا نوٹ بھی ارسال کیا۔ مسٹر ایلیا خط لکھنے والے تمام قیدیوں کو اسی طرح رقم بھیجا کرتے تھے۔

میرے اہل خانہ مجھے مستقل خطوط لکھ کر ”اللہ کی طرف مڑنے اور مشرق کی طرف رُخ کرنے“ کا کہتے۔ میرے لیے سب سے مشکل کام، عبادت کرنا تھا کیونکہ ایلیا محمد کی تعلیمات پر ایمان لانا میرے لیے اب تک محض ذہنی تبدیلی تھی ”یہ سچ ہے“ یا ”اس کے متعلق تو میں نے پہلے سوچا ہی نہیں“ قسم کی لیکن گھٹنے دوہرے کر کے عبادت کرنے کا عمل میرے لیے مشکل تھا۔ مجھے اس کی مشق میں ایک ہفتہ لگا۔ اس سے قبل مجھے صرف کسی گھر کا تالا توڑنے کے

لیے جھکنے کی عادت تھی۔ میں جب بھی عبادت کے لیے جھکنے کی کوشش کرتا تو شرم اور گھبراہٹ سے پھر کھڑا ہو جاتا۔

بدی کو جھکا کر اعترافِ جرم کرنا اور اللہ سے معافی کا خواستگار ہونا شاید سب سے مشکل ترین کام ہے۔ گو اب یہ کہنا بے حد آسان ہے لیکن تب جب میں سراپا بدی تھا تو اس کیفیت سے گزرنا سہل نہ تھا۔ میں بار بار عبادت کے انداز میں بیٹھنے کی کوشش کرتا اور بالآخر جب میں بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا تو مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب اللہ سے کہوں کیا؟

آنے والے سالوں میں ”نور فوک پر یزن کو لونی“ میں میری زندگی ایک صوفی (Hermit) کی سی بن کر رہ گئی۔ میں زندگی بھر اتنا مصروف نہیں ہوا، میں حیران اس بات پر تھا کہ میری گزشتہ زندگی اس قدر تیزی سی بدل گئی تھی جیسے چھت پر پڑی برف پگھل جاتی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اچکا اور مجرم میرا کوئی جاننے والا تھا اور اپنے متعلق اس اجنبیت سے سوچنا میرے لیے حیران کن تھا۔

اپنے متعلق میں جو کچھ سوچتا وہ روزانہ یک صفحی خط میں جناب ایلیا محمد کو مبہم انداز میں لکھ بھیجتا۔ اس کے علاوہ دوسرا خط روزانہ اپنے بہن بھائیوں کے نام لکھتا۔ ان سے موصول ہونے والا ہر خط جناب ایلیا محمد کی تعلیمات کے متعلق میری معلومات میں اضافہ کرتا۔ میں کافی کافی دیر ان کی تصاویر کو دیکھتا رہتا۔

میں مزاجاً ایک باعمل آدمی ہوں۔ کوئی بات میرے ذہن میں بیٹھ جائے تو میں بے کار نہیں بیٹھ سکتا۔ شاید اسی لیے میں نے کوئی اور راہ نہ پاتے ہوئے اپنے ماضی کے دوستوں مثلاً سیمی دلال، جون ھیوز، جوئے خانے کے مالک، جمپ سٹیڈی چور اور بہت سے منشیات فروشوں کو خطوط لکھنا شروع کر دیئے۔ میں انہیں اللہ، اسلام اور ایلیا محمد کے متعلق بتاتا۔ مجھے ان میں سے کسی کا پتہ معلوم نہ تھا لیکن میں انہیں ہارلم اور روکس بیری کے اُن شراب خانوں اور کلبوں کی معرفت خط لکھتا جنہیں میں جانتا تھا۔

مجھے کبھی کسی خط کا جواب نہیں آیا۔ تمام اچکے اور مجرم اتنے ان پڑھ تھے کہ خط نہیں لکھ سکتے تھے۔ میں ایسے کئی اچکوں کو جانتا ہوں جو دیکھنے میں ”وال سٹریٹ“ کے قاری نظر آئیں گے مگر اپنے نام خط پڑھنے کے لیے دوسروں کے محتاج ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اگر مجھے ایسا خط موصول ہوتا جس میں ”سفید آدمی ہی شیطان ہے۔“ لکھا ہوتا تو

میں بھی اس کا جواب نہ دیتا۔ یقینا انہوں نے بھی یہی سوچا ہو گا کہ "ڈیٹرائٹ ریڈ" پاگل ہو گیا ہے یا جیل سے نکلنے کا کوئی بہانہ بنا رہا ہے۔

جتنے سال میں نورفوک پریزن کولونی میں رہا مجھ سے کسی افسر نے ان خطوط کی بابت نہیں پوچھا حالانکہ تمام خطوط سنسر ہو کر ہی آگے جاتے تھے اور یقینا ان فائلوں میں ان خطوط کا ذکر ہوتا ہو گا جو تمام ریاستیں اور وفاقی جیل خانے ایلیا محمد کی تعلیمات سے متاثر ہو کر مذہب تبدیل کرنے والے سیاہ فاموں کے متعلق بناتے تھے لیکن اس وقت میرا خیال تھا کہ اس خاموشی کی وجہ یہی ہے کہ گورا جانتا ہے کہ وہ شیطان ہے۔

بعد ازاں میں نے بوسٹن کے میئر کو میساچیوسٹس کے گورنر کو حتیٰ کہ "ہیری ایس ٹرومین" کو بھی خطوط لکھے لیکن انہوں نے بھی کوئی جواب نہیں دیا شاید انہوں نے میرے خطوط دیکھے بھی نہ ہوں۔ میں انہیں لکھتا کہ شمالی امریکا کے اس ویرانے میں سیاہ فام آدمی کی حالت کی تمام ذمہ داری سفید فام معاشرے پر عائد ہوتی ہے۔

اپنے خطوط ہی کی وجہ سے میں نے اپنے طور پر تعلیم حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

روز بروز میری یہ پریشانی بڑھتی جا رہی تھی کہ جو کچھ میں خط کے ذریعے پہنچانا چاہتا ہوں بالخصوص جناب ایلیا محمد کے نام خطوط میں وہ میں نہیں لکھ پاتا تھا۔ سڑکوں پر میں انتہائی ماہر اچکا تھا اور جو کچھ میرے منہ سے نکلتا لوگ اس پر توجہ دیتے اور اب سادہ سی انگریزی لکھتے ہوئے میں ماہر تو کجا کسی لائق بھی نہیں تھا جو بازاری زبان میں بولتا تھا۔ وہ قابلِ فہم نہیں تھی۔

آج جو لوگ مجھے ملتے ہیں یا ٹیلی ویژن پر مجھے سنتے ہیں یا وہ لوگ جو میرے بیانات پڑھتے ہیں وہ سمجھتے ہونگے کہ میں آٹھ سے زیادہ پڑھا ہوا ہوں اس خیال کا باعث میرا جیل کے ایام کا مطالعہ ہی ہے۔

اس تعلیم کا آغاز چارلس ٹاؤن جیل میں ہی ہوا تھا جہاں مجھے بمبی کے علم پر رشک آتا تھا۔ جب بھی کوئی گفتگو ہوتی بمبی سب پر چھا جاتا، میں بھی اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتا لیکن جب بھی میں کوئی کتاب پڑھنے کے لیے اٹھاتا تو چند جملوں کو چھوڑ کر باقی تمام لفظ مجھے چینی زبان کے لگتے، جب میں ان الفاظ کو چھوڑ کر کچھ پڑھتا تو مجھے کتاب کا مضمون پلے نہ پڑتا، نارفوک پریزن کالونی آنے تک میں اسی حالت سے گزر رہا تھا حتیٰ کہ میں نے یہ کوشش بھی چھوڑ دی اور مجھے درست راستہ دکھائی دیا۔

میں نے سوچا کہ الفاظ سیکھنے کے لیے اور مطالعہ کے لیے مجھے لغت حاصل کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی کتابت پر بھی توجہ دینا شروع کر دی کیونکہ میں ایک سطر بھی سیدھی نہیں لکھ پاتا تھا۔ انہی وجوہ کی بناء پر میں نے نارفوک پریزن کالونی سکول سے ایک لغت اور چند پنسلوں کی درخواست کی۔ دو روز تک میں لغت کی ورق گردانی کرتا رہا مجھے اندازہ نہیں تھا کہ لفظ اتنے زیادہ ہوتے ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مجھے ان میں سے کون سے الفاظ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ بالآخر میں نے کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے ان الفاظ کو نقل کرنا شروع کر دیا۔

اپنے سست، بھدے اور اذیت ناک خط میں اپنی کاپی کے اندر میں نے پہلے صفحے پر لکھی ہر چیز بشمول پنکچوایشن کی علامات اتاری، میرا خیال ہے مجھے اس کام میں پورا دن لگا پھر میں اپنا لکھا ہوا بار بار اونچی آواز میں دہراتا رہا۔

اگلی صبح میں انہی لفظوں کے متعلق سوچتا ہوا اٹھا، مجھے فخر تھا کہ نہ صرف میں نے ایک وقت میں اتنے الفاظ لکھے ہیں بلکہ ایسے الفاظ لکھیں ہیں جو اس سے قبل میرے خیال میں وجود ہی نہیں رکھتے تھے۔ مزید یہ کہ تھوڑی سی کوشش سے مجھے ان الفاظ کے معانی بھی یاد آ گئے اور جن کے معنی مجھے یاد نہ آئے انہیں میں نے دوبارہ دیکھا، مثلاً پہلے ہی صفحہ کا ایک لفظ آرڈ وارک (Aardvark) اب بھی میرے دماغ میں آتا ہے اس کی تصویر بھی لغت میں موجود تھی۔ وہ لمبی دم، لمبے کانوں والا جانور تھا جو چیونٹی خور کی طرح اپنی زبان کی مدد سے دیمک شکار کر کے زندہ رہتا ہے۔

میں اتنا مسحور ہوا کہ میں نے لغت کا اگلا صفحہ بھی نقل کر لیا۔ اس بار بھی مجھے پہلے والا تجربہ ہوا۔ ہر نئے صفحے کے ساتھ میں لوگوں، جگہوں اور تاریخی واقعات کی بابت سیکھتا۔ لغت دراصل ایک چھوٹا انسائیکلو پیڈیا ہوتی ہے بالآخر حصہ "اے" ختم ہو گیا جس سے میری ساری کاپی بھر گئی۔ پھر میں نے حصہ "بی" شروع کیا۔ اس طرح میں نے پوری لغت نقل کر لی۔ اب میری لکھنے کی رفتار بھی بہتر ہو گئی تھی فارغ اوقات میں خطوط لکھتے اور کاپی میں لکھتے ہوئے میں نے لاکھوں الفاظ لکھے ہوں گے۔

میرے خیال میں میرا ذخیرہ الفاظ بڑھنا فطری سی بات تھی۔ اب میں کوئی بھی کتاب نہ صرف پڑھ سکتا تھا بلکہ سمجھ بھی سکتا تھا۔ میرے سامنے کھلنے والی دنیا کی وسعت کا اندازہ کوئی وسیع المطالعہ شخص ہی کر سکتا ہے تب سے جیل چھوڑنے تک میں اگر کتب خانے میں مصروف مطالعہ نہ ہوتا تو اپنے بستر میں پڑھ رہا ہوتا تھا۔ جناب ایلیا محمد کے ساتھ خط و کتابت اور بہن بھائیوں مثلاً ایلاء اور ریگی نالڈ سے ملاقات اور مطالعے کی مصروفیت میں مجھے قید ہونے کا احساس ہی نہ رہتا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے زندگی بھر اتنی حقیقی آزادی ملی ہی نہیں تھی۔

نورفوک پریزن کولونی کا کتب خانہ اسکول کی عمارت میں تھا جہاں ھارورڈ اور بوسٹن کی جامعات سے اساتذہ مختلف جماعتیں پڑھانے آتے تھے۔ وہاں قیدیوں کے مابین ہفتہ وار مباحثے ہوتے جن میں ”کیا بچوں کو دودھ پلانا چاہیے؟“ جیسے موضوعات پر بھی بحث ہوتی۔

کتب خانے میں ہر موضوع پر کتب میسر تھیں جن میں تاریخ اور مذہب پر کتب زیادہ تھیں اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کی کہ مسٹر پارک ہرسٹ اتنے صاحب ثروت تھے کہ ان کے انتخاب میں ایسی بہت ساری کتابیں بھی شامل تھیں جو عام طور پر میسر نہیں آتیں۔

قید میں جہاں بنیادی مقصد ہی ہماری اصلاح تھا ایک ساتھی کو اس طرح کتابوں میں غرق دیکھ کر دوسرے قیدی ہنستے تھے۔ بہت سارے قیدی کافی صاحب مطالعہ اور مقبول مقرر تھے اور کچھ تو ایسے بھی تھے جو چلتے پھرتے انسائیکلو پیڈیا تھے۔ جتنا مطالعہ میں نے پڑھنا سیکھنے کے بعد کیا کوئی جامعہ کسی طالب علم کو اتنا مطالعہ نہیں کروا سکتی۔

میں کتب خانے سے زیادہ اپنے کمرے میں مطالعہ کرتا تھا اور ایسے قیدی کو جو پڑھنا جانتا ہو مقرر تعداد سے زیادہ کتب لینے کی اجازت تھی۔

جب سنجیدہ کتب کا مطالعہ بتدریج بہتر ہوتا گیا تو مجھے رات دس بجے بند ہونے والی بجلی پر بہت غصہ آنے لگا۔

خوش قسمتی سے ٹھیک میرے دروازے کے باہر ایک برآمدے کا بلب لگا ہوا تھا جس کی چمک میرے کمرے میں آتی تھی۔ یہ چمک اتنی تھی کہ آنکھیں اس کی عادت ہونے کے بعد کتاب پڑھ سکتی تھیں چنانچہ جب بجلی بند کرنے کا حکم آتا تو میں بستر سے اتر کر فرش پر بیٹھ جاتا اور مطالعہ جاری رکھتا۔ ہر گھنٹے کے بعد پہرے دار گشت کرتا ہوا وہاں سے گزرتا تو میں چھلانگ لگا کر بستر میں گھس جاتا اور سونے کی اداکاری کرتا اور پہرے دار کے گزرتے ہی میں چھلانگ لگا کر دوبارہ فرش پر آ جاتا اور اگلے اٹھاون منٹ اسی چمک میں پڑھتا رہتا۔ یہ سلسلہ صبح تین چار بجے تک چلتا میرے لیے تین چار گھنٹے کی نیند کافی تھی کیونکہ ماضی میں تو میں اس سے بھی کم سونے کا عادی تھا۔

جناب ایلیا محمد کی تعلیمات میں اس نکتہ پر بہت زور دیا جاتا کہ تاریخ کو کس طرح سفید کیا گیا ہے؟ جب گورے نے تاریخ پر کتب لکھنی شروع کیں تو اس نے سیاہ فام کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ میرے لیے ایلیا محمد کی تعلیمات میں اس سے زیادہ اہم بات کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ساتویں جماعت میں جب میں دوسرے سفید فام لڑکوں کے ساتھ پڑھتا تھا تو تاریخ کی کتاب میں نیگرو تاریخ صرف ایک پیراگراف میں سمیٹ دی گئی تھی اور طالب

علم استاد کے منہ سے یہ لطف سن کر کہ ”نیگروز کے پاؤں اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان سے زمین میں گڑھا پڑ جاتا ہے“ بہت ہنسے تھے۔

قطع نظر اس بات کے کہ وہ ایلیا محمد کے پیروکار تھے یا نہیں مگر امریکہ بھر کے سیاہ فاموں میں ایلیا محمد کی تعلیمات انتہائی سرعت کے ساتھ پھیلیں۔ امریکہ بھر میں شاید ہی کوئی بالغ سیاہ فام یا سفید فام ایسا ہو گا جو تاریخ کی کتابوں سے سیاہ فاموں کے حقیقی کردار کے متعلق آگاہی رکھتا ہو۔ ایک بار جب میں نے ”سیاہ فام کی سنہری تاریخ“ کے متعلق سنا تو میں نے کتب خانے میں ایسی کتب کی تلاش شروع کر دی جن میں سیاہ فاموں کی تاریخ سے متعلق معلومات ہوں۔

مجھے وہ کتب بھی اچھی طرح یاد ہیں جن سے میں پہلی پہلی بار متاثر ہوا۔ میں نے وہ مجموعہ خرید کر آج بھی گھر پر رکھا ہوا ہے تاکہ کل میرے بچے بھی انہیں پڑھ سکیں۔ اس کتابی مجموعے کا نام ”عجائبات عالم“ (Wonders of the World) تھا۔ یہ دریافت شدہ آثار قدیمہ اور ایسے مجسموں کی تصاویر تھیں جو غیر یورپی لوگوں کی نمائندگی کرتے تھے۔

ول ڈیورانٹ کی کتاب ”تمدن کی کہانی“ (Story of Civilization)، ایچ جی ویلز کی ”تاریخ کا خاکہ“ (Outline of History) اور ڈبلیو ای بی ڈوبوئس کی کتاب ”سیاہ فاموں کی ارواح“ (Souls of Black Folk) نے مجھے امریکہ آمد سے قبل سیاہ فاموں کی تاریخ سے کچھ واقفیت بخشی۔ کارٹر جی ووڈسن کی کتاب ”نیگرو تاریخ“ میں بطور غلام امریکہ لائے جانے سے قبل سیاہ فاموں کی سلطنت اور ابتدائی نیگروز کی جدوجہد آزادی کے تذکرے نے میری آنکھیں کھول دیں۔

جے اے روجر کی تین جلدوں پر مشتمل کتاب ”جنس اور نسل“ (Sex and Race) نے مجھے قبل از مسیح نسلی ادغام کے متعلق بتایا۔ اس سے میں نے ایسوپ جن کی حکایتیں مشہور ہیں کے متعلق جانا کہ وہ بھی سیاہ فام تھا، اس کے علاوہ مجھے اس کتاب سے فراعین مصر، عظیم کوپ تک عیسائی سلطنتوں، دنیا کی قدیم ترین جاری سیاہ تہذیب ایتھوپیا اور دوسری قدیم ترین تہذیب چین کے متعلق علم ہوا۔

سفید فام کی تخلیق سے متعلق جناب ایلیا محمد کی تعلیمات مجھے گریگر مینڈل کی کتاب ”جینیاتی انکشافات“ (Findings in Genetics) کی طرف لے گئیں۔ میں نے یہ کتاب ایک آسٹرئین راہب سے پڑھی تھی۔ اس کتاب کے بار بار

مطالعہ سے مجھے یہ سمجھنے میں آسانی ہو گئی کہ ایک سیاہ فام سے نسل بعد نسل سفید فام نسل کا حصول ممکن ہے لیکن ایک سفید فام سے کبھی بھی سیاہ فام نسل حاصل نہیں کی جا سکتی کیونکہ سفید کروموسوم Recessive ہوتا ہے اور چونکہ اس میں کسی کو شبہ نہیں ہے کہ ابتداء میں صرف ایک آدمی ہی تھا لہٰذا نتیجہ واضح ہے۔

شاید گزشتہ سال آرنلڈ ٹائن بی نے نیویارک ٹائمز میں سفید آدمی کا تذکرہ کرتے ہوئے بلیچڈ (Bleached) کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس کے صحیح الفاظ کچھ یوں تھے (White Bleached, human beings of North European Origin) ٹائن بی نے یورپ کے جغرافیائی علاقہ کو بھی ایشیاء کا محض ایک جزیرہ قرار دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یورپ نام کی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔

اگر آپ دنیا کو دیکھیں تو امریکہ ایشیاء کی توسیع نظر آئے گا (لیکن اس کے ساتھ ساتھ ٹائن بی خود بھی تاریخ کو سفید کرنے میں معاون دکھائی دیتا ہے کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ افریقہ واحد براعظم ہے جس کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ گو اس نے یہ بات دہرائی نہیں مگر سچ روز بروز سامنے آتا جا رہا ہے)۔

غلامی کے آلام پڑھ کر مجھے جو صدمہ پہنچا اسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ ایلیا محمد کا وزیر بننے کے بعد یہ میرا پسندیدہ موضوع بن گیا۔ امریکہ پہنچنے کے بعد غلاموں کے مصائب پر فریڈرک اوم سٹیڈ کی کتاب نے میری آنکھیں کھول دیں۔ ایک یورپی خاتون فینی کیمبل جس نے جنوبی امریکہ کے ایک “غلام دار” سے شادی کی تھی اپنی کتاب میں بیان کرتی ہے کہ کس طرح انسانوں سے تحقیر آمیز سلوک ہوتا تھا۔ میں نے “انکل ٹامز کیبن” بھی پڑھا تھا اور یہ واحد ناول ہے جو آج تک میں نے پڑھا ہے۔

پارک ہرسٹ کے ذخیرے میں کچھ مجلد پمفلٹ بھی تھے جو نیو انگلینڈ کی " Abolitionist Anti-Slavery Society" کے شائع کردہ تھے۔ میں ان آلام و مصائب کی تفصیل پڑھتا، سیاہ فام عورتوں کے ہاتھ پائوں باندھ کر کوڑے مارے جانے کی تصاویر دیکھتا، ان میں خاکوں کے ذریعے بچوں کو مائوں سے (دوبارہ کبھی نہ ملنے کے لیے) چھینتے دکھایا گیا تھا، غلاموں کا تعاقب کرتے ہوئے کتوں، بندوقوں، زنجیروں، بیلچوں اور کوڑوں سے مسلح سفید بدمعاش جو مفرور غلاموں کو پکڑنے پر مامور تھے۔ میں نے ایک غلام مبلغ نیٹ ٹرنر کے متعلق پڑھا جس نے گورے آقا کے دل میں خوف الٰہی پیدا کیا تھا۔ نیٹ ٹرنر آخرت کے اجر یا غیر متشدد آزادی کا علم بردار نہ تھا۔ 1831ء میں ورجینیا میں ایک رات نیٹ اور سات دیگر غلاموں نے اپنے آقا کے گھر پر حملہ کیا اور ایک کے بعد دیگر بڑے مکانوں پر حملہ آور ہوئے اور اگلی صبح تک قتل و غارت کرتے رہے۔ ستاون سفید فام ایک رات میں قتل کئے گئے

تقریباً ستر غلام نیٹ کے پیروکار بن گئے سفید فام لوگ خوفزدہ ہو کر زندگی بچانے کے لیے اپنے گھروں سے بھاگ گئے، سرکاری عمارات میں مقفل ہو گئے یا جنگلوں میں جا چھپے اور کچھ تو ریاست ہی چھوڑ گئے۔ سپاہیوں کی ایک چھوٹی سی فوج کو نیٹ ٹرنر کو پکڑ کر پھانسی لگانے میں دو ماہ لگے اور میں نے کہیں پڑھا ہے کہ نیٹ کی مثال سے متاثر ہو کر تقریباً تیس سال بعد جان براؤن نے ورجینیا میں ہارپرزفیری کے مقام پر حملہ کیا اس کے ہمراہ تیرہ سفید فام اور پانچ نیگروز تھے۔

میں نے بابائے تاریخ ہیروڈوٹس کو پڑھا بلکہ یوں کہیں کہ اس کے متعلق پڑھا جس سے مجھے مختلف اقوام کی تواریخ پڑھنے کا موقع ملا اور یہ جان کر کہ اس سفیدفام قوم نے کس طرح دنیا بھر میں غیر سفید فام لوگوں کا خون چوسا اور نچوڑا اور انہیں لوٹا اور ان کی عزتوں سے کھیلی، میری آنکھیں بتدریج کھلتی گئیں، سردست مجھے ول ڈیورائٹ کی کتاب مشرقی تہذیبوں کی کہانی (The Story of Oriental Civilization) اور مہاتما گاندھی کی انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی داستان پڑھنے کا موقع بھی ملا ہے۔

کتاب بعد کتاب مجھ پر کھلا کہ اس سفید فام نے کس طرح دنیا بھر کی سیاہ، بھوری، سرخ اور زرد اقوام کا استحصال کیا ہے، میں نے دیکھا کس طرح سولہویں صدی میں سفید فام نام نہاد عیسائی تاجروں نے اپنی تسکین نفس کے لیے سمندروں کا سفر شروع کیا اور ایشیاء کی اور افریقی سلطنتوں میں لوٹ مار کر کے اپنی طاقت بڑھائی۔ میں نے پڑھا اور دیکھا ہے کہ سفید فام جب غیر سفید فام لوگوں کے درمیان گیا تو وہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات اور صلیب کے حقیقی مفہوم کے مطابق عاجز، شائستہ اور حضرت عیسیٰؑ جیسا بننے کی بجائے اس کے بالکل برعکس دکھائی دیا۔

میرا خیال ہے اور جیسا کہ میں نے پڑھا ہے کہ مجموعی طور پر سفید فام سوائے ایک عملی موقع پرست کے اور کچھ بھی نہیں جو فوسٹین طریقہ کار کا پیروکار ہے اور مجرمانہ مہمات میں عیسائیت کو ابتدائی سہارے کے طور پر استعمال کرتا ہے، پہلے وہ ہمیشہ مذہبی طور پر غیر سفید قدیم ثقافتوں اور تہذیبوں کو بت پرست اور کافر قرار دیتا ہے اور جب یہ مرحلہ مکمل ہو جاتا ہے تو اپنے غیر سفید فام شکار پر جنگ کا ہتھیار لے کر چڑھ دوڑتا ہے۔

میں نے پڑھا کہ کس طرح 1759ء میں برطانوی سفید فام لوگوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی آڑ میں ہندوستان میں داخل ہو کر تقریباً نصف ارب انتہائی مذہبی بھورے لوگوں کو دھوکے، مکاری اور جھوٹے وعدوں کے سبز باغ دکھا کر قابو کر لیا۔ طفیلی برطانوی انتظامیہ تقریباً نصف برصغیر کو اپنے شکنجے میں کستی چلی گئی۔ 1859ء میں کچھ مجبور اور مایوس

لوگوں نے بالآخر بغاوت کر دی اور سوائے افریقن غلاموں کی تجارت کے تاریخ ایسی کوئی مثال پیش نہیں کر سکتی جس میں غیر ضروری طور پر غیر سفید ہندوستانی لوگوں کو اتنے وحشیانہ اور بے رحمانہ طریقے سے قتل کیا گیا ہو۔

تقریباً ایک سو پندرہ ملین افریقی سیاہ فام (1630 میں امریکہ کی کل آبادی کے تقریباً مساوی انسانوں کی تجارت کے دوران غلام بنائے گئے یا قتل کئے گئے، اور میں نے پڑھا کہ جب غلام بازاروں کی جگہ نہ رہی تو یورپ کی سفید آدم خور طاقتوں نے سیاہ براعظم کے انتہائی قیمتی علاقوں کو اپنی کالونیاں بنا لیا اور اگلی صدی میں یورپ کی چانسلریوں نے قاہرہ سے کیپ ٹاؤن تک طاقت اور استحصال کی برہنہ شطرنج کھیلی۔

میرا حال یہ تھا کہ جیل وارڈن اور دس محافظ مل کر بھی مجھے ان کتابوں سے الگ نہیں کر سکتے تھے حتیٰ کہ خود جناب ایلیا محمد بھی ان کتابوں سے زیادہ موثر نہیں ہو سکتے تھے۔ جن میں مجموعی سفید فام کی غیر سفید فام انسانوں کی مجموعی آبادی کے ساتھ شیطانیت کا ناقابل تردید ثبوت موجود تھا۔ میں ریڈیو سنتے ہوئے، ٹیلیویژن دیکھتے ہوئے اور شہ سرخیاں پڑھتے ہوئے گورے آدمی کو مجموعی طور پر چین سے خوفزدہ اور پریشان دیکھتا ہوں اور جب سفید فام چینیوں کی نفرت کے متعلق لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں تو مجھے جیل میں اپنے زیر مطالعہ کتابوں کی یاد آتی ہے۔ جن میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح اس موجودہ سفید نسل کے آباؤ اجداد نے چینیوں کے اعتماد سے فائدہ اٹھا کر ان کی بے چارگی کے وقت چین کو لوٹا، ان حقیقی سفید عیسائی تاجروں نے لاکھوں پاؤنڈ افیون چین بھیجی، 1839ء میں اتنے چینی منشیات میں مبتلا ہو چکے تھے کہ چینی حکومت نے مجبور ہو کر افیون کی بیس ہزار پیٹیاں ضائع کیں، جس کے نتیجے میں سفید فام نے فوری طور پر جنگ افیون کا اعلان کر دیا۔ ذرا غور کیجئے ایسے شخص کے خلاف اعلان جنگ جو منشیات میں مبتلا ہونے سے انکار کرتا ہے چینیوں کو انہی کے ایجاد کردہ گن پاؤڈر سے بری طرح مارا گیا۔

معاہدئہ نین کنگ کی رو سے برطانوی سفید فام نے چین کو مجبور کیا کہ وہ ضائع کردہ افیون کی قیمت ادا کرے۔

برطانوی تجارت کے لیے چین کو بندرگاہیں کھولنے پر مجبور کیا گیا، چین کو ہانگ کانگ سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا گیا۔ چین کا درآمدی ٹیرف اتنا کم رکھا گیا کہ سستی برطانوی اشیاء کا چینی بازاروں میں سیلاب آ گیا جس نے چین کی صنعتی ترقی کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔

دوسری جنگ افیون کے بعد "ٹائی ہنٹسن" معاہدے کے تحت بگڑتی ہوئی افیون تجارت کو قانونی حیثیت دے دی گئی۔ چین کے کسٹمز پر برطانوی، فرانسیسی، امریکی اختیار کو قانونی تحفظ دیا گیا۔ جب چین نے اس معاہدے کو تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو پیکنگ کو لوٹ کر نظر آتش کر دیا گیا۔

"غیر ملکی سفید شیطانوں کو مار دو" 1901ء میں "باکسر بغاوت" میں چینی جنگ کا نعرہ تھا۔ اس جنگ میں شکست کے بعد چینیوں کو پیکنگ کے منتخب علاقوں سے نکال دیا گیا اور متکبر اور وحشی گوروں نے وہ مشہور کتبے لگائے جن پر تحریر تھا "چینیوں اور کتوں کا داخلہ ممنوع ہے۔"

دوسری جنگ عظیم کے بعد سرخ چین نے اپنے دروازے مغربی سفید دنیا پر بند کر دیئے۔ لائف میگزین نے اپنی حالیہ اشاعت میں چین میں ہونے والی بڑے پیمانے پر صنعتی، سائنسی اور زرعی کوششوں پر بڑا مبسوط مضمون لکھا ہے۔ سرخ چین کے اندر سے کچھ مشاہدہ کرنے والوں نے بتایا ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں گوروں سے نفرت کی اتنی بڑی مہم کبھی نہیں دیکھی گئی جتنی اس وقت اس غیر سفید ملک میں جاری ہے جہاں موجودہ شرح پیدائش اگر اسی طرح برقرار رہی تو اگلے پچاس سالوں میں چینی دنیا کی نصف آبادی بن جائیں گے اور حالیہ نیوکلائی تجربوں میں کامیابی کے بعد ایسا لگتا ہے کہ چین ایک روز اپنی عظمت گم گشتہ پھر حاصل کرے گا۔

ہمیں حقیقت کا سامنا کرنا چاہیے۔ واضح نظر آ رہا ہے کہ نسلی بنیاد پر اقوام متحدہ میں ایک نیا ورلڈ آرڈر وقوع پذیر ہے۔ غیر سفید اقوام متحد ہو رہی ہیں زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب اقوام متحدہ میں امریکی سفیر اڈلائی سٹیونسن نے شکایت کی تھی کہ یہاں پر "ایک نسلی کھیل" کھیلا جا رہا ہے۔ اس نے سچ کہا تھا وہ حقیقت کا سامنا کر رہا تھا۔ نسلی کھیل واقعی کھیلا جا رہا ہے لیکن سٹیونسن کی شکایت ایسی ہی ہے جیسے جیس جیمز، مارشل پر مسلح ہونے کا الزام لگائے کیونکہ دنیا کی تاریخ میں گوروں سے زیادہ بدترین نسلی کھیل کسی نے بھی نہیں کھیلا۔

مسٹر ایلیا محمد جنہیں میں روزانہ خط لکھتا تھا میرے اندر آنے والی تبدیلیوں سے بے خبر تھے۔

جب میں فلسفے سے آشنا ہوا تو میں نے تمام اہم فلسفیانہ مدارج کو چھونے کی کوشش کی۔ بتدریج میں نے تقریباً تمام پرانے مغربی اور مشرقی فلسفی پڑھ ڈالے۔ میں مشرقی فلسفیوں کو ترجیح دیتا تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ مغربی فلسفہ زیادہ تر مشرقی مفکرین سے ہی ادھار لیا گیا ہے مثلاً سقراط نے مصر کا سفر کیا تھا، کچھ ذرائع تو یہ بھی کہتے ہیں کہ سقراط کو کچھ مصری اسراروں میں شامل بھی کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ سقراط کی دانش کا کچھ حصہ مشرق کے دانش وروں کی عطا تھا۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ مطالعہ نے میرے سامنے شعور کے نئے افق کھول دیئے۔ مجھے جیل ہی میں علم ہو گیا تھا کہ مطالعے نے میری زندگی کا راستہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیا ہے۔ مطالعہ کی صلاحیت نے میرے اندر ذہنی

بیداری کی خفتہ خواہش کو بیدار کر دیا، میں یہ سب کچھ روایتی کالج کے طلبہ کی طرح معاشرتی عزت کی علامت کے طور پر کسی ڈگری کے حصول کے لیے نہیں کر رہا تھا۔ میری خانہ ساز تعلیم میں ہر نئی کتاب نے اس برے پن، اندھے پن اور گونگے پن کا احساس اجاگر کیا جس میں امریکی سیاہ فام مبتلا تھے۔ کچھ عرصہ قبل ایک انگریز مصنف نے لندن سے ٹیلی فون پر سوال پوچھا کہ ” آپ کی مادر علمی کونسی ہے؟“ میں نے جواب دیا ”کتابیں“ آپ مجھے کبھی پندرہ منٹ بھی کسی ایسی کتاب کے مطالعے سے دور نہیں پائیں گے جس سے میرے خیال کے مطابق کالوں کی بہتری میں مدد مل سکتی ہو۔

گزشتہ روز میں نے لندن میں تقریر کی اور جہاز سے آتے جاتے ہوئے میں اقوام متحدہ کی وہ دستاویز پڑھ رہا تھا جس میں دنیا بھر کی پسی ہوئی اقلیتوں کے انسانی حقوق کو تحفظ دیا گیا ہے۔ امریکی سیاہ فام دنیا بھر میں اقلیتوں پر جبر کی انتہائی قابل شرم مثال ہیں۔ سیاہ فاموں کو ”معاشرتی حقوق“ کا جھانسا دیکر امریکی ریاستوں کا اندرونی معاملہ قرار دے دیا گیا ہے لیکن سیاہ فام انسانی حقوق کے حصول سے پہلے معاشرتی حقوق کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ اگر امریکی سیاہ فام انسانی حقوق کے متعلق سوچنا شروع کرے اور پھر سے اپنے آپ کو دنیا کی عظیم اقوام کا حصہ سمجھنے لگے تو اسے معلوم ہو گا کہ اقوام متحدہ کے لیے اس کا مقدمہ سب سے زیادہ مضبوط ہے۔

چار سو سال سے سیاہ فاموں نے امریکہ کی آبیاری اپنے خون پسینے سے کی ہے اور جو حقوق نئے تارکین وطن کو امریکی زمین پر پائوں رکھتے ہی مل جاتے ہیں ان کے حصول کے لیے آج بھی سیاہ فاموں کو گوروں سے بھیک مانگنا پڑتی ہے۔

یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا میں نے انگریز کو بتایا تھا کہ میری مادرِ علمی کتابیں اور اچھا کتب خانہ ہے۔ دوران سفر میرے پاس ہمیشہ کتاب ہوتی ہے اور اگر مجھے ہر روز گوروں سے جنگ لڑنا نہ پڑے تو میں ساری زندگی تسکین تجسس کے لیے مطالعہ میں گزار سکتا ہوں۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی چیز ہو جس کے متعلق مجھے تجسس نہ ہو، میرا نہیں خیال کہ کسی شخص نے جیل سے اتنا فائدہ اٹھایا ہو گا سچ پوچھئے تو اگر جیل کی بجائے میں کسی کالج میں طالب علم ہوتا اور ایک مختلف زندگی گزار رہا ہوتا تو کبھی اتنا زیادہ مطالعہ نہ کر پاتا۔ میری رائے میں کالج میں طلبہ کی توجہ خراب کرنے کے مواقع نسبتاً زیادہ ہیں اور مجھے غالباً جیل کے علاوہ پندرہ گھنٹے روزانہ مطالعہ کی فرصت بھی نہ ملتی۔

میں نے شوپن ہار، کانٹ اور نطشے وغیرہ سب کا مطالعہ کیا۔ میں ان سے کوئی خاص متاثر نہیں ہوں لیکن صرف یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ان سالوں میں میں کن لوگوں کے نظریات میں غرق رہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تین

وہ شخصیتیں ہیں جنھوں نے فاشسٹ اور نازی فلسفے کی تعبیر کے لیے بنیاد فراہم کی۔ میں ان کا کوئی خاص احترام نہیں کرتا کیونکہ میرا خیال ہے کہ ان کا زیادہ وقت ایسے مباحث میں صرف ہوتا تھا جو زیادہ اہم نہیں ہیں۔ ان کو پڑھ کر مجھے وہ نام نہاد نیگرو "دانشور" یاد آتے ہیں جو ہمیشہ بے مقصد اور بے فائدہ بحثوں میں الجھے رہتے ہیں۔

سپی نوزا نے کچھ عرصہ مجھے صرف اس لیے متاثر کیا کیونکہ وہ بھی سیاہ فام ہسپانوی یہودی تھا۔ یہودیوں نے اسے صرف اس لیے دائرہ مذہب سے نکال دیا کیونکہ وہ نظریہ وحدت الوجود کی وکالت کرتا تھا۔ یہودیوں نے اس کی زندگی میں ہی اس کی رسومات تدفین ادا کر دیں گویا وہ جیتے جی ان کے لیے مر گیا ہو۔ اس کے خاندان کو سپین سے نکال دیا گیا جو میرے خیال میں ہالینڈ میں جا کر آباد ہوئے۔

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ مغربی فلسفے کا دھارا ایک بند گلی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ سفید آدمی نے سیاہ فاموں کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ بھی عظیم دھوکا کیا ہے کیونکہ وہ منظم طور پر اپنی احمقانہ ضرورت کے لیے تاریخ میں سے سیاہ فاموں کا حقیقی کردار غائب کرنا چاہتا تھا۔

آج سیاہ براعظم یعنی افریقہ میں پیش آمدہ واقعات نے سفید فاموں کو پریشان کر دیا ہے۔ نو دریافت شدہ فنی شہکار بار بار یہ ثابت کرتے ہیں کہ گوروں کے غاروں سے نکلنے سے پہلے سیاہ فام عظیم، عمدہ اور باشعور تہذیبوں کے مالک تھے۔ صحارا کے زیریں علاقے میں جہاں سے امریکی نیگروز کے آباؤ اجداد اغواء کئے گئے تھے ایسے ایسے نفیس اور فن کے شہکار مجسمے اور دیگر اشیاء برآمد ہوئی ہیں جو جدید آدمی نے کبھی دیکھی بھی نہیں ہوں گی۔ ان میں سے چند چیزیں نیویارک شہر کے میوزیم آف ماڈرن آرٹ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ سونے کی بنی ہوئی ایسی ایسی اعلیٰ معیار کی خوبصورت اشیاء ہیں جن کا کوئی ثانی نہیں۔ سیاہ ہاتھوں کی بنی ہوئی یہ قدیم اشیاء جنہیں سیاہ ہاتھوں نے ہی سنوارا اور چمکایا ہے آج کا انسان ان کے پاسنگ بھی نہیں ہو سکتا۔

تاریخ کو اس حد تک سفید کیا گیا ہے کہ سفید فام تو کجا سیاہ فام پروفیسرز بھی عام جاہل سیاہ فام شخص سے زیادہ نہیں جانتے کہ صدیوں پہلے سیاہ فام کتنی اعلیٰ تہذیبوں، ثقافتوں اور صلاحیتوں کے حامل تھے۔ مجھے کچھ نیگروز کالجز میں لیکچرز دینے کا اتفاق ہوا تو کچھ ایسے برین واشڈ سیاہ پی ایچ ڈیز جن کی کمریں ڈگریوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں، سفید فاموں کے اخباروں کی طرف دوڑ پڑے اور مجھے "متعصب کالا" کہنے لگے کس واسطے؟ اس واسطے کہ وہ وقت سے پچاس سال پیچھے ہیں۔ اگر میں کسی نیگرو کالج کا صدر ہوتا تو میں طلبہ کے ایک گروہ کو افریقہ میں کھدائی کے لیے بھیجتا تا کہ سیاہ فام نسل کی تاریخی عظمت کا ثبوت زیادہ سے زیادہ سامنے آ سکے۔ چاہے اس کے لیے مجھے کالج کی

عمارت گروی رکھنی پڑتی، اب سفید فام افریقہ میں کھدائی اور تلاش کا کام کر رہے ہیں۔ آج کوئی افریقی ہاتھی بغیر کسی بیلچہ بردار گورے سے ٹھوکر کھائے افریقہ میں چل بھی نہیں سکتا۔ عملی طور پر ہم ہر ہفتے افریقہ کی گمشدہ تہذیبوں کے متعلق کسی نہ کسی نئی عظیم دریافت کے متعلق پڑھتے ہیں۔ سفید فاموں کا سائنسی رویہ صرف ایک نئی چیز ہے سیاہ براعظم کی قدیم تہذیبیں مستقل پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔

مثال کے طور پر ایک برطانوی اینتھرو پولوجسٹ ڈاکٹر لوئس ایس بی لیکی نے ایک پاؤں، ہاتھ کے ایک حصے، کچھ جبڑوں، کھوپڑی کے کچھ ٹکڑوں پر مشتمل استخوانی فوسلز دکھاتے ہوئے کہا ہے کہ انسان کے آغاز کی تاریخ نئے سرے سے لکھے جانے کی ضرورت ہے۔

یہ انسانی سپیسی حضرت عیسیٰؑ سے1818036 سال قبل کے زمانہ سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ ہڈیاں ٹانگہ نیکا میں پائی گئیں جو سیاہ براعظم میں واقع ہے۔

وہ جھوٹ جو سیاہ فام ہی نہیں بلکہ سفید فام نسلوں کے ساتھ بھی بولا گیا ایک بہت بڑا جرم ہے۔ ان معصوم بچوں کے خلاف جو ایسے سیاہ فام ماں باپ کے ہاں پیدا ہوئے جو سمجھتے ہیں کہ ان کی نسل کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ وہ معصوم بچے جو بولنا سیکھنے سے قبل یہ جان لیتے ہیں کہ ان کے والدین خود کو کمتر سمجھتے ہیں۔ وہ معصوم بچے جو بڑھتے ہوئے، زندگی گزارتے ہوئے اور بڑھاپے میں مرتے ہوئے اپنے سیاہ فام ہونے پر شرمندہ ہوتے ہیں۔ لیکن اب حقیقت سامنے آتی جا رہی ہے۔

نورفوک پریزن کولونی میں داخلے کے بعد دو انتہائی مفید تجربات میری زندگی کا حصہ بنے۔ نمبر ایک تو اپنے سیاہ فام بھائیوں کی آنکھیں کھولنا، نمبر دو مطالعہ کے علاوہ میں نے پریزن کولونی کے ہفتہ وار مباحثے میں حصہ لینا شروع کر دیا، جو عوامی اجتماعات سے خطاب کا آغاز تھا۔

اس موقع پر میں ایک افسوسناک اور شرمناک حقیقت کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں پہلے پہل جیل آیا تھا تو مجھے گوروں کے آس پاس رہنا اس قدر پسند تھا کہ ایک دوسرے سے چمٹ کر رہتے سیاہ فام مجھے برے لگتے تھے۔ لیکن بعد میں جب جناب ایلیا محمد کی تعلیمات نے میری آنکھیں کھول دیں تو ابتدائی رویئے کے برعکس میں سیاہ فاموں تک جناب ایلیا محمد کا پیغام پہنچانے کا کوئی موقع ضائع نہ کرتا۔

جس سیاہ فام نے زندگی بھر اپنے متعلق، اپنی نسل کے متعلق اور سفید فام کے متعلق سچ نہ سنا ہو اسے سچائی سے روشناس کرواتے ہوئے احتیاط بلکہ بے حد احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ریگی نالڈ نے مجھے بتایا تھا کہ جناب ایلیا محمد کے حلقہ بگوش بنتے وقت تمام مسلمان ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔ سیاہ فام بھائی اس حد تک برین واشڈ ہیں کہ بعض اوقات وہ پہلی مرتبہ سچ کا سامنا کرتے وقت ناپسندیدگی یا ناراضی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ریگی نالڈ کی نصیحت تھی کہ سچ تھوڑا تھوڑا کر کے بتدریج پیش کیا جائے اور مزید پیش رفت سے قبل ضروری ہے کہ پہلے سچ کو ہضم ہونے کا موقع دیا جائے۔

سب سے پہلے میں نے اپنے سیاہ فام قیدی ساتھیوں کو سیاہ فام کی شاندار تاریخ سے آگاہ کرنا شروع کیا۔ انہیں وہ باتیں بتائیں جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھیں۔ میں نے انہیں غلاموں کی تجارت سے متعلق وہ خوفناک حقائق بتائے جن سے وہ کبھی واقف نہیں تھے۔ یہ باتیں بتاتے ہوئے میں ان کے چہروں کا جائزہ لیتا رہتا کیونکہ سفید فاموں نے غلاموں کے ذہنوں سے ان کا ماضی مکمل طور پر مٹا دیا تھا۔ امریکہ میں رہتے ہوئے کوئی سیاہ فام اپنا حقیقی خاندانی نام نہیں جان سکتا حتیٰ کہ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ مینڈنگوز، وولوف، سرر، فولا، فانٹی، آشانٹی یا دوسرے قبائل کے ناموں سے بھی واقف نہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ افریقہ سے لائے جانے والے کچھ غلاموں کی زبان عربی تھی اور ان کا مذہب اسلام تھا۔ بہت سے قیدی میری باتوں پر اس وقت تک یقین نہ کرتے جب تک انہیں یہ معلوم نہ ہوتا کہ یہ باتیں بھی گوروں نے ہی بتائی ہیں۔ میں انہیں سفید فاموں کی لکھی ہوئی کتابوں میں سے منتخب حصے پڑھ کر سناتا اور انہیں سمجھاتا کہ حقیقت کا علم کچھ سفید فام علماء کو ہے لیکن ایک سازش کے تحت نسل در نسل اس سچ کو سیاہ فاموں سے چھپایا گیا ہے۔

میں ان کے ردعمل کا بغور مشاہدہ کرتا اور احتیاط کا دامن نہ چھوڑتا کیونکہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ کوئی بھی برین واشڈ سیاہ فام میری بات سن کر گوروں کو اطلاع کرنے نہیں دوڑ پڑے گا۔ جب میں دیکھتا کہ ایک شخص تیار ہو گیا ہے جس کا مجھے اندازہ ہو جاتا تھا تو میں اسے دوسروں سے الگ کر کے جناب ایلیا محمد کی بتائی ہوئی سچائی اس پر آشکار کرتا کہ "سفید فام ہی شیطان ہے۔"

اس بات سے بہت سوں کو جھٹکا لگتا لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کے متعلق سوچنا شروع کر دیتے۔

شاید امریکی نظام قید میں یہ پریشانی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ اسلامی تعلیمات جو سارے ملک کے سیاہ فاموں میں گردش کر رہی ہیں، قیدی سیاہ فاموں کو زیادہ مسلمان کیوں کر رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاہ فاموں کی تعداد آبادی کے تناسب سے باہر سے زیادہ جیلوں میں ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ تمام نیگروز میں سیاہ فام مجرم ”سفید فام ہی شیطان ہے“ سننے کے لیے پہلے سے تیار ہوتے تھے۔

جب آپ یہ بات ایک نگرو کو بتاتے ہیں تو سوائے چند وفادار پاگلوں کے جن کو دانشور کہلوانے کا شوق ہے یا کچھ دوسرے سیاہ فام جو گوروں کی میزوں سے بچے ہوئے ٹکڑے کھا کر موٹے خوشحال، گونگے، بہرے اور اندھے ہو گئے ہیں۔ ہر امریکی سیاہ فام کے اعصابی مرکز کو چھیڑتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ایک دن، ایک ماہ، ایک سال یا ساری زندگی کھل کر ردعمل کا اظہار نہ کرے لیکن ایک بات کا یقین رکھیں کہ جب کبھی وہ اپنی زندگی کے متعلق سوچے گا تو دیکھے گا کہ کہاں کہاں اور کب کب سفید فام نے اس کے ساتھ شیطانی رویہ رکھا۔

اور جیسا کہ میں کہتا ہوں کہ سیاہ فام قیدی تمام نیگروز سے بہتر ہے جہاں اسے ایک سفید فام نے کئی سال کے لیے سلاخوں کے پیچھے بند کر رکھا ہے۔ عام طور پر مجرم نیگروز کے انتہائی پست طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ان کی ساری زندگی ذلت اور خواری میں گزر جاتی ہے اور وہ کبھی کسی ایسے سفید فام آدمی سے نہیں ملے ہوتے جس نے ان سے کچھ چھینا نہ ہو یا انہیں نقصان نہ پہنچایا ہو۔

صرف اس پنجرے میں بند سیاہ فام کو ایک بار میری طرح ایلیا محمد کی تعلیمات پر سوچنے کا موقع دیجئے اور اسے یاد کرنے دیجئے جب وہ جوان تھا اور وکیل، ڈاکٹر یا سائنسدان وغیرہ بننے کا آرزومند تھا۔ اس پنجرے میں بند سیاہ فام کو یہ احساس دلوا دیجئے کہ کس طرح پہلے غلاموں کے جہاز سے اترتے وقت امریکہ میں لاکھوں سیاہ فاموں کی حالت ایسی تھی جیسے بھیڑیوں کے غار میں بھیڑ کی ہوتی ہے۔ اسی لیے جب سیاہ فام قیدیوں کو پنجروں کے اندر مسلمان قیدیوں سے ایلیا محمد کی تعلیمات پہنچتی ہیں تو وہ بہت تیزی کے ساتھ مسلمان ہوتے ہیں۔ ”سفید فام ہی شیطان ہے“ ایک ایسا جملہ ہے جس کے اندر سیاہ فام قیدیوں کے زندگی بھر کے تجربے کی گونج سنائی دیتی ہے۔

میں بتا چکا ہوں کہ نورفوک پریزن کالونی میں ہفتہ وار مباحثے ہوتے تھے مطالعے نے میرے ذہن کی حالت پریشر کوکر جیسی بنا دی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں سفید فام کو اس کی حقیقت اس کے منہ پر بتاؤں چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ یہ کام مباحثوں میں شرکت کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔

عوام کے سامنے کھڑے ہونا اور خطاب کرنا ایک ایسا کام تھا جو اپنی گزشتہ زندگی میں کبھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ گلیوں بازاروں میں اٹھائی گیری کرتے ہوئے، منشیات بیچتے ہوئے اور لوٹ مار کرتے ہوئے میں ایک پاؤنڈ حشیش کا خواب تو دیکھ سکتا تھا لیکن یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ایک روز کلوسمز اور ایریناز میں عظیم ترین امریکی یونیورسٹیوں میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں تقریریں کروں گا۔ مصر، افریقہ اور انگلینڈ میں تقاریر کا تو خیر ذکر ہی نہ کریں۔

جیل کے مباحثوں کے دوران اجتماع سے خطاب اتنا ہی خوش کن تھا جتنا کہ کتابوں کے توسط سے علم کی دریافت خوش کن تھی۔ آپ سب کے سامنے کھڑے ہیں لوگ آپ کی طرف متوجہ ہیں، ذہن سے خیالات لبوں تک آ رہے ہیں، دماغ اس فکر میں ہے کہ اگلی بات کونسی ہو جس کے درست ابلاغ سے مباحثہ جیتا جا سکے۔ جب ایک بار میں نے مباحثوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تو پھر سلسلہ چل نکلا۔ مجھے ایوان کی کسی جانب سے بھی موضوع پر بولنے کے لیے کہا جاتا تو میں اس کے لیے مکمل تیاری کرتا اور جو مواد میسر ہوتا اسے پڑھ ڈالتا۔ میں اپنے آپ کو مخالف کی جگہ پر رکھ کر سوچتا کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو مباحثہ جیتنے کے لیے کیا کہتا پھر میں ان نکات کا توڑ سوچتا اور اگر ذرا سا بھی امکان ہوتا تو میں اپنی تقریر میں سفید فام کی شیطانیت کا ذکر ضرور کرتا۔

ایک بحث کا عنوان “فوجی تربیت لازمی ہونی چاہیے یا نہیں؟” میرے مخالف نے دلیل کے طور پر کہا کہ ایتھوپیا کے لوگ اطالوی جہازوں پر گولیوں کے جواب میں پتھر پھینکتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ لازمی فوجی تربیت ضروری ہے۔ میں نے کہا کہ ایتھوپیا کے لوگوں کے سیاہ جسم کے پرخچے ان بموں سے اڑتے ہیں جن کو روم کے پوپ کی اشیرواد حاصل ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ایتھوپیائی لوگ اپنے برہنہ جسموں کے ساتھ جہازوں سے ٹکرا جاتے ہیں کیونکہ وہ جان گئے ہیں کہ وہ مجسم شیطان سے برسر پیکار ہیں۔

سب نے فاؤل کا نعرہ لگایا اور کہا کہ میں نسلی مسئلے کو موضوع بنا رہا ہوں۔ میں نے کہا یہ نسلی نہیں بلکہ تاریخی واقعہ ہے اور انہیں چاہیے وہ جائیں اور جا کر “پیئروان پاسن” کی کتاب "Days of our Years" پڑھیں اور میری توقع کے عین مطابق بحث کے فوراً بعد جیل کی لائبریری سے یہ کتاب غائب ہو گئی۔ ایام قید میں ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں بقیہ زندگی سفید فام کو اس کی اصلیت بتانے میں صرف کروں گا چاہے مجھے جان بھی دینا پڑے۔ ایک بار ہومر کے وجود اور عدم وجود پر بحث کے دوران میں نے سفید فاموں سے کہا کہ ہومر علامت ہے اس سچائی کہ کس طرح سفید یورپیوں نے سیاہ افریقیوں کو اغواء کیا اور ان کو اس طرح اپنے میں مدغم کیا کہ وہ دوبارہ کبھی اپنے

لوگوں میں واپس نہ جا سکیں (ہومر، عمر اور مور اگر آپ غور کریں تو ایک ہی لفظ کی مختلف شکلیں ہیں بلکہ اسی طرح جیسے پیٹر، پیٹرو اور پیٹرا ایک ہی لفظ ہیں جس کا مطلب چٹان ہے) انہی موروں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر یورپیوں نے اپنی قصیدہ خوانی کروائی مثلاً آپ نے ایسپ کی فیبل پڑھی ہوں گی ایسپ بھی ایک ایتھوپیائی باشندے کا یونانی نام ہے۔

ایک اور گرما گرم بحث جو مجھے یاد آتی ہے وہ شیکسپیئر کی شناخت کے متعلق ہے۔ جس میں رنگ و نسل کا جھگڑا نہیں تھا۔ میں شیکسپیئرین مغالطے میں یونہی الجھ گیا کنگ جیمز کی ترجمہ شدہ انجیل انگریزی میں ادب کا عظیم ترین شاہکار سمجھی جاتی ہے اور شیکسپیئر اور انجیل دونوں کی زبان بالکل ایک سی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ 1604ء سے 1611ء تک شہنشاہ جیمز نے انجیل کے ترجمہ اور تحریر کے لیے شعراء کی خدمات حاصل کیں۔ اگر اس وقت شیکسپیئر زندہ ہوتا تو یقینا سب سے بڑا شاعر ہوتا لیکن انجیل سے شیکسپیئر کے تعلق کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ اگر وہ اس وقت زندہ تھا تو کنگ جیمز نے اس سے استفادہ کیوں نہیں کیا اور اگر اس نے استفادہ کیا تھا تو اس کو راز کیوں رکھا گیا؟ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ فرانسس بیکن ہی شیکسپیئر تھا اگر یہ سچ ہے تو بیکن نے اسے راز کیوں رکھا؟ بیکن کسی شاہی خانوادے سے تعلق نہیں رکھتا تھا کیونکہ شاہی شخصیات بعض اوقات فرضی نام کا استعمال کرتے تھے کیونکہ ان میں فن یا تھیٹر سے وابستگی نامناسب خیال کی جاتی تھی اور اس عمل سے بیکن کا نقصان کیا تھا اور سچ پوچھیے تو اس کا فائدہ ہی فائدہ تھا۔

میں نے اس بحث میں اس خیال کی تائید کی کہ کنگ جیمز ہی دراصل حقیقی شاعر تھا اور شیکسپیئر کے قلمی نام سے لکھتا تھا وہ بے حد ذہین تھا اور تخت برطانیہ پر بیٹھنے والوں میں سے عظیم ترین تھا۔ شاہی خاندان میں اس کے علاوہ اتنا کمال کس میں تھا جو شیکسپیئر کی تخلیقات کا خالق ہوتا۔ یہ وہی تھا جس نے اس قدر شاعرانہ انداز میں انجیل لکھی جس نے آج تک دنیا کو اپنا اسیر بنا رکھا ہے۔

جب ریگی نالڈ مجھ سے ملنے کے لیے آیا تو میں نے اسلامی تعلیمات سے متعلق نو دریافت شہادت کی دستاویزی تیاری کے متعلق بات کی۔ دی ہارورڈ کلاسکس کی تینتالیسویں یا چوالیسویں جلد میں میں نے ملٹن کی "پیراڈائز لوسٹ" پڑھی۔ جس میں تحریر تھا کہ شیطان جنت سے نکالے جانے کے بعد اقتدار پر قبضے کے لیے کوشاں ہے۔ جس کے لیے وہ یورپی طاقتوں مثلاً پوپ، شارلی مین، شیر دل رچرڈ اور دیگر سورمائوں کو استعمال کر رہا تھا۔ میں نے اس سے یہ استنباط کیا کہ یورپیوں کا محرک اور راہنما شیطان ہے یا شیطانی شخصیات لہٰذا ملٹن اور جناب ایلیا محمد دراصل ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔

جب ریگی نالڈ نے ایلیا محمد کے حوالے سے منفی گفتگو شروع کی تو مجھے یقین نہیں آیا۔ اس نے کوئی واضح بات تو نہیں کی مگر اس کا لہجہ اور انداز بدلا ہوا تھا۔ میں اس کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا لہٰذا تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ ریگی نالڈ وہ تھا کہ جس پر مجھے بے حد اعتماد تھا، جس کی میں عزت کرتا تھا، جس نے مجھے قوم اسلام سے متعارف کروایا تھا۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا، اسلام مجھے زندگی کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہو گیا تھا۔ اسلام اور جناب ایلیا محمد نے میری ساری دنیا ہی بدل دی تھی۔

پھر مجھے پتہ چلا کہ ریگی نالڈ کو جناب ایلیا محمد نے قوم اسلام (Nation of Islam) سے برطرف کر دیا ہے کیونکہ اس نے اخلاقی ضابطے کا خیال نہیں رکھا تھا۔ سچائی جان لینے اور مان لینے اور مسلم قوانین کو تسلیم کرنے کے باوجود اس نے نیویارک ٹیمپل کی سیکرٹری کے ساتھ غیر اخلاقی تعلقات برقرار رکھے۔ جب چند دیگر مسلمانوں کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے اس کی شکایت شکاگو میں جناب ایلیا محمد سے کی اور انہوں نے ریگی نالڈ کو برطرف کر دیا۔

ریگی نالڈ کے جانے کے بعد میں شدید صدمے کی حالت میں تھا۔ میں نے اس رات مسٹر ایلیا محمد کو خط لکھا جس میں اپنے بھائی کا دفاع کرتے ہوئے معافی کی درخواست کی اور بتایا کہ میرے لیے میرا بھائی کیا معنی رکھتا ہے۔

خط جیل کے سینسر والے ڈبے میں ڈالنے کے بعد میں رات بھر اللہ سے دعا کرتا رہا شاید ہی اتنے خلوص سے کسی نے دعا مانگی ہو اور اس دبدھا سے نکلنے کی استدعا کی ہو۔

اگلی رات میں اپنے بستر میں لیٹا ہوا تھا کہ بستر کے ساتھ پڑی کرسی میں ایک آدمی کو بیٹھے دیکھ کر بری طرح چونکا مجھے یاد ہے اس نے گہرے رنگ کا جوڑا پہنا ہوا تھا۔ وہ عام لوگوں کی طرح بالکل واضح دکھائی دے رہا تھا۔ وہ نہ کالا تھا نہ گورا بلکہ گندمی رنگ کا تھا اس کی شباہت ایشیائی باشندوں پر تھی اور بالوں میں تیل لگا رکھا تھا۔

میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

میں بالکل خوفزدہ نہیں ہوا مجھے علم تھا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا ہوں مجھ سے ہلا بھی نہیں جاتا تھا نہ میں نے کچھ کہا نہ اس نے۔ میں اس کی نسل کا تعین نہیں کر سکتا تھا صرف یہ جانتا تھا کہ وہ غیر یورپی ہے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کون ہے؟ وہ کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا اور پھر جس طرح آیا تھا اسی طرح چلا گیا۔

جلد ہی جناب ایلیا محمد نے ریگی نالڈ سے متعلق میرے خط کا جواب بھیجا۔ انہوں نے لکھا "اگر تم سچ پر ایمان لانے کے بعد اس پر شک کرو تو پھر یوں سمجھ لو کہ تم پہلے بھی سچائی پر کامل ایمان نہیں رکھتے تھے۔ تمہاری باطنی کمزوری کے علاوہ اور کونسی چیز ہے جس نے سچائی کو تمہارے لیے مشتبہ بنا دیا۔"

اس بات نے مجھے بہت متاثر کیا، ریگی نالڈ ایک منظم اسلامی زندگی نہیں گزار رہا تھا اور میں نے جانا کہ ایلیا محمد صحیح تھے اور میرا خونی بھائی ریگی نالڈ غلط تھا کیونکہ صحیح صحیح ہے اور غلط غلط ہے۔ اس وقت مجھے احساس نہیں تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ جب ایلیا محمد کے بیٹے اس پر انہی غیر اخلاقی اور دیگر بہت سے افعال کا الزام لگائیں گے، جس کی سزا ریگی نالڈ کو دی گئی تھی۔

لیکن اس وقت میرے ذہن سے تمام شکوک و شبہات دور ہو گئے تھے اور میرے بھائی کا مجھ پر جتنا بھی اثر تھا وہ جاتا رہا۔ اسی دن کے بعد اپنی ذات کی حد تک مجھے اپنے بھائی کا ہر کام غلط لگتا۔

پھر بھی ریگی نالڈ مجھے ملنے آتا رہا جب وہ مسلمان تھا تو انتہائی بے داغ لباس پہنتا تھا لیکن اب وہ بے ہودہ قسم کی ٹی شرٹز کھلے کھلے پاجامے اور جوگرز پہنے ہوتا۔ میں اسے زوال پذیر دیکھ رہا تھا وہ بات کرتا تو میں سرد مہری سے سنتا لیکن سنتا ضرور بہر حال وہ میرا بھائی تھا۔

میں نے دیکھا کہ بتدریج سزائے ربانی، جسے عیسائی "لعنت" کہتے ہیں ریگی نالڈ کو ملنی شروع ہو گئی۔ ایلیا محمد کا کہنا تھا کہ "ریگی نالڈ کو اللہ سزا دے رہا ہے اور جو شخص بھی ایلیا محمد کو للکارے گا وہ مستوجب سزائے ربانی ہو گا۔" ہمیں اسلامی تعلیمات میں بتایا جاتا تھا کہ سچائی سے ناآشنا شخص اندھیرے میں زندگی گزارتا ہے لیکن سچ جان لینے اور مان لینے کے بعد وہ روشنی میں آ جاتا ہے اور اس کے بعد جو شخص پھر جاتا ہے اسے اللہ سزا دیتا ہے۔

جناب ایلیا محمد کہنا تھا کہ پنج کونہ ستارہ عدل اور حواس خمسہ کی علامت ہے۔ اللہ سزا کا اطلاق اپنے پیغمبر کے باغیوں یا سچ کے منکروں کے حواس پر کرتا ہے۔ ہمیں بتایا جاتا تھا کہ جب تک مسلمان خود راہ راست سے نہ بھٹکے اللہ مخالفوں اور مخالفتوں سے اس کا دفاع اسی طرح کرتا ہے۔ ہمیں بتایا جاتا کہ اللہ مرتدوں کو ذہنی اذیت میں مبتلاء کر دیتا ہے۔ میں واقعی یہ سوچتا تھا کہ اللہ میرے بھائی کو سزا دے رہا ہے۔

فلبرٹ کے لکھے ہوئے خط سے معلوم ہوا کہ ریگی نالڈ آج کل ان کے ساتھ رہ رہا ہے اس کے علاوہ مجھے اس کی کچھ خبر نہ رہی۔ ایک روز ایلاء مجھے ملنے کے لیے آئی۔ اس نے بتایا کہ ریگی نالڈ آج کل اس کے گھر واقع راکس بیری میں

ہے اور سویا رہتا ہے۔ ایلاء نے بتایا کہ ایک روز دستک سن کر میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ریگی نالڈ بری حالت میں موجود تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ ڈیٹرائٹ سے آیا ہے۔ پیدل۔

مجھے یقین تھا کہ وہ پیدل ہی گیا ہو گا کیونکہ بقول ایلیا محمد کے سزائے ربانی کے بعد ریگی نالڈ وقت اور فاصلے کی پیمائش سے قاصر ہو چکا تھا۔ مغرب کے لوگ وقت کی ڈائی مینشن سے ابھی واقف نہیں ہیں۔ ایلیا محمد ہی کے بقول عظیم قوتوں کے حامل لوگ سزائے ربانی کے اطلاق کے لیے کسی شخص کے حواس کو اس حد تک مختل کر سکتے ہیں کہ پانچ منٹ میں اس کے سر کے بال سفید برف ہو جائیں یا وہ نو سو میل کا سفر کر کے بھی یہی سمجھے کہ وہ چند قدم ہی چلا ہے۔

مسلمان ہونے کے بعد میں نے جیل ہی میں داڑھی رکھ لی تھی۔ ریگی نالڈ ملنے آیا تو بہت مضطرب تھا اس کا کہنا تھا کہ میری داڑھی کا ہر بال ایک سانپ ہے، اسے ہر طرف سانپ ہی سانپ نظر آتے تھے۔

پھر اسے یقین ہو گیا کہ وہ نعوذباللہ اللہ کا پیغامبر ہے۔ ایلاء نے بتایا کہ وہ راکس بیری میں لوگوں سے کہتا پھرتا ہے کہ اس کے پاس خدائی طاقتیں ہیں پھر اس نے ترقی کرتے ہوئے خود کو "اللہ" کہنا شروع کر دیا اور بالآخر اس نے اپنے آپ کو اللہ سے بھی عظیم کہنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً حکام نے اسے دماغی امراض کے ادارے میں بھیج دیا۔ انہیں اس مرض کی سمجھ نہیں آئی۔ وہ اللہ کی سزا کو نہیں سمجھ سکتے تھے کچھ عرصہ بعد اسے رہا کر دیا گیا لیکن دوبارہ گرفتار کر کے ایک دوسرے ادارے میں داخل کر دیا گیا۔

وہ اب بھی ایک ادارے میں ہے جس کا مجھے علم ہے لیکن میں بتاؤں گا نہیں کیونکہ میں اس کی تکلیف میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔

میرا ایمان ہے کہ مقدر میں یہ لکھا تھا۔ ریگی نالڈ کا ایک ہی مقصد تھا کہ وہ مجھے کفر کے بحر ظلمات سے نکالنے کے لیے بطور چارہ استعمال ہو۔ اس کے علاوہ کوئی اور توجیہ میری سمجھ سے بالا ہے۔

بعد میں جب ایلیا محمد پر انتہائی بدکار ہونے کا الزام لگا تب میں نے جانا کہ ریگی نالڈ کی بیماری سزائے ربانی نہیں تھی بلکہ ایلیا محمد کی ایماء پر گھر بھر نے جس طرح اس کا مقاطعہ کیا تھا اس تکلیف اور رنج نے اسے ایلیا محمد کا دیوانگی کی حد تک مخالف بنا دیا تھا۔

کسی ایسے شخص کو خواب میں یا خیال میں دیکھنا جسے آپ نے حقیقتاً نہ دیکھا ہو اور بالکل حقیقی شکل و صورت میں دیکھنا سوائے پیش بنی کے اور کچھ نہیں کہلا سکتا۔ بعد ازاں مجھے علم ہوا کہ میں نے جیل میں ڈبلیو ڈی فارڈ کو دیکھا تھا جنہوں نے ایلیا محمد کو اپنا پیغمبر بنا کر شمالی امریکہ کے سیاہ فاموں کے لیے بھیجا تھا۔

جیل کا آخری سال چارلس ٹاؤن پریزن میں ہی گزرا۔ سفید فام قیدیوں کو بھی میرے حالات کی خبر ہو چکی تھی، کچھ برین و اشڈ سیاہ فام بہت بک بک کرتے۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ سنسر والوں نے میری ڈاک کی اطلاع آگے پہنچا دی ہے جس پر نورفوک پریزن کولونی کے افسران بہت مضطرب ہوئے۔ انہوں نے میرے بعض ادویات کھانے سے انکار کو میری منتقلی کی وجہ بنا لیا۔

میری پریشانی کی واحد وجہ یہ تھی کہ پیرول بورڈ کے سامنے پیش ہونے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا لیکن میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے جیل میں اسلام پھیلانے کے عمل کو میری سزا میں توسیع کے بجائے تخفیف کی بنیاد بنا لیا جائے تاکہ مجھ سے جلد پیچھا چھڑایا جا سکے۔

جب میں جیل آیا تھا تو میری نظر 20/20 تھی لیکن جب مجھے دوبارہ چارلس ٹاؤن کی جیل بھیجا گیا تو کم روشنی میں مطالعہ کے باعث مجھے عینک لگ چکی تھی۔

چارلس ٹاؤن پریزن میں گھومنے پھرنے کی آزادی کافی کم تھی لیکن مجھے پتہ چلا کہ بہت سے نیگرو انجیل کا درس لینے جاتے ہیں سو میں بھی وہاں چلا گیا۔

مدرس ایک بلند قامت، سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والا (ایک مکمل شیطان) ہارورڈ کا مذہبی طالب عمل تھا۔ پہلے اس نے لیکچر دیا پھر سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ ہم میں سے انجیل کس نے زیادہ پڑھ رکھی تھی، اس نے یا میں نے، لیکن اسے یہ کریڈٹ بہرحال جاتا ہے کہ اس کی مذہب سے وابستگی کمال تھی۔ میں اسے کسی نہ کسی طرح پریشان اور متذبذب کرنا چاہتا تھا تاکہ نیگروز کو سوچنے، بات کرنے اور میرے خیالات آگے پھیلانے کا موقع ملے۔

جب اس نے پال پر گفتگو کی تو بالآخر میں نے ہاتھ کھڑا کر دیا اور اس نے سوال کی اجازت دے دی۔ میں نے کھڑے ہو کر سوال کیا "پال کس رنگ کا تھا؟" پھر میں نے وقفہ ڈال ڈال کر کہنا شروع کیا۔ "اسے سیاہ فام ہی ہونا

چاہیے ... کیونکہ وہ عبرانی تھا... اور اصل عبرانی سیاہ فام تھے... تھے ناں؟“ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا جیسا کہ روایتی سفید فاموں کا ہوتا ہے۔ اس نے کہا ”ہاں۔“

میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی ”حضرت عیسیٰؑ کس رنگ کے تھے؟... وہ بھی تو عبرانی تھے... تھے ناں؟“

تمام گورے اور کالے قیدی بالکل ساکت بیٹھے تھے۔ وہ دھلے دماغوں والے سیاہ فام ہوں یا سفید فام شیطان عیسائی، یہ سننے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا کہ حضرت عیسیٰؑ سفید فام نہیں تھے۔ معلم ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اس کے ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی تب سے آج تک میں نے ایسا کوئی ذہین سفید فام نہیں دیکھا جو اس بات پر اصرار کرے کہ حضرت عیسیٰؑ سفید فام تھے اور وہ کر بھی کیسے سکتے تھے؟ معلم نے جواب دیا ”حضرت عیسیٰؑ بھورے تھے۔“ میں نے اس کے مصالحانہ رویئے کی بناء پر بات ختم کر دی۔

میری توقع کے عین مطابق چارلس ٹاؤن کے تمام قیدیوں میں یہ کہانی گونجنے لگی۔ میں جدھر بھی جاتا قیدی میری جانب اشارہ کرتے اور جب کبھی مجھے کسی سیاہ فام قیدی سے گفتگو کا موقع ملتا میں اس سے یہی پوچھتا ”تم نے کبھی ایلیا محمد کے متعلق کچھ سنا ہے؟“

!

باب :12

نجات دہندہ

میں نے 1952ء کے موسم بہار میں اپنے اہل خانہ کو نہایت مسرت کے ساتھ مطلع کیا کہ میسا چیوسٹس اسٹیٹ پیرول بورڈ نے میری رہائی کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے لیکن سرخ فیتہ کے باعث ابھی میری رہائی میں کچھ ماہ کی تاخیر تھی جس کے بعد مجھے ولفرڈ کی حضانت میں دیا جانا تھا، جو ڈیٹرائٹ میں فرنیچر کی دکان چلا رہا تھا۔ ولفرڈ نے دکان کے مالک یہودی سے پہلے ہی وعدہ لے لیا تھا کہ وہ میری رہائی کے فوراً بعد مجھے نوکری دے دے گا۔

جیل کے اطلاعاتی نظام کے تحت مجھے خبر ہو چکی تھی کہ شارٹی کے بھی پیرول کے احکامات آ چکے ہیں لیکن کوئی معزز آدمی اس کو حضانت میں لینے کے لیے تیار نہ ہے (مجھے بعد میں علم ہوا کہ جیل میں شارٹی نے موسیقی مرتب کرنے کے متعلق کافی مطالعہ کیا تھا اور اس نے کچھ دھنیں بھی ترتیب دی تھیں جن میں سے ایک کا نام "باسٹل کونسرٹو" تھا)

ہارلم یا بوسٹن جانے کی بجائے ڈیٹ رائٹ جانے کا فیصلہ میں نے اپنے خاندان کے احساسات کو مد نظر رکھ کر کیا تھا خصوصاً ہلڈا نے اصرار کیا تھا کہ اگرچہ میں اپنی دانست میں ایلیا محمد کی تعلیمات بخوبی سمجھتا ہوں لیکن ابھی مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے جس کے لیے مجھے ڈیٹ رائٹ آ کر عملی مسلمانوں کے معبد کا رکن بننا چاہیے۔

اگست میں جیل حکام نے تھوڑی سی رقم، کپڑوں کا ایک گھٹیا سا جوڑا اور نیکی کا درس دے کر جیل سے نکال دیا۔ میں نے پھر کبھی پلٹ کر ادھر نہیں دیکھا۔

سب سے پہلے میں ترکی غسل کے لیے رکا۔ میں اپنے جسم سے جیل کے داغ بھاپ کے ذریعے مٹا ڈالنا چاہتا تھا۔ ایلیاء نے بھی اس بات سے اتفاق کیا کہ مجھے زندگی کا دوبارہ آغاز ڈیٹ رائٹ ہی سے کرنا چاہیے کیونکہ نئے شہر میں پولیس

بھی مجھے تنگ نہیں کرے گی۔ لیکن یہ ایلاء کا خیال تھا دیگر مسلمانوں کا نہیں۔ ہلڈا اور ریگی نالڈ نے اسے قائل کرنے کی بے حد کوشش کی لیکن وہ اپنی مضبوط قوت ارادی کی بنیاد پر ادھر راغب نہیں ہوئی اس نے مجھ سے کہا کہ جس کا جو جی چاہے بن جائے ہولی رارل، سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ یا جو کچھ بھی لیکن وہ مسلمان نہیں ہوگی۔

اگلی صبح ہلڈا نے مجھے کچھ رقم دی روانہ ہونے سے پہلے میں نے بازار سے تین چیزیں خریدیں، ایک بہتر قسم کا نظر کا چشمہ ایک سوٹ کیس اور ایک کلائی کی گھڑی۔

میں سوچتا ہوں کہ میں نادانستگی میں آنے والی زندگی کے لیے تیار ہو رہا تھا کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں ان تین چیزوں کے علاوہ اور کوئی چیز استعمال نہیں کی۔ چشمے کی مدد سے میں اپنی نظر درست رکھنے میں کامیاب ہو سکا اور سفر تو میں اتنا کرتا ہوں کہ میری بیوی کو بعض اوقات متبادل سوٹ کیس پہلے سے تیار رکھنا پڑتا ہے۔ اور مجھ سے زیادہ تو وقت کے معاملے میں حساس آدمی آپ کو ملے گا ہی نہیں یوں سمجھئے کہ میں اپنی زندگی گھڑی کے مطابق گزارتا ہوں حتیٰ کہ جب میں گاڑی چلا رہا ہوتا ہوں تو میں سپیڈو میٹر کی بجائے اپنی گھڑی کے مطابق کار چلا رہا ہوتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک وقت فاصلے سے زیادہ اہم ہے۔

میں ڈیٹ رائٹ جانے والی بس میں سوار ہو گیا ولفرڈ فرنیچر کی جو دکان چلاتا تھا وہ کالوں کی کچی بستی کے عین بیچ میں تھی اور جس طرح وہ یہودی مالک نیگروز کی کھال اتارتا تھا اسے دیکھتے ہوئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ میں ولفرڈ کی دکان کا نام ظاہر نہ ہی کروں ولفرڈ نے مجھے مالکوں سے متعارف کرایا اور میں حسب معاہدہ بطور سیلزمین کام کرنے لگا۔

"ادائیگی بعد میں۔" یہ ایک ایسا اعلان تھا جسے پڑھ کر نیگروز مکھیوں کی طرح کھنچے چلے آتے تھے۔ چونکہ اس فرنیچر کے لیے انہیں قرض بھی انہی یہودیوں سے لینا پڑتا تھا جس کی وجہ سے یہ فرنیچر انہیں تین چار گنا زیادہ مہنگا پڑتا تھا جو بے حد قابل شرم تھا۔ یہ کچی بستیوں کی دکانوں پر عام بکنے والا گھٹیا اور بھدا سا فرنیچر تھا جس پہ کپڑا منڈھا ہوتا تھا۔ نقلی چیتے کی کھال جیسی بستر کی چادریں اور مصنوعی شیر کی کھال کے قالین وغیرہ وغیرہ سب اسی قبیل کا سامان ہوتا تھا۔ میں محنت کشوں کے بھدے، سخت چنڈیاں پڑے ہوئے ہاتھوں کو قرض کے ان معاہدوں پر دستخط کرتے دیکھتا جن کی تحریر وہ پڑھنے سے بھی قاصر تھے اور جن کے سود کی شرح ہائی وے رابری (Highway-Robbery) سے کم نہیں تھی۔

میں 1964ء کی صدارتی مہم کے دوران جیٹ میگزین میں شائع شدہ سینیٹر بیری گولڈ واٹر کا بیان کردہ لطیفہ حقیقی زندگی میں مشاہدہ کر رہا تھا لطیفہ کچھ یوں تھا کہ ایک گورے ایک نیگرو اور ایک یہودی کو ایک ایک خواہش کرنے کا اختیار دیا گیا۔ گورے نے کچھ تحفظات (Securities) مانگے نیگرو نے بہت ساری دولت کی خواہش کی اور یہودی نے کچھ جعلی زیورات اور اس کالے کا پتہ مانگا۔

میں ساری زندگی کوچہ و بازار میں یہ استحصال دیکھتا آیا تھا جس کی سمجھ مجھے اب آنی شروع ہوئی تھی۔ میں اپنے بھائیوں کو سفید فام کے معاشی پنجوں میں تڑپتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور سفید فام ہر روز ان کچی بستیوں کے مکینوں سے نچوڑی ہوئی دولت کا تھیلہ بھر کر گھر کو لوٹ جاتا۔ میں دیکھتا کہ دولت سے سیاہ فام لوگوں کی بجائے صرف سفید فام تاجروں کی معاشی حالت میں بہتری آتی جو عموماً ان مخصوص علاقوں میں رہتے تھے جہاں کوئی کالا دکھائی بھی نہیں دینا چاہیے۔ جب تک کہ وہ کسی گورے کا ملازم نہ ہو۔

ولفرڈ نے مجھے اپنے گھر میں رہنے کی دعوت دی جسے میں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔ جیل کے پنجرے کے بعد خاندان کے ساتھ گھر کے محبت بھرے ماحول میں رہنا ایک خوشگوار تبدیلی تھی، جو کسی بھی نو آزاد قیدی کے لیے بہت دل گداز تجربہ ہوتا ہے لیکن خصوصاً ایک اسلامی گھر کے ماحول میں رہنا ایسی کیفیت تھی جس کے لیے میں اکثر اللہ کے حضور سجدہ شکر بجا لاتا۔ گو میں اسلامی گھر کے معمولات سے جیل کے ایام میں ہی بذریعہ خطوط آگاہ ہو چکا تھا لیکن ان معمولات کا حصہ بنے بغیر اس کیفیت کو سمجھنا اور لطف لینا مشکل ہے۔ میرا بھائی ولفرڈ ہر عمل اور اس کی افادیت کے بارے بہت محبت اور تحمل سے سمجھاتا۔

اس گھر میں دیگر گھروں کی طرح صبح کے وقت افرا تفری یا ہڑ بونگ کا نشان بھی دکھائی نہ دیتا۔ گھر کا سربراہ اور محافظ ولفرڈ سب سے پہلے بیدار ہوتا کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ ”باپ ہی اپنے خاندان کے طرز زندگی کا تعین کرتا ہے۔ وہ اور میں وضو کرتے پھر ولفرڈ کی بیوی رتھ بیدار ہوتی بعد ازاں بچے بیدار ہوتے تاکہ غسل خانے کے استعمال میں بھی نظم و ضبط قائم رہے۔“

وضو کرنے سے پہلے مسلمان اونچی آواز میں کہتے ”میں اللہ کے نام سے وضو کا آغاز کرتا ہوں“ پھر پہلے دایاں اس کے بعد بایاں ہاتھ دھویا جاتا اس کے بعد اچھی طرح دانت صاف کرتے اور تین بار کُلّی کی جاتی پھر تین بار نتھنوں کو اچھی طرح دھویا جاتا اس کے بعد غسل کرنے سے آپ کا مکمل بدن عبادت کے لیے پاکیزہ ہو جاتا تھا۔

گھر کا ہر فرد حتیٰ کہ بچے بھی نئے دن کے آغاز پر ایک دوسرے سے ملتے ہوئے نرمی اور شائستگی سے اسلام علیکم (جس کا مطلب تم پر سلامتی ہو) کہتے دوسرا اس کے جواب میں وعلیکم السلام (جس کا مطلب تم پر بھی سلامتی ہو) کہتا۔ جس وقت باقی گھر والے وضو کرتے اس دوران ولفرڈ مصلیٰ بچھاتا مجھے بتایا گیا کہ مسلمان اس وقت عبادت کرتے ہیں جب سورج افق کے قریب ہو اور اگر یہ وقت قضا ہو جائے تو نماز اس وقت تک ملتوی کرنی پڑتی ہے جب تک سورج افق سے کافی بلند نہ ہو جائے کیونکہ مسلمان آفتاب پرست نہیں ہیں اور ہم صرف باقی دنیا میں موجود سات سو پچیس ملین مسلمان بہن بھائیوں کے ساتھ اظہار یک جہتی کے لیے مشرق کے رخ عبادت کرتے ہیں۔

سب اہلخانہ مکمل بالباس ہو کر مشرق کی طرف منہ کر کے قطار میں کھڑے ہو جاتے اور جوتے اتار کر مصلّے پر کھڑے ہو جاتے۔

آج میں اپنے گھر والوں کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے عربی زبان استعمال کرتا ہوں جبکہ ابتداء میں مجھے نماز صرف انگریزی میں آتی تھی "میں اللہ کے لیے فجر کی نماز پڑھتا ہوں جو بہت شان والا ہے۔ اللہ عظیم ترین ہے اے اللہ تو ہی شان والا ہے تو ہی تعریف کے لائق ہے تیرا نام برکت و الا ہے اور تو اپنی عظمت میں بلند ترین ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی اور عبادت اور خدمت کے لائق نہیں ہے۔"

ناشتے میں ہم لوگ رس یا کافی کے علاوہ کوئی ٹھوس غذا نہیں لیتے تھے۔ ولفرڈ اور میں کام پر چلے جاتے جہاں دوپہر اور پھر سہہ پہر تقریباً تین بجے ہم بغیر کسی کو احساس دلائے اپنے ہاتھ چہرہ اور دہن دھوتے اور مشرق کی طرف منہ کر کے خاموشی کے ساتھ مراقبہ کرتے۔

مسلمان بچے بھی سکولوں میں ایسے ہی کرتے، مسلمان بیویاں اور مائیں بھی اپنے روز مرہ کے کام چھوڑ کر دنیا کے سات سو پچیس ملین مسلمانوں کے ہمراہ اللہ کے حضور پیش ہو جاتیں۔

بدھ، جمعہ اور اتوار۔ ڈیٹرائٹ کے نسبتاً چھوٹے معبد نمبرا میں اجلاس کے دن مقرر تھے۔ معبد جو دراصل ایک دکان کا سامنے والا حصہ تھا کے قریب ہی سوٗروں کے تین بوچڑ خانے تھے۔ بدھ اور جمعہ کے روز مرتے ہوئے سوروں کی چیخیں دوران اجلاس سنائی دیتی رہتیں۔ میں آپ کو یہ صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ کو 1950ء کی دہائی میں مسلمانوں کی حالت کا اندازہ ہو سکے۔

جہاں تک میرا خیال ہے معبد نمبر ایک 1470 فریڈرک اسٹریٹ پر واقع تھا۔ یہ پہلا معبد تھا جو 1931ء میں آقا ڈبلیو ڈی فارڈ نے ڈیٹرائٹ مشی گن میں قائم کیا تھا۔ میں نے کبھی عیسائیوں کو انفرادی اور خانگی سطح پر مسلمانوں جیسا نہیں پایا۔ مسلم مرد صاف اور مہذب لباس پہنتے عورتیں ٹخنوں تک لمبا لباس پہنتیں، چہروں کا سنگھار نہ کرتیں اور سر ڈھانپے رکھتیں، صاف ستھرے بچے نہ صرف بزرگوں بلکہ اپنے ہم عمروں سے بھی تہذیب کے ساتھ پیش آتے۔

میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ سیاہ فام اپنے رنگ و نسل پر فخر کرنے لگیں گے اور دوسرے سیاہ فاموں سے حسد کرنے یا ان پر شک کرنے کے بجائے ان سے محبت کرنے لگیں گے۔ جب ایک مسلمان آدمی اپنے سیاہ فام بھائی کے ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر خوش دلی کے ساتھ ملاقات پر اظہار مسرت کرتا تو مجھے بہت خوشی محسوس ہوتی۔ جو عزت مسلمان بہنوں چاہے وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ ہوں کو دی جاتی تھی وہ سیاہ فاموں میں اس سے قبل عنقاء تھی۔ ایک دوسرے سے ملتے ہوئے بہت گرم جوشی اور باہمی احترام کا مظاہرہ کیا جاتا اور ہم ایک دوسرے کو "بھائی... بہن... محترمہ... جناب" کہہ کر عزت سے بلاتے حتیٰ کہ بچے بھی دوسرے بچوں کے ساتھ گفتگو میں ان القاب کا استعمال کرتے۔ واہ کیا بات ہے!

معبد نمبر 1 میں منسٹر لیموئل حسن نے ہمارا استقبال "السلام علیکم" کہہ کر کیا، ہم نے جواباً "وعلیکم السلام" کہا، منسٹر لیموئل ہمارے سامنے ایک تختہ سیاہ کے قریب کھڑے تھے۔ تختہ سیاہ کے اوپر مستقل طور پر روغن سے امریکی جھنڈا اور اس کے نیچے "غلامی، اذیت اور موت" تحریر تھا۔ پھر ایک صلیب کے نشان کے ساتھ "عیسائیت" تحریر تھا۔ صلیب کے نیچے ایک تصویر تھی جس میں ایک سیاہ فام کو ایک درخت کی ٹہنی کے ساتھ پھانسی لگے دکھایا گیا تھا۔ تختہ سیاہ کے دوسری طرف ہماری تعلیمات کے مطابق اسلامی جھنڈا بنا ہوا تھا جس میں سرخ پس منظر پر ایک ہلال اور ستارہ تھا جس کے نیچے "اسلام:۔ آزادی، عدل، مساوات" تحریر تھا اور اس کے نیچے ایک سوال تحریر تھا "ملحمۃ العظمہ" (War of Armageddon) کے بعد دونوں میں سے کون بچے گا؟

منسٹر لیموئل نے ایک گھنٹے سے زیادہ ایلیا محمد کی تعلیمات کے متعلق خطاب کیا، میں ان کا ایک ایک حرف اور لفظ انتہائی توجہ سے ذہن میں بٹھا رہا تھا اکثر اوقات وہ اہم نکات کو چاک کی مدد سے تختہ سیاہ پر سمجھاتے۔

مجھے معبد میں پڑی ہوئی خالی نشستوں پر بہت غصہ آتا، میں نے ولفرڈ سے کہا کہ اردگرد کے علاقے میں منشیات، لڑائی جھگڑے، شور شرابے، ناچ گانے، شراب خوری اور گالی گلوچ میں ملوث اتنے زیادہ برین واشڈ سیاہ فام بہن

بھائیوں کے ہوتے ہوئے کوئی نشست خالی نہیں رہنی چاہیے۔ دراصل جناب ایلیا محمد کی تعلیمات سیاہ فام آدمی کو امریکی سفید فاموں کا جبر سہنے کی خو ڈال رہی تھیں۔

معبد میں رکنیت سازی کے رویئے سے مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے خود شکستی اور انتظار کے رویئے کو ترویج دی جا رہی ہے۔ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ اللہ خود بخود مزید مسلمان بھیج دے گا جب کہ میرا خیال تھا کہ اللہ ان لوگوں کی مدد کرنا زیادہ پسند کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ میں سال ہا سال تک کچی بستیوں کی سڑکوں پر پھرا تھا۔ میں وہاں کے نیگروز سے اچھی طرح واقف تھا میرے لیے ہارلم یا ڈیٹرائٹ میں کوئی فرق نہیں تھا، میں نے باقی لوگوں سے اختلاف کرتے ہوئے تجویز دی کہ ہمیں زیادہ لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے باہر نکلنا چاہیے جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں ساری زندگی بے حد فعال بلکہ بے چین طبع رہا ہوں۔ ولفرڈ نے مجھے صبر کرنے کا مشورہ دیا اور میرے لیے صبر کرنا صرف اس لیے ممکن ہوسکا کہ مجھے توقع تھی کہ میں بہت جلد اس شخص کو دیکھ بلکہ شاید مل بھی سکوں گا جسے "پیغمبر" ایلیا محمد کہا جاتا ہے۔

آج میں بشمول سربراہان مملکت دنیا بھر کے معروف لوگوں سے ملتا ہوں لیکن 1952ء میں لیبر ڈے سے پہلے اتوار کو میرے اشتیاق کی جو کیفیت تھی وہ پھر کبھی میسر نہیں آئی، ڈیٹرائٹ معبد نمبر 1 سے مسلمان دس گاڑیوں کے کاروان میں شکاگو میں معبد نمبر 2 میں ایلیا محمد کا خطاب سننے جا رہے تھے۔ ولفرڈ کی گاڑی میں بیٹھ کر مجھے جو خوشی ہوئی اس کا تجربہ مجھے بچپن کے بعد نہیں ہوا تھا، تب سے اب تک میں نے دس دس ہزار سیاہ فاموں پر مشتمل بڑے بڑے جلوس دیکھے ہیں لیکن اس اتوار کی سہ پہر دو چھوٹے معبدوں کے اراکین اکٹھے ہوئے جن کی تعداد بمشکل دو سو مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ جب شکاگو والوں نے ہم ڈیٹرائٹ والوں کا استقبال کیا تو میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

میں پیغمبر ایلیا محمد کے شخصی اثرات کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ معبد نمبر 2 کے عقب سے وہ پلیٹ فارم پر آئے وہی چھوٹا حساس اور نرم بھورا چہرہ جو آج تک میں نے تصویروں میں دیکھا تھا۔ میرے سامنے تھا جس کے گرد "ثمر اسلام" (Fruit of Islam) محافظ مارچ کرتے آ رہے تھے۔ ان کے مقابلے میں پیغمبر بہت کمزور اور چھوٹے نظر آتے تھے۔ انہوں نے اور ثمر اسلام نے سیاہ سوٹ، سفید شرٹیں اور بو ٹائیاں کس رکھی تھیں، پیغمبر نے سونے سے کڑھی ہوئی ٹوپی پہن رکھی تھی۔

میں اس عظیم آدمی کو دیکھ رہا تھا جو ایک انجان قیدی کو خط لکھنے کے لیے وقت نکالتا رہا، یہ وہ آدمی تھا جس کے متعلق ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس نے ہماری یعنی سیاہ فام لوگوں کی رہنمائی کے لیے بہت سال تک تکلیفیں سہیں اور قربانیاں دی تھیں کیونکہ اسے ہم سے بہت محبت تھی۔ جب انہوں نے کلام کیا تو میں اپنی نشست پر آگے ہو کر بیٹھ گیا اور نہایت توجہ سے ان کی باتیں سننے لگا۔ انہوں نے فرمایا کہ ”گذشتہ اکیس سال سے میں بغیر رکے آپ کے سامنے کھڑا آپ کو تبلیغ کرتا رہا ہوں۔ چاہے میں آزاد تھا یا قید۔ سچ کی تعلیم دینے کی پاداش میں مجھے ساڑھے تین سال وفاقی جیل میں اور ایک سال سے زیادہ سٹی جیل میں رہنا پڑا۔ مجھے سات طویل سالوں تک پدرانہ شفقت سے محروم رہنا پڑا کیونکہ احکام الٰہی اور سچائی کے منافق دشمن میرے تعاقب میں تھے۔ وہ ایسی سچائی اور وحی ہے جو آپ کو نہ صرف زندگی بخشتی ہے بلکہ روئے زمین پر بسنے والی تمام مہذب اور آزاد اقوام و افراد کے ساتھ برابری کی سطح پر لا کھڑا کرتی ہے۔“

ایلیا محمد نے بتایا کہ صدیوں سے شمالی امریکہ کے اس ویرانے میں نیلی آنکھوں والا سفید فام شیطان ”نام نہاد نیگرو“ کی ذہنی تطہیر کر رہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ امریکی سیاہ فام ذہنی، اخلاقی اور روحانی طور پر مردہ ہو چکا ہے۔ ایلیا محمد نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سیاہ فام ہی اصل آدمی ہے جسے اپنے وطن سے اغواء کر کے اس سے اس کی زبان، اس کی ثقافت، اس کا خانگی ڈھانچہ اور خاندانی نام تک چھین لیا گیا حتیٰ کہ آج امریکی سیاہ فام کو اس بات کا احساس تک نہیں کہ وہ کیا تھا۔

انہوں نے ثابت کیا کہ ان کی تعلیمات سے اپنی شخصیت کا صحیح عرفان حاصل کر کے سیاہ فام لوگ سفید فام معاشرے کی پستی سے اٹھ کر تہذیب کی اس اوج پر متمکن ہو جائیں گے جو ان کا نقطہ آغاز تھا۔

تقریر کے اختتام پر انہوں نے ذرا سانس لیکر میرا نام پکارا۔

مجھے گویا بجلی کا جھٹکا لگا۔ انہوں نے میری طرف براہِ راست نہ دیکھتے ہوئے مجھے کھڑا ہونے کا حکم دیا اور دوسروں کو بتایا کہ میں حال ہی میں جیل سے رہا ہوا ہوں اور یہ کہ دوران قید میں کتنا ”مضبوط“ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ”میلکم بھائی ایک سال تک جیل سے مجھے روزانہ خطوط لکھتے رہے اور میں بھی اکثر حتی المقدور انہیں جواب لکھتا رہا۔“

میں دو سو مسلمانوں کی نگاہوں کا مرکز تھا اور وہ میرے واقعات ایک حکایت کی طرح بیان کر رہے تھے۔

ایلیا محمد کہہ رہے تھے "جب اللہ نے جوب (Job) کی وفاداری کی تعریف کی تو شیطان نے کہا کہ اللہ کی حفاظتی باڑ نے جواب کو وفادار رکھا ہے۔ شیطان نے اللہ سے کہا کہ اگر یہ حفاظتی باڑ ہٹا دی جائے تو میں جوب کو اتنا باغی کر دونگا کہ وہ اللہ کے منہ پر اللہ کو برا بھلا کہے۔

شیطان دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں نے جیل میں اسلام کو بطور حفاظتی باڑ استعمال کیا ہے اور اب جب کہ تم جیل سے باہر ہو تو وہ تمہیں دوبارہ شراب، سگریٹ، منشیات اور جرم کی زندگی کی طرف مائل کرے گا۔ ہمارے اچھے بھائی میلکم کی حفاظتی باڑ ہٹ چکی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ وفادار رہے گا۔"

اور اللہ نے مجھے توفیق دی کہ بے شمار امتحانوں کے باوجود میں اسلام پر ایمان میں مستحکم اور مضبوط رہا اور جب میرے اور ایلیا محمد کے درمیان بحران پیدا ہوا تو میں نے بحران کے ابتدائی دور میں انہیں انتہائی خلوص کے ساتھ بتایا تھا کہ میں ان پر خود ان سے بھی زیادہ قوی ایمان رکھتا ہوں۔

آج جناب ایلیا محمد اور میں صرف رشک اور حسد کی وجہ سے اکٹھے نہیں ہیں ورنہ میں دنیا کے کسی بھی شخص سے زیادہ مسٹر ایلیا محمد پر ایمان رکھتا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ ایلیا محمد جب بھی ڈیٹرائٹ کے معبد نمبر ایک میں آتے تو ولفرڈ کے ہاں ٹھہرتے تھے اور ہر مسلمان کا کہنا تھا کہ ایلیا محمد ہر شخص کی مہربانی کا صلہ بڑھ کر ادا کرتے ہیں۔ اس شام انہوں نے ہمارے تمام خاندان اور منسٹر لیموئل حسن کو اپنے نئے گھر مدعو کیا۔ انہوں نے بتایا کہ بچوں اور پیروکاروں کے اصرار پر انہیں اٹھارہ کمروں پر مشتمل بڑے اور بہتر گھر میں منتقل ہونا پڑا جو شکاگو میں 4847 ووڈلان ایونیو پر واقع تھا۔ ہمارے پہنچنے پر ایلیا محمد نے ہمیں وہ حصہ دکھایا جہاں وہ خود روغن کر ہی رہے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں دوڑ کر اللہ کے اس پیغمبر کے لیے کرسی اٹھا لائوں۔ دوسری طرف وہ بھی میرے آرام کے لیے اسی طرح پریشان تھے۔

کھانے کے دوران ہم ان کی پر حکمت گفتگو سننے کی توقع کر رہے تھے لیکن وہ ہمیں گفتگو پر مائل کرتے رہے۔ میں پہلے بھی اسی سوچ میں تھا کہ ڈیٹرائٹ معبد کے لوگ کیوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر ہیں کہ اللہ لوگوں کو مسلمان کرے گا جبکہ امریکہ بھر میں کروڑوں سیاہ فام اس انتظار میں ہیں کہ کوئی انہیں چونکا دے، جگا دے اور نئی زندگی بخش دے۔ وہ سیاہ فام جن تک ایلیا محمد کا پیغام ہی نہیں پہنچا تھا۔ اس روز ان کی میز پر مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملا۔ میں نے ان سے پوچھا:

"آپ کے خیال میں کتنے مسلمان ڈیٹرائٹ معبد میں اکٹھے ہونے چاہئیں؟"

انہوں نے کہا "میرے خیال میں ان کی تعداد ہزاروں میں ہونی چاہیے۔"

"آپ نے درست فرمایا تو ان ہزاروں کو یہاں تک لانے کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؟"

"آپ نوجوانوں کو راغب کریں۔" انہوں نے کہا "بوڑھے شرم کے مارے خود پیچھے آئیں گے۔"

میں نے اس نصیحت پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈیٹرائٹ پہنچ کر میں نے ولفرڈ سے بات کی اور اپنی خدمات معبد کے منسٹر لیموئل حسن کو پیش کر دیں۔ انہوں نے بھی میرے فیصلہ سے اتفاق کیا اور ہر روز فرنیچر کی دکان سے فارغ ہو کر میں تبلیغ پر نکل جاتا جسے بعد ازاں ہم نے "ماہی گیری" کا نام دیا۔ میں کچی بستیوں کے بازاروں کی زبان بہت عمدگی سے جانتا تھا۔

اسی دوران مجھے شکاگو سے "ایکس (X) کا خطاب بھی مل گیا جو مسلمانوں میں اس گمشدہ افریقی خاندانی نام کی علامت تھا جس سے وہ کبھی واقف نہیں ہو سکے گا۔ میں نے اپنے نام سے ملحق "لٹل" جو کسی نیلی آنکھوں اور سفید چمڑی والے شیطان کی دین تھا، ہٹا کر ایکس لکھنا شروع کر دیا۔ تب سے میں ہمیشہ کے لیے "میلکم ایکس" ہو گیا۔ مسٹر ایلیا محمد نے بتایا کہ ہم تب تک "ایکس" لکھتے رہیں گے جب تک اللہ خود واپس آ کر اپنی زبان سے ہمیں کوئی مقدس نام عطا نہیں کرے گا۔

میں ڈیٹرائٹ کے گھٹیا شراب خانوں میں تبلیغ کرتا گھومتا مگر بے چارے جاہل، دھلے ذہن کے سیاہ فام ذہنی، اخلاقی اور روحانی طور پر اندھے، بہرے اور گونگے تھے۔ مجھے اس بات پر بہت طیش آتا کہ کوئی ایک آدھ ہی ایسا ہوتا جو ان زندگی بخش تعلیمات میں کسی قسم کی دلچسپی ظاہر کرتا۔ ایسے شخص کو میں اگلے اجلاس میں معبد آنے کی دعوت دیتا لیکن وعدہ کرنے والوں میں سے نصف بھی معبد نہیں آتے تھے۔ پھر بھی ہر ماہ کچھ نہ کچھ لوگ دلچسپی کا اظہار کرتے اور شکاگو کے معبد نمبر دو کے باہر گاڑیوں کی قطار بتدریج طویل ہوتی گئی لیکن مسٹر ایلیا محمد کو براہ راست سننے کے باوجود بہت کم ایسے ہوتے جو "قوم اسلام" کی باقاعدہ رکنیت کے لیے درخواست دیتے۔

چند مہینوں کی کوشش کے بعد دکان کے بیرونی حصے میں واقع معبد نمبر ایک کے اراکین تین گنا ہو گئے۔ اس بات سے ایلیا محمد اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے خود تشریف لا کر ہماری عزت افزائی کی۔ جب منسٹر لیموئل حسن نے انہیں میری محنت کے متعلق بتایا تو انہوں نے میری بہت تعریف کی۔

ہمارا کارواں بڑھتا گیا ہم جب بھی شکاگو جاتے ایلیا محمد ہمیں اپنے گھر پر کھانے کی دعوت دیتے۔ وہ میری استعداد اور صلاحیتوں میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے جس کا اندازہ ان کی گفتگو سے ہو جاتا تھا اور میں ... میں تو ان کی پرستش کرتا تھا۔

میں نے 1953ء کے اوائل میں فرنیچر کی دکان چھوڑ کر ڈیٹرائٹ میں گار ووڈ فیکٹری میں ہفتہ وار اجرت پر نوکری کر لی جہاں کوڑے کے ٹرکوں کے ڈھانچے بنتے تھے۔

ایک روز مسٹر ایلیا محمد نے کھانے کی میز پر فرمایا کہ انہیں ایسے نوجوانوں کی سخت ضرورت ہے جو منسٹرز کی ذمہ داریاں اٹھانے کے اہل ہوں کیونکہ اب تعلیمات کا دائرہ وسیع کرنے اور نئے معبد قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں بھی منسٹر بن جاؤں گا اور مسٹر ایلیا محمد کی براہ راست نمائندگی کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کوئی منسٹر بننے سے متعلق میری رائے لیتا تو میں یہی کہتا کہ میں انتہائی نچلے درجے پر رہ کر مسٹر ایلیا محمد کی خدمت کرنا چاہتا ہوں اور اسی میں خوش ہوں۔

نامعلوم یہ مسٹر ایلیا محمد کی تجویز تھی یا منسٹر لیموئل حسن نے خود فیصلہ کرتے ہوئے مجھے اجتماع سے خطاب کرنے کے لیے کہا۔ میں نے اپنی ذات پر مسٹر ایلیا محمد کی تعلیمات کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ”اگر میں آپ کو اپنی سابق زندگی کے متعلق بتاؤں تو آپ یقین نہیں کریں گے... جب میں سفید فام کے متعلق بات کرتا ہوں تو میں کسی ایسے شخص کے متعلق بات نہیں کر رہا ہوتا جس سے میں ناواقف ہوں...“

اس کے بعد ایک مرتبہ لیموئل حسن نے مجھے فی البدیہہ خطاب کے لیے کھڑا کر دیا۔ میں بے یقینی اور ہچکچاہٹ کا شکار تھا لیکن جیل کے مباحثوں کا تجربہ کام آیا (مجھے اب یاد تو نہیں ہے کہ میں نے اس وقت کیا کہا تھا لیکن اتنا یاد ہے کہ میرے ابتدائی موضوعات میں ”عیسائیت اور غلامی“ سر فہرست تھا کیونکہ جیل میں مطالعے کی وجہ سے اس موضوع پر میری گرفت کافی مضبوط تھی)

”میرے بھائیو اور بہنو! ہمارے سفید آقا کے عیسائی مذہب نے شمالی امریکہ کے ویرانے میں بھٹکنے والے سیاہ فام لوگوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ مرنے کے بعد ہمارے کاندھوں پر پر نکل آئیں گے اور ہم اڑ کر آسمان پر چلے جائیں گے جہاں اللہ نے ہمارے لیے جنت میں خصوصی جگہ بنا رکھی ہے۔ یہ ہے سفید فاموں کا عیسائی مذہب جو ہم سیاہ فاموں کے ذہن دھونے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ہم نے اسے تسلیم کر لیا قبول کر لیا اس پر ایمان لائے اور اس پر

عمل بھی کیا اور جب ہم یہ سب کچھ کر رہے تھے تو اس نیلی آنکھوں والے شیطان نے عیسائیت کو ہی بدل کر رکھ دیا تاکہ ہماری پشت پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو سکے۔ ہم اگلی دنیا کی جنت اور اس کی نعمتوں میں محو رہیں اور وہ اسی دنیا میں، اسی زندگی میں جنت کا لطف اٹھاتا رہے۔"

آج جب ہزاروں مسلمان میرا خطاب سنتے ہیں یا لاکھوں سامعین ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر مجھے سنتے ہیں تو مجھے کبھی وہ حرارت اور جوش محسوس نہیں ہوتا جو اس وقت سو پچھہتر مسلمانوں اور چند متجسس حاضرین کے سامنے دکان کے بیرونی حصہ میں بوچڑ خانے سے آتی ہوئی سوروں کی آواز کے دوران محسوس ہوتا تھا۔

1953ء کی گرمیوں میں اللہ کی مہربانی سے مجھے ڈیٹرائٹ معبد نمبر ایک کا اسسٹنٹ منسٹر مقرر کر دیا گیا۔ ہر روز کام سے فارغ ہو کر میں جھونپڑ پٹی میں باصلاحیت سیاہ فاموں کو مسلمان بنانے کے لیے نکل پڑتا۔ میں اپنے سیاہ فام بہن بھائیوں کی نقوش دیکھتا جن کے ذہن سفید فام نے دھو ڈالے تھے۔ ان کے بال بھی میرے بالوں کی طرح لئی کے آتشیں محلول میں پک پک کر بے جان ہو کے گوروں کے بالوں کی طرح سیدھے ہو گئے تھے۔ وقتاً فوقتاً جناب ایلیا محمد کی تعلیمات کا مذاق اڑانے والوں سے بھی سابقہ پڑ جاتا تھا جب کوئی میرا ہم نسل مجھے کہتا "تم نیگروز پاگل ہو گئے ہو، چلو اپنی شکل گم کرو" تو میرا سر گھومنے لگتا۔ مجھے اس پر رحم بھی آتا اور غصہ بھی اور میں اگلے خطاب کا بے چینی سے موقع ڈھونڈنے لگا۔

"پیارے بھائیو! ایلیا محمد نے سیاہ فاموں کی آزادی کا جو منصوبہ شروع کیا ہے اس میں جتنا حصہ ڈال سکتے ہیں ڈالیں۔ ان سفید فاموں نے سیاہ فاموں کو اپنا محتاج بنا کر ان پر غلبہ پا لیا ہے تاکہ ہم ہمیشہ ان کے ٹکڑوں پر پلتے رہیں اور ان کے دستر خوان کے بچے کھچے ٹکڑوں کی بھیک مانگتے رہیں..."

"... میرے خوبصورت سیاہ بہن بھائیو! جب میں "سیاہ" کہتا ہوں تو اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو "سفید" نہیں ہے۔ ایک نگاہ اپنی جلد پر ڈالیں ہم سب ایک ہزار ایک مختلف رنگ رکھنے کے باوجود سفید فام کی نظر میں صرف "سیاہ" ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھو کہ تمہارے سیاہ افریقی رنگ کو سفید فام نے اپنے خون کی ملاوٹ سے کس کس طرح آلودہ کیا ہے۔ مجھے دیکھو! مجھے گلیوں بازاروں میں "ڈیٹرائٹ ریڈ" کہہ کر پکارا جاتا ہے کیونکہ آبرو کا لٹیرا سرخ بالوں والا سفید شیطان میرا نانا تھا۔ میری ماں کا باپ، وہ اس کا نام زبان پر بھی نہیں لانا چاہتی۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اس آدمی کی شکل بھی نہیں دیکھتی تھی۔ میری ماں کو اپنے اس فعل پر خوشی تھی اور میں اس کے اس رویئے پر خوشی محسوس کرتا ہوں اگر میں اس خون کو اپنے بدن سے نکال سکتا جس نے میرے جسم اور میری رنگت کو آلودہ کر رکھا

ہے تو میں ضرور اسے نکال دیتا کیونکہ مجھے اس خون کے ایک ایک قطرے سے نفرت ہے اور یہ صرف میرا المیہ نہیں ہے ہم سب کا ہے۔ ذرا سوچو عہد غلامی میں شاید ہی ہماری کوئی نانی، پڑنانی نگڑنانی ہو جو سفید آقا کے ہاتھوں آبرو ریزی سے بچی ہو۔ وہی سفید فام آبرو کا لٹیرا جس نے سیاہ فام مرد کو ڈرا ڈرا کر نامرد بنا دیا حتیٰ کہ آج بھی سیاہ فام کے دل میں سفید فام کا خوف جاگزیں ہے۔ آج بھی ہماری زندگیاں سفید فام کی ایڑی کے نیچے سسک رہی ہیں۔

سوچو، اس سیاہ غلام کے متعلق سوچو جو سہا ہو اپنی اس بیوی، ماں یا بیٹی کی چیخیں سن رہا ہے جسے زبردستی خرمن، باورچی خانے یا جھاڑیوں کے پیچھے لے جایا جا رہا ہے۔ میرے بھائیو اور بہنوں! سنو آبرو لٹی ماؤں، بیویوں اور بیٹیوں کو سنو اور اپنی خون میں ڈوبی بے بسی کا تصور کرو۔ اس وحشی جانور کے حملے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچوں کو ”ملاٹو، کو آرڈرون اور آکٹورون“ جیسے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔

ایک دوسرے کو دیکھو اور سوچو کہ ہمارے رنگ کو آلودہ کرنے کے بعد یہ شیطان یہ زعم بھی رکھتا ہے کہ ہم یعنی اس کا شکار اس سے محبت بھی کریں۔“

کبھی کبھی احساس کی شدت کے باعث میں رات گئے تک سڑکوں پر گھومتا رہتا۔ میں گھنٹوں خاموش رہ کر ان مظالم کے متعلق سوچتا رہتا جو امریکہ میں ہمارے مظلوم لوگوں پر ہوئے تھے۔

ایک روز گارووڈ فیکٹری میں جہاں میں کام کرتا تھا میرا سپروائزر گھبرایا ہوا آیااور بولا کہ دفتر میں کوئی شخص مجھے ملنے آیا ہے۔ دفتر میں موجود سفید فام شخص نے کہا ”میں ایف بی آئی سے ہوں“ یہ کہہ کر اس نے چمڑے کے کیس میں جڑا ہوا اپنا شناختی نشان میرے آنکھوں کے سامنے کیا جو یہ عام طور پر خوفزدہ کرنے کے لیے کرتے ہیںاور یہ بتائے بغیر کہ کہاں جانا ہے اور کیوں جانا ہے اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

میں اس کے ساتھ چل دیا دفتر پہنچ کر انہوں نے صرف اتنا پوچھا کہ میں نے کوریا کی جنگ کے لیے اپنا نام درج کیوں نہیں کروایا؟ میں نے جواب دیا کہ ”میں حال ہی میں جیل سے نکلا ہوں میرا خیال تھا کہ جیل کا ریکارڈ رکھنے والوں کو نہیں چنا جاتا۔“

انہوں نے اس پر اعتبار کر لیا، مجھ سے بہت سے سوال پوچھے گئے۔ بالآخر انہوں نے مجھے وردی پہننے اور رجسٹریشن کروانے کا حکم دیا۔ میں وہاں سے بھرتی کے دفتر گیا انہوں نے مجھے ایک فارم بھرنے کے لیے دیا جس کے مذہب

کے خانے میں میں نے ”مسلمان“ لکھ دیا۔ فارم وصول کرنے والے شیطان نے اس کا مطالعہ کیا۔ کن اکھیوں سے مجھے دیکھا اور اٹھ کر اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آیا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

اندر تین شیطان میز کے پیچھے بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں پر میرے لیے ناپسندیدگی کا تاثر تھا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اپنے آپ کو کس بنیاد پر مسلمان کہا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ جو بھی امریکہ میں ایلیا محمد کے پیروکار ہیں وہ سب مسلمان ہیں۔

انہوں نے دوسرا سوال کیا کہ تم نے فارم میں خود کو ”شعوری طور پر اعتراض کرنے والا“ کیوں کہا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ جب مجھے سفید فام کہیں جا کر لڑنے اور مرنے کے لیے کہتا ہے تاکہ وہ سیاہ فاموں کے ساتھ ہونیوالے سلوک کو تحفظ دے سکے تو میرا ضمیر فوراً اعتراض کرنے لگتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ میرا کیس التواء میں رکھا جائے گا۔ بعد میں انہوں نے میرا جسمانی معائنہ کیا اور مجھے ایک کارڈ بھیج دیا۔ یہ 1953ء کی بات ہے 7 سال تک مجھ سے کسی نے رابطہ نہیں کیا۔ پھر اس کے بعد ایک اور کارڈ بذریعہ ڈاک موصول ہوا جو آج بھی میرے پاس موجود ہے اس کا نمبر 20219251377 ہے اور اس پر تاریخ 21 نومبر 1960ء درج ہے اور اس پر ”کلاس A-5“ چھپا ہوا ہے اور کارڈ کی پشت پر ”مشی گن لوکل بورڈ نمبر219 وین کاؤنٹی 3604 وئن روڈ وین مشی گن“ کی مہر لگی ہوئی ہے۔

جب بھی میں معبد نمبر1 میں خطاب کرتا میری آواز بیٹھ جاتی۔ تقریر کا عادی ہونے میں میرے گلے کو کافی عرصہ لگا۔ میں کہتا:

”تمہیں پتہ ہے کہ سفید فام تم سے نفرت کیوں کرتا ہے؟ کیوں کہ وہ جب بھی تمہارا چہرہ دیکھتا ہے اسے اس آئینے میں اپنے جرائم دکھائی دیتے ہیں اور اس کے ضمیر کی چبھن اسے اس حقیقت کا سامنا نہیں کرنے دیتی۔“

امریکہ کے ہر سفید فام شخص پر لازم ہے کہ وہ جب بھی کسی سیاہ فام کو دیکھے تو گھٹنے ٹیک کر اس سے کہے کہ ”میں معذرت چاہتا ہوں۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔ میری نسل نے تمہاری نسل کے خلاف تاریخ کے بدترین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ کیا تم مجھے کفارہ ادا کرنے کا موقع دو گے؟“ لیکن کیا آپ کسی سفید فام سے ایسے رویئے کی توقع کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں اور وجہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ اس لیے ایسا نہیں کرے گا کیونکہ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا کیونکہ اسے بطور شیطان تخلیق کیا گیا تھا دنیا میں فساد برپا کرنے کے لیے...“

انہی دنوں میں نے گاروؤڈ فیکٹری چھوڑ دی اور فورڈ موٹر کمپنی میں کام کرنے لگا۔ بطور نوجوان منسٹر میں شکاگو جاتا اور جب بھی موقع پاتا جناب ایلیا محمد سے ملتا۔ وہ میری حوصلہ افزائی کرتے۔ وہ اور ان کی بیوی "بہن کلارا محمد" مجھے اپنے بیٹوں کی طرح سمجھتے۔ ان کے بچوں سے کم ہی ملاقات ہوتی۔ وہ شکاگو کے گردونواح میں مزدوری اور ٹیکسی چلانے جیسے کام کرتے تھے۔ اسی گھر میں ایلیا محمد کی والدہ "میری" بھی رہتی تھی۔ میں ان کے ساتھ بھی تقریباً اتنا وقت ہی گزارتا جتنا ایلیا محمد کے ساتھ گزارتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے ایلیا محمد کے ماضی کے قصے سناتیں جب وہ سب سینڈرزویل، جارجیا میں رہتے تھے جہاں 1897ء میں ایلیا محمد پیدا ہوئے تھے تو مجھے بہت اچھا لگتا۔

اسلامی کھانا کھانے کے بعد ایلیا محمد مجھ سے لمبی گفتگو کرتے۔ ہم ان کی گاڑی میں کریانے کی مختلف دکانوں پر جاتے جو مسلمانوں کی ملکیت تھیں۔ یہ دکاندار اپنے سیاہ فام بھائیوں کو ملازم رکھ کر ان سے تجارت کر کے ان کی ہر طرح سے مدد کرتے تاکہ وہ سفید فام کے استحصال سے محفوظ رہیں۔

ایسے ہی کسی مسلمان کے کریانہ و دواخانہ قسم کی دکان پر ایلیا محمد جھاڑو دینے کا کام کرتے تھے۔ وہ ایسے کام مثال کے طور پر کرتے تھے کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ بے کاری اور کاہلی سیاہ فام قوم کا اپنی ذات سے متعلق سب سے بڑا گناہ ہے۔ میں اس کام کو ان کے مرتبہ سے کم سمجھتے ہوئے ان سے جھاڑو چھیننے کی کوشش کرتا مگر وہ ایسا نہ کرنے دیتے اور مجھے صرف اپنے قریب رہنے اور پیغام پھیلانے کے متعلق بہتر طریقے سمجھنے کی اجازت دیتے۔

ان کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے ایتھنز کے بازار میں اپنے طلباء میں دانش پھیلاتے ہوئے سقراط کا خیال آتا یا اسی کے ایک شاگرد ارسطو کا تصور ذہن میں آتا جو دانش گاہ میں چہل قدمی کرتے ہوئے طلباء کو علم عطا کرتا تھا۔ ایک روز ایلیا محمد نے کاؤنٹر پر گندے پانی کے گلاس کے ساتھ صاف پانی کا گلاس رکھ کر مجھ سے کہا "تم میری تعلیمات پھیلانے کا طریقہ سیکھنا چاہتے ہو؟" پھر انہوں نے گندے پانی کے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اگر کسی شخص کے پاس گندے پانی کا گلاس دیکھو تو اسے ملامت نہ کرو صرف اسے اپنا صاف پانی والا گلاس دکھا دو۔ جب وہ اس کا جائزہ لے گا تو تمہیں یہ کہنا نہیں پڑے گا کہ تمہارا گلاس بہتر ہے۔"

ان کی یہ تعلیم مجھے سب سے زیادہ پسند آئی اور آج بھی ہے۔ اگرچہ میں نے اس پر زیادہ عمل نہیں کیا کیونکہ مجھے جنگ پسند ہے۔ اگر کسی کے گلاس میں گندا پانی ہو تو میرا دل چاہتا ہے کہ اسے بتاؤں۔

ایلیا محمد مصروف ہوتے تو "اماں میری" مجھے ان کے لڑکپن اور نوجوانی کے قصے سناتیں۔ ان کی یادیں وہاں سے شروع ہوتی تھیں جب وہ خود سات سال کی تھیں اور انہیں اشارہ ملا تھا کہ ایک روز وہ ایک بہت عظیم آدمی کی ماں بنیں گی۔ انہوں نے ایک بپتسمہ منسٹر عزت مآب پول سے شادی کر لی جو سینڈرزویل کے قریب کھیتوں میں اور آراء مشین پر کام کرتے تھے۔ "اماں میری" کے تیرہ بچوں میں سے ایلیا محمد ذرا مختلف تھے۔

یہ دبلا سا بچہ عموماً بڑے بہن بھائیوں کے جھگڑوں کے تصفیئے کرتا اور کچھ بڑا ہونے پر سب ان کو اپنا راہ نما سمجھنے لگے۔ مکتب میں داخلے کے وقت ہی انہوں نے نسلی شعور کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ غربت کی وجہ سے ایلیا محمد کو چوتھی جماعت میں تعلیم ترک کر کے نوکری کرنا پڑ گئی۔ رات کے وقت ایک بڑی بہن حسب استطاعت انہیں پڑھا دیتی۔

ایلیا آنکھوں میں آنسو لیے گھنٹوں انجیل کی ورق گردانی کرتے رہتے (ایلیاء محمد نے مجھے خود بتایا کہ بچپن میں انہیں انجیل کے الفاظ ایک مقفل دروازہ لگتے تھے جسے صاحب علم کھول سکتا تھا اور اپنی کم علمی کے دکھ پر انہیں بے اختیار رونا آ جاتا تھا) لڑکپن میں بھی وہ بے حد دبلے پتلے تھے لیکن ان کے اندر اپنی نسل کے لیے غیر معمولی محبت تھی لیکن "اماں میری" کے بقول وہ سیاہ فاموں کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ غلطی کی وجوہات پر بھی گفتگو کرتے تھے۔

جب "اماں میری" فوت ہوئیں تو اس کا جنازہ شکاگو کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔ جس میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر بہت سے لوگ بھی ایلیا محمد کی اپنی والدہ سے محبت کے پیش نظر شریک ہوئے۔

ایلیا محمد مجھ سے کہا کرتے تھے کہ "مجھے اپنی کم تعلیم پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ میرا چوتھی جماعت سے آگے نہ جاسکنا اس بات کا ثبوت ہے کہ میں اللہ کی عطا کردہ سچی تعلیم کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔ اللہ نے ہی مجھے ریاضی سکھائی میری زبان اٹکتی تھی اللہ نے مجھے الفاظ درست ادا کرنے سکھائے۔"

ایلیا محمد کہا کرتے تھے کہ انہیں اس بات کی کبھی سمجھ نہیں آئی کہ سفید فام کسان اور آراء مشین کے افسران کیوں بلاوجہ سیاہ فام ملازموں کو گالی گلوچ کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے ایک بار اپنے مالک سے کہا کہ "اگر آپ کو میرا کام پسند نہیں ہے تو مجھے نوکری سے نکال دیں مگر مجھے گالی مت دیں" (عمومی گفتگو میں ایلیا محمد اسی شائستگی کو ملحوظ رکھتے تھے وہ بہت روایتی خطیبوں کے انداز میں لچھے دار گفتگو نہیں کرتے تھے لیکن جو کچھ بھی وہ کہتے تھے۔ مجھ پر اس

طرح اثر کرتا کہ بڑے بڑے خطیبوں کی تقریر بھی وہ اثر نہیں کر سکتی تھی) وہ عام طور پر اتنی ایمانداری سے کام کرتے تھے کہ انہیں دوسرے نیگروز کا انچارج بنا دیا جاتا تھا۔

1923ء میں جب ان کا نام ابھی ایلیا پول تھا اور "بہن کلارا" سے شادی کے بعد ان کے پہلے دو بچے ہو چکے تھے ایک روز ان کے سفید فام مالک نے انہیں گالی بکی۔ کسی پریشانی سے بچنے کے لیے وہ اپنے خاندان کو لے کر ڈیٹرائٹ آ گئے جہاں ان کے مزید پانچ بچے پیدا ہوئے جبکہ آخری بچہ شکاگو میں پیدا ہوا۔

1931ء میں ان کی ملاقات آقا ڈبلیو ڈی فارڈ کے ساتھ ڈیٹرائٹ میں ہوئی۔ اس زمانے میں ہر طرف جنگ کے بعد کے اثرات پھیلے ہوئے تھے لیکن سیاہ فاموں کے جھونپڑ پٹیوں میں حالات بدترین تھے۔ ایک روز غربت کے مارے نیگروز کے دروازوں پر ہلکی بھوری جلد والے آدمی نے دستک دی۔ وہ ریشم کے کپڑے اور دیگر گھریلو اشیاء بیچ رہا تھا اور اپنا تعارف "مشرق سے ایک بھائی" کہہ کر کرواتا تھا۔

اس آدمی نے نیگروز کو بتانا شروع کیا کہ وہ اپنے اجداد کے نطفوں میں ایک دور کی سرزمین سے یہاں آئے ہیں۔ اس نے انہیں گندے سور اور غلیظ غذائیں کھانے سے منع کیا جو نیگروز کھانے کے عادی تھے۔ جو نیگروز اس کی باتوں سے اتفاق کرتے تھے ان کے ساتھ اس نے علیحدہ اجلاس بلانا شروع کر دیئے جن میں وہ انہیں قرآن اور انجیل کی تعلیم دیتا تھا۔ اس کے طلباء میں ایلیا پول بھی شامل تھے۔

اس آدمی نے اپنا نام ڈبلیو ڈی فارڈ بتایا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ عربی پیغمبر محمدؐ بن عبداللہ کے قبیلے قریش میں پیدا ہوا تھا۔ ریشم اور دوسری چیزیں بیچنے والا یہ تاجر انجیل عیسائی نیگروز سے زیادہ بہتر جانتا تھا۔ المختصر اس نے بتایا کہ "گاڈ" کا صحیح نام اللہ ہے۔ اس کا اصل دین اسلام ہے اس کے دین کے پیروکاروں کا نام مسلمان ہے۔

جناب ڈبلیو ڈی فارڈ نے بتایا کہ امریکی نیگروز براہ راست مسلمانوں کی نسل سے ہیں۔ وہ دراصل گمشدہ بھیڑیں ہیں جو چار سو سال سے قوم اسلام سے بچھڑی ہوئی ہیں اور وہ یعنی جناب فارڈ نیگروز کو ان کے حقیقی دین کی طرف لے جانے کے لیے آئے ہیں۔

وہ کہتا تھا کہ جنت کہیں آسمان میں نہیں ہے اور دوزخ کہیں زمین کے نیچے نہیں ہے۔ بلکہ جنت اور جہنم اسی زمین کے اوپر لوگوں کے حالات زندگی کا نام ہے۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ امریکی نیگروز چار سو سال سے جہنم میں رہ رہے ہیں اور وہ انہیں ان کے گھر ان کے ہم نسلوں میں واپس لے جانے کے لیے آیا ہے۔

اس کا کہنا تھا کہ جس طرح جہنم زمین پر ہے اسی طرح شیطان بھی زمین پر ہی موجود ہے۔ یہ سفید نسل چھ ہزار سال پہلے سیاہ فام حقیقی آدمی سے پیدا کی گئی تھی تاکہ اگلے 6 ہزار سال تک زمین کو جہنم بنائے رکھے۔

یہ سیاہ لوگ خدا کی اولاد دراصل اپنے آپ میں خدا ہیں اور انہیں میں ایک آدمی ایسا ہے جو خدائوں کا خدا ہے۔ وہ بہت بہت اعلیٰ عظیم ترین دانش اور طاقت میں آخری ہے اور اس کا صحیح نام اللہ ہے۔

1931ء میں ڈیٹرائٹ میں آقا ڈبلیو ڈی فارڈ نے اپنے مٹھی بھر پیروکاروں کو بتایا کہ ہر مذہب یہ کہتا ہے کہ آخری وقت پر خدا آئے گا گمشدہ بھیڑوں کو ان کے دشمنوں سے الگ کر کے انہیں ان کے ہم نسلوں سے ملائے گا اور یہ پیش گوئی اشارہ کرتی ہے گمشدہ بھیڑوں کے متلاشی اور محافظ کی طرف جسے "ابن آدم" یا "انسانی صورت میں خدا" یا "زندگی بخشنے والا" یا "بحال کرنے والا" یا "مسیحا" جیسے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ جو مشرق سے برق کی طرح آئے گا اور مغرب میں ظاہر ہو گا۔

وہ ایسی ذات واحد ہو گا جسے یہودی "مسیحا" عیسائی "مسیح" اور مسلمان "مہدی" کہتے ہیں۔ میں حیران بیٹھا ایلیا محمد کی زبانی اپنے مذہب کی اصل تاریخ سنتا رہتا۔ ایلیا محمد کا کہنا تھا کہ ایک روز ان پر منکشف ہوا کہ آقا ڈبلیو ڈی فارڈ مذکورہ پیش گوئی پر پورے اترتے ہیں۔ انہوں نے ایک روز ڈبلیو ڈی فارڈ سے پوچھا "آپ کون ہیں اور آپ کا اصل نام کیا ہے؟" اس نے جواب دیا "میں ہی وہ "ایک" ہوں جس کا دنیا والے دو ہزار سال سے انتظار کر رہے تھے۔"

"لیکن آپ کا اصل نام کیا ہے؟" ایلیا محمد نے پوچھا اور اس نے کہا "میں مہدی ہوں اور تمہیں صحیح راہ دکھانے کے لیے آیا ہوں۔"

ایلیا محمد کے بقول وہ آقا فارڈ کو اسی طرح کشادہ چشم و ذہن کے ساتھ بغیر کسی شک کے سنتے تھے جس طرح میں ایلیا محمد کی باتیں سنتا تھا اور اپنے نجات دہندہ کی گفتگو دل و دماغ میں بٹھاتے رہتے۔

امریکہ کے سیاہ فاموں تک تعلیمات پہنچانے کے لیے تنظیم سازی کا آغاز کرتے ہوئے آقا ڈبلیو ڈی فارڈ نے منسٹرز کے لیے تربیتی جماعت شروع کی۔ ان نئے وزراء کے نام رکھتے ہوئے آقائے ایلیا پول کا نام "ایلیا کریم" رکھا۔

اس کے بعد آقا فارڈ نے 1931ء میں ڈیٹرائٹ میں "یونیورسٹی آف اسلام" قائم کی۔ اس میں بالغ افراد کو دوسرے موضوعات کے علاوہ ریاضی سکھائی جاتی تھی اور غریب نیگروز کو نیلی آنکھوں والے سفید شیطان کی مکاری اور ہوشیار

سے بچنے کے لیے (Tricknology) پڑھائی جاتی تھی۔

جاہل طبقہ میں مکتب کھولنے کا مطلب ہے تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی لیکن کہیں سے تو آغاز کرنا ہی پڑتا ہے۔ یونیورسٹی آف اسلام میں بچوں کا مرکز قائم کرنے کے لیے جناب ایلیا کریم نے اپنے بچوں کو ڈیٹرائٹ کے عوامی مکتب سے ہٹا لیا۔ جناب ایلیا محمد نے مجھے بتایا کہ ان کے بڑے بچوں میں جو روائیتی تعلیم کی کمی نظر آتی ہے وہ اس قربانی کی غماز ہے جو انہوں نے ڈیٹرائٹ اور شکاگو کی "یونیورسٹیز آف اسلام" کے قیام کے لیے دی ہے جہاں اب بہتر نصابی تعلیم میسر ہے۔

آقا ڈبلیو ڈی فارڈ نے ایلیا کریم کو اپنا سپریم وزیر چن لیا جس سے دیگر وزراء میں شدید حسد پیدا ہو گیا۔ وہ سب ایلیا کریم سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے اور زیادہ اچھے خطیب بھی۔ وہ اپنے غصے کا اظہار ان کی موجودگی میں بھی کرنے سے باز نہ رہتے اور کہتے "ہم اپنے سے کم تعلیم یافتہ کے سامنے کیوں جھکیں؟"

لیکن ایلیا کریم جن کا نیا نام ایلیا محمد ہو گیا تھا نے بطور سپریم وزیر اگلے ساڑھے تین سال آقا فارڈ سے خصوصی تعلیم حاصل کی جس کے دوران بقول ان کے انہوں نے ایسی باتیں سنیں جو دوسروں پر ظاہر نہیں کی گئی تھیں۔

اسی دور میں ایلیا محمد اور آقا فارڈ معبد نمبر 2 قائم کرنے شکاگو گئے انہوں نے "مل واکی" میں معبد نمبر 3 کی تعمیر کا آغاز بھی کیا۔

1934ء میں آقا ڈبلیو ڈی فارڈ بغیر کوئی نشان چھوڑے غائب ہو گئے۔

ایلیا محمد کا کہنا ہے کہ ان پر حاسد وزراء نے کئی قاتلانہ حملے کروائے۔ ان منافقوں نے انہیں شکاگو بھاگ جانے پر مجبور کر دیا اور معبد نمبر2 ان کا ہیڈ کوارٹر بن گیا حتیٰ کہ منافقین نے ان کا پیچھا کر کے وہاں سے بھی بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ واشنگٹن ڈی سی پہنچ کر انہوں نے معبد نمبر4 شروع کیا اور ساتھ ساتھ "کانگریشنل لائبریری" میں ان کتب کا مطالعہ شروع کر دیا جن کے متعلق آقا فارڈ نے بتایا تھا کہ ان میں سچائی کے مختلف ٹکڑے ملیں گے جو سفید شیطان نے محفوظ کئے ہیں۔ جو عام مطالعہ کے کتب میں میسر نہیں ہوتے۔

"منافقین" کے تعاقب کی وجہ سے ایلیا محمد کسی شہر میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے تھے اور مسلسل شہر در شہر گھومتے رہتے اور جب بھی موقع ملتا اپنے بیوی بچوں سے ملنے آ جاتے جن کے طعام کے ذمہ داری دوسرے غریب مسلمانوں نے اٹھا رکھی تھی۔ ایلیا محمد کی گھر میں موجودگی کے متعلق شکاگو کے سچے پیروکاروں کو بھی علم نہیں ہوتا تھا۔

1942ء میں ایلیا محمد کو گرفتار کر لیا گیا کیونکہ کچھ ٹوڈی نیگروز نے سفید شیطان کو ان کی تعلیمات کے متعلق مخبری کر دی تھی۔ چنانچہ ان پر مسلح بغاوت کا الزام عائد کر دیا گیا حالانکہ ان سا نرم خو شخص فوج کی نوکری کے لائق بھی نہیں تھا۔ انہیں پانچ سال سزا سنا دی گئی میلان میں "مشی گن وفاقی جیل" میں ساڑھے تین سال قید رکھنے کے بعد انہیں پیرول پر چھوڑ دیا گیا۔ 1946ء میں انہوں نے شمالی امریکہ کے ویرانے میں بھٹکتے سیاہ فام کی آنکھوں سے پٹی کھولنے کا کام دوبارہ شروع کر دیا۔

مجھے آج بھی مسلم معبد میں اپنا جذبات انگیز خطاب یاد آتا ہے۔

"یہ چھوٹا سا، پیارا سا، شریف سا آدمی، عزت مآب ایلیا محمد جو اس وقت شکاگو میں ہمارے بہن بھائیوں کو تعلیم دے رہا ہے۔ یہ اللہ کا نمائندہ جو امریکہ میں اس وقت انتہائی طاقتور سیاہ فام ہے وہ میرے تمہارے لیے سات سال تک منافقوں سے بھاگتا رہا۔ جس نے مزید ساڑھے تین سال جیل کے پنجرے میں گزارے جہاں سفید شیطان نے اسے قید کر دیا تھا کیونکہ سفید شیطان نہیں چاہتا کہ ایلیا محمد تمہارے اندر سوئے ہوئے جن کو بیدار کر دے۔

میں نے ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان کے منہ سے ان کا پیغام سنا ہے۔ میں گھٹنوں کے بل اللہ کے حضور گڑگڑاتا ہوں کہ وہ سفید فام کو اس کے جرائم اور سیاہ فام کو ایلیا محمد کے تعلیمات سے آگاہ کر دے اور اگر اس کام میں میری جان بھی چلی جائے تو کوئی پرواہ نہیں..."

یہ میرا رویہ تھا اور یہی میرا لہجہ تھا جو میں بغیر ہچکچاہٹ یا خوف کے استعمال کرتا تھا۔ میں ان کا انتہائی وفادار خادم تھا اور میرے خیال میں جتنا یقین اور ایمان میں ان پر رکھتا تھا اتنا وہ خود اپنی ذات پر نہیں رکھتے تھے۔

میں آنے والے سالوں میں ایک نفسیاتی اور روحانی بحران سے گزرنے والا تھا۔

!

باب:13

وزیر میلکم ایکس

میں نے فورڈ موٹر کمپنی کے لنکن مرکری ڈویژن کی نوکری چھوڑ دی کیوں کہ مجھ پر واضح ہو چکا تھا کہ ایلیا محمد کو اپنی تعلیمات شمالی امریکہ کے دھلے ذہنوں والے خوابیدہ بائیس لاکھ سیاہ فاموں تک پہنچانے کے لیے وزراء اور نئے معبدوں کی شدید ضرورت ہے۔ میں نے نسبتاً جلدی فیصلہ کر لیا، میں شروع سے ذرا تیز مزاج ہوں اور دوسرے وزراء کی نسبت ذرا جلدی فیصلہ تک پہنچ جاتا ہوں لیکن ہماری قوم کا ہر وزیر اپنے وقت پر، اپنے انداز میں اپنی خلوت جاں میں یہ فیصلہ ضرور کرتا ہے کہ اس کی سابق زندگی ایلیا محمد کا پیروکار بننے کے لیے محض ایک تمہید تھی کیونکہ اسلام بتاتا ہے کہ ہر ہونے والا واقعہ پہلے سے لکھا ہوتا ہے۔

جناب ایلیا محمد میری تربیت کے لیے مہینوں تک مجھے اپنے شکاگو والے گھر میں ان گنت بار مدعو کرتے رہے۔ جیل میں رہ کر میں نے اتنا پڑھا اور سیکھا نہیں تھا جتنا ان کی صحبت میں سیکھتا تھا۔ وہ مجھے عبادات کا طریقہ، تنظیمی اور انتظامی معاملات، قرآن اور انجیل کے مطالب اور ان کا استعمال سمجھاتے۔ ہر گزرتا دن میرے دل میں ان کے احترام کو بڑھاتا چلا جاتا اور میں سوچتا کہ چوتھی جماعت تک پڑھے، آرا مشین کے ملازم کمزور سی بھیڑ نما آدمی کو اتنی دانش آخر اللہ کے سوا اور کون عطا کر سکتا ہے؟

"یہ "بھیڑ" کی تشبیہہ میں نے "کتاب الہام" کی ایک پیش گوئی سے لی ہے جس میں ایک ایسی علامتی بھیڑ کا ذکر ہے جس کے منہ میں دو دھاری تلوار ہو گی۔ یہ دو دھاری تلوار ایلیا محمد کی تعلیمات تھیں جن سے وہ سیاہ فاموں کا ذہن سفید فام کی قید سے آزاد کروا رہے تھے۔

میری نظر میں ان کا احترام بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ اس احترام کے لیے میں لاطینی لفظ (ADORARE)استعمال کروں گا جو مفہوم و معنی میں روایتی لفظ "احترام" سے زیادہ موزوں ہے۔ اس کا مطلب ہے ایسے شخص کی پرستش جس سے آپ کو سب سے پہلے خوف محسوس ہوا ہو ایسا خوف نہیں جو مسلح شخص سے محسوس ہوتا ہے بلکہ وہ خوف جو آپ کو سورج کی قوت سے محسوس ہوتا ہے۔

جناب ایلیا محمد جب مناسب سمجھتے مجھے بوسٹن جانے کی اجازت دے دیتے جہاں بھائی لائیڈ ایکس رہتا تھا۔ میری آمد پر وہ اسلام میں دلچسپی رکھنے والوں کو میرا خطاب سننے کے لیے مدعو کر لیتا۔ میں گفتگو کا آغاز ایلیا محمد کے متعلق اپنی پسندیدہ تشبیہہ سے کرتا۔

"خدا نے ایلیا محمد کو ایک تیز سچائی عطا کی ہے۔ یہ دو دھاری تلوار کی طرح ہے جو تمھیں اندر تک کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اس سے تمھیں درد تو بہت ہوتا ہے لیکن اگر تم سچ کو قبول کر لو تو یہ تمھیں اس سے بچا لے گا جو تمھارے لیے جان لیوا ہے۔" اس کے بعد میں مزید تمہید باندھنے میں وقت ضائع نہ کرتا اور کہتا "مجھے علم ہے کہ آپ اس نام نہاد عیسائی سفید فام کے جرم کی شدت اور گھناؤنے پن سے ناواقف ہیں... حتیٰ کہ انجیل میں اتنے بڑے جرم کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے کہیں چھوٹے جرم پر اللہ کا غضب گناہ گاروں کو آگ کے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ایک سو ملین سیاہ لوگ تمھارے اور میرے اجداد اس سفید فام کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں۔ پندرہ ملین لوگوں کو غلامی کے لیے یہاں لاتے ہوئے اس نے راہ میں ایک سو ملین لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کاش میرے لیے ممکن ہو تاکہ میں اس زمانے کے سمندر کی تہہ آپ کو دکھا سکتا جہاں سیاہ جسم، خون اور ٹھوکروں اور بیلچوں سے ٹوٹی ہوئی ہڈیاں آپ کو نظر آتیں۔ ان حاملہ عورتوں کے جسم جنہیں بیمار ہونے کے جرم میں زندہ سمندر میں پھینک دیا گیا۔ ان شارکوں کا لقمہ بننے کے لیے جو یہ سیکھ چکی تھیں کہ اچھی اور آسان غذا کے لیے ان جہازوں کا تعاقب ضروری ہے۔

سیاہ فام عورتوں کی آبرو لوٹنے کا عمل انہی جہازوں سے شروع ہوا تھا کیونکہ یہ سفید شیطان تسکین طبع کے لیے گھر پہنچنے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میرے بھائیو اور بہنو! مہذب انسانیت اس قدر لالچ ہوس اور قتل و غارت گری کا تصور بھی نہیں کر سکتی..."

اپنی اثر پذیری کے اعتبار سے عہد غلامی کے مصائب کا بیان کبھی ناکام نہیں ہوا۔ مجھے اس بات پر حیرانی ہوتی کہ عہد غلامی کو سفید فاموں نے سیاہ فاموں کی نظر میں کس قدر رومانی بنا رکھا تھا۔ جب میں نیگروز کو غلامی کے مظالم پر مشتعل کر چکتا تو ان کی موجودہ حالت کی طرف آتا۔

”میں چاہتا ہوں کہ جب آپ یہاں سے نکلیں تو دیکھیں، غور کریں۔ اس شیطان کا مشاہدہ کریں کہ آپ کو مغلوب رکھتے وقت وہ کتنا مسرور، متکبر، چھچھورا اور مغرور ہوتا ہے۔ جب بھی کسی سفید فام کو دیکھو تو سمجھو کہ تم حقیقی شیطان کو دیکھ رہے ہو۔ اس بات پر غور کریں کہ آج دنیا کی امیر ترین قوم نے اپنی سلطنت آپ کے غلام اجداد کی پسینے سے بھیگی خون آلود پشت پر قائم کی ہے اور اپنی شیطانیت اور ہوس کی بنیاد پر اس نے ہمیں دنیا بھر میں قابل نفرت بنا دیا ہے۔“

جتنے بھی لوگ میری تقریر سن کر جاتے اگلی مرتبہ اپنے دوستوں کو ساتھ لے کر آتے۔ ان میں سے کبھی کسی نے سفید فام کی نقاب کشائی کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا۔ جب میں خطاب کے بعد ان سے کہتا ”آپ میں سے جو شخص میرے کہے پر یقین رکھتا ہے کھڑا ہو جائے۔“

یہ سن کر موجود ہر شخص کھڑا ہو جاتا اور ہر اتوار کی شب جب میں یہ سوال کرتا ”آپ میں سے کتنے ہیں جو ایلیا محمد کی پیروی کرنا چاہتے ہیں؟“ تو چند اشخاص کھڑے ہو جاتے۔ تین ماہ کی محنت کے بعد ہماری تعداد اتنی ہو گئی کہ ہم ایک نیا معبد کھول سکیں۔ مجھے یہ سوچ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہم کرسیاں تک کرائے کی لیتے تھے جب میں جناب ایلیا کو اپنے نئے معبد کے خطبے کے بارے میں بتایا تو میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔

جب میری بہن ایلاء نے میری تقریر سننے آنا شروع کیا اس وقت ہم ایک چھوٹی سی مسجد اس مقصد کے لیے بنا چکے تھے۔ وہ حیران بیٹھی میری تقریر سنا کرتی اور جب چندے کا وقت آتا تو وہ چندہ بھی دیتی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ بھی میری طرح محتاط اور سخت مزاج ہے۔ اس لیے میں نے اسے مذہب تبدیل کرنے کے لیے کبھی نہیں کہا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور اسے مذہب تبدیل نہیں کروا سکتا تھا۔

میں ہر اجلاس کا اختتام بتائے ہوئے طریقہ پر کرتا ”اللہ کے نام سے جو مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ ساری تعریفیں اسی کے لیے ہیں۔ وہ سارے جہانوں کا مالک ہے۔ مہربان اور رحم والا حشر کے دن کا مالک ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں۔ تو ہی وہ ہے جس کی ہم خدمت کرتے ہیں اور تیری ہی مدد کے طلبگار ہیں۔ ہمیں درست راستہ دکھا۔ ان کا راستہ جن پر تو نے اپنا انعام کیا نہ کہ ان کا راستہ جن پر تیرا غضب ہوا نہ ہی ان کا راستہ جو تیرا پیغام سننے کے بعد گمراہ ہو گئے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہیں۔“ مجھے یقین تھا کہ ایلیا محمد کو اللہ نے بذات خود ہم لوگوں کے لیے بھیجا تھا۔ پھر میں اپنا ہاتھ اٹھا کر انہیں رخصت کی اجازت سے پہلے کہتا ”دوسروں کے ساتھ وہ مت

کرنا جو تم اپنے ساتھ ہونا پسند نہیں کرتے۔ امن کے ساتھ رہو ظالم مت بنو لیکن اگر کوئی تم پر حملے میں پہل کرے تو ہماری تعلیم یہ ہے کہ دوسرا گال پیش مت کرو۔ اللہ آپ کو ہر کام میں کامیابی اور کامرانی عطا کرے۔"

جیل سے آنے کے بعد سوائے ایک مرتبہ کے میں سات سال تک راکس بیری نہ جا سکا تھا چنانچہ میں نے شارٹی سے ملنے کے بہانے دوبارہ وہاں جانے کا سوچا۔ ملاقات پر شارٹی نے عجیب رویہ اپنائے رکھا کیونکہ اسے اطلاع مل چکی تھی کہ میں کسی مذہبی چکر میں وہاں آیا ہوں اور وہ نہیں جانتا تھا کہ میں واقعی سنجیدہ ہوں یا ان بہروپیئے مبلغین کی طرح ہوں جو ان سیاہ فاموں کی جھونپڑیوں میں دلالی کا پیشہ کرتے ہیں اور عموماً ان بوڑھی محنت کش عورتوں کے بچے ہوتے ہیں جو اپنی اولاد کو خوشحال زندگی گزارتے دیکھنا چاہتی ہیں۔ میں نے بہت جلد شارٹی پر واضح کر دیا کہ میں اسلام کے متعلق کس قدر سنجیدہ ہوں لیکن اسے پریشانی سے بچانے کے لیے میں نے پرانی سڑک چھاپ گفتگو شروع کر دی اور ہمارا وقت بہت اچھا گزرا۔ جب ہم نے شارٹی کا وہ ڈرامائی رد عمل یاد کیا جب جج "جرم نمبر 1 دس سال ... جرم نمبر 2 دس سال" کہہ رہا تھا تو ہم اتنا ہنسے کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہم نے یاد کیا کہ صرف سفید فام لڑکیوں کی وجہ سے ہمیں دس سال سزا دی گئی ورنہ ہم سے بدتر مجرموں کی کہیں کم سزا دی جاتی تھی۔

شارٹی کا ابھی تک ایک چھوٹا سا بینڈ تھا اور وہ اچھا کما رہا تھا۔ اسے بجا طور پر فخر تھا کہ جیل میں اس نے موسیقی کا مطالعہ عمدگی سے کیا تھا۔ میں نے اسے اسلام کے متعلق بہت کچھ بتانا چاہا مگر اس کے رد عمل سے لگتا تھا کہ وہ یہ ذکر سننا نہیں چاہتا۔ کسی نے جیل میں ہمارے مذہب کے خلاف اس کے کان بھرے تھے۔ اس نے ایک لطیفہ سنا کر موضوع گفتگو بدل دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ سور کی چانپوں اور سفید عورتوں سے اس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں اب وہ مطمئن ہوا ہے یا نہیں مگر مجھے علم ہے کہ اس نے ایک گوری سے شادی کر لی ہے اور "ھوگ" کا گوشت کھا کھا کر اسی کی طرح موٹا ہو گیا ہے۔ میں جوئے خانے کے مالک "جون ہیوز" کے علاوہ راکس بیری کے کچھ دوسرے واقفوں کو بھی ملا۔ میری آمد کی اطلاع پر وہ سب پریشان تھے لیکن میں نے اپنے پرانے انداز کی مدد سے ان کی تھوڑی بہت پریشان کم کر دی۔ میں نے ان کے سامنے اسلام کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ میں اب تک دیکھ چکا تھا کہ ان کے دماغ کس قدر دھوئے جا چکے ہیں۔

معبد نمبر 11 کے وزیر کے طور پر میں نے بہت کم عرصہ گزارا جونہی یہ معبد منظم ہوا میں اس کا انتظام و انصرام یولیسس ایکس کے حوالے کر کے آ گیا اور ایلیا محمد نے مجھے فلاڈیلفیا روانہ کر دیا۔

یہ برادرانہ محبت کا شہر مزاج کے اعتبار سے بوسٹن سے بھی اچھا نکلا اور یہاں کے سیاہ فام سفید فاموں کے متعلق حقیقت زیادہ جلدی سمجھ لیتے تھے۔ فلاڈیلفیا کا معبد نمبر12 مئی 1954ء میں قائم ہوا۔ اگلے ماہ بوسٹن اور فلاڈیلفیاء میں کامیابیوں کے بعد ایلیا محمد نے مجھے معبد نمبر7 کا وزیر مقرر کیا جو نیویارک جیسے اہم شہر میں تھا۔

میں آپ کو اپنے جذبات کی بلندیوں کے متعلق نہیں بتاؤں گا مگر مجھے یقین تھا کہ ایلیا محمد کی تعلیمات امریکی سیاہ فام کو دوبارہ زندگی بخش دیں گی اور اسلام بہت زیادہ پھلے پھولے گا اور پورے امریکہ میں اس کے پھیلاؤ کی گنجائش نیویارک کے نواحی علاقے سے زیادہ کہیں نہیں ہے جہاں ایک ملین سے زیادہ سیاہ فام لوگ رہتے ہیں۔

اس علاقے میں سڑکوں پر آوارہ گردی کیے اور ویسٹ انڈین آرچی کے ساتھ کتوں کی طرح جھگڑے کا واقعہ گزرے 9 سال ہو چکے تھے۔ پرانے دوستوں کو اتنے عرصے بعد ملنا بہت خوشگوار لگا۔ میں ویسٹ انڈین آرچی اور سیمی دلال کو ملنے کا زیادہ مشتاق تھا لیکن سیمی کے متعلق سن کر بہت صدمہ ہوا۔ سیمی نے دلالی چھوڑ کر جوے کا دھندا شروع کیا تھا اور اچھی خاصی کمائی کرنے لگا تھا حتیٰ کہ اس نے ایک نوجوان لڑکی سے شادی بھی کر لی لیکن ایک صبح وہ اپنے بستر پر مردہ پایا گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت اس کی جیبوں میں25 ہزار ڈالر تھے (لوگوں کو شاید اتنی رقم کے ہونے کے اعتبار نہ آئے لیکن میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں 1964ء میں شکاگو کے ایک جوئے خانے کا مالک لارنس ویکفیلڈ اپنے گھر میں مردہ پایا گیا اور اس کے گھر سے بوریوں اور تھیلوں میں بھری ہوئی 7 لاکھ 60 ہزار ڈالر کی رقم برآمد ہوئی... اور اس کے باوجود سیاہ فاموں کو اپنی غربت کی وجہ سمجھ نہیں آئی)۔

سیمی کے بعد میں نے ایک ایک شراب خانے سے ویسٹ انڈین آرچی کا پتہ کیا۔ نہ تو اس کے مرنے کی اطلاع تھی نہ کہیں اور جانے کی لیکن کسی کو اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ عام طور پر ایسے پیشے سے وابستہ لوگوں کی موت گولی، چھری، زہر، نشے، بیماری، دیوانگی یا شراب خوری کسی بھی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ وہ بھی ایسے ہی کہیں مر گیا ہو گا۔ کئی ایسے لوگ بھی ملے جو اپنے وقت میں سخت جان بھیڑیئے اور لگڑ بگے تھے مگر اب کسمپرسی کی زندگی جی رہے تھے۔ اپنی تمام تر سمجھ داری کے باوجود وہ اس لیے پس ماندہ تھے کیونکہ وہ غریب، جاہل اور غیر تربیت یافتہ سیاہ فام تھے۔ ان میں سے کچھ پیغام رسانی یاد ربانی جیسے چھوٹے کام کرنے پر مجبور تھے۔ میں اللہ کا شکر گزار تھا کہ میں مسلمان ہو گیا اور اس انجام سے بچ گیا۔

انہی لوگوں میں ایک کیڈیلک ڈریک ہوا کرتا تھا۔ موٹا، خوش مزاج، سگار پینے والا اور شوخ لباس پہننے والا سیاہ فام دلال جو میرے بیراگیری کے دنوں میں شام کے وقت باقاعدگی سے "سمالز پیراڈائز" آیا کرتا تھا۔ میں نے اسے بھیڑ

میں بھی پہچان لیا۔ سنا تھا کہ وہ ہیروئن پینے لگا ہے۔ اتنا غلیظ اور بدحال میں نے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ میں تیزی سے اس کے قریب سے گزر گیا کیونکہ اس لڑکے سے مل کر جسے وہ ہر روز ایک ڈالر بخشیش دیا کرتا تھا وہ بھی پریشان ہوتا۔

ویسٹ انڈین آرچی کی تلاش کامیاب رہی۔ دراصل سڑکوں کی جاسوسی کا نظام اتنا ہی عمدہ ہے جتنا ویسٹرن یونین کے لیے ایف بی آئی کا۔ معبد نمبر سات میں جب میں درس سے فارغ ہوا تو ایک اچکا جسے میں نے پانچ ڈالر دیئے تھے میرے پاس آیا اور بتایا کہ ویسٹ انڈین آرچی بیمار ہے اور برونکس میں کرائے کے کمرے میں رہتا ہے۔

میں ٹیکسی لے کر مطلوبہ پتہ پر پہنچا دروازہ آرچی نے ہی کھولا۔ وہ گندے کپڑے پہنے کھڑا مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ آپ نے کبھی کسی ایسے شخص کا بھوت دیکھا ہے جسے آپ نے اچھے دنوں سے یاد رکھا ہو۔ اسے قبول کرنے میں میرے ذہن کو کچھ لمحے لگے۔ اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا "ریڈ! تمہیں مل کر بہت خوشی ہوئی۔" میں اسے گلے ملا اور اسے سہارا دے کر اندر لے گیا۔ وہ بستر کے سرے پر اور میں موجود واحد کرسی پر بیٹھ گیا اور اسے بتایا کہ اس کے خوف سے ہارلم چھوڑنے نے کس طرح میری زندگی بچا لی اور میں اسلام کی طرف راغب ہوا۔

اس نے بتایا کہ وہ مجھے پسند کرتا تھا کہ اور مجھے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ سوچ کر مجھے آج بھی جھرجھری آ جاتی ہے کہ ہم ایک دوسرے کی جان لینے کے کتنے قریب تھے۔ جوئے والے جھگڑے میں ہم دونوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور ایک دوسرے کو ماضی کی فضول باتیں دہرانے سے منع کیا۔ وہ بار بار مجھے کہتا رہا کہ مجھ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔

میں نے آرچی کو ایلیا محمد کی تعلیمات کے بارے میں کچھ بتایا اسے غریب سیاہ فاموں کا استحصال کرنے والے سفید فام معاشرے کے متعلق بتایا اور کہا کہ میں اکثر جیل میں بھی سوچتا تھا کہ تم جیسا ذہین آدمی جو ہر روز سینکڑوں عددی امتزاج ذہن میں رکھ سکتا ہے اس کی خدمات تو ریاضی اور سائنس جیسے مضامین کے لیے لی جانی چاہئیں "ہاں ریڈ تمہاری بات تو قابل غور ہے" اس نے مجھ سے کہا لیکن ہم دونوں جانتے تھے کہ آرچی کا انجام قریب ہے۔ میں اس کے ماضی اور موجودہ حالت کا موازنہ کر کے بہت دکھی ہوا۔ میرے پاس زیادہ رقم نہیں تھی اور جو تھوڑی سی رقم میں نے اسے پیش کی وہ لینا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے اسے قائل کر ہی لیا۔ جون 1954ء میں نیویارک کا معبد نمبر7 ایک دکان کے بیرونی حصے میں واقع تھا اور مسلمانوں کی تعداد اتنی تھی کہ ایک بس بھی نہیں بھرتی تھی اور ہماری

ہارلم کی بستی میں یہ تعداد کوئی ہزار کے قریب ہو گی باقی لوگوں کو ہم سے کوئی غرض نہ تھی۔ جس طرح جیل سے باہر پورے امریکہ کے سفید فاموں میں شاید 5 سو بھی آدمی نہ ہوں جو ہمارے وجود سے آگاہی رکھتے ہوں۔

میں نے نیویارک کے اراکین اور دوستوں میں ایلیا محمد کی تعلیمات بڑے شد و مد سے پھیلانا شروع کر دیں لیکن ہر اجلاس کے بعد میری پریشانی بڑھتی جاتی۔ غربت کے مارے جاہل اور پسماندہ سیاہ فام جن کے ہر مسئلے کا حل اسلام میں تھا میری باتیں سن کر بھی متاثر نہ ہوتے اور جب میں آخر میں پوچھتا کہ ایلیا محمد کی پیروی کون کون کرنا چاہتا ہے تو صرف دو یا تین لوگ کھڑے ہوتے اور کبھی کبھی تو اتنے بھی نہیں۔

مجھے اپنی بے چارگی پر بہت غصہ آتا۔ میں اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے بہت غور کرتا اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہارلم کے مصروف علاقے میں ہماری آواز کو بھی اٹھنے والی عدم اطمینان جیسی دوسری آوازوں جیسا سمجھ لیا گیا تھا کیونکہ مختلف قوم پرست گروہ اور ان کے مبلغین اپنے پیروکار بڑھانے کے لیے دن رات کام کر رہے تھے۔ میں سیاہ فاموں کی آزادی اور اتحاد کے علم بردار گروہوں کا مخالف نہیں تھا لیکن ان کی وجہ سے ایلیا محمد کی آواز ان تک پہنچانا مشکل ہو گیا تھا۔

اس مسئلے پر قابو پانے کے لیے پہلے پہل میں نے پمفلٹ چھپوائے ہارلم میں چند دیگر مسلمان بھائیوں کے ہمراہ اہم جگہوں پر پمفلٹ بانٹنے کا کام شروع کیا۔ ہم کسی بھی سیاہ فام آدمی یا عورت کے سامنے راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے اور اسے مجبوراً پمفلٹ قبول کرنا پڑتا یا اگر وہ ہچکچاتے تو ہم اسے کہتے "خدا کے لیے غور کرو کس طرح سفید فام نے سیاہ نسل کو لوٹا۔ اغواء اور بے آبرو کیا ہے۔" یا اسی طرح کوئی اور توجہ طلب جملہ بولتے۔

اس کے بعد ہم نے قوم پرستوں کے اجلاسوں میں جانا شروع کر دیا۔ ان اجلاسوں میں ہر شخص سیاہ فام نسل کے انقلاب کی بات سننے میں دلچسپی رکھتا تھا ہمیں زیادہ اچھے نتائج ملنا شروع ہو گئے۔ ہم ہینڈ بل لوگوں میں بانٹتے جن پر تحریر ہوتا "بھائیو ہماری بات سننے کے لیے بھی آئو عزت مآب ایلیا محمد سیاہ فاموں کی روحانی ذہنی اخلاقی معاشی اور سیاسی بیماریوں کا علاج جانتے ہیں۔"

ہمیں اپنے اجلاسوں میں نئے چہرے دکھائی دینے لگے پھر ہم نے دریافت کیا کہ "ماہی گیری" کے لیے بہترین جگہ "عیسائی گرجا گھر" ہیں۔

اتوار کے روز ہم اپنا اجتماع دوپہر دو بجے منعقد کرتے کیونکہ پورے ہارلم میں اس روز گرجا گھر کی سروسز لگ بھگ اسی وقت ختم ہوتی تھیں۔ ہم ذرا بڑے گرجا گھروں کو نظر انداز کر دیتے تھے کیونکہ ان میں متوسط طبقہ کے سیاہ فام ہوتے تھے جو دکھاوے اور "سٹیٹس" کے احساس میں شرابور ہوتے تھے اور دکان کے بیرونی حصہ میں واقع معبد میں آنا پسند نہ کرتے۔

گرجا گھروں سے آنے والے زیادہ تر جنوب کے مہاجر ہوتے جن میں زیادہ بوڑھے ہوتے تھے جو "اچھی تبلیغ" سننے کہیں بھی چلے جاتے تھے۔

ہو سکتا ہے آپ کے علم میں ہو کہ عیسائی تعلیمات تفریحی انداز میں غریب سیاہ فاموں تک پہنچانے کا ایک پورا سرکٹ قائم تھا۔ گرجا گھروں کے باہر چندہ جمع کرنے کے لیے سستے کھانوں کی فروخت کے اشتہار آویزاں کئے جاتے تھے اور اگلے اتوار کے لیے گٹار اور طنبورے پر مذہبی تعلیمات کی طرزیں بنائی جاتی تھیں۔ بہن روزیٹا تھارپ اور کلاراوارڈ نامی گلوکار کافی شہرت رکھتے تھے۔ ان میں سب سے مشہور مہالیا جکسن تھی جو ایک مبلغ کی بیٹی تھی اور لوزی آنا کی رہنے والی تھی۔ وہ اپنی گزر بسر کے لیے شکاگو آئی تھی جہاں وہ سفید فام لوگوں کے گھروں میں پکائی دھلائی کا کام کرنے کے بعد فیکٹری میں کام کرتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ نیگرو گرجا گھروں میں مذہبی بھجن بھی گاتی تھی۔ سفید فام لوگوں تک شہرت پہنچنے سے قبل وہ پہلی سیاہ فام تھی جو نیگروز میں اتنی مشہور ہوئی کہ اس کے ریکارڈ سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوتے تھے۔ اس کا اپنا کہنا تھا کہ اسے جب بھی موقع ملتا ہے وہ جھونپڑیوں میں واقع گرجا گھروں کے نیگروز کے ساتھ گانا پسند کرتی ہے۔ جس سے اس کی روح کو تسکین ملتی ہے۔

جن سیاہ فام عیسائیوں کو ہم اپنے معبد تک گھیر کر لاتے جب انہیں یہ بتایا جاتا کہ جس سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والے خدا کی وہ عبارت کر رہے ہیں وہ ان کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے تو وہ بہت حیران ہوتے کبھی کبھی میں اتنا جذباتی ہو جاتا کہ مجھے اپنی بات کی وضاحت کرنا مشکل ہو جاتی۔

"بہنوں اور بھائیو! تم میرے آنسو دیکھ رہے ہو جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میں آج تک نہیں رویا لیکن جب میں آپ کو بتائوں کہ اس سفید فام کے مذہب نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے تو میرا اپنے آنسوئوں پر اختیار نہیں رہتا۔ بہنوں اور بھائیو! اگر میں تم سے کہوں کہ ہم آج تک غلط مذہب کی پیروی کرتے آئے ہیں تو پریشان مت ہونا۔ ہم یہی سمجھتے رہے ہیں کہ ہمارے لیے کوئی مذہب نہیں ہے، یعنی سیاہ فاموں کے لیے خاص مذہب۔

لیکن ایسا مذہب ہے، اس کا نام اسلام ہے۔ میں اس کے ہجے کر دیتا ہوں۔ ا۔ س۔ ل۔ ا۔ م! اسلام لیکن اسلام کے متعلق میں بعد میں بتاؤں گا پہلے عیسائیت کے بارے چند چیزیں سمجھ لیں تاکہ ہم جان سکیں کہ ہمارے مسائل کا حل اسلام کیوں ہے؟

بہنوں اور بھائیو! سفید فام نے ہمارے دماغ دھو ڈالے تاکہ ہماری نگاہ سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والے عیسیٰؑ پر مرتکز رہے۔ ہم ایسے عیسیٰؑ کی پرستش کر رہے ہیں جو ہم جیسا دکھائی بھی نہیں دیتا۔ اب آپ اسلام کے مبلغ ایلیا محمد کی تعلیمات سنئے۔ سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والے سفید فام نے ہمیں سفید عیسیٰؑ کی پرستش سکھائی اور اپنے خدا کی حمد پڑھنا اور گانا سکھایا۔ ہمیں سکھایا گیا کہ ہم اس وقت تک یہ حمد پڑھتے گاتے رہیں جب تک کہ مر نہ جائیں اور اگلے جہاں کی تصوراتی جنت کا اپنی موت تک انتظار کریں۔ جب کہ سفید فام کے لیے دودھ اور شہد کی نہریں ان پختہ گلیوں میں بہہ رہی ہیں جو طلائی ڈالرز سے اس دنیا میں بنی ہیں۔

اگر آپ کو میرے کہے پر یقین نہ آئے تو جایئے اور جا کر اس جگہ کو غور سے دیکھیے جہاں آپ رہتے ہیں اپنے آپ کو اور اپنے اردگرد کے لوگوں کو دیکھیے۔ آپ کو یقین آ جائے گا اور یہ محض بدقسمتی کا معاملہ نہیں ہے۔ جب اپنے آپ کو دیکھ چکیں تو پھر سنٹرل پارک میں جا کر دیکھیے کہ سفید خدا نے سفید فاموں کو کیا کچھ عطا کیا ہے؟ سفید فاموں کا طرز زندگی دیکھیے ان کے گھروں کو دیکھیے لیکن وہاں زیادہ دیر رکیئے گا نہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آپ زیادہ دیر رک ہی نہیں سکیں گے کیونکہ دربان آپ کو ”چلتے بنو“ کا حکم دے دے گا۔ شہر کے مرکز میں جا کر ان کی رہائشیں اور کاروبار دیکھیے ”مین ہیٹن“ جزیرے کو دیکھیں جسے اس شیطان صفت سفید فام نے بھروسہ کرنے والے انڈینز سے 24 ڈالر میں ہتھیا لیا تھا۔ اس کے سٹی ہال کو ”اس کی وال اسٹریٹ کو‘ اپنے آپ کو اور اس کے خدا کو دیکھو!۔“

میں نے ابتداء میں ہی یہ بات سیکھ لی تھی کہ لوگوں سے اس زبان میں بات کرو جو وہ سمجھتے ہوں۔ جس طرح قوم پرست گروہوں میں تقریباً تمام مرد ہوتے تھے اسی طرح گرجا گھر جانے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہوتی تھی۔ میں خطاب کے دوران اس پہلو کو بھی پیش نظر رکھتا۔ ”خوبصورت سیاہ خواتین! عزت مآب ایلیا محمد ہمیں بتاتے ہیں کہ سیاہ فام آدمی کو اس وقت تک عزت حاصل نہیں ہو گی جب تک وہ اپنی عورتوں کی عزت نہیں کرے گا۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاہ فام اٹھ کھڑے ہوں اور ان کمزوریوں کو اٹھا کر پرے پھینک دیں جو سفید فام آقا نے اس پر مسلط کر رکھی ہیں۔ سیاہ فام مردوں کو چاہیے کہ وہ آج ہی سے اپنی عورتوں کو پناہ، تحفظ اور عزت دینا

شروع کر دیں۔ تم میں سے کتنے ہیں جو میری بات سے اتفاق کرتے ہیں؟" یہ سن کر تقریباً سو فیصد لوگ کھڑے ہو گئے لیکن جب میں نے یہ سوال کیا کہ "کیا کھڑے ہوئے لوگ عزت مآب ایلیا محمد کی پیروی کرنا چاہیں گے؟"

تو صرف چند لوگ ہی کھڑے ہوئے۔

مجھے علم تھا کہ یہ لوگ ہمارے سخت اخلاقی نظم و ضبط سے بھاگتے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے کہا "سفید فام چاہتا ہے کہ سیاہ فام بدکردار، گندا اور جاہل رہے جب تک ہم اس حال میں رہیں گے ہم بھکاری اور وہ مالک بنے رہیں گے۔ ہمیں اس وقت تک آزادی، انصاف اور برابری نہیں ملے گی جب تک ہم اپنے لیے کچھ نہیں کریں گے۔"

لیکن جو ڈانواڈول لوگ مجھے سننے کے لیے آتے تھے وہ "ضابطہ" کے متعلق وضاحت چاہتے تھے۔ "قوم اسلام" میں زنا قطعاً حرام تھا۔ غلیظ سور اور دیگر نقصان دہ غذائیں کھانا ممنوع تھا۔ ہر قسم کے تمباکو، شراب اور منشیات پر پابندی تھی۔ ایلیا محمد کا کوئی پیروکار رقص، جوئے، معاشقوں، فلموں یا کھیلوں میں ملوث نہیں ہو سکتا تھا اور نہ کام سے لمبی غیر حاضری کر سکتا تھا۔ ضرورت سے زیادہ سونے کی اجازت نہ تھی گھریلو جھگڑوں اور بدتہذیبی کی بالخصوص عورتوں کے ساتھ، سخت ممانعت تھی۔ جھوٹ بولنے اور چوری کرنے کی اجازت نہ تھی اور ماسوائے مذہبی معاملات کے سول افسران کی نافرمانی پر بھی پابندی تھی۔ اخلاقی ضابطوں کی نگرانی ہمارے "ثمر اسلام" گروہ کے لوگ کرتے تھے۔ جو باصلاحیت اور تربیت یافتہ مسلم مرد تھے۔ ضابطہ شکنی کی سزا جناب ایلیا محمد قوم سے معطلی یا مختلف عرصہ تک علیحدگی سے دیتے تھے اور اگر جرم بہت گھناؤنا ہوتا تو مجرم کو اپنی قوم سے نکال بھی دیا جاتا تھا۔

معبد نمبر7 کے اراکین ہر اجلاس کے بعد بڑھتے گئے گو اس کی رفتار میری خواہش سے کم تھی۔ سارا ہفتہ میں ٹرین یا بس سے سفر کرتا۔ بدھ کے روز مجھے تعلیم دینے کے لیے فلاڈیلفیا معبد نمبر 12 جانا پڑتا تھا۔ پھر میں سپرنگ فیلڈ میسا چیوسٹس معبد قائم کرنے گیا جسے ایلیا محمد نے تیرھواں نمبر دیا۔ اس معبد کے قیام میں میرے معاون برادر آسبورن ایکس تھے جنہیں پہلی بار اسلام سے میں نے ہی جیل میں متعارف کروایا تھا۔ وہیں ایک خاتون نے اگلی جمعرات مجھے ہارٹ فورڈ آنے کی دعوت دی جہاں وہ کچھ لوگوں سے مجھے ملوانا چاہتی تھی اور میں وہاں پہنچ گیا۔

روایتاً جمعرات گھریلو نوکروں کی چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ اس خاتون کے گھر میں پندرہ کے قریب نوکرانیاں، باورچی شوفرز اور سفید فاموں کے دیگر ملازمین موجود تھے۔ یہ تو آپ نے بھی سن رکھا ہو گا کہ "کوئی شخص اپنے ملازم کے

لیے ہیرو نہیں ہوتا۔" چنانچہ ان نیگروز کو جو سفید فاموں کے ہاتھ دیکھ چکے تھے بات سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور جب یہ لوگ دیگر ملازموں اور ہارٹ فورڈ کے دوسرے سیاہ فاموں تک پہنچے تو ایلیا محمد کو بہت جلد معبد نمبر 14 کھولنا پڑا اور میں نے وہاں تعلیم کے لیے ہر جمعرات جانا شروع کر دیا۔

میں جب بھی شکاگو ایلیا محمد سے ملنے جاتا تو وہ کسی نہ کسی نئے پہلو یا نکتے کو مجھ پر آشکار کرتے۔ میں انہیں احساس دلائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ ان کی تعلیمات سے مسلح وزراء کو زیادہ تیزی کے ساتھ پیغام پھیلانا چاہیے لیکن ان کا تحمل اور دانش میری تیزی کو نرمی میں بدل دیتا۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ حقیقی راہنما اپنے پیروکاروں پر اتنا بوجھ نہیں ڈالتا جو ان کی برداشت سے زیادہ ہو اور نہ ایک حقیقی راہ نما اتنا تیز چلتا ہے کہ اس کو پیروکاروں کو ساتھ دینا مشکل ہو جائے۔

"زیادہ تر لوگ جب ایک آدمی کو پرانی موٹر کار میں آہستہ سفر کرتے دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ وہ تیز چلنا نہیں چاہتا لیکن اس آدمی کو علم ہوتا ہے کہ تیز رفتاری گاڑی کو تباہ کر دے گی۔ جب اسے اچھی گاڑی ملے گی تو وہ اسے تیز بھی چلا لے گا۔" ایک مرتبہ جب میں نے ایک کم کوش وزیر کی شکایت کی تو انہوں نے جواب دیا کہ "میں ایک ناقابل اعتبار تیز گھوڑے پر قابلِ اعتبار خچر کو ترجیح دوں گا۔"

مجھے علم تھا کہ وہ خود بھی تیز گاڑی چلانا چاہتے تھے۔ یہ 1955ء کی بات ہے اور مجھے اس لیے یاد ہے کہ پہلی بار میں نے دور کا سفر کیا تھا۔ اٹلانٹا، جارجیا میں معبد نمبر 15 کھولنے کے لیے۔

جو مسلمان بھی کسی ذاتی غرض سے ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرتا وہ وہاں ایلیا محمد کی تعلیمات کے بیج بھی کاشت کر آتا۔ برادر جیمز ایکس، جو معبد نمبر 12 کے سرکردہ برادران میں سے تھا، اس نے اٹلانٹا میں اتنے لوگوں کی توجہ حاصل کر لی تھی کہ ایلیا محمد نے مجھے اجلاس کی سربراہی کے لیے وہاں بھیجا۔ اگرچہ میرے خیال میں ایلیا محمد کے تمام معابد کے قیام میں میرا ہاتھ رہا ہے مگر میں اٹلانٹا کے معبد کا افتتاح کبھی نہیں بھول سکتا۔

برادر جیمز ایکس کی استطاعت صرف اتنی تھی کہ اس نے اجتماع کے لیے ایک تعزیتی پارلر کرائے پر لے لیا۔ ان دنوں "قوم اسلام" کی معاشی حالت یہ تھی کہ جناب ایلیا محمد سے لے کر نیچے تک سب کے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ایک عیسائی نیگرو کا جنازہ اٹھ ہی رہا تھا ہمیں عزاداروں کے نکلنے تک انتظار کرنا پڑا۔

اندر پہنچ کر میں نے ان سے کہا "آپ نے دیکھا کہ تمام لوگ ایک ایسے شخص کے لیے رو رہے تھے جو جسمانی طور پر مردہ تھا لیکن جو ہمارے سیاہ فام ذہنی طور پر مردہ ہیں قوم اسلام کو ان کی بہت فکر ہے۔ اس بات سے آپ سب کو صدمہ تو ہو گا لیکن شاید آپ کو احساس نہیں ہے کہ امریکہ میں موجود سیاہ نسل ذہنی طور پر مردہ ہو چکی ہے۔ آج ہم یہاں ایلیا محمد کی تعلیمات لے کر آئیں ہیں جو مردوں کو زندگی بخشتی ہیں۔"

یہاں پر یہ بتانا بے جا نہ ہو گا کہ کسی مسلمان کی وفات پر اکٹھے ہونے والے اس کے رشتے دار اور احباب پر ہماری تعلیمات کا عام طور پر خاطر خواہ اثر ہوتا تھا جیسا کہ مسٹر ایلیا محمد کی تعلیمات کے مطابق ہمارے ہاں رائج تھا۔ پہلے میں جنازے پر اللہ کی حمد و ثناء بیان کرتا پھر مرحوم یا مرحومہ کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتا پھر میں عام طور پر جاب (Job) کے باب نمبر 7 اور 14 میں سے دو پیرے پڑھتا جہاں جاب بتاتا ہے کہ "زندگی بعد از موت کا کوئی وجود نہیں ہے دوسرے پیرے میں ڈیوڈ اپنے بیٹے کی وفات پر ہی کہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔"

میں حاضرین کے سامنے وضاحت کرتا کہ کیوں ہمیں آنسو بہانے، پھول چڑھانے، گانے یا ساز بجانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے اپنے بھائی کو اس کی زندگی میں ہی آنسوئوں اور موسیقی کا نذرانہ پیش کر دیا تھا۔ اگر اس وقت اسے پھول اور موسیقی پیش نہیں کی گئی تو اب اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ وہ ان چیزوں سے آگاہی نہیں رکھتا لہٰذا اب ان چیزوں پر اٹھنے والی رقم اس کے خاندان کو پیش کریں گے۔ مخصوص معلم بہنیں پھرتی کے ساتھ چھوٹی طشتریوں میں چھوٹی چھوٹی پودینے کی گولیاں پیش کرتیں۔ میرے اشارے پر یہ گولیاں حاضریں اپنے منہ میں رکھ لیتے اور میں کہتا اب ہم قطار بنا کر اپنے بھائی کی آخری جھلک دیکھیں گے لیکن ہم روئیں گے نہیں۔ جس طرح ہم اس گولی کے لیے نہیں روتے جیسے یہ میٹھی گولی ہمارے منہ میں گھل گئی اسی طرح ہمارا بھائی جس کی مٹھاس سے ہم اس کی زندگی میں محظوظ ہوئے اب ہماری یادوں میں گھل کر ہمیں مٹھاس بخشتا رہے گا۔"

مجھے لگ بھگ دو سو مسلمانوں نے بتایا کہ وہ جنازے کے وقت میری تقریر سن کر اللہ کی طرف رجوع ہوئے لیکن بعد میں مجھے علم ہوا کہ موت اور تجہیز و تدفین کے متعلق ایلیا محمد کی تعلیمات مشرق میں رائج اسلامی تعلیمات کے قطعی برعکس ہیں۔

1956ء تک آتے آتے ہماری تعداد کافی بڑھ گئی تھی اور ہر معبد کی کامیاب کاوش سے مسلمانوں کی تعداد بالخصوص ڈیٹرائیٹ، شکاگو اور نیویارک جیسے بڑے شہروں میں اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ دوسرے لوگ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے

تھے۔ دراصل اگر بڑے شہروں میں ایک بڑی تنظیم بغیر عوامی مظاہرے اور شور کے وجود رکھتی ہو تو یہ ممکن ہے کہ دوسرے لوگ اس کے وجود سے ناواقف ہوں۔

تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ ایلیا محمد کا اسلام کچھ دوسری طرح کے سیاہ فاموں تک بھی پہنچنے لگا۔ اب ہم نے پڑھے لکھے کاروباری اور دیگر پیشوں سے وابستہ لوگوں تک یہ پیغام پہنچانا شروع کیا۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو سفید دنیا میں کچھ "مقام" بھی رکھتے تھے مثلاً کچھ سول سرونٹس، نرسیں، کلرک، ملازمین اور ڈیپارٹمنٹ سٹورز کے کچھ سیلزمین اور اس ساری صورتحال میں اہم بات یہ تھی کہ کچھ لوگ ایلیا محمد کے لیے بڑے ذہین، ہوشیار اور فعال وزرا ثابت ہو رہے تھے۔

"قوم اسلام" کی تعمیر کی کوششوں میں میں اتنا منہمک تھا کہ اپنی نیند بھی پوری نہیں کر پاتا تھا۔ 1956ء میں ایلیا محمد نے معبد نمبر7 کے وزیر کے طور پر مجھے نئی شیورلیٹ استعمال کی اجازت دی (یہ کار قوم کی تھی میری ذاتی نہیں تھی میرے پاس سوائے اپنے کپڑوں، کلائی کی گھڑی اور سوٹ کیس کے اور کچھ نہیں تھا۔ قوم کے دیگر وزراء کی طرح مجھے تھوڑی سی رقم اپنی گزر بسر اور جیب خرچ کے لیے ملتی تھی۔ ایک وقت تھا جب میں نے پیسے کے لیے کون کونسا کام تھا جو نہیں کیا تھا لیکن اب پیسے کا خیال بھی میرے ذہن میں نہیں آتا تھا) بہرحال ایلیا محمد نے گاڑی کے متعلق اطلاع دیتے ہوئے مجھے کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ مجھے نئے مسلمانوں کے لیے ان کی تعلیمات پھیلانے اور نئے معبد قائم کرنے کا کتنا شوق ہے۔

پانچ ماہ کے اندر میں نے "ماہی گیری" کے لیے اس کار پر تیس ہزار میل کا سفر کیا، ایک رات دیر گئے میں ایک بھائی کے ساتھ ویدرز فیلڈ کنکٹی کٹ میں سفر کر رہا تھا جب ایک سرخ اشارے پر میں نے گاڑی روکی تو ایک دوسری کار نے پیچھے سے میری کار کو ٹکر مار دی۔ میں زخمی تو نہیں ہوا لیکن اچھا خاصا ہل گیا۔ وہ شیطان ایک عورت کے ساتھ کار میں سوار تھا وہ عورت اپنا چہرہ چھپا رہی تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اس کی بیوی نہیں ہے۔ کچھ دیر میں پولیس آ گئی لیکن ان کے رویئے سے احساس ہوتا تھا کہ وہ کوئی اہم شخصیت ہے۔ بعد میں مجھ پر کھلا کہ وہ کنکٹی کٹ کا انتہائی اہم سیاست دان تھا۔ جرمانے کی رقم اولڈز موبائل نامی کار پر صرف ہو گئی جو ہمیشہ سے میرے استعمال میں تھی۔

میں ہمیشہ مسلم بہنوں سے قریبی ذاتی تعلقات بڑھانے سے احتراز کرتا تھا۔ میری تمام تر وابستگی اسلام کے ساتھ تھی تقریباً ہر معبد میں کم از کم ایک بہن نے مجھے اشارۃً کہا کہ مجھے ایک بیوی کی ضرورت ہے لیکن میں نے واضح کر دیا کہ میری مصروفیت اس قدر زیادہ ہے کہ مجھے شادی وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

ہر ماہ جب میں شکاگو جاتا تو ایلیا محمد کے پاس کسی نہ کسی بہن کا شکایتی خط پڑا ہوتا جس میں کہا گیا ہوتا کہ مرد عورت کے رویوں پر تعلیمات دیتے ہوئے میرا لہجہ کافی سخت ہو جاتا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس میں خواتین کے متعلق بڑے سخت اصول و ضوابط ہیں جن کی بنیاد یہ ہے کہ مرد فطرۃً قوی اور عورت فطرۃً کمزور ہے۔ مرد کو ہمیشہ عورت کی عزت کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے اپنی عزت کروانے کے لیے اس پر اپنا اختیار بھی رکھنا چاہیے۔

لیکن ان دنوں میری ذاتی وجوہات کچھ اور تھیں جس کی وجہ سے عورت سے محبت کرنا ممکن نہیں تھا۔ عورتوں کے سابقہ تجربہ کی بنیاد پر میرا خیال تھا کہ عورت مکار، دھوکے باز اور ناقابل اعتبار ہوتی ہے۔ میں نے بہت سارے مردوں کو دیکھا تھا جو عورت کے ہاتھوں برباد ہوئے یا کم از کم پستی میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ عورتیں بولتی بہت ہیں ان کو خاموش رہنے کی تلقین کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ جیسی جیمز کو بندوق کے بغیر رہنے یا مرغی کو نہ کڑکڑانے کی تلقین کرنا اور اگر کوئی شخص میری طرح کسی قسم کے قائدانہ مقام پر بھی ہو تو غلط عورت کا انتخاب اس کے لیے بے حد نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے حتیٰ کہ "سیمسن" دنیا کا طاقتور ترین آدمی بھی اس عورت کے ہاتھوں تباہ ہوا تھا جو اس کی بانہوں میں سویا کرتی تھی۔ اس عورت کے الفاظ نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔

مختصر یہ کہ اس میدان میں میرا تجربہ بہت زیادہ تھا۔ میں بہت سی طوائفوں اور داشتاؤں سے واقف تھا۔ جو بیویوں کی نسبت ان کے شوہروں کو زیادہ اچھی طرح جانتی ہیں کیونکہ بیویاں صرف شکایتوں سے شوہر کے کان کھاتی رہتی ہیں صرف طوائف یا داشتہ ہی کسی شوہر کے دلی راز یا اس کے مسائل توجہ سے سنتی ہے۔ وہ اس کا خیال رکھتی ہیں۔ اس کو آرام پہنچاتی ہیں اس کی باتیں سنتی ہیں اور مرد دل کھول کر ان کے آگے رکھ دیتا ہے۔ دس سال ہوئے میں نے محبوبہ کا خیال بھی دل سے نکال دیا تھا اور اب وزیر بننے کے بعد میں نے بیوی کے متعلق سوچنا بھی مزید کم کر دیا تھا۔ خود ایلیا محمد مجھے مجرد رہنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔

معبد نمبر7 کی بہنیں دیگر برادران کو کہتی رہتی تھیں کہ "تم سب اس لیے مجرد رہتے ہو کیونکہ برادر وزیر میلکم کبھی کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔"

میں نے اپنے خیالات کسی سے نہیں چھپائے تھے خصوصاً بہنوں سے اور میں دیگر بھائیوں کو بھی بے حد احتیاط کا مشورہ دیتا تھا۔

1956ء میں بہن ”بیٹی۔ ایکس“ نے معبد نمبر7 میں شمولیت اختیار کی میں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، ایک سال بعد مجھے اس میں دلچسپی محسوس ہوئی، وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ میں اس میں دلچسپی تو کجا اس کا نام بھی جانتا ہوں گا۔ وہ لمبے قد اور مجھ سے بھی گہرے بھورے رنگ کی تھی اس کی آنکھیں بھی بھوری تھیں۔ مجھے خبر تھی کہ وہ ڈیٹرائٹ کی رہائشی ہے اور ”الاباما“ میں ”ٹس کیگی انسٹی ٹیوٹ“ کی طالبہ رہ چکی ہے۔ وہ نیویارک کے ایک ہسپتال کے نرسنگ سکول میں تھی اور مسلمان لڑکیوں کو صحت اور طب کی معلومات دیتی تھی۔

وضاحتاً عرض کر دوں کہ ہفتے میں ہر روز مسلمانوں کے لیے مختلف کلاسوں کا اہتمام ہوتا تھا۔ سوموار کی رات ”ثمر اسلام“ کی تربیتی کلاس ہوتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں صرف عسکری تربیت از قسم ورزش، جوڈو، کراٹے وغیرہ دی جاتی تھی جو ایف او آئی (Fruit of Islam) کا صرف ایک جزو تھا۔ علاوہ ازیں شخصی تربیت کے لیے لیکچرز اور مباحثوں پر بھی یکساں توجہ دی جاتی تھی۔ انہیں شوہر اور باپ کی ذمہ داریاں، عورتوں کے فرائض اور ان کے حقوق، گھر میں مرد کی بطور والد حاکمیت وغیرہ بتائی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ روزمرہ کے معاملات جن میں ایمان داری اور پاکیزگی کی گھر، گروہ، ملکی اور قومی سطح پر چوبیس گھنٹوں میں اہمیت اور کاروباری اصول وغیرہ بھی پڑھائے جاتے تھے۔

منگل کو ہر مسلم معبد میں ”شب اتحاد“ منائی جاتی تھی۔ جن میں بہن بھائی مل کر گفتگو اور لوازمات مثلاً بسکٹ، مٹھائی اور پھلوں کے رس سے لطف اندوز ہوتے۔ بدھ کی رات آٹھ بجے ”طالب علموں کا داخلہ“ (Student Enrollment) ہوتا۔ اس رات اسلام کے بنیادی موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ یہ کیتھولک مذہب کی "Catechism Class" (سوال و جواب کا سلسلہ) سے مشابہ ہوتی تھی۔ جمعرات کو ایم جی ٹی (Muslium Girl's Training) ”مسلم لڑکیوں کی تربیت“ اور جی سی سی (General Civilization Class) ”عمومی تہذیبی جماعت“ ہوتی تھیں۔ جن میں مسلم عورتوں اور لڑکیوں کو گھرداری، بچوں کی پرورش، شوہروں کی دیکھ بھال، پکائی، سلائی، اندرون و بیرون خانہ رویہ اور اسی قسم کی دوسری باتیں سکھائی جاتیں جو مسلم بہن، ماں اور بیوی کے لیے ضروری ہیں۔

جمعہ کو ہمیشہ ”شب تہذیب“ (Civilization Night) ہوتی جس میں بہنوں اور بھائیوں کو خانگی تعلقات کی تعلیم دی جاتی۔ زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے صحیح مزاج آشنا ہو جائیں۔ ہفتہ کی شب چھٹی

ہوتی تھی۔ اس شب سب مسلمان ایک دوسرے کے گھروں میں ملاقات کے لیے جاتے اور اتوار کو ہر مسلم معبد میں عبادت ہوتی تھی۔

جمعرات کو ایم جی ٹی اور جی سی سی کی کاسوں میں کبھی کبھی میں بھی جا نکلتا جیسا کہ دیگر کلاسوں میں چلا جاتا تھا۔ میں بہن ”بیٹی۔ ایکس“ سے پوچھتا کہ ”تعلیم کیسی چل رہی ہے؟ بہنیں کیسا سیکھ رہی ہیں؟“ اور وہ جواباً کہتی ”برادر وزیر! سب ٹھیک ہے۔“ میں اس کا شکریہ ادا کرتا اور بس، کچھ عرصہ بعد میں اس سے دوستانہ انداز میں مختصر گفتگو بھی کرنے لگا۔

ایک روز میں نے اسے میوزیم آف نیچرل ہسٹری لے جانے کا سوچا کہ شاید اس سے تعلیمی حوالے سے کچھ بہتری ہو۔ میں اسے میوزیم میں زیر نمائش ”شجر ارتقائ“ دکھانا چاہتا تھا جس کا مقصد ایلیا محمد کی تعلیمات کی سچائی ثابت کرنا تھا کہ سور ایک بڑا غلیظ گوشت خور جانور ہے۔ اس لیے اسے چوہے، بلی اور کتے کے گروہ میں دکھایا گیا ہے۔ میں نے یہ خیال بہن بیٹی ایکس کے سامنے اس کے مقصد سمیت رکھ دیا مجھے خود بھی یقین تھا کہ میرا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہے۔

لیکن سہ پہر کے مقررہ وقت پر میں نے اسے فون کر کے کہا کہ ایک ضروری کام کی وجہ سے میرا آنا مشکل ہے چنانچہ پروگرام منسوخ کیا جاتا ہے۔ اس نے جواباً کہا کہ ”آپ نے بتانے میں کافی دیر کی میں تو بس نکل ہی رہی تھی۔“ اس پر میں نے کہا ”اچھا میں جیسے تیسے کر کے آ جاتا ہوں لیکن میں زیادہ وقت نہیں دے پاؤں گا۔“

دوران سیر میں نے اس کے خیالات جاننے کے لیے اس سے بہت سی باتیں پوچھیں، میں اس کی ذہانت اور تعلیم سے کچھ متاثر بھی ہوا۔ ان دنوں ہمارے پاس ایسے بہت کم لوگ تھے جو کالج میں پڑھ چکے ہوں۔

بعد میں ایک بوڑھی بہن نے مجھے ”بہن بیٹی ایکس“ کے ایک ذاتی مسئلہ کے متعلق بتایا تو میں حیران ہوا کہ خود اس نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ نوجوان وزراء ہمہ وقت ان نوجوانوں کے مسائل سننے کے عادی تھے جنہیں ان کے والدین مسلمان ہونے کی پاداش میں عاق کر دیتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ جب ”بہن بیٹی ایکس“ نے اپنے منہ بولے والدین کو جو اس کے تعلیمی اخراجات اٹھا رہے تھے، بتایا کہ وہ مسلمان ہو گئی ہے تو انہوں نے اس کو کہا کہ یا تو مسلمانوں کو چھوڑ دو یا پھر نرسنگ سکول کی تعلیم چھوڑ دو۔ اس کی تعلیمی مدت ختم ہونے والی تھی لیکن وہ اسلام سے وابستہ رہی۔ اس نے ہسپتال میں رہائش پذیر ڈاکٹروں کے بچوں کی دیکھ بھال کا کام شروع کر دیا۔

میں بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ میں بہت دیر تک اس مسئلہ پر غور کرتا رہا کہ شادی کے متعلق سوچنا کیسا رہے گا؟ ویسے تو کسی بھی معبد کی بہن اس مقصد کے لیے منتخب کی جا سکتی تھی لیکن بہن بیٹی ایکس قدو قامت اور عمر کے اعتبار سے زیادہ موزوں محسوس ہوتی تھی۔

ایلیا محمد کا کہنا تھا کہ طویل قامت کے مرد کو پست قامت عورت سے یا اس کے علی الرغم شادی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ ایسا جوڑا بہت عجیب لگتا ہے۔ ان کا فرمان تھا کہ بیوی کی مثالی عمر شوہر کی عمر سے نصف جمع سات سال ہوتی ہے کیونکہ عورتیں جسمانی اعتبار سے مرد سے آگے ہوتی ہیں۔ اگر بیوی شوہر کی عزت نہ کرے تو شادی کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ مرد کو ہر طرح سے اپنی برتری قائم رکھنی چاہیے تاکہ عورت اسے اپنا نفسیاتی محافظ تسلیم کرے۔

مجھے خود بھی اپنے خیالات پر حیرانی ہوئی اور میں بہن بیٹی ایکس کے آس پاس ہونے سے احتراز کرنے لگا۔ اگر میں کسی ریسٹورنٹ میں ہوتا اور بہن بیٹی ایکس وہاں آ جاتی تو میں باہر نکل جاتا تھا۔ مجھے صرف یہ اطمینان تھا کہ اسے میرے خیالات کا علم نہیں ہے۔ میرے اس اجتناب کا اسے کوئی خاص احساس بھی نہیں ہوا کیونکہ میں پہلے ہی لیئے دیئے رہتا تھا۔

اب میں نے سوچنا شروع کیا کہ اگر میں اس سے بات کروں تو اس کا کیا ردعمل ہو گا؟ میں نے اس معاملے میں کئی آدمیوں کو ذلیل اور شرمندہ ہوتے دیکھا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھوں کسی قسم کی پریشانی مول لوں۔

مجھے اس کا بھی علم تھا کہ اس کے رشتہ دار بہت کم ہیں کیونکہ میں سسرالیوں کو اچھوت سمجھتا ہوں۔ معبد نمبر7 میں میں نے کئی شادیاں محض مسلمان مخالف رشتہ داروں کی وجہ سے تباہ ہوتے دیکھی تھیں۔

میں اس سے اس قسم کی رومانی گفتگو بھی نہیں کرنا چاہتا تھا جو لوگوں کے ذہنوں میں ہالی ووڈ اور ٹیلی ویژن نے بھر رکھی ہے۔ لہٰذا اگر مجھے کچھ کہنا تھا تو سیدھے اور صاف لفظوں میں کہنا تھا۔ میں سنی ہوئی، پڑھی ہوئی یا کسی فلم میں دیکھی ہوئی بات نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنے انداز میں کرنا چاہتا تھا۔

جب میں نے شکاگو کے دورے کے دوران اس سنجیدہ اقدام کے متعلق ایلیا محمد کو بتایا تو وہ مسکرا دیئے۔ میں نے وضاحت کی کہ میں صرف سوچ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس بہن سے ملنا چاہیں گے۔ "قوم" اب معاشی طور پر اس قابل ہو چکی تھی کہ مختلف معبدوں میں تربیت دینے والی بہنوں کو شکاگو کے معبد نمبر دو میں ہونے والی خواتین کی جماعت میں شرکت کے لیے بھیجا جا سکے تاکہ وہ ہیڈ کوارٹر میں ایلیا محمد سے ذاتی طور پر بھی مل لیں۔ چونکہ بہن

بیٹی ایکس اس سارے عمل سے واقف تھی لہٰذا جب اس کو شکاگو بھیجنے کی بات ہوئی تو اس نے کسی حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔ اسے دیگر جزو وقتی تربیت دینے والی مہمانوں کی طرح ایلیا محمد اور کلارا محمد کے گھریلو مہمان کے طور پر رکھا گیا۔ جناب ایلیا محمد نے بعد ازاں مجھے بتایا کہ انہوں نے بھی بہن بیٹی ایکس کو پسند کیا۔

ایک اتوار کی شب معبد نمبر 7 میں اجتماع کے بعد میں نے گارڈن اسٹیٹ پارک وے کے راستے پر گاڑی ڈالی۔ میں ڈیٹرائٹ میں اپنے بھائی ولفرڈ سے ملنے جا رہا تھا جسے ایک سال قبل 1957ء میں ڈیٹرائٹ کے معبد نمبر ایک کا وزیر بنا دیا گیا تھا اور کافی مدت سے میں اسے یا اپنے خاندان کے دیگر لوگوں سے نہیں ملا تھا۔

صبح تقریباً دس بجے میں ڈیٹرائٹ پہنچا۔ ایک پٹرول پمپ سے پٹرول ڈلوا کر میں نے دیوار پر نصب پے فون سے بہن بیٹی ایکس کا نمبر ملایا۔ کسی نے اسے بلوا دیا اور اس نے کہا "اوہ ہیلو! برادر وزیر" میں نے چھوٹتے ہی اس سے کہا "دیکھو کیا تم شادی کرنا چاہتی ہو؟"

فطری طور پر اس نے حیرانی اور پریشانی کا اظہار کیا لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ وہ اداکاری کر رہی تھی کیونکہ عورتوں کو پہلے سے پتہ ہوتا ہے۔ اس نے میری توقع کے عین مطابق "ہاں" کہہ دیا۔ میں نے جواباً اس سے کہا کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے تم جہاز سے ڈیٹرائٹ پہنچ جائو۔

چنانچہ وہ جہاز میں ڈیٹرائٹ پہنچ گئی۔ میں اس کے رضاعی والدین سے ملا جو ڈیٹرائٹ میں ہی تھے۔ وہ ذہنی طور پر مجھے قبول کر چکے تھے اور مجھ سے مل کر انہیں خوشگوار حیرت ہوئی یا کم از کم انہوں نے ایسا ظاہر کیا۔ پھر میں نے بہن بیٹی ایکس کو اپنے سب سے بڑے بھائی ولفرڈ کے اہل خانہ سے ملوایا۔ میں نے اس سے ایسی جگہ کے متعلق پوچھا جہاں مزید تاخیر اور دھوم دھڑکے کے بغیر شادی ہو سکے اس نے مجھے انڈیانا کے متعلق بتایا۔

اگلی صبح میں نے بیٹی کو اس کے والدین کے ہاں سے لیا اور انڈیانا کے پہلے قصبے کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر علم ہوا کہ چند روز قبل ریاستی قانون تبدیل ہو گیا ہے اور اب وہاں طویل انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ منگل 14 جنوری 1958ء کی بات ہے۔ ہم لانسنگ کے قریب ہی تھے جہاں فلبرٹ رہتا تھا۔ جب ہم اس کے گھر پہنچے تو وہ کام پر گیا ہوا تھا۔ جس وقت بیٹی اور فلبرٹ کی بیوی مصروف گفتگو تھیں اس دوران میں نے فون کے ذریعے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی جہاں صرف ایک دن میں شادی ہو سکتی تھی اگر ہم جلدی کریں تو۔

ہم نے خون کے معائنے کروائے جو کہ ضروری تھا پھر اجازت نامہ لیا۔ سرٹیفکیٹ پر مذہب کے خانے میں میں نے ”مسلم“ لکھا پھر ہم ”جسٹس آف دی پیس“ گئے جہاں ایک کبڑے سفید فام نے ہماری شادی کر دی تمام گواہ بھی سفید فام تھے۔ جہاں جہاں قبول ہے کہنا تھا وہ ہم نے کہہ دیا۔ تمام لوگ مسکراتے ہوئے ہماری حرکات دیکھ رہے تھے۔ بوڑھے شیطان نے اعلان کیا ”میں تمہیں میاں بیوی قرار دیتا ہوں۔ اپنی دلہن کا بوسہ لو۔“

میں اس فلمی سے منظر سے نکل آیا ایسے مواقع پر عورتوں کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں دہلیز تک گود میں اٹھا کر لے جایا جائے اور بعضی بعضی عورتوں کا وزن تو شوہر سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ میں اندازہ بیان نہیں کر سکتا کہ کتنی شادیاں فلموں اور ٹیلی ویژن کی عادی خواتین کی توقعات کی وجہ سے ٹوٹتی ہیں جو گلدستوں اور بوس و کنار کے ساتھ ساتھ سنڈریلا کی طرح ہر وقت رقص اور دعوتوں کی امید کرتی ہیں لیکن جب دن بھر کی مشقت کے بعد کتے کی طرح تھکا ہارا نڈھال شوہر بھوکا پیاسا گھر آتا ہے تو بیگم کا مزاج بگڑ جاتا ہے۔

ہم نے کھانا لانسنگ ہی میں فلبرٹ کے گھر پر کھایا۔ میں نے فلبرٹ سے کہا کہ ”میرے پاس ایک حیران کن خبر ہے۔“ فلبرٹ نے جواب دیا کہ ”تمہارے پاس مجھے حیران کرنے والی کوئی خبر نہیں ہے۔“ جب دفتر سے واپسی پر اسے بتایا گیا کہ میں ایک مسلم بہن کو ملوانے لایا تھا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یا تو میں شادی کر چکا ہوں یا کرنے والا ہوں۔

بیٹی کو نرسنگ اسکول میں تعلیمی مصروفیت کے باعث فوراً واپس جانا پڑا۔ اس نے چار دن بعد واپسی کا وعدہ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے معبد نمبر 7 میں کسی کو بھی شادی کے متعلق نہیں بتایا تھا۔

اس اتوار ایلیا محمد معبد نمبر ایک میں تعلیم دینے والے تھے۔ میں نے نیویارک میں اپنے ماتحت وزیر کو ذمہ داری سنبھالنے کا کہہ دیا۔ ہفتے کو بیٹی بھی واپس آ گئی اتوار کو تعلیم سے فارغ ہو کر ایلیا محمد نے ہماری شادی کا اعلان کر دیا میری طبیعت کے پیش نظر مشی گن تک کے لوگوں کو اس شادی کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

ہم دونوں اکٹھے نیویارک واپس آ گئے۔ معبد نمبر7 میں اس خبر نے سب کو واقعتاً ہلا کر رکھ دیا کچھ نوجوان برادران مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ جیسے میں غداری کا مرتکب ہوا ہوں لیکن باقی تمام لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی بہنوں نے بیٹی کی جان کھا لی۔ مجھے ایک جملہ اب بھی یاد ہے ”تم جیت گئیں“ ایک بہن نے بیٹی سے

کہا جیسا کہ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ عورتوں کی یہی فطرت ہوتی ہے مجھے ہمیشہ یہ احساس رہتا ہے کہ "بیٹی کو پہلے ہی ساری صورت حال کا پتہ تھا ہو سکتا ہے کہ اس نے مجھے جیتا ہی ہو۔"

بہرحال اس کے بعد ہم اڑھائی سال تک کوئنز میں واقع برادر جان علی اور اس کی بیوی کے ہمراہ اس کے دو کمروں کے مکان میں رہے۔ برادر جان اب شکاگو میں نیشنل سیکرٹری ہے نومبر 1958ء میں ہماری سب سے بڑی بیٹی عطیلہ پیدا ہوئی اس کا نام "عطیلہ ہُن" کے نام پر رکھا گیا تھا۔ "جس نے روم فتح کیا تھا۔" عطیلہ کی پیدائش کے بعد ہم لانگ آئی لینڈ میں کوئنز کے مکمل سیاہ فاموں کے علاقے میں واقع سات کمروں کے موجودہ گھر میں منتقل ہو گئے۔

دوسری بیٹی جس کا نام قبلاہ تھا (جو کہ قبلاہ خان کے نام پر رکھا گیا تھا) 1960 میں کرسمس کے دن پیدا ہوئی۔ پھر الیاسہ (جو ایلیا کی عربی الیاس سے مشتق ہے) جولائی 1962ء میں پیدا ہوئی اور 1964ء میں ہماری چوتھی بیٹی "امیلہ" دنیا میں آئی۔

اب میرا خیال ہے کہ میں واقعی بیٹی سے محبت کرتا ہوں۔ وہ واحد عورت ہے جس کے ساتھ میں نے کبھی محبت کا سوچا اور وہ ان چند بلکہ صرف چار عورتوں میں سے ایک ہے جن پر میں نے زندگی میں کبھی اعتماد کیا اور اصل بات یہ ہے۔ بیٹی ایک اچھی مسلمان عورت اور بیوی تھی کیونکہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو میاں بیوی کو محبت کے صحیح مفہوم سے آشنا کرتا ہے۔ مغرب کا تصور محبت صرف شہوت پر مبنی ہے لیکن محبت جسم سے آگے بڑھنے کا نام ہے یہ آپ کے رویئے، مزاج، خیالات، پسند ناپسند کی تبدیلی کا نام ہے۔ یہ ہی وہ چیزیں ہیں جو ایک عورت اور بیوی کو خوبصورت بناتی ہیں اور یہ خوبصورتی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ مغربی تہذیب میں جب عورت کی جسمانی خوبصورتی کم ہوتی ہے تو وہ شوہر کے لیے اپنی دلکشی کھو دیتی ہے لیکن اسلام مرد کو عورت کے جسم سے پرے دیکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی کچھ بیٹی نے کیا اور مجھے سمجھنے میں کامیاب ہو گئی۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ میرے جیسے آدمی کے ساتھ دوسری عورتیں گزارہ کر ہی نہیں سکتیں کیونکہ بیٹی جانتی ہے کہ دھلے دماغ کے سیاہ فام اور مغرور شیطان صفت سیاہ فام کو حقیقت سے آگاہ کرنا ایک کل وقتی ذمہ داری ہے۔ اگر مجھے گھر پر کام کا موقع ملے جس کی نوبت بہت کم آتی ہے تو بیٹی مجھے مطلوبہ خاموشی اور سکون مہیا کرتی۔ میں بہ مشکل دو تین دن گھر رہ پاتا ہوں اور کبھی کبھی تو مجھے پانچ ماہ کے لیے بھی گھر سے دور رہنا پڑتا ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہونا پسند کرتی ہے میں شاذ ہی کبھی اسے باہر لے کر گیا ہوں گا۔ اور اب تو وہ بوسٹن سے سان فرانسسکو یا میامی سے سی ایٹل جاتے ہوئے

یا قاہرہ انقرہ یا شہر مقدس مکہ سے میری ٹیلی فونک گفتگو کی عادی ہو گئی ہے۔ ایک بار بیٹی نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا کہ ”جب تم نہیں ہوتے ہو تو تم میرے قریب ہوتے ہو۔“

شادی کے ایک سال بعد قوم کی تعداد بڑھانے کے لیے شبانہ روز محنت نے مجھے تھکا دیا۔ بوسٹن کے معبد میں بطور مہمان معلم میں نے ہمیشہ کی طرح آخر میں پوچھا ”آپ میں سے کون کون عزت مآب ایلیا محمد کی پیروی کرنا چاہتا ہے؟“ میری حیرانی کی انتہاء نہ رہی جب میں نے کھڑے ہونے والے لوگوں میں اپنی بہن ایلا کو دیکھا۔ ہمارا کہنا ہے کہ مشکل سے قائل ہونے والے لوگ زیادہ اچھے مسلمان ثابت ہوتے ہیں۔ ایلاء کو قائل ہونے میں پانچ سال لگے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ کسی بڑے شہر میں کوئی بڑی تنظیم جب تک کوئی اہم واقعہ نہ ہو جائے عام لوگوں کی نظر سے اوجھل رہ سکتی ہے۔ ”قوم اسلام“ میں کسی شخص کو اندازہ نہیں تھا کہ ایک رات ہارلم میں کیا ہونے والا ہے۔

دو سفید فام پولیس والوں نے ایک لڑائی پر قابو پانے کے لیے راہ گیروں کو ”چلتے بنو“ کا حکم دیا۔ ان تماشائیوں میں بھائی جانسن ہنٹن اور معبد نمبر7 سے وابستہ ایک دیگر بھائی بھی تھے۔ انہوں نے سفید فام پولیس والوں کی حسب منشا موقع سے بھاگنے سے انکار کر دیا۔ برادر ہنٹن پر ڈنڈوں (Nightsitcks) سے حملہ کیا گیا جس سے اس کی کھوپڑی چیخ گئی اور اسے ایک پولیس کار میں ڈال کر قریبی تھانے لے گئے۔ دوسرے بھائی نے ہمارے ریسٹورنٹ میں فون کر دیا اور چند ٹیلی فونز کے بعد آدھ گھنٹے کے اندر اندر پچاس کے قریب معبد نمبر7 کے ”ثمر اسلام“ کے اراکین تھانے کے باہر صف بندی کر چکے تھے۔ دیگر نیگروز محض تجسس کی وجہ سے دوڑتے ہوئے آئے اور ان کے پیچھے اکٹھے ہو گئے۔ میں نے اندر جا کر معبد نمبر 7 کے وزیر کے طور پر اپنے بھائی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی پہلے تو پولیس والوں نے اس کی موجودگی ہی سے انکار کر دیا لیکن پھر اس کی موجودگی تسلیم کرتے ہوئے ملاقات کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے ان پر واضح کیا کہ ملاقات اور طبی دیکھ بھال کی تسلی کے بغیر ہم واپس نہیں جائیں گے۔ وہ سب لوگوں کے اجتماع سے خوفزدہ اور گھبرائے ہوئے تھے۔ برادر ہنٹن کو دیکھ کر میں بمشکل اپنے غصے پر قابو رکھ سکا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ اس کا سر، چہرہ اور کندھے خون میں تر تھے۔ میری آرزو تھی کہ پولیس کی درندگی کا ایسا واقعہ مجھے دوبارہ دیکھنے کو نہ ملے۔ میں نے انچارج لیفٹیننٹ سے کہا کہ ”اس آدمی کو ہسپتال میں ہونا چاہیے۔“ انہوں نے ایک ایمبولینس منگوا کر برادر ھنٹن کو ہارلم کے ہسپتال بھجوا دیا اور ہم تمام مسلمان پندرہ بلاک تک پیدل چل کر

ہسپتال پہنچے۔ نیگروز نے چونکہ پہلی بار ایسا واقعہ دیکھا تھا لہٰذا وہ دکانوں، ریستورانوں اور شراب خانوں سے نکل کر مجمع میں شامل ہو کر اس کا حجم بڑھاتے گئے۔

مسلمانوں کی سربراہی میں ہارلم ہسپتال پہنچنے والا مجمع مشتعل تھا کیونکہ ہارلم کے سیاہ فام پولیس کی درندگی سے تنگ آ چکے تھے اور انہوں نے اس سے قبل کسی سیاہ فام کو ہماری طرح سخت موقف اپناتے نہیں دیکھا تھا۔ پولیس کا ایک افسر اعلیٰ میرے پاس آیا اور کہا کہ "ان لوگوں کو یہاں سے ہٹاؤ۔" میں نے جواب دیا کہ "میرے بھائی بغیر کسی کو نقصان پہنچائے، انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ پر امن طور پر کھڑے ہیں" پھر بے حد شائستگی سے میں نے کہا کہ "اصل مسئلہ آپ کے اپنے دیگر ساتھی ہیں۔"

جب ڈاکٹر نے ہمیں یقین دلا دیا کہ برادر ہنٹن کو صحیح طبی امداد مل رہی ہے تو میں نے باقی ساتھیوں کو واپس جانے کے لیے کہا۔ دوسرے نیگروز کا مزاج بہت خراب تھا مگر ہمارے جانے کے بعد وہ بھی منتشر ہو گئے۔ بعد میں ہمیں علم ہوا کہ برادر ہنٹن کے سر میں اسٹیل کی پلیٹ ڈالنا پڑی تھی (آپریشن کے بعد "قوم اسلام" کی مدد سے برادر ہنٹن نے مقدمہ دائر کیا اور جیوری نے اسے 70000 ڈالر بطور ہرجانہ دلوائے جو پولیس تشدد کے خلاف نیویارک سٹی کی تاریخ میں سب سے بڑی رقم تھی)

نیویارک سٹی کے لاکھوں قارئین کے لیے یہ "ہارلم میں نسلی ہنگامہ" کی کہانی سے زیادہ کوئی خبر نہ تھی۔ ہمارے معاملہ کو زیادہ اچھالا تو نہیں گیا لیکن پولیس کے شعبہ نے "قوم اسلام" کی فائلوں کا مطالعہ کیا اور ہمیں ایک مختلف نگاہ سے دیکھنے لگے۔ سب سے اہم بات یہ کہ ہارلم جو دنیا میں سیاہ فاموں کی گنجان ترین کچی آبادی ہے کے ایک اخبار "ایمسٹرڈیم نیوز" نے ساری کہانی کو شہ سرخی کے ساتھ شائع کیا اور پہلی بار سیاہ فام مرد، عورتیں اور بچے گلیوں بازاروں میں "مسلمانوں" پر گفتگو کرتے پائے گئے۔

!

باب : 14

سیاہ فام مسلمان

انیس سو انسٹھ کے موسم بہار میں برادر جانسن ہنٹن کے واقعہ سے چند ماہ قبل ایک نیگرو صحافی لوئس لومیکس نے ایک صبح مجھ سے پوچھا کہ کیا "قوم اسلام" متنازع موضوعات پر مشتمل مائک ویلس شو کے لیے دستاویزی فلم بنانے کے واسطے تعاون کرے گی؟ میں نے کہا کہ ایسے مسائل کے لیے ایلیا محمد کی رائے لینا ضروری ہے اور لومیکس ان کی رائے کے لیے شکاگو پرواز کر گیا۔ کچھ سوال پوچھنے اور چند باتوں سے اجتناب کا مشورہ دینے کے بعد ایلیا محمد نے اجازت دے دی۔

کیمرہ مینوں نے نیویارک، شکاگو اور واشنگٹن ڈی سی میں ہماری مساجد کے آس پاس "قوم اسلام" کے مناظر فلم بند کرنا شروع کر دیئے۔ ایلیاء محمد اور مجھ سمیت چند وزراء کی آوازیں ریکارڈ کی گئیں جن میں ہمیں سیاہ فام سامعین کو سفید فام شیطان اور دھلے دماغوں کے سیاہ فاموں کے متعلق حقائق بیان کرتے دکھایا گیا تھا۔

انہی دنوں بوسٹن یونیورسٹی میں ایک سیاہ فام عالم سی ایرک لنکن نے ڈاکٹریٹ کے تھیسس کے لیے "قوم اسلام" کا انتخاب کیا۔ لنکن کی دلچسپی اس موضوع سے اس وقت پیدا ہوئی جب کلارک کالج اٹلانٹا جورجیا میں مذہب کے ایک طالبعلم نے اپنا ٹرم پیپر داخل کیا جس کے تعارفی حصہ کا میں یہاں حوالہ دینا پسند کروں گا۔ یہ اٹلانٹا کے ان بہت سارے سیاہ فام طالب علموں میں سے ایک کے خیالات ہیں جو ہمارے مقامی معبد نمبر 15 میں اکثر آتے جاتے تھے۔

"عیسائی مذہب امریکی نیگروز میں موجود برابری کی آرزو اور عزت کی خواہش سے ہم آہنگی نہیں رکھتا۔ اس نے بجائے مدد کرنے کے رکاوٹیں پیدا کیں۔ جہاں اسے اخلاقی طور پر مستقیم ہونا چاہیے تھا وہاں یہ غیر مستقیم ثابت ہوا۔ اس نے اپنے پیرکاروں کو رنگ کی بنیاد پر تقسیم کر دیا حالانکہ حضرت عیسیٰؑ کے ماتحت اس نے اپنا مقصد عالمی بھائی چارہ قرار

دیا تھا۔ عیسائی محبت دراصل سفید فام کی اپنی ذات اور اپنی نسل کے ساتھ محبت ہے۔ برابری اور انصاف پر مبنی مستقبل کی جس دنیا کی تعمیر سیاہ فام کرنا چاہتا ہے اس کی واحد امید اسلام ہے۔"

ابتدائی تحقیق نے پروفیسر لنکن پر موضوع کی وسعت عیاں کر دی اور وہ بہت سی گرانٹس کے حصول اور پبلشرز کی حوصلہ افزائی کے بعد اپنے تھیسس کو کتاب کی شکل دینے پر رضامند ہو گئے۔

ہماری نسبتاً چھوٹی سی "قوم" پر ٹیلی ویژن شو ہونا اور ایک کتاب کا چھپنا ہمارے لیے بڑی خبریں تھیں۔ ہر مسلمان یہ توقع کرنے لگا کہ اب سفید فام کے مضبوط ذرائع ابلاغ کے ذریعہ امریکہ بھر میں موجود ہمارے دھلے دماغوں والے بہن بھائی بلکہ شیاطین بھی ایلیا محمد کی تعلیمات دیکھ، سن اور پڑھ سکیں گے جو اپنی اثر پذیری کے اعتبار سے دو دھاری تلوار سے مشابہہ ہیں۔

ہم نے اپنے طور پر اشاعتی طاقت سے استفادے کی چھوٹی موٹی کوششیں بھی کیں۔ میں ایمسٹرڈیم نیوز کے ایڈیٹر جیمز ھک سے مل چکا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ معاشرے سے اٹھنے والے ہر آواز قابل توجہ ہوتی ہے لہٰذا جلد ہی میں ایمسٹرڈیم نیوز میں ہفتہ وار کالم لکھنے لگا۔ پھر ایلیا محمد میری جگہ کالم لکھنے لگے اور میں ایک اور سیاہ فام اخبار "لاس اینجلس ہیرالڈڈ سپیچ" سے وابستہ ہوگیا۔ لیکن میں اپنا ایک ایسا اخبار نکالنا چاہتا تھا جو "قوم اسلام" کی خبروں سے بھرا ہو۔

1957ء میں ایلیا محمد نے مجھے لاس اینجلس میں ایک معبد قائم کرنے بھیجا۔ یہ کام مکمل کرنے کے بعد میں وقتاً فوقتاً لاس اینجلس ہیرالڈڈ سپیچ کے دفتر آنے جانے لگا۔ اس سے مجھے اخبار کے دیگر طباعتی مراحل دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ مجھ پر شروع سے اللہ کا کرم رہا ہے کہ اگر میں ایک بار کوئی کام ہوتا دیکھ لوں تو دوبارہ اسے خود سہولت کے ساتھ کرلیتا ہوں۔ کیونکہ جرائم کی دنیا میں شاید زندہ رہنے کا یہ بنیادی اصول تھا۔

نیویارک واپس پہنچ کر میں نے ایک سکینڈ ہینڈ کیمرہ خریدا اور کافی فلمیں بنانے کے بعد میں اس قابل ہوگیا کہ قابل استعمال تصویریں کھینچ سکوں۔ مجھے جب بھی موقع ملتا میں "قوم اسلام" کے متعلق دلچسپ خبریں اکٹھی کرتا رہتا، ہر ماہ ایک روز کے لیے میں خود کو کمرے میں بند کر لیتا۔ اپنا مواد اور تصاویر اکٹھی کرکے پرنٹر کے پاس لے جاتا۔ میں نے اپنے اخبار کا نام "فرمان محمد (Muhammad Speaks) رکھا جسے مسلمان برادران کچی بستیوں کی سڑکوں پر فروخت

کرتے۔ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ جب Hierarchy میں حسد پیدا ہو جائے گا تو میرے قائم کردہ اخبار میں ہی میرے متعلق کچھ نہیں چھاپہ جائے گا۔

خیر "قوم اسلام" کی تشہیر ابھی ابتدائی سطح پر ہی تھی جب ایلیا محمد نے مجھے تین ہفتہ کے دورے پر افریقہ بھیجا۔ ہماری قلیل تعداد کے باوجود کچھ افریقی اور ایشیائی شخصیات نے ایلیا محمد کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ ان کی امریکی سیاہ فام لوگوں کی بیداری اور بہتری کی کوششوں کو پسند کرتے ہیں۔ بعض اوقات یہ پیغامات میرے توسط ہی سے بھیجے جاتے تھے کیونکہ میں ایلیا محمد کے خصوصی ایلچی کے طور پر مصر، عرب، سوڈان، نائجیریا اور گھانا جا چکا تھا۔

آج اکثر نیگرو راہنما اس بات کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں کی عالمی تشہیر سراسر سفید فاموں کے پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دیگر ذرائع کی مرہون منت ہے، مجھے ان سے ذرہ بھر اختلاف نہیں ہے وہ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ "قوم اسلام" میں کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔

1959ء میں ٹیلی ویژن پر پروگرام چلایا گیا جس کا نام تھا "نفرت کی پیداوار۔ نفرت" اس کے ٹائیٹل میں چونکا دینے والے مناظر بڑی عمدگی کے ساتھ ایڈٹ کر کے چلائے گئے تھے جس میں ایلیا محمد میں اور دیگر خطاب کرتے۔۔۔ قوی جثے اور سنجیدہ چہروں والے سیاہ فام یعنی ہمارے "ثمر اسلام۔" سفید سکارف اور سفید عبائیں پہنے ہر عمر کی مسلمان بہنیں۔۔۔ ہمارے ریستورانوں اور دوسرے شعبوں کے مسلمان۔۔۔ ہماری مساجد میں آتے جاتے مسلمان اور دیگر سیاہ فام دکھائے گئے تھے۔

ایک ایک جملہ حیرانی کی شدت بڑھانے کے لیے ایڈٹ کیا گیا تھا۔ یہی پروڈیوسر کی آرزو تھی۔ میرے خیال میں جب پروگرام چلایا گیا تو لوگ اس کے آگے سے ہل نہیں سکے۔ اس سے بالکل اسی طرح کا خوف پیدا ہوا جس طرح کا خوف 1930 میں آرسن ویلز کے پروگرام نے پورے امریکہ میں دوڑا دیا تھا۔ اس نے ریڈیو پروگرام میں یہ ظاہر کیا تھا جیسے مریخ والوں نے واقعی زمین پر حملہ کر دیا ہے۔

ہمارے پروگرام کے بعد کسی نے کھڑکی سے چھلانگ تو نہیں لگائی لیکن نیویارک سٹی میں ردعمل کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ میری ذاتی رائے میں اس ردعمل کا ذمہ دار پروگرام کا عنوان "نفرت... نفرت" تھا۔

لاکھوں لوگ، سیاہ و سفید کہہ رہے تھے "تم نے دیکھی؟۔۔۔ تم نے سنی؟ سفید فاموں سے نفرت کی تبلیغ۔"

سیاہ فاموں کی حد تک یہ بھی سفید فاموں کے روائتی مزاج کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے آپ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ جب اسے علم ہوتا ہے کہ اس کا شکار اس کی جعلی عظمت و شکوہ کے متعلق اس کی ذاتی رائے سے اتفاق نہیں کرتا تو وہ بدک جاتا ہے۔ امریکہ میں صدیوں سے یہ بات درست تھی کہ شکار شدہ استحصال شدہ اور تشدد سہنے والے سیاہ فام انکل ٹامنگ کرتے اور "جی آقا" کہہ کر بھیک مانگتے اور دانت نکالتے رہیں۔ لیکن اب حالات اور تھے۔ سب سے پہلے سفید اخبار والے فیچر رائٹر اور کالم نویس آئے اور انہوں نے "ہوشیار"... "نفرت کے پیغامبر"... "نسلوں کے مابین اچھے تعلقات کے لیے خطرہ۔۔۔" "سیاہ علیحدگی پسند"... "سیاہ حاکمیت پرست"۔۔۔ اور اس طرح کے عنوانات سے لکھا۔ ابھی روزناموں کی روشنائی خشک نہیں ہوئی تھی کہ قومی ہفتہ وار رسالے چیخنے لگے "نفرت کے معلم" "تشدد کی متلاشی"۔۔۔ "سیاہ فام نسل پرست"۔۔۔ "سیاہ فام فاشسٹ"۔۔۔ "عیسائیت دشمن"۔۔۔ "کمیونزم سے متاثر ہونے کا امکان" وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ شیطان اعظم کے پریسوں سے نکلا اور انسانی تاریخ کا حصہ بن گیا اس کے بعد مشتعل سفید فام نے اپنی اگلی چال چلی۔

آغاز غلامی ہی سے امریکی سفید فام نے ایسے منتخب نیگروز کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے جو تپتے کھیتوں میں مصائب بھگتنے والی بڑی تعداد کی نسبت ان کے لیے زیادہ فائدہ مند ہیں۔ سفید فام ان گھریلو اور زراعتی ملازمتوں پر مشتمل خاص نوکر رکھتا ہے جنہیں وہ نسبتاً زیادہ ٹکڑے ڈالتے ہوئے انہیں اپنے باورچی خانے میں کھانے کی اجازت بھی دیتا ہے جو اپنے "اچھے آقا" کی اپنی ذات سے متعلق خود ساختہ تصور نیکی و بھلائی کی اس کی توقع کے مطابق توصیف کرتے رہتے ہیں۔ ان گھریلو زراعتی نوکروں سے "اچھا آقا" ہمیشہ اپنی دل پسند باتیں سن سکتا ہے مثلاً آپ بے حد اچھے آقا ہیں!" یا "اے آقا! یہ کھیتوں میں کام کرنے والے بوڑھے سیاہ نیگر اسی طرح خوش رہتے ہیں اے آقا! ان کے پاس اتنا ذہن ہی نہیں ہے کہ آپ ان کی بہتری کی کوئی کوشش کریں۔"

فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ یہ گھریلو اور زراعتی نوکر ذرا مہذب ہوگئے ہیں اور بس اب جب سفید فام فون اٹھا کر اپنے گھریلو یا زراعتی کمی کا نمبر ملاتا ہے تو اسے ان تربیت یافتہ سیاہ پتلیوں کو ہدایت دینے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی کیونکہ وہ پہلے ہی ٹیلی ویژن پروگرام دیکھ چکے اور اخبار پڑھ چکے ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی ذمہ داری کا علم ہوتا ہے۔

میں کسی کا نام نہیں لوں گا لیکن اگر آپ1960ء کے نام نہاد نیگرو راہنمائوں کی فہرست بنائیں تو آپ کو ان کے ناموں کا خود ہی پتہ چل جائے گا جنہوں نے اپنے "اچھے آقا" کی طرف سے ہم پاگل محنت کش نیگروز پر حملے کرنا

شروع کیے۔ اپنے آقائوں کو یقین دہانی کروانے کے لیے سب سے پہلے تو ہم کچی بستیوں کے مکینوں کے متعلق یہ کہا گیا کہ "یہ مسلمان کسی بھی لحاظ سے نیگرو عوام کی نمائندگی نہیں کرتے۔" پھر ہمیں "ایک غیر ذمہ دار نفرت پرست فرقہ" کہا گیا اور کبھی یہ کہا گیا کہ "عین اس وقت جب نسلی تصور بہتر ہونا شروع ہوا۔۔۔ ایک نامناسب نیگرو تاثر" وہ اپنا بیان دینے کے لیے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے "ایک قابل نفرت معکوس نسل پرستی"۔۔۔ "قدیم اسلامی فلسفے کے احمق دکھاوے باز"۔۔۔ "عیسائیت مخالف مرتد" وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے چھوٹے سے معبد نمبر7 کے ریستوران کا ٹیلی فون لگتا تھا دیوار سے ٹوٹ کر گر جائے گا۔ سارا دن تقریباً پانچ گھنٹے فون میرے کان سے لگا رہتا۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور پریس کے لوگ سیاہ فام رہنمائوں کے بیانات پر مسلمانوں کا ردعمل جاننا چاہتے تھے۔ دوسرے میں شکاگو میں ایلیا محمد سے مزید ہدایات کے لیے رابطے میں رہتا۔ مجھے حیرانی اس بات پر تھی کہ میری بتائی ہوئی باتوں کے باوجود وہ تحمل کیسے قائم رکھتے تھے؟ کیونکہ میرے لیے تو خود پر قابو رکھنا بے حد مشکل ہو جاتا تھا۔ میرے گھر کے غیر مندرج(Unlisted) ٹیلی فون کا نمبر بھی لوگوں کو معلوم ہوگیا لگتا تھا میں جہاں جاتا ہوں فون بجنے لگتا ہے چونکہ نیویارک سٹی خبری ذرائع کا اہم ہیڈ کوارٹر ہے اور میں نیویارک میں ایلیا محمد کا وزیر تھا۔ اس لیے مجھے سان فرانسسکو سے مین حتیٰ کہ لندن، سٹاک ھوم اور پیرس تک سے آنے والی کالز بھی سننا پڑتی تھیں۔ اس سارے عرصہ میں دلچسپ بات یہ تھی کہ یورپ والوں نے "نفرت" کا سوال دوبارہ نہیں اٹھایا۔ صرف امریکی سفید کو "نفرت زدہ" ہونے کے طاعون کا بھوت چمٹا ہوا تھا۔ اسی بات سے مجھے احساس ہوتا تھا کہ نیگروز سے نفرت پر وہ بھی ضمیر کی خلش میں مبتلا ہے۔

اب تک مسلمان جس "سفید شیطانی آدمی" کی باتیں کرتے آئے تھے اب اس سے ہمارا حقیقی واسطہ پڑا تھا "جناب میلکم ایکس صاحب آپ سیاہ فاموں کی برتری اور نفرت کی تبلیغ کیوں کرتے ہیں؟" میرے سامنے سرخ جھنڈی لہرائی جاتی اور میرا خون کھولنے لگتا۔ میں جواباً آگ اگلنے لگتا "سفید فام خود احساس برتری کے جرم کا مرتکب ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ عزت مآب ایلیا محمد پر الزام لگا رہا ہے کہ وہ سیاہ فاموں کو برتری اور نفرت کی تعلیم دے رہے ہیں۔ حالانکہ وہ سیاہ فام کی سوچ بلند کرنے کے ساتھ ساتھ اس ملک میں معاشرتی اور معاشی حالت بہتر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں" منافق دوغلا سفید فام آدمی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا جب ہمارے غلام آباواجداد سفید فاموں کے ساتھ بھائی چارے کی بات کرتے تھے انہیں مار دیا جاتا تھا اور اب ایلیا محمد جب علیحدگی کی بات کرتے ہیں تو انہیں "نفرت کا مبلغ اور فاشسٹ" کہا جاتا ہے سفید فام سیاہ فاموں کا وجود گوارہ نہیں کرتے۔ وہ ان طفیلیوں(Parasites) سے جان

چھڑانا چاہتے ہیں۔ وہ اس سیاہ فام نسل سے چھٹکارا چاہتے ہیں جس کی موجودگی اور حالت نے سفید فام کے کردار کو دنیا کے سامنے برہنہ کر دیا ہے۔ سوتم ایلیا محمد کے خلاف کیوں ہو؟" میرے لہجے کی کاٹ گہری ہو جاتی۔

"سفید فام کا کسی سیاہ فام سے یہ پوچھنا کہ کیا وہ اس سے نفرت کرتا ہے؟ ایسے ہی ہے جیسے کوئی آبرو لوٹنے والا اپنی شکار لڑکی سے یا کوئی بھیڑیا کسی بھیڑ سے پوچھے کیا تمہیں مجھ سے نفرت ہے؟ سفید فام کو اخلاقی طور پر اس نفرت کے لیے کسی پر الزام دھرنے کا حق نہیں ہے! جب میرے اجداد سانپ کے ڈسے ہوئے ہوں، میں سانپ کا ڈسا ہوا ہوں تو اگر میں اپنے بچوں کو سانپوں سے بچنے کی تاکید کروں تو سانپ مجھ پر نفرت پھیلانے کا الزام لگاتے ہوئے کیسا لگے گا؟"

وہ شیطان مجھ سے پوچھتے "جناب میلکم ایکس، آپ "ثمر اسلام" کو جوڈو کراٹے کی تربیت کیوں دلواتے ہیں؟" یعنی اگر کوئی سیاہ فام ذاتی دفاع کے لیے کچھ سیکھ لے تو یہ سفید فام فوراً خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ میں جواب دیتا "سیاہ فاموں کے جوڈو یا کراٹے سیکھتے ہی یہ کام اتنا منحوس کیوں ہوگیا؟ سارے امریکہ میں، بوائے سکاؤٹس، دی وائی ایم سی اے، حتیٰ کہ وائی ڈبلیو سی اے، پی اے ایل، یہ سب جوڈو سیکھاتے ہیں۔ چھوٹے گرامر سکولوں تک میں بچیاں اپنا دفاع کرنا سیکھتی ہیں یہ سب ٹھیک ہے، اچھا ہے لیکن اس وقت تک جب تک سیاہ فام اس کی تربیت حاصل نہیں کرتے۔"

دوسرا سوال کیا جاتا "میلکم ایکس آپ کی تنظیم کے کل اراکین کتنے ہیں؟ رائٹ ریورنڈ بشپ ٹی چکن ونگ کا کہنا ہے کہ آپ لوگ مٹھی بھر سے زیادہ نہیں ہیں۔"

"جو کوئی بھی آپ کو بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کتنی ہے وہ دراصل لاعلم ہے اور جسے صحیح علم ہے وہ یہ بات آپ کو کبھی نہیں بتائے گا۔" میں جواب دیتا۔

بشپ چکن ونگ قسم کے لوگوں کا حوالہ ہماری "عیسائیت دشمنی" کے لیے اکثر دیا جاتا تھا۔ میں اس موضوع پر بھی منہ توڑ جواب دیتا۔ "عیسائیت سفید فاموں کا مذہب ہے انجیل مقدس اور اس کی من چاہی تفسیر سفید فام کا واحد نظریاتی ہتھیار ہے جس سے وہ لاکھوں غیر سفید انسانوں کو غلام بناتا چلا آ رہا ہے۔ جس ملک کو بھی سفید فام لوگوں نے بندوق سے فتح کرنے کا ارادہ کیا وہاں پہلے لوگوں کے ذہن و دل کو انجیل اور اس کی تعلیمات کی روشنی میں "ملحد اور کافر" قرار دیا گیا۔ اس کے بعد اسلحے کے زور پر وہاں پر قبضہ کیا گیا اس کے بعد اپنے کرتوتوں کو چھپانے کے لیے مبلغین بھیج دیئے جاتے ہیں۔

سفید فام رپورٹر غصے میں ہمیں سیاہ فاموں کے "عوامی سرغنہ"(Demagogues) قرار دیتے۔ جب ایک دو بار مسلسل یہ لفظ میرے سامنے بولا گیا تو میں نے اس کا جواب دینے کی کوشش بھی کی۔ "اگر یونان پر نگاہ ڈالیں تو سب سے پہلے یہ بات دیکھنا ضروری ہے کہ یونانی (Demogogues) کس کو کہتے تھے اس کے حقیقی معنی ہیں "لوگوں کا معلم" اور اگر آپ کچھ عوامی معلمین کو دیکھنا چاہیں تو یونان کی عظیم ترین شخصیت سقراط وہ پہلا شخص ہے جسے عوام کو علم دینے کے جرم میں قتل کیا گیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس لیے صلیب پر جان دی کہ کیونکہ ان کے عہد کے "فارسی" سچائی کے نہیں قانون کے پرستار تھے۔ اسی طرح جدید فارسی بھی ایلیا محمد کو نقصان پہنچانے کے لیے انہیں عوامی سرغنہ، پاگل اور متعصب کے القابات سے پکار رہے ہیں۔ گاندھی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے وہ شخص جسے چرچل نے برطانوی جیل میں کھانا کھانے سے انکار پر "چھوٹا برہنہ فقیر" قرار دیا تھا لیکن ایک چوتھائی ارب لوگ، ایک پورا برصغیر گاندھی کی پشت پر تھا اور انہوں نے برطانوی شیر کی دم مروڑ کر رکھ دی۔

گلیلیو اپنے تفتیشیوں کے سامنے کھڑا کہتا رہا "زمین حرکت کرتی ہے" اور مارٹن لوتھر کے متعلق کیا خیال ہے جس نے اسے ملحد قرار دینے والے کیتھولک چرچ کے خلاف اپنا تھیسس اسی چرچ کے دروازے پر کیل سے نصب کر دیا۔ ہم عزت مآب ایلیا محمد کے پیروکار اسی طرح کچی بستیوں میں رہ رہے ہیں جس طرح ایک زمانے میں عیسائیت کے پیروکاروں کا فرقہ حشرات الارض کی طرح زیر زمین غاروں میں چھپ کر رہنے پر مجبور تھا لیکن درحقیقت وہ رومی سلطنت کی قبر کھود رہے تھے۔"

مجھے آج بھی ٹیلی فون پر کی گئیں وہ گرما گرم بحثیں اسی طرح یاد ہیں جیسے یہ کل کی بات ہو۔ رپورٹر غصے میں ہوتے تھے اور میں بھی غصے میں ہوتا تھا۔ جب میں تاریخی حوالے پیش کرتا وہ مجھے حال میں کھینچ لاتے اور انٹرویو اور اپنی ذمہ داری بھول کر اپنے اندر کے سفید شیطان کا دفاع کرنا شروع کر دیتے۔ وہ لنکن کا گڑا مردہ اکھاڑ لیتے اور اس کی غلاموں کی آزادی بطور دلیل پیش کرتے۔ میں انہیں لنکن کی تقاریر ہی میں سے سیاہ فاموں کے خلاف کی جانے والی باتیں بتاتا۔ وہ 1954ء کا "School Integration" کے متعلق عدالت عظمیٰ کا فیصلہ اٹھا لاتے۔ میں اس کے متعلق کہتا کہ:

"امریکہ کی تاریخ میں اس سے بڑا جادوئی کرتب کبھی نہیں کیا گیا۔ یعنی عدالت عظمیٰ کے نو جج جو ماضی میں قانون سازی کے ماہر سمجھے جاتے تھے وہ مل کر بھی کوئی واضح قانون بنانے میں ناکام رہے، ایک طرف انہوں نے نیگروز کو حقوق عطا کر کے ان سے داد لے لی دوسری طرف گوروں سے کہا کہ یہ رہیں اس کی خامیاں۔"

رپورٹرز ایسے "اچھے" لوگوں کو پیش کرنے کی پوری کوشش کرتے جن کو میں رد نہ کر سکوں۔ ایک صحافی کی آواز تو شدت جذبات سے رندھ گئی اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میرے خیال میں کوئی ایسا سفید فام بھی ہے جس نے امریکی سیاہ فاموں کے لیے کچھ کیا ہو؟ میں نے جواب دیا"ہاں دو آدمی ایسے ہیں ہٹلر اور سٹالن۔ یہ سفید فاموں پر ہٹلر کے دباؤ کا نتیجہ ہی تھا کہ سیاہ فاموں کو کارخانوں میں مناسب نوکریاں ملیں اور سٹالن نے اس دباؤ کو برقرار رکھا۔ "

لیکن قطع نظر اس بات کے کہ میں انٹرویو میں کیا کہتا تھا میرے بیان کو کبھی صحیح حالت میں چھاپا نہیں گیا۔ اسے ہمیشہ توڑ موڑ کر اور گھما پھرا کر چھاپا جاتا"اگر میں کہتا کہ مریم کے پاس ایک میمنا تھا" تو اخبار میں چھپتا"میلکم ایکس کی مریم پر طنز۔ "

میری تلخی سفید پریس کی بجائے ان نیگرو راہنماؤں" کے خلاف تھی جو ہم پر حملے کرتے تھے۔ جناب ایلیا محمد چاہتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے ہم سیاہ فام راہنماؤں کے خلاف کھلم کھلا جوابی حملے سے گریز کریں کیونکہ سیاہ نسل کو تقسیم کرکے باہم لڑوانا بھی سفید فام کا ایک داؤ تھا۔ اس کی وجہ سے سیاہ فاموں میں وہ اتحاد پیدا نہیں ہو سکا جو امریکی سیاہ فاموں کے لیے از بس ضروری تھا۔ لیکن جتنا ہم پیچھے ہٹتے یہ سیاہ پتلیاں اتنی ہی شدت سے بڑھ بڑھ کر ایلیا محمد پر حملے کرتیں حتیٰ کہ ایسا محسوس ہونے لگا گویا ہم "اہم" نیگروز کے خلاف بولنے سے ڈرتے ہیں بالآخر ایلیا محمد کا تحمل جواب دینے لگا اور ان کی تائید سے میں پھر آگ اگلنے لگا۔

"آج کا انکل ٹام سر پر رومال نہیں باندھتا بیسویں صدی کا انکل ٹامس اکثر ٹاپ ہیٹ پہنتا ہے۔ وہ خوش لباس اور تعلیم یافتہ ہے وہ مجسم تہذیب و شائستگی نظر آتا ہے وہ ییل اور ہارورڈ کے لہجے میں بولتا ہے وہ پروفیسر ڈاکٹر، جج اور ریورنڈ بلکہ رائٹ ریورنڈ ڈاکٹر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کا انکل ٹامس ایک پیشہ ور نیگرو ہے... میرا مطلب ہے کہ سفید فام کے لیے نیگرو بننا اس کا پیشہ ہے۔ "

اس سے قبل امریکہ بھر میں ان منتخب نام نہاد راہ نماؤں کے کسی نے سرعام پرزے نہیں اڑائے تھے۔ وہ اپنے متعلق سچ سن کر سفید فاموں سے بھی زیادہ مشتعل ہوئے اور انہوں نے اپنے نام ور اداروں کے ذریعے ایلیا محمد پر حملے کرنا شروع کیے۔ میں انہیں"سفید سروں والے سیاہ جسم" کہتا تھا۔ ان نیگرو ترقی کی تنظیموں کے اجزائے ترکیبی ایک سے تھے۔ سیاہ فام"راہ نما" عوام کے دکھاوے کے لیے سامنے ہوتے تاکہ وہ عام سیاہ فاموں کو سفید فاموں کے

خلاف لڑتے نظر آئیں۔ لیکن ان کی اصل ڈوری پردے کے پیچھے بیٹھے سفید فام صدر یا بورڈ چیئرمین وغیرہ کے ہاتھ میں ہوتی۔

میری شعلہ فشانی کو لائف، لُک، نیوز ویک اور ٹائم وغیرہ چھاپتے۔ کچھ اخبارات نے ایک آدھ مضمون یا خبر چھاپنے کے بجائے "قوم اسلام" پر چار چار پانچ پانچ مضامین چھاپنے شروع کر دیئے۔ ریڈرز ڈائجسٹ نے جو کہ تیرہ زبانوں میں چوبیس ملین کی تعداد میں چھپتا ہے اور دنیا بھر میں پڑھا جاتا ہے ایک مضمون"Mr Muhammad Speaks" کے عنوان سے چھاپا یہ مضمون انہی صاحب نے لکھا تھا جنہیں میں یہ کتاب لکھوا رہا ہوں(میلکم ایکس کی مراد ایلکس ہیلی سے ہے جنہوں نے میلکم ایکس کا زیر نظر انٹرویو کیا تھا اور خود بھی اس موضوع پر شہرۂ آفاق ناول "روٹس" لکھا تھا۔ مترجم) جس کی وجہ سے ہمیں دیگر اہم ماہناموں میں بھی جگہ ملنے لگی۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں مجھے پینل گفتگو اور مباحثوں میں "قوم اسلام" کے دفاع کے لیے بلایا جاتا۔ میرا سامنا خاص قسم کے دانش وروں سے ہوتا جن میں سفید اور سیاہ فام دونوں شامل ہوتے وہ لوگ ایلیا محمد کی تعلیمات کو اس طرح غلط انداز میں بگاڑ کر پیش کرتے کہ مجھے آگ لگ جاتی۔ مجھے اس سے قبل مسلمانوں کے علاوہ کسی اور مجمع کے سامنے بالخصوص ریڈیو ٹیلی ویژن پر مائکرو فون کے ذریعے لاکھوں لوگوں سے خطاب کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

اٹھائی گیری کے زمانے سے میں جان گیا تھا کہ ہر کام کے کچھ خاص داؤ ہوتے ہیں اور جیل میں مباحثوں کے دوران مخالفین کو غیر متوقع طور پر پریشان کرنے کا ہنر سیکھ چکا تھا۔ مجھے علم تھا کہ نشری انٹرویوز میں بھی کوئی نہ کوئی ایسے داؤ ہوں گے جو میرے علم سے باہر ہیں اور اگر میں دوسروں کے افعال کا بغور جائزہ لوں تو بہت جلد ایلیا محمد اور ان کی تعلیمات کا دفاع کرنے کے لائق ہو جاؤں گا۔

میں جب اسٹوڈیو میں داخل ہوتا تو شیاطین اور سیاہ فام پی ایچ ڈی "پتلیاں" آپس میں بے حد دوستانہ انداز میں ایک دوسرے کا نام پکارتے اور ہنستے نظر آتے۔ اس عظیم جھوٹ پر مجھے قے آنے لگتی حتیٰ کہ وہ میرے ساتھ بھی بے تکلفی کی اداکاری کرتے۔ حالانکہ ہم سب جانتے تھے کہ انہوں نے مجھے ذہنی طور پر نیچا دکھانے کے لیے بلایا ہے۔

وہ مجھے کافی پیش کرتے میں "نہیں، شکریہ" کہہ کر پوچھتا کہ مجھے کہاں بیٹھنا ہے؟ مائکرو فون بعض اوقات سامنے میز پر رکھا ہوتا اور کبھی تار کے ذریعے گلے میں حمائل کر دیا جاتا اور مجھے آغاز ہی سے یہ دوسرا انداز پسند تھا کیونکہ اس طرح آپ کو ہر وقت مائکرو فون سے فاصلے کی پریشانی نہیں رہتی۔

پروگرام کا میزبان عموماً میرا تعارف بے حد غیر مذہبی انداز میں کرواتا۔ ”آج ہمارے ساتھ شعلہ نوا، ناراض میلکم ایکس موجود ہیں جو نیویارک کے مسلمانوں کے سربراہ ہیں۔۔۔“ میں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے میزبانوں کے برعکس اپنا تعارف خود کروانے کی مشق شروع کر دی اور جونہی مجھے موقع ملتا میں میزبان کی بات کاٹ کر اپنا تعارف خود کروانا شروع کر دیتا۔

”میں جناب ایلیا محمد کا نمائندہ ہوں۔ جو اس مغربی حصہ ارض پر انتہائی تیزی سے بڑھنے والے مسلمانوں کے گروہ کے روحانی سربراہ ہیں۔ ہم جو ان کے پیروکار ہیں، یہ جانتے ہیں کہ انہیں اللہ نے ہمارے پاس بھیجا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ امریکہ میں بیس ملین سیاہ فاموں کی بدحالی الہامی پیش گوئی کی تکمیل ہے۔ ہمارا یہ بھی ایمان کہ اس وقت عزت مآب ایلیا محمد کی امریکہ میں موجودگی، نام نہاد نیگروز کو دی جانے والی تعلیم ان نام نہاد نیگروز کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے خلاف ایلیا محمد کی تنبیہہ یہ تمام الہامی پیشگوئی کا نتیجہ ہیں۔ مجھے نیویارک کے معبد نمبر 7 کا وزیر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جو قوم اسلام کا ایک حصہ ہے اور عزت مآب ایلیا محمد کی سربراہی میں کام کر رہا ہے۔۔۔“

میں اپنے گرد بیٹھے شیاطین اور ان کے تربیت یافتہ طوطوں کو دیکھتا جو مجھ پر، ایلیا محمد پر اور ”قوم اسلام“ پر حملہ کرنے کے لیے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ ”یک جہتی“ کے مارے ہوئے نیگروز یہی سوال کرتے کہ ”مسلمان یہ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے کہ امریکی نیگروز کے مسائل کا حل یک جہتی میں ہے۔“ میں اس سوال کا جواب اس طرح دیتا ”کوئی باشعور سیاہ فام یک جہتی کی خواہش نہیں رکھتا۔ نہ کوئی باشعور سفید فام حقیقتاً یک جہتی چاہتا ہے، کوئی باشعور سیاہ فام اس بات پر یقین نہیں کرے گا کہ سفید فام اسے ”علامتی یک جہتی“ سے زیادہ کچھ دے گا۔ نہیں بالکل نہیں۔ عزب مآب ایلیا محمد نے ہمیں بتایا ہے کہ امریکی سیاہ فام کے مسائل کا حل سفید فام سے مکمل علیحدگی میں ہے۔“

جن لوگوں نے مجھے ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر سنا ہے وہ جانتے ہیں کہ میں بغیر رکے بولتا ہوں تاآنکہ میں اپنی بات مکمل نہ کر لوں۔ لیکن ان دنوں میں اس تکنیک کو بہتر کر رہا تھا۔

”ایلیاء محمد نے ہمیں بتلایا ہے کہ چونکہ مغربی معاشرہ بگاڑ کا شکار ہے اور اس میں گناہ کا دور دورہ ہے لہٰذا اللہ نے اس کا حساب لینے اور اسے تباہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور عذاب میں مبتلاء اس معاشرے سے بچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ سیاہ فام اس بدعنوان معاشرے سے لاتعلق رہیں۔ ان سے الگ ہو کر اپنا علیحدہ خطۂ ارض حاصل کریں جہاں

ہم اپنی اصلاح کر سکیں، اپنا اخلاقی معیار بلند کر سکیں اور اللہ والے بن سکیں۔ مغربی دنیا کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نمائندے اس گہرے نسلی مسئلے کے حل میں ناکام رہے ہیں۔ اس کے اعلیٰ قانون دان ناکام ہو چکے ہیں، سماجی ماہرین ناکام ہو چکے ہیں، معاشرتی راہ نما ناکام ہو چکے ہیں۔ یک جہتی کا نعرہ لگانے والے خود ناکام ہو چکے ہیں۔ اب جب کہ یہ تمام لوگ ناکام ہو چکے ہیں تو پھر وقت آگیا ہے کہ ہم مل کر بیٹھیں اور سوچیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس پیچیدہ نسلی مسئلے کا حل سوائے اللہ کی اپنی ذات کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔"

جب بھی میں "علیحدگی" کی بات کرتا تو بعض لوگ چلانے لگتے کہ ہم مسلمان بھی اسی بات کا تقاضہ کر رہے ہیں جس کا تقاضہ سفید فام نسل پرست اور عوامی معلم کر رہے ہیں۔ میں اس کی وضاحت بھی کرتا۔

"ہم "قطع رحمی" کی بات نہیں کر رہے ہم "علیحدگی" کی بات کر رہے ہیں۔ یہ دونوں ایک نہیں ہیں۔ ایلیا محمد کا فرمان ہے کہ سیگریگیشن" کا مطلب ہے آپ کی زندگی اور آزادی پر کسی اور کا اختیار سیگریگیٹ کا مطلب ہے اختیار، کم تر پر برتر کا تسلط سیگریگیشن کہلاتا ہے۔ جبکہ دو ہم مرتبہ لوگوں کا باہمی فائدے کے لیے رضاکارانہ طور پر الگ ہونا "علیحدگی" کہلاتا ہے۔ عزت مآب ایلیا محمد کا فرمان ہے کہ جب تک امریکہ میں ہمارے لوگ سفید فاموں کے ماتحت رہیں گے انہیں نوکری، خوراک، لباس اور رہائش کے لیے بھیک مانگنا پڑے گی۔ وہ ہمیشہ ہماری زندگیوں پر اختیار کے حامل رہیں گے، ہماری زندگیوں پر حکمران رہیں گے، امریکہ میں سیاہ فاموں کے ساتھ ہمیشہ بچوں کا سلوک کیا گیا ہے۔ بچہ پیدائش کے وقت تک ماں کے پیٹ میں رہتا ہے۔ جب پیدائش کا وقت آتا ہے تو بچے کو ماں سے "الگ" ہونا پڑتا ہے ورنہ ماں اور بچہ دونوں کو خطرہ لاحق ہوتا ہے وقت مقررہ کے بعد ماں بچے کو پیٹ میں نہیں رکھ سکتی۔ بچہ اپنی دنیا اور اس کی ضرورتوں کا متقاضی ہوتا ہے۔"

جس شخص نے بھی مجھے سنا ہے وہ اتفاق کرے گا کہ میں سو فیصد ایلیا محمد کی نمائندگی کرتا تھا۔ میں نے خود کبھی کریڈٹ لینے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح کے اجتماعی مذاکروں میں کوئی نہ کوئی اس انتظار میں رہتا کہ موقع ملتے ہی مجھ پر "نیگروز کو مشتعل کرنے" کا الزام لگا سکے۔ اس کے جواب کے لیے مجھے کسی خاص تیاری کی ضرورت نہیں تھی۔ میں جواب دیتا کہ:

"امریکہ میں عیسائیت کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ سفید فام کے ہاتھوں سیاہ فام اشتعال پسند نہیں بنا۔۔۔ یہ معجزہ ہے کہ 22 ملین سیاہ فام ان جابروں کے خلاف نہیں اٹھ کھڑے ہوئے۔ حالانکہ اخلاقی اعتبار سے اور جمہوری روایات کے پیش نظر اس کا حق رکھتے تھے۔ یہ ایک معجزہ ہے کہ سیاہ فام قوم بڑی شدومد سے "دوسرا گال پیش کرنے" اور

”جنت بعداز مرگ“ کے فلسفہ پر یقین کیے ہوئے ہے۔ یہ ایک معجزہ ہے کہ سفید فاموں کی جنت میں صدیوں سے جہنم کا عذاب بھگتتے ہوئے امریکی سیاہ فام امن و سکون سے رہ رہے ہیں۔ معجزہ یہ ہے کہ سفید فاموں کے کٹھ پتلی نیگرو ”راہ نمائوں“ ان کے مبلغین اور ڈگریوں سے لدے تعلیم یافتہ نیگروز نے اپنے غریب سیاہ فام بھائیوں کا خون چوسنے کے ساتھ ساتھ انہیں قابو میں بھی رکھا۔“

الغرض جب تک سٹوڈیو میں ”آن دی ایئر“ کی سرخ بتی جلتی رہتی میں ایلیا محمد اور قومِ اسلام کی نمائندگی بھرپور طریقے سے کرنے کی کوشش کرتا۔

جن دنوں مسلمانوں کے متعلق اختلاف بڑھ رہا تھا اور ہم بڑی اجتماعی ریلیوں کا آغاز کرنے والے تھے انہی دنوں ڈاکٹر سی ایرک لنکن کی کتاب شائع ہوئی۔ جس کا عنوان تھا ”امریکہ میں سیاہ مسلمان“ (The Black Muslims in America) پریس والے ”سیاہ مسلمان“ کی ترکیب لے اُڑے۔ ہر تبصرے، ہر حوالے میں اس کتاب کے منتخب اقتباسات چھاپے جاتے۔ خصوصاً ہمارے متعلق منفی باتیں اور ڈاکٹر لنکن کی تحریر کو بہت سراہا جاتا۔ عوام کا ذہن ”سیاہ مسلمان“ کی ترکیب سے چپک کر رہ گیا تھا لیکن ایلیا محمد سے لیکر ”قوم اسلام“ کا ہر فرد اس لفظ سے مضطرب تھا۔ مجھے اس لفظ سے جان چھڑوانے میں لگ بھگ دو سال کوشش کرنا پڑی۔ میں ہر جگہ کہتا ”ہم امریکی سیاہ فام ہیں ہمارا مذہب اسلام ہے اور ہمیں صرف مسلمان پکارا جانا چاہیے“ لیکن اس لفظ نے کبھی ہمار پیچھا نہیں چھوڑا۔

ہمارے اجتماعی مظاہرے ابتداء ہی سے حیران کن حد تک کامیاب رہے۔ جہاں ڈیٹرائٹ کا معبد نمبر1 بڑے فخر کے ساتھ ایلیا محمد کی تقریر سننے کے لیے دس گاڑیوں کا کارواں بھیجا کرتا تھا وہاں اب ڈیڑھ دو سو سے لے کر بعض اوقات تین سو بسوں میں لوگ ایلیا محمد کی تقریر سننے جاتے۔ ہر بس میں ”ثمر اسلام“ کے دو رکن انچارج ہوتے۔ بس کے باہر بڑا سا کینوس کا بینر ٹنگا ہوتا۔ جسے راہ چلتے، ارد گرد کھڑے لوگ اور ٹریفک پولیس کے افراد پڑھتے۔ سینکڑوں متجسس مسلمان اور نیگروز بھی ہمارے ساتھ ہو لیتے۔ ایلیا محمد اپنے ذاتی جیٹ پر شکاگو سے تشریف لاتے ایئر پورٹ سے جلسہ گاہ تک ایلیا محمد کی گاڑی کے آگے پولیس کی گاڑی سائرن بجاتی چلتی۔ قانونی ادارے جو ہمیں پہلے پہل احمق سمجھتے تھے اب ہمیں ”سفید احمقوں“ سے بچانے کے لیے خصوصی اہتمام کرتے تاکہ کوئی ”واقعہ“ یا ”حادثہ“ پیش نہ آ جائے۔

امریکہ میں سیاہ فاموں کے اتنے شاندار جلسے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ ایلیا محمد کی تقریر سننے کے لیے ذاتی اور عوامی گاڑیوں سے دس دس ہزار لوگ جمع ہو جاتے جس کی وجہ سے بڑے بڑے ہال مثلاً نیویارک سٹی کا ”سنیٹ

نکولس ایرینا"، "شکاگوز کولیسئیم" اور واشنگٹن ڈی سی کا"یولائن ایرنیا" چھوٹے پڑ جاتے تھے۔ ان اجتماعات میں سفید فاموں کی شرکت پر پابندی تھی اس بات کا امریکی سیاہ فام نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا اور اس بات پر سفید فاموں اور ان کی "پتلیوں" نے ہم پر تازہ حملے شروع کر دیئے"ہمیں نسل پرست اور سیاہ "Segregationists" کہا گیا۔

بعد میں پہنچنے والے سینکڑوں سامعین کے لیے ہال میں جگہ نہ بچتی تو لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے باہر ہی ان کے سننے کا انتظام کر دیا جاتا۔ نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے "ثمر اسلام" کے اراکین واکی ٹاکی کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ رکھتے۔ ہال میں داخل ہونے والے مردوں، عورتوں اور بچوں کی اچھی طرح تلاشی لی جاتی جس کے ذمہ داری "ثمر اسلام" کے علاوہ پختہ عمر کی باپردہ مسلم عورتوں پر تھی۔ تمباکو اور شراب کے علاوہ ایسی چیزوں کا خصوصی دھیان رکھا جاتا تھا جس سے ایلیا محمد کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ ایلیا محمد خود بھی ایسے کسی حملے سے بے انتہا دہشت زدہ رہتے تھے اور اس سے بچاؤ کے لیے سامعین کی بھرپور تلاشی پر اصرار کرتے تھے۔ آج میں اس کی وجہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں۔

"ثمر اسلام" کے سینکڑوں سپاہی جو قریب کے معبدوں سے علی الصبح پہنچ جاتے تھے انہیں لوگوں کو بلحاظ مرتبہ ان کی نشستوں تک پہنچانے کا فرض سونپا جاتا۔ بالکنی اور ہال کا عقبی حصہ عام سیاہ فاموں سے بھر جاتا۔ ان سے آگے مسلمانوں کی نشستیں ہوتی تھیں جہاں سفید کپڑوں میں سیاہ فام بہنیں اور گہرے رنگ کے سوٹوں کے ساتھ سفید شرٹس پہنے بھائی بیٹھتے۔ ان سے اگلے حصہ میں کچھ نام نہاد سیاہ فام"معززین" کے لیے نشستیں مخصوص رکھی جاتی تھیں جنہیں باقاعدہ مدعو کیا جاتا تھا۔ ان میں سیاہ فاموں کی زبان بولنے والے "طوطے" اور "پتلے" دانش ور اور کاروباری لوگ ہوتے تھے۔ ایلیا محمد ان کی وجہ سے بہت رنجیدہ رہتے تھے کیونکہ یہ پڑھے لکھے تھے اور دیگر سیاہ فاموں کو مفلسی اور ذلت سے نکلنے میں بہت معاون ہو سکتے تھے اور ہم چاہتے تھے کہ ان تک ایلیا محمد کے پیغام کا حرف حرف پہنچے۔ سب سے اگلی دو قطاروں میں سیاہ فام صحافی اور فوٹوگرافرز بٹھائے جاتے جو نیگرو پریس کے علاوہ سفید فاموں کے اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے متعلق ہوتے تھے۔ امریکی سیاہ فام لکھاریوں کو ایلیا محمد کا شکر گزار ہونا چاہیے کیونکہ "قوم اسلام" کے متعلق لکھنا شہرت اور ترقی کا سب سے آسان راستہ تھا جس کی وجہ سے وہ آگے چل کر بہت معروف ہوئے۔

اسٹیج کے اوپر ایلیا محمد کی کرسی کے پیچھے پانچ چھ قطاروں میں ہم وزراء کی نشستیں ہوتیں تھیں کچھ وزراء سینکڑوں میل کا سفر کرکے یہاں پہنچتے تھے۔ ہم سب ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے اور "السلام و علیکم" کہتے۔ پرانے وزراء کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے وزراء سے بھی ملاقات ہوتی۔ ولبرٹ اور فلبرٹ دونوں علی الترتیب ڈیرائٹ اور لانسنگ کے معبدوں کے وزیر تھے۔ ایلیا محمد کا صاحبزادہ والس محمد، فلاڈیلفیا کے معبد کا وزیر تھا۔ کچھ وزراء کا ماضی بہت غیر معمولی تھا مثلاً واشنگٹن ڈی سی کے معبد کا وزیر "لوسی اس" اس سے قبل "سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ" تھا اور بتیسویں درجے کا "میسن" تھا۔ کیم ڈن، نیوجرسی کا وزیر جارج ایکس پتھالوجسٹ تھا وزیر ڈیوڈ ایکس قبل ازیں رچمنڈ، ورجینیا کے عیسائی گرجا گھر کا وزیر تھا اس کے ساتھ اس کے حواریوں کی اتنی بڑی تعداد مسلمان ہوئی کہ اکثریت کی بنیاد پر گرجا کو معبد میں بدل دیا گیا۔ بوسٹن کے ایک معبد کا نمایاں وزیر لوئیس ایکس ماضی میں "دی چارمر" کے نام سے مقبول اور ابھرتا ہوا گلوکار تھا اور اس نے ہماری قوم کے لیے پہلا مقبول گیت لکھا جس کا مکھڑا تھا "سفید فام کی جنت سیاہ فام کے لیے جہنم ہے۔" لوئیس ایکس ہی نے ہمارے لیے پہلا ڈرامہ لکھا جس کا عنوان تھا "اورگینا (Orgena)" جو دراصل "اے نیگرو" کے الٹے ہجے تھے۔ یہ ایک مقدمے کی روداد تھی جس میں ایک علامتی سفید فام کے غیر سفید فاموں کے خلاف عالمی جرائم کو موضوع بنایا گیا تھا۔ سفید فام کو مجرم قرار دیا جا کر سزائے موت سنائی جاتی ہے، وہ سیاہ فاموں کے لیے کیے گئے کارنامے بیان کرتا ہے لیکن سیاہ فام اسے گھسیٹتے ہوئے لے جاتے ہیں۔

چونکہ زیادہ تر معبد میرے قائم کردہ یا منظم کردہ تھے اس لیے ان بھائی وزراء کو دیکھ کر مجھے ابتدائی مشکلات یاد آ جاتیں جن کا موازنہ میں موجودہ صورتحال سے کرتا تو اسے اللہ کی قوت قرار دیتا اور مجھے ایلیا محمد کا فرمان بالکل درست معلوم ہوتا کہ ابتدائی قربانیوں کے دور میں انہیں اللہ کی طرف سے بذریعہ کشف لوگوں کی بہت سی تعداد دکھائی جاتی جو ان کی تعلیمات سن رہے ہوتے تھے۔ ایلیا محمد کا کہنا تھا کہ سفید فام کی قید کے دنوں یہی کشف تھے جو انہیں حوصلہ بخشتے تھے۔

جب قوم اسلام کے قومی سیکرٹری جان علی یا بوسٹن معبد کے وزیر لوئیس ایکس مائکروفون سنبھالتے تو سارے میں خاموشی چھا جاتی اور یہ برادران سیاہ فام سامعین کے سامنے ایک نئی دنیا پیش کرتے جس کا نام "قوم اسلام" تھا۔ "بہن ٹائی نیٹا ڈائی نیئر" مسلم خواتین کے موثر اور اہم کردار کو اجاگر کرتی اور ہماری قومی جدوجہد میں امریکی سیاہ فاموں کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی سماجی اور سیاسی حالت سدھارنے میں مسلم عورتوں کی اہمیت بیان کرتی۔

اس کے بعد میں مائکرو فون پر آتا تاکہ سامعین کو ایلیا محمد کے خطاب کے لیے تیار کروں۔ میں ہاتھ اٹھ کر کہتا "اسلام علیکم" جواباً مسلم نشستوں سے "وعلیکم السلام" کی گونج سنائی دیتی اس کے بعد میں گفتگو شروع کرتا:

"میرے سیاہ فام بھائیو اور بہنوں! آپ کسی بھی مذہب کے ماننے والے ہوں یا کسی بھی مذہب کو نہ ماننے والے ہوں ہمارے بیچ ایک عظیم اور اٹوٹ رشتہ ہے۔۔۔ہم سب سیاہ فام ہیں۔ میں جناب ایلیا محمد کی عظمت بیان کرنے میں زیادہ وقت صرف نہیں کروں گا۔ وہ پہلے اور واحد سیاہ فام رہنما ہیں جنھوں نے میرے اور آپ کے دشمن کو شناخت کیا ہے۔ عزت مآب ایلیا محمد وہ پہلے سیاہ فام راہ نما ہیں جنھوں نے ہمیں سرعام وہ سچائی بتانے کی جرأت کی ہے جسے ہم سیاہ فام زندگی بھر سنتے، دیکھتے اور سہتے چلے آئے ہیں یعنی۔۔۔

ہمارا دشمن سفید آدمی ہے!۔

رہا سوال کہ ایلیا محمد ہمیں یہ سب کیوں بتا رہے ہیں؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب آپ کو دشمن کا علم ہو جاتا ہے تو وہ آپ میں پھوٹ ڈال کر بھائی کو بھائی سے لڑوانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب آپ دشمن کو جان لیتے ہیں تو وہ دھوکے، وعدوں، جھوٹ اور منافقت سے آپ کو گونگا، بہرا اور اندھا نہیں رکھ سکتا۔

جب آپ دشمن کو پہچان لیتے ہیں تو وہ آپ کی ذہنی تطہیر نہیں کر سکتا اور نہ آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر آپ کو یہ دیکھنے سے محروم کر سکتا ہے کہ آپ دنیا میں جیتے جی جہنم میں رہ رہے ہیں اور وہ اسی دنیا میں جنت کے مزے لوٹ رہا ہے۔ یہ دشمن آپ کو یقین دلاتا ہے کہ آپ کا مقصد سفید فام عیسائی خدا کی عبادت کرنا ہے۔

یقیناً یہ شیطان ہمارا دشمن ہے اور میں یہ ثابت کروں گا۔ آپ کوئی سا روزنامہ اٹھالیں اور ہمارے پیارے مذہبی راہنما کے خلاف لگائے گئے جھوٹے الزامات کو پڑھیں۔ آپ دیکھیں گے کہ "کاکیشن" نسل کسی ایسے سیاہ فام شخص کو اپنے لوگوں کی نمائندگی کرنے کا حق نہیں دیتی جو ان کا طوطا یا پتلا نہ ہو۔ یہ کاکیشن شیطان آقا نہ ہمیں اپناتا ہے نہ آزاد کرتا ہے ہمیں صرف معاشرے کے انتہائی پست درجے میں رکھتا ہے۔ وہ ہمیں ایک خاص فاصلے پر رکھنا پسند کرتا ہے آنکھ سے اوجھل لیکن دست رس میں۔ وہ ایسے سیاہ فام راہ نمائوں کو پسند کرتا ہے جن سے وہ اندر کی خبر رکھ سکے۔ چونکہ ایلیا محمد نے اس کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا ہے اس لیے وہ ان سے نفرت کرتا ہے اور جب آپ اسے ایلیا محمد سے نفرت کرتے دیکھتے ہیں تو بغیر سوچے سمجھے آپ بھی اسے نسل پرست معلم نفرت یا ایسا سفید فام دشمن شخص سمجھنے لگتے ہیں جو سیاہ فاموں کی برتری کا مبلغ ہے..."

جناب ایلیا محمد جنہیں ہم اپنے الفاظ میں اسلام کی کمزور، شریف اور بھوری بھیڑ" کہتے تھے تشریف لاتے، مستعد، منتخب اور وفادار"ثمر اسلام" کے محافظ انہیں حصار میں لیے ہوتے۔ جناب ایلیا محمد کی ٹوپی پر چاند، سورج اور ستارے اور اسلامی جھنڈا کڑھا ہوا تھا۔ تمام مسلمان توصیفی نعرے لگانے لگتے "ننھی بھیڑ(Litte Lamb)""السلام علیکم۔""الحمدللہ۔"

میری طرح حاضرین کی آنکھوں میں آنسو بھر جاتے۔ انہوں نے مجھے اس وقت بچایا جب میں مجرم تھا۔ اپنے گھر میں سگے بیٹھے کی طرح میری تربیت کی۔ جب محافظ اسٹیج سے چند قدم دور رک جاتے اور ایلیا محمد تنہا سٹیج پر آتے تو سب وزراء آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملاتے، گلے ملتے، میں اس لمحے جذبات کی انتہائی بلندی پر ہوتا۔ میں مائکرو فون پر مشتاق سیاہ فاموں سے مخاطب ہوتا:

"میرے سیاہ فام بہنوں اور بھائیو! جب تک ہم خود کو نہیں پہچانیں گے ہمیں کوئی نہیں پہچانے گا۔ جب تک ہم اپنے مقام سے آگاہ نہیں ہوں گے منزل کا تعین نہیں کر پائیں گے۔ عزت مآب ایلیا محمد ہمیں ہماری شناخت اور مقام سے آگاہ کر رہے ہیں جو اس سے قبل امریکی سیاہ فام کے علم میں نہیں تھے۔ آپ محض دیکھنے سے ان کی قوت اور اختیار کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

وہ اپنی طاقت کا اظہار یا نمائش نہیں کرتے مگر پورے امریکہ میں ایسا اور کوئی سیاہ فام راہنما نہیں ہے جس کے پیروکار اس کے کہے سے اپنی جان نثار کر سکتے ہوں۔ میرے سیاہ فام بہنوں اور بھائیو! اب آپ امریکہ کے انتہائی دانش مند سیاہ فام امریکہ کے بہادر ترین سیاہ فام، امریکہ کے انتہائی بے خوف سیاہ فام اور شمالی امریکہ کے اس ویرانے کے سب سے زیادہ طاقت ور سیاہ فام کو سننے جا رہے ہیں۔"

جناب ایلیا محمد تیزی سے آگے آتے، ایک نگاہ خاموش سامعین پر ڈالتے اور کہتے "السلام علیکم" جواباً مسلمان بآواز بلند کہتے ""وعلیکم السلام' مسلمان سامعین تجربے کی بناء پر جانتے تھے کہ اگلے دو گھنٹوں تک ایلیا محمد سچائی کی دو دھاری تلوار بن کر خطاب کریں گے۔ ہر مسلم کو صرف یہ فکر تھی کہ اتنی لمبی تقریر سے ان کے دمے کے مرض پر برا اثر پڑے گا۔

"میرے پاس ایسی کوئی اعلیٰ ڈگری نہیں ہے جو مجھ سے قبل آپ سے مخاطب ہونے والے رکھتے تھے۔ لیکن تاریخ ڈگریوں کو درخور اعتناء نہیں سمجھتی۔

سفید فام نے آپ کو بچپن ہی سے اپنے خوف میں مبتلاء کر دیا ہے۔ آپ کا سامنا انسان کے سب سے بڑے دشمن سے ہے۔۔۔ وہ ہے خوف۔ مجھے علم ہے کہ آپ میں سے کچھ لوگ سچ سننے سے بھی ڈرتے ہیں۔ کیونکہ آپ کی پرورش ہی خوف اور جھوٹ پر ہوئی ہے۔ لیکن میں اس وقت تک سچ کہتا رہوں گا جب تک آپ خوف سے آزاد نہیں ہو جاتے۔

تمہارا آقا تمہیں اس سرزمین پر لایا اور تمہارے ماضی سے متعلق ہر چیز تباہ کر دی۔ آج تم اپنی زبان سے ناآشنا ہو، اپنے قبیلے سے ناواقف ہو۔ اگر تم اپنے قبیلے کا نام سنو تو اسے پہچان ہی نہیں پاؤ گے۔ تمہیں اپنی حقیقی ثقافت کا علم نہیں ہے۔ حتیٰ کہ تمہیں اپنے خاندان کے اصل نام کا پتہ نہیں ہے۔ تم سفید فام آقا کا دیا ہوا نام اختیار کیے ہوئے ہو، وہ آقا جو تم سے نفرت کرتا ہے۔

تم وہ لوگ ہو جو سمجھتے ہیں کہ انہیں انجیل اور عیسائیت کا مکمل علم ہے۔ تم اتنے بے عقل ہو کو تم عیسائیت کی سچائی کے علاوہ کسی اور چیز پر ایمان نہیں رکھتے۔

تم کرۂ ارض کا واحد گروہ ہو جو خود سے، اپنی نسل سے، اپنی صحیح تاریخ سے اور اپنے دشمن سے لاعلم ہے۔ تم ان باتوں کے علاوہ کچھ نہیں جانتے جو سفید فام آقا نے تمہیں بتانے کے لیے منتخب کر رکھی ہیں اور اس نے تمہیں وہی کچھ بتایا ہے جس کا فائدہ اسے اور اس کی نسل کو ہو اور اس نے تمہیں یہی بتایا ہے کہ تم بے حیثیت بے یارو مدد گار نام نہاد "نیگرو" ہو۔

میں نے لفظ "نام نہاد" استعمال کیا ہے کیونکہ تم "نیگرو" نہیں ہو۔ کیونکہ 'نیگرو' نام کی کسی نسل کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تم ایشیائی قوم کے رکن ہو جو "شہباز"(Shabazz) نامی قبیلہ سے ہے۔ "نیگرو" ایک تہمت ہے جو سفید فام آقا نے تم پر تھوپی ہے اور جب سے یہ سفید فام آقا غلاموں سے بھرا پہلا جہاز لے کر آیا اسی طرح تم پر، مجھ پر اور ہماری نسل پر تہمتیں تھوپتا آیا ہے۔"

جب ایلیا محمد سانس لینے کو رکتے تو مسلمان نعرے لگانے لگتے "ننھا میمنا (Little Lamb) " سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔" "ایلیا محمد ہمیں تعلیم دو" وغیرہ۔ ایلیا محمد بات آگے بڑھاتے "امریکہ میں ہم سیاہ نسل کے لوگ جس جہالت اور خود نفرتی میں مبتلاء ہیں وہ سفید فام آقا کی تعلیم کی عملی مثال ہیں۔ کیا ہم نے کرۃ اراض کے دیگر لوگوں کی طرح خود کو متحد کرنے کے لیے عقل سلیم کا استعمال کیا؟ نہیں ہم سر جھکائے، بیٹھے بھیک مانگ رہے ہیں اور آقا سے یک

جہتی کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں اس سے زیادہ مضحکہ خیز منظر کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہر روز یہ سفید فام تمہیں ہزار طریقے سے بتاتا ہے کہ "تم یہاں رہ نہیں سکتے، یہاں داخل نہیں ہو سکتے، یہاں کھا نہیں سکتے وہاں پی نہیں سکتے، ادھر چل نہیں سکتے ادھر کام نہیں کر سکتے یہاں سواری نہیں کر سکتے کھیل نہیں سکتے، پڑھ نہیں سکتے۔" کیا ہم اب بھی یہ بات نہیں سمجھ سکتے کہ وہ ہم سے یک جہتی نہیں چاہتا۔

تم اس کے کھیتوں میں کام کرتے ہو، اس کا کھانا پکاتے ہو، وہ گھر سے باہر ہو تو اس کے بیوی بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہو۔ کئی مرتبہ اس کے بچوں کو اپنی چھاتی سے دودھ پلاتے ہو۔ تم اس آقا سے کہیں زیادہ بہتر عیسائی ہو جتنا تمہیں عیسائیت سکھانے والا ہے۔

تمہارے خون پسینے کی محنت سے آج وہ اس ملک کو اتنا امیر بنانے کے قابل ہوا ہے کہ اپنے دشمنوں تک کو کروڑوں ڈالر کی امداد دے سکتا ہے اور جب یہ دشمن اس کی امداد سے قوت پکڑ کر اسی پر حملہ آور ہوتے ہیں تو تم ہی سپاہی بن کر اس کے لیے جان قربان کرتے ہو اور امن کے دنوں میں تم ہی اس کے قابل اعتماد خادم ہوتے ہو۔ لیکن اس امریکی عیسائی سفید فام کے اندر اتنی انسانیت اور اتنا سا انصاف بھی نہیں ہے کہ وہ ہم سیاہ فاموں کو جنہوں نے اس کے لیے اتنا کچھ کیا ہے اپنے جیسا انسان مان کر قبول کر لے۔"

مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دیگر سیاہ فام بھی پر جوش نعرے لگانے لگتے اور ایلیا محمد سے اصرار کرتے کہ وہ انہیں مزید بتائیں۔ ایلیا محمد کہتے۔

"لہٰذا ہمیں خود کو اس سفید فام سے جو ہم سے شدید نفرت کرتا ہے الگ کر لینا چاہیے۔ تم تو اس سے اتحاد و یگانگت کی بھیک مانگ رہے ہو اور آبرو کا لٹیرا یہ سفید نسل پرست کہتا ہے کہ سیاہ خون کی آمیزش سے اس کی نسل خراب ہو جائے گی۔ یہ اس کا کہنا ہے لیکن ذرا خود پر نگاہ ڈالو۔ اپنی نشستوں سے گردن گھما کر دیکھو اس سفید فام آقا نے پہلے ہی اتنی "یگانگت" پیدا کر رکھی ہے کہ چند سیاہ فاموں کو چھوڑ کر کسی کا رنگ روپ بھی اپنے اجداد سے مطابقت نہیں رکھتا۔"

"میرے خدایا۔ یہ آدمی ٹھیک کہتا ہے" غیر مسلم سیاہ فاموں کے گروہ سے آوازیں آتیں "ایلیا محمد ہمیں اور بتائو۔ سنو سب اس کی بات سنو۔"

”اس نے ہمارے اندر بے حد معمولی سیاہی چھوڑ ی ہے۔“ ایلیا محمد اپنی بات جاری رکھتے ”اب جب وہ ہم سے اتنی نفرت کرتا ہے تو دراصل وہ خود سے نفرت کرتا ہے اور پھر اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے؟ اس کے قانون کے مطابق اگر ہمارے اندر ایک قطرہ سیاہ خون بھی ہے تو ہم سیاہ فام ہیں۔ چنانچہ جب ہم ہر صورت سیاہ فام ہیں تو پھر ہم اس بچے کھچے سیاہ خون کے قطرے کے دفاع کا اعلان کرتے ہیں۔“ جناب ایلیا محمد کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار دکھائی دینے لگتے لیکن وہ بات جاری رکھتے ”چنانچہ اسی دلیل کی بنیاد پر ہم خود کو سفید فام سے الگ کرتے ہیں تاکہ مزید ”یگانگت“ سے خود کو بچا سکیں۔

یہ سفید فام جو اپنے آپ کو اتنا اچھا اور فیاض سمجھتا ہے جو اپنے دشمنوں کی بھی مالی معاونت کرتا ہے ہماری لیے بلکہ اپنے وفادار نوکروں اور غلاموں کے لیے ایک علیحدہ ریاست یا علیحدہ علاقہ مختص نہیں کر سکتا؟ ایک ایسا علاقہ جہاں ہم خود کو سفید فاموں کی کچی بستیوں سے بلند کر سکیں۔ ہم اپنے لیے کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے۔ ہمیں اپنی صلاحیتوں کے استعمال کا موقع ہی نہیں ملا کیونکہ ہمارے ذہن اس حد تک دھو دیئے گئے ہیں کہ ہمیں اپنی ہر ضرورت کے لیے اسی سفید فام آقا کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتے ہیں۔“

جب انہیں خطاب کرتے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہوجاتا تو سب وزراء نے باری باری گزارش کی کہ انہیں خطاب ختم کر دینا چاہیے لیکن وہ مضبوطی سے اسٹینڈ کو پکڑے تقریر جاری رکھتے۔

”ہم سیاہ فام اپنی صلاحیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کوئی بھی بغیر آزاد ہوئے اپنی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتا حتیٰ کہ اگر آپ کے گھر میں پالتو بلی بھی ہے تو یہ جاننے کے لیے کہ وہ اپنی خوراک حاصل کر سکتی ہے اور اپنا دفاع کر سکتی ہے آپ کو اسے جنگل میں آزاد چھوڑنا پڑے گا۔ ہم امریکی سیاہ فاموں کو اپنی صلاحیتیں جانچنے کے لیے کبھی آزادی نہیں دی گئی۔ ہم اپنا بوجھ اٹھانے کا علم اور تجربہ رکھتے ہیں۔ ہم نے زندگی بھر کھیتی باڑی کی ہے ہم اپنے لیے خوراک اگا سکتے ہیں۔ ہم اپنی ضروریات کے حصول کے لیے فیکٹریاں لگا سکتے ہیں۔ ہم تجارت اور کامرس کر سکتے ہیں اور دوسرے مہذب لوگوں کی طرح آزاد ہو سکتے ہیں۔“

اس زمینی ، بھلائی اور خودنفرتی سے جان چھڑوا کر بھائیوں کی طرح اکٹھے رہ سکتے ہیں ہماری تھوڑی سی زمین ہو اور اپنے لیے کچھ کر سکیں سفید فام آقا جانے اور اس کا کام۔“

جناب ایلیا محمد جب مزید نہ بول سکتے تو اچانک چپ کر جاتے تالیاں تھیں کہ بجتی چلی جاتیں۔ میں بڑی مشکل سے حاضرین کو چپ کرواتا ثمر اسلام کے کارکن قطاروں میں کاغذی بالٹیاں لے کر چندہ جمع کرنے کے لیے گھومنے لگتے میں حاضرین سے کہتا:

”جیسا کہ آپ جانتے ہیں اور آپ نے ابھی سنا ہے کہ عزت مآب ایلیا محمد اور ان کے پروگرام کو چلانے اور قائم رکھنے کے لیے سفید فاموں کا ایک پیسہ بھی استعمال نہیں ہوتا جناب ایلیا محمد کا پروگرام اور ان کے پیروکار ”یگانگت“ نہیں رکھتے جناب ایلیا محمد کا پروگرام اور تنظیم مکمل طور پر سیاہ ہیں۔

ہم واحد سیاہ تنظیم ہیں جسے صرف سیاہ فام لوگ ہی امداد دیتے ہیں۔ یہ نام نہاد ”نیگرو پروگریس“ تنظیمیں یہ دعوے کرکے کہ وہ ہمارے حقوق کے حصول کے لیے ہماری طرف سے لڑ رہے ہیں ہماری بے عزتی کرتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ وہ سفید فام سے اس لیے لڑ رہے ہیں کہ وہ ہمیں حقوق دینا نہیں چاہتا جھوٹ ہے کیونکہ ان تنظیموں کی سرپرستی گورا خود کرتا ہے۔ اگر آپ کا تعلق کسی ایسی تنظیم سے ہے تو آپ سالانہ دو یا تین یا پانچ ڈالر چندہ دیتے ہونگے لیکن ان تنظیموں کو دو تین اور پانچ ہزار ڈالر کے عطیات کہاں سے آتے ہیں؟ سفید فام آدمی سے۔ جو ان کا پیٹ بھرتا ہے لہٰذا وہ ان تنظیموں کو کنٹرول بھی کرتا ہے ان کی رہنمائی کرتا ہے اور ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اپنی عقل استعمال کرو۔۔۔ کیا اپنی اولاد کی طرح تم کسی کی سرپرستی کرکے اس پر اختیار اور کنٹرول حاصل نہیں کرو گے یا اس کی راہنمائی نہیں کرو گے؟

سفید فام بڑی خوشی سے جناب ایلیا محمد کی سرپرستی کرنا چاہتا ہے کیونکہ اگر ایلیا محمد اس کی امداد پر انحصار کریں گے تو وہ انہیں مشورے دے سکے گا۔ میرے سیاہ بہنوں اور بھائیو چونکہ جناب ایلیا محمد کی امداد صرف تمہارے پیسے سیاہ پیسے، سے ہوتی ہے اسی لیے وہ شہر بہ شہر اجتماعات منعقد کرتے ہیں تاکہ ہم سیاہ فاموں کو سچ بتا سکیں۔ اسی لیے ہم تمام سیاہ فاموں سے امداد کا مطالبہ کرتے ہیں۔“

چندے کی بالٹیاں بڑی تیزی سے بھرنے لگتیں انہیں جلدی سے خالی کیا جاتا اور وہ پھر بھر جاتیں ان پیسوں سے ناصرف جلوسوں کے اخراجات پورے ہو جاتے بلکہ قوم اسلام کی تعمیر و ترقی کے لیے بھی مدد ملتی۔

بہت سارے بڑے اجتماعات کے بعد ایلیا محمد نے سفید فام صحافیوں کو اجتماع میں شامل کرنے کی اجازت دے دی۔ لیکن ثمر اسلام دوسرے لوگوں کی طرح ان کی بھی مکمل تلاشی لیتے ان کے کیمرے کے خول، کیمرے، کاپیاں وغیرہ اچھی طرح چیک کیے جاتے۔

بعد میں جناب ایلیا نے کہا کہ جو سفید فام سچ سننے کے خواہش مند ہوں وہ بھی ہمارے عوامی اجتماعات میں شامل ہو سکتے ہیں۔ بہت جلد ایک علیحدہ حصہ سفید فام لوگوں سے بھرنے لگا۔

آنے والے سفید فاموں میں زیادہ تر طلباء اور علامہ ہوتے تھے میں ان کے جامد اور سرخ چہرے دیکھتا رہتا۔ کیونکہ سفید آدمی جانتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ شیطانی کام ہے میں سیاہ فاموں پر حملے کرنے والے نام نہاد دانشور اور پیشہ ور سیاہ فاموں کے چہرے بھی دیکھتا رہتا ان کے پاس علمی استعداد تھی وہ تکنیکی اور سائنسی مہارت رکھتے تھے جو ان کے سیاہ فام بھائیوں کو اس پسماندہ حالت سے نکال سکتی تھی۔ لیکن یہ تمام سیاہ فام پیشہ ور اور دانشور سوائے ذلت کے اور بھیک کے شاید کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتے تھے اور ہر وقت نام نہاد آزاد خیال سفید فاموں کے ساتھ یگانگت کی کوشش میں لگے رہتے۔ سفید فام انہیں تسلی دیتے کہ ایک دن سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ صرف صبر اور انتظار کرو۔ یہ دانشور اور پیشہ ور سیاہ فام صرف اس لیے اپنے ہم نسلوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے کیونکہ یہ متحد نہیں ہیں۔ اگر یہ باہم متحد ہوتے، اپنے ہم نسلوں سے متحد ہوتے تو یہ دنیا بھر کے سیاہ فاموں کو فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ میں اس سچ کے اثرات کا اندازہ ان کے چہروں کے تغیر سے لگا سکتا تھا۔

ہماری نگرانی کی جاتی تھی۔ ٹیلی فونز ٹیپ کئے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ آج بھی اگر میں اپنے ذاتی ٹیلی فون پر یہ کہوں کہ میں امپائر اسٹیٹ بلڈنگ کو بم سے اڑانے لگا ہوں تو پانچ منٹ میں میرے گھر کو گھیر لیا جائے گا۔ بعض اوقات عوامی خطبات میں حاضرین کے درمیان میں ایف بی آئی اور دیگر اداروں کے ایجنٹوں کے چہرے پہچان لیتا تھا۔ پولیس اور ایف بی آئی دونوں تواتر کے ساتھ ہم سے پوچھ گچھ کرتے رہتے۔ جناب ایلیا محمد کہتے "مجھے ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جو کچھ مجھے چاہیے وہ میرے پاس موجود ہے یعنی۔ "سچ" بہت سی راتیں میں یہ سوچ سوچ کر گزار دیتا کہ اس دو دھاری تلوار (ایلیاء محمد) کی تعلیمات جدید علوم میں بہترین تربیت یافتہ لوگوں سے بھرپور حکومت کو کیسے پریشان متفکر اور مشتعل کر سکتی ہیں۔ پھر میں سوچتا کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک وہ سب سے زیادہ جاننے والا یعنی خود اللہ راہنمائی نہ کرے۔

سیاہ فام ایجنٹوں کو ہمارے اندر، نفوذ کے لیے بھیجا جاتا۔ لیکن سفید فاموں کے یہ جاسوس اکثر "پہلے سیاہ فام" والے جذبات کے حامل نکلتے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ تمام لیکن ان میں سے بعض جب ہم میں شامل ہو کر سچائی سنتے اور غور کرتے تو ہمارے لیے کام کرنے پر تیار ہو جاتے۔ کچھ تو سفید فاموں کی ایجنسیوں سے استعفیٰ دے کر قوم اسلام میں شامل ہو جاتے۔ کچھ اپنی نوکریاں برقرار رکھتے ہوئے جوابی جاسوسی کرتے اور ہمیں سفید فاموں کے اقدامات کے بارے میں آگاہ کرتے رہتے۔ اس طرح ہمیں علم ہوا کہ ہمارے معبدوں کے اندرونی حالات جاننے کے علاوہ دوسری بڑی پریشانی جو آج بھی میرے خیال میں امریکہ کے نزدیک سب سے بڑی پریشانی ہے یہ تھی کہ سیاہ فام مجرم بڑی تیزی سے اسلام قبول کر رہے تھے۔ عموماً اسلام قبول کرنے والے مجرموں سے دوران قید ہی قوم اسلام کے اخلاقی اصولوں کی پابندی کا عہد لے لیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب وہ جیل سے نکل کر معبد میں داخل ہوتے تو رجسٹریشن کے لیے مکمل تیار ہوتے۔ سچ پوچھیں تو وہ ان مسلمانوں کی نسبت جنہوں نے کبھی اندر سے جیل نہیں دیکھی زیادہ بہتر تیار ہوتے تھے۔

عیسائی گرجوں کی نسبت ہمارے ہاں داخلہ زیادہ مشکل تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی شخص ایلیا محمد کا پیروکار ہونے کا اعلان کر کے بھی وہی پرانی گناہ آلود، غیر اخلاقی زندگی گزارتا رہے۔ کسی بھی مسلمان کو ہمارے سخت معیار پر پورا اترنے سے قبل اپنی ظاہری اور اخلاقی حالت بدلنا پڑتی تھی۔ بہت کم اجلاس ایسے ہوتے جن میں تازہ منڈے ہوئے سر کے ساتھ نو مسلم بھائی نظر نہ آتے ہوں۔ انہیں سب سے پہلے ہمیشہ کے لیے جعلی، لئی سے کانک شدہ، دھاتی رنگ کے بالوں کو، جسے آج کل کچھ لوگ "دی پراسس The Process کہتے ہیں خیر آباد کہنا پڑتا تھا۔ مجھے آج بھی جہالت اور خود نفرتی کی اس علامت کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ مجھے علم ہے کہ میری اس بات سے کانک شدہ یا پراسسڈ غیر مسلم بھائیوں کے جذبات مجروح ہوں گے مگر آپ جب بھی کسی کو اس حال میں دیکھیں گے تو قریب جانے پر وہ جاہل ہی نکلے گا۔ کیونکہ یہ سفید بال چیخ چیخ کر اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ "مجھے نیگرو ہونے پر شرمندگی ہے۔" اگر وہ میری طرح اپنے سیاہ ہونے پر فخر محسوس کرنے لگے تو اپنے آپ کو زیادہ بہتر محسوس کرے گا۔

کوئی مسلمان سگریٹ نوشی نہیں کرے گا۔۔۔ یہ بھی ہمارا ایک اصول تھا۔ بعض مسلمانوں کے لیے سگریٹ چھوڑنا اور بعض کے لیے منشیات چھوڑنا کافی مشکل تھا۔ لیکن جب ہم سیاہ فام عورتوں اور مردوں کو بتاتے کہ سفید فام گورنمنٹ کو عوام کی صحت سے زیادہ تمباکو کی صنعت سے حاصل ہونے والے اربوں ڈالر کے ریونیو سے زیادہ دلچسپی ہے تو وہ سگریٹ نوشی چھوڑنے پر تیار ہو جاتے۔ نئے مسلمان ہونے والے شخص سے پوچھا جاتا کہ ایک نوکری پیشہ سگرٹوں

کے ایک ڈبے کے لیے کتنی رقم ادا کرتا ہے اور پھر اسے بتایا جاتا کہ عام قیمت پر خریدے گئے ہر ڈبے پر سرکار خون پسینے سے کمائے دو ڈالر ٹیکس کی مد میں اینٹھ لیتی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ نے بھی کہیں پڑھا ہو کیونکہ اس پر بہت لکھا گیا ہے کہ "قوم اسلام" نے عادی نشہ بازوں کی حیران کن تعداد کو نشہ ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ بلکہ "نیویارک ٹائمز" کی ایک کہانی کے مطابق چند سماجی اداروں نے مطبی (Clinical) مشوروں کے لیے مسلم زعماء سے راہنمائی بھی چاہی تھی۔

مسلم پروگرام کا آغاز رنگ اور نشے کے باہمی تعلق کے بارے میں آگاہی سے ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ کرۂ ارض کے مغربی حصہ میں مقامی نشہ بازوں کا سب سے بڑا ارتکاز ہارلم میں تھا۔ ہمارے پروگرام کا ابتدائی اور بڑا حصہ ان مسلمانوں پر مشتمل تھا جو خود ماضی میں "جنکیز" (Junkies) رہ چکے تھے۔ یہ پرانے نشہ باز دوستوں سے کام شروع کرتے۔ یہ ایک صبر آزما کام تھا جو چند ماہ سے ایک سال تک طویل ہو سکتا تھا۔ اس کے چھ بنیادی نکات تھے سب سے پہلے نشہ باز کو یہ ماننا ہوتا تھا کہ وہ نشہ باز ہے دوسرے درجے میں اسے نشے کی وجوہات تلاش کرنے پر مائل کیا جاتا۔ پھر اسے بتایا جاتا کہ نشہ ترک کرنا ممکن ہے چوتھے درجے میں اس کے اندر اتنی خودداری اور انا پیدا کی جاتی کہ وہ محسوس کرنے لگتا کہ وہ نشہ ترک کر سکتا ہے۔ پھر نشہ باز خود یکدم نشے کا استعمال روک دیتا تھا۔ چھٹے درجے میں وہ صحت یاب ہو کر اپنے واقف نشہ بازوں کی اصلاح کے لیے جت جاتا تھا۔

یہ چھٹا درجہ وہ مقام تھا جہاں عام تنظیمیں بے بس ہو جاتی تھیں کیونکہ نشہ باز کی ضد اور شک اس راہ میں رکاوٹ بن جاتا تھا۔ لیکن مسلمان دوستوں کے ساتھ غیر مسلم سیاہ فام نشہ باز کا رویہ مختلف ہوتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کو نصیحت کرنے والا خود بھی پندرہ سے تیس ڈالر روزانہ کا نشہ باز تھا اور وہ دونوں مل کر نشہ بازی بلکہ چوری چکاری تک کرتے رہے تھے۔ پھر یہ مسلمان نشہ بازوں کے ساتھ بازاری اور روزمرہ کی زبان میں گفتگو کر سکتے تھے۔

شراب نوش کی طرح نشہ باز بھی اس وقت تک اپنے علاج کی جانب مائل نہیں ہوتا جب تک وہ اپنی صحیح حالت کا اندازہ نہ کر لے۔ مسلمان اپنے سیاہ فام دوست کو جونک کی طرح چمٹ جاتے اور اسے مسلسل احساس دلاتے رہتے۔ نشہ باز کے ذہن میں اس احساس کو جگہ بنانے میں مہینوں لگ جاتے اس کے بعد ہی اس کا صحیح علاج شروع ہوتا۔ بعض اوقات تو درجن بھر نشہ باز صرف اس لیے مسلمان کی بات سننے پر رضا مند ہو جاتے تھے کیونکہ انہیں علم ہوتا تھا کہ وہ بھی انہی میں سے رہ چکا ہے۔

مسلمان انہیں بتاتے کہ ”ہر نشہ باز نشہ کا استعمال فرار کے لیے کرتا ہے“ اور زیادہ تر جنکیز سفید فاموں کے امریکہ میں سیاہ فام ہونے کے احساس کو دبانے کے لیے نشہ کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیاہ فام نشہ کر کے سفید فام کا یہ قول سچ ثابت کر رہے ہیں کہ ”سیاہ فام کی کوئی اوقات نہیں ہے۔“

مسلمانوں کی گفتگو سادہ اور راز دارانہ ہوتی تھی ”تم جانتے ہو کہ میں تمہارے جذبات سمجھ سکتا ہوں کیا میں تم جیسا ہی نہیں ہوتا تھا؟ بندروں کی طرح جسم کھجاتا ہوا بدبودار غلیظ بھوکا چوریاں کرتا اور ان گوروں سے چھپتا۔ بندہ خدا تم سوچو تو سہی کہ سفید فام سے منشیات خریدنے کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ گورے امیر ہوتے جا رہے ہیں اور تم موت کے منہ میں جا رہے ہو۔“

مسلمانوں کو اس بات کا بخوبی علم ہوتا تھا کہ کب دوسرے شخص کو نشہ ترک کرنے کے لیے قوم اسلام میں شمولیت کا راستہ دکھانا ہے۔ اس نشہ باز کو مقامی مسلمان ریسٹورنٹ میں لایا جاتا کبھی کبھی اسے سماجی مواقع پر دوسروں سے ملوایا جاتا جہاں صاف ستھرے اور عزت نفس سے آگاہ مسلمان دکھائی دیتے جو کچی بستیوں کے ابتر اور ناشائستہ رویہ کی بجائے باہمی طور پر عزت محبت اور اخلاق کا مظاہرہ کرتے نظر آتے۔ نشہ باز کو شاید زندگی میں پہلی مرتبہ خلوص دل سے بھائی جناب اور محترم کہہ کر پکارنے والے لوگ ملتے جہاں کسی کو اس کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اول تو کوئی اس کے نشہ کا ذکر ہی نہیں کرتا تھا اگر کرتا بھی تو اسے اس سخت چیلنج کا سامنا کرنے کا مشورہ دینے کی حد تک ہوتا تھا۔

جوں جوں نشہ باز میں خود اعتمادی پیدا ہوتی توں توں وہ یہ سوچنے لگتا کہ نشہ چھوڑنا ممکن ہے پہلی بار اسے سیاہ فام کی عزت نفس کا احساس ہوتا۔

جو شخص معاشرے کے کیچڑ اور غلاظت میں رہنے کا عادی ہو اس کے لیے یہ تمام باتیں بہت قوت بخش ثابت ہوتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک بار یقین پیدا ہو جانے سے جیسی کایا کلپ پستی میں رہنے والے کی ہوتی ہے کسی کی نہیں ہوتی اور میں اپنے آپ کو اس کی بہترین مثال کہتا ہوں۔ بالآخر وہ وقت آ جاتا جب نشہ باز نشہ ترک کرنے کی تکلیف سہنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ ان حالات میں مسلمان ضروری دنوں میں چوبیں چوبیں گھنٹے شفٹ میں اس کے ساتھ وقت گزارتے۔ جب نشہ باز نشہ ترک کر دیتا تو عادت سے مجبور ہو کر چلاتا گڑ گڑاتا اور گالی گلوچ کر کے ”صرف ایک کش“ کی فریاد کرتا۔ اس وقت مسلمان اسی کی زبان میں اسے کہتے ”اس بندر کو گردن سے اتار پھینکو اس عادت پر لعنت بھیجو سفید فام سے پیچھا چھڑوا لو“ تکلیف سے بل کھاتے ہوئے نشہ باز کی آنکھیں اور ناک بہنے لگتے وہ سر

سے پائوں تک پسینے میں ڈوب جاتا اپنا سر دیواروں سے ٹکرانے کی کوشش کرتا اپنے تیار داروں سے لڑتا کبھی قے کرتا کبھی اسہال میں مبتلا ہو جاتا اس وقت مسلمان اسے کہتے "سب کچھ نکل جانے دو تم ٹھیک ہو جائو گے اور ایک روز ثمر اسلام میں شامل ہوجائو گے" جب یہ تکلیف دہ مرحلہ ختم ہو جاتا تو مسلم تیار دار سابق نشہ باز کی صحت بحال کرنے کے لیے اسی یخنی وغرہ پلاتے وہ زندگی بھر مشکل وقت میں ساتھ دینے والے ان مسلمان بھائیوں کو نہ بھول پاتا۔۔۔وہ یہ کبھی نہیں بھول پاتا تھا کہ یہ "قوم اسلام" کا منصوبہ تھا جس نے اسے نشے کے جہنم سے بچایا۔ اس کے بعد وہ سیاہ فام بھائی(یا بہن جس کی تیار داری کسی مسلمان بہن نے کی تھی) زندگی بھر نشے کا خیال بھی دل میں نہیں لاتا تھا۔ بلکہ سابق نشہ باز اپنی تجدید، عزت نفس کی بحالی اور پاکیزگی کے حصول کے بعد خود "جنکی جنگل" (Janki Jangle) میں اپنے کسی دوست کو بچانے کے لیے داخل ہو جاتا۔

اگر کوئی سفید فام یا "اجازت یافتہ" سیاہ فام مسلمانوں کی ہی طرح منشیات سے تحفظ کا منصوبہ کامیابی سے چلاتا تو اسے سرکاری مراعات، تعریف و توصیف ملتی ہے۔ وہ سپاٹ لائٹ اور شہہ سرخیوں میں آ جاتا ہے لیکن اس کے برعکس ہم پر تنقید شروع ہو جاتی ہے۔ حکومت اور شہر کے کروڑوں ڈالر بچانے پر مسلمانوں کو مراعات کیوں نہیں دی جاتیں؟ مجھے صحیح علم نہیں ہے کہ نشہ بازوں کے جرائم سے سالانہ کتنا نقصان قومی سطح پر ہوتا ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ صرف نیویارک سٹی میں اس کا سالانہ تخمینہ اربوں ڈالر ہیںہے اور ایک اندازے کے مطابق صرف ہارلم میں سالانہ بارہ ملین ڈالر چور لے اڑتے ہیں۔

نشہ باز روزانہ کے نشے کی قیمت جو اندازاً دس سے پچاس ڈالر ہوتی ہے اپنی محنت سے نہیں کماتا وہ رقم کما بھی کیسے سکتا ہے؟ وہ چوری کرتا ہے، اٹھائی گیری کرتا ہے، دوسرے انسانوں پر عقاب یا گدھ کی طرح جھپٹتا ہے، جیسے میں کرتا تھا۔

نشہ باز عورتیں "بوسٹ" (Boost) (دکانوں سے اشیاء چرانا) یا عصمت فروشی کرتی تھیں۔ ایسی سیاہ فام عورتوں کو اخلاقی طور پر مسلمان بننے کی اہل بنانے کے لیے مسلم بہنوں کو زیادہ سخت رویہ اپنانا پڑتا تھا۔ وہ انہیں احساس دلاتیں کہ "تم سفید فاموں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہوں کہ وہ تمہارے جسم کو محض کوڑا کرکٹ سمجھیں۔"

ابتدائی دور میں جناب ایلیا محمد کے پیروکار زیادہ تر سابق مجرمان اور جنکیز تھے اور قوم اسلام کی بنیاد میں ان کا معتدبہ حصہ تھا جناب ایلیا محمد اکثر کہتے کہ ہمیشہ کم ترین سیاہ فاموں پر توجہ دو۔ وہ تبدیل ہونے کے بعد زیادہ اچھے مسلمان بنتے تھے۔ لیکن بتدریج ہم نے دیگر سیاہ فاموں پر بھی توجہ دی اور ان "اچھے عیسائیوں" کو گرجا گھروں سے نکالا اس

کے بعد پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ نیگروز بھی ہمارے رکن بنتے گئے۔ ہر ریلی کے بعد مقامی طور پر چند ایسے لوگ ہمارے رکن بنتے جو نام نہاد ”درمیانے درجہ“ سے تعلق رکھتے تھے اور قبل ازیں ہمیں ”نفرت کے مبلغ“ اور ”سیاہ نسل پرست“ اور اس طرح کے دیگر ناموں سے بلاتے تھے۔ مسلم حقائق سننے اور سمجھنے کے بعد سیاہ نوجوان لڑکوں اورلڑکیوں کی کثیر تعداد ہمارے ساتھ شامل ہوتی گئی با صلاحیت اور تربیت یافتہ لوگوں کے لیے قوم اسلام میں بڑی گنجائش تھی۔

کچھ ایسے بھی رجسٹرڈ مسلمان تھے جو سفید فاموں میں اپنے مرتبے کی وجہ سے اپنے آپ کو مسلمانوں کے علاوہ کسی اور کے سامنے مسلمان ظاہر نہیں کرتے تھے۔ انہیں صرف وزراء یا جناب ایلیا محمد ہی جانتے تھے۔

1961ء میں ہماری قوم کافی پھلی پھولی ہمارے اخبار ”محمد سپیکس“ میں پچھلے صفحے پر ایک ماہر تعمیرات کا بنایا ہوا اسلامک سینٹر کا خاکہ چھپا جو بیس ملین ڈالر کی لاگت سے شکاگو میں تعمیر ہونا تھا ہر مسلمان اس کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا اس منصوبہ میں ایک مسجد، سکول، کتب خانہ اور ہسپتال سیاہ فاموں کے شاندار ماضی پر مشتمل ایک عجائب گھر کی تعمیر بھی شامل تھی۔

جناب ایلیا محمد نے اسلامی ممالک کا دورہ کرنے کے بعد ہمیں ہدایت کی کہ ہم اپنے معبدوں کو آئندہ مساجد کہا کریں گے۔

اب ہماری ترقی کی رفتار بہت بڑھ چکی تھی اور چھوٹے موٹے تاجروں کی تعداد کافی زیادہ ہوگئی تھی۔ ان تاجروں نے دوسرے سیاہ فاموں کو بتایا کہ اگر ہم متحد ہو جائیں اور جہاں تک ممکن ہو ایک دوسرے کے ساتھ لین دین کریں اور ایک دوسرے کو ملازم رکھیں اور دیگر اقلیتوں کی طرح اپنا پیسہ اپنے پاس رکھیں تو سیاہ فام اپنے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

جناب ایلیا محمد کی تقاریر بے حد باقاعدگی کے ساتھ ایک چھوٹے ریڈیو اسٹیشن کے ذریعے امریکہ بھر میں نشر ہوتی تھیں۔ ڈیٹرائٹ اور شکاگو میں سکول جانے والے بچے ہائی سکول اور جونیئر ہائی سکول کے ذریعے یونیورسٹیز آف اسلام میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ کنڈر گارٹن سے ہی انہیں سیاہ فاموں کی شاندار تاریخ سے آگاہ کیا جاتا اور تیسرے درجے سے ہی انہیں سیاہ فاموں کی اصل زبان یعنی عربی پڑھائی جاتی۔

جناب ایلیا محمد کے آٹھوں بچے قوم اسلام کے اہم عہدوں پر کام کر رہے تھے اور اس وقت میں ان سے وابستگی کی بنا پر کافی فخر محسوس کرتا تھا۔ جب ایلیا محمد نے مجھے وزیر بنا کر بھیجا تو میں اس بات پر شرم محسوس کرتا تھا کہ ان کے اپنے بچے سفید فاموں کے لیے ٹیکسیاں چلاتے ہیں یا تعمیراتی کام کرتے ہیں یا سفید فاموں کی فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں۔ میری آرزو تھی کہ میں ایلیا محمد کے گھرانے کے لیے بھی میں اسی خلوص سے کام کروں جس خلوص سے ان کے لیے کام کرتا تھا۔ ایک بار میں نے ایلیا محمد صاحب کو تجویز بھی دی کہ اگر وہ اجازت دیں تو میں چند مساجد سے چندہ اکٹھا کر لوں تاکہ ان کے بچے سفید فاموں کی نوکری سے چھٹکارا پا کر اپنی قوم ہی میں کسی نوکری کے لائق ہو جائیں۔ ایلیا محمد صاحب نے میری تجویز سے اتفاق کیا خصوصی چندے کی مہم نہایت کامیاب رہی اور رفتہ رفتہ ان کے بچے قوم کے لیے کام کرنے کے لائق ہوگئے۔ ایما نوئل آج کل ایک ڈرائی کلیننک پلانٹ چلاتا ہے بہن ایتھل (محمد) شریف مسلم بہنوں کی سپریم انسٹرکڑ ہے (اس کا شوہر ریمنڈ شریف ثمر اسلام کا سپریم کیپٹن ہے) بہن لاٹی محمد دو یونیورسٹیز آف اسلام کی سپروائزر ہے۔ نیتھنیئل محمد ڈرائی کلینگ پلانٹ پر اپنے بھائی کے ماتحت ہے۔ ہربرٹ محمد میرا شروع کردہ قوم کا اخبار "محمد اسپیکس" (Muhammad Speaks) شائع کرتا ہے۔ ایلیا محمد جونیئر ثمر اسلام کا اسسٹنٹ سپریم کیپٹن ہے۔ والس محمد فلاڈیلفیا کی مسجد کا وزیر تھا۔ جسے بعد میں میرے ساتھ ہی معطل کر دیا گیا جس کی وجہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ سب سے چھوٹا لڑکا اکبر محمد جامعہ الازھر قاہرہ کا طالب علم ہے اس نے بھی اپنے باپ سے تعلق توڑ لیا ہے۔

طویل تھکا دینے والی مسلسل تقاریر ہی کا نتیجہ تھا کہ جناب ایلیا محمد کا "برانکئیل ایسما" (Bronchial Asthma) شدت اختیار کر گیا، گفتگو کرتے کرتے ان پر کھانسی کا دورہ پڑتا جو بڑھتا چلا جاتا اور انہیں ہلا کر رکھ دیتا اور انہیں نہ چاہنے کے باوجود وقت سے پہلے بستر میں لیٹنا پڑتا۔ انہیں پہلے سے طے شدہ بڑی بڑی ریلیوں میں حاضری معطل کرنا پڑتی جس سے ہزاروں سامعین کو مایوسی ہوتی۔

قوم کے تمام اراکین بہت پریشان تھے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ انہیں خشک آب و ہوا میں رہنا چاہیے جس پر قوم نے ایلیا محمد کو فینکس ایریزونا میں ایک گھر خرید دیا۔ شروع میں ایک بار جب جہاز سے اترتے ہی مجھے کیمرہ مینوں نے گھیر لیا اور مجھے پر فلیش لائیٹس کی روشنیاں پڑنے لگیں میں بہت حیران ہوا کہ میری آمد کی اطلاع انہیں کیسے ہوگئی؟ لیکن پھر مجھے کیمروں کے پیچھے گنز نظر آئیں تو علم ہوا کہ وہ ایریزونا انٹیلی جنس ڈویژن کے لوگ تھے۔

تمام مسلمان اس خبر سے بے حد خوش ہوئے کہ ایریزونا کی آب وہوا ”ایلیا محمد“ کو بہت راس آئی ہے۔ تب سے وہ سال کا زیادہ حصہ وہیں گزارتے ہیں اور اس کمزوری صحت کے باوجود ان پر فیصلہ سازی اور انتظامی امور کی ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ ہماری قوم میں داخلی اور خارجی ہر اعتبار سے وسعت پیدا ہو رہی تھی اور جناب ایلیا محمد کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا کہ انہیں کس عوامی خطاب یا ریڈیو یا ٹیلی ویژن کی دعوت قبول کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان معاملات کا فیصلہ بھی کرنا ہوتا تھا جو میں ان کے سامنے رکھتا تھا۔

جناب ایلیا محمد نے مجھ پر اظہار اعتماد کے لیے تنظیمی امور میں مجھے خود فیصلے کی اجازت دے دی۔ ان کا کہنا تھا کہ قوم اسلام کی بہتری کے لیے میں اپنی دانست میں جو بہتر سمجھوں فیصلہ کر سکتا ہوں۔ ایک بار انہوں نے مجھ سے کہا ”میلکم بھائی میں تمہیں مشہور دیکھنا چاہتا ہوں کیونکہ تمہاری مقبولیت دراصل میری مقبولیت ہے۔ لیکن ایک بات یاد رہے کہ تمہیں نفرت کا عادی ہونا ہو گا کیونکہ لوگ معروف لوگوں سے حسد کے مارے نفرت کرنے لگتے ہیں“ ان کے منہ سے میرے لیے اس سے زیادہ سچی بات کبھی نہیں نکلی تھی۔

!

باب:15

آئی کیرس(I Carus)

جتنی زیادہ جگہوں پر میں ایلیا محمد کی نمائندگی کرتا اتنے ہی سامعین کے خطوطو کی تعداد بڑھتی جاتی۔ جن میں 95 فیصد سفید فاموں کے ہوتے تھے۔ ان میں سے بہت کم ایسے ہوتے جن میں مجھے "ڈیئر نیگر۔ ایکس" کہہ کر میری تحقیر کی گئی یا موت کی دھمکی دی گئی ہوتی تھی۔ زیادہ تر خطوط سے یہ بات سامنے آتی تھی کہ سفید فاموں کو بنیادی طور پر دو خوف ہیں نمبر ایک ان کا ذاتی خوف کہ اللہ ان کی تہذیب کو تباہ کرنے والا ہے نمبر دو اور زیادہ عام خوف یہ کہ سیاہ فام مرد اور سفید فام عورت کا جسمانی تعلق بڑھتا جا رہا ہے۔

سفید فام خط نویسوں کی حیران کن تعداد ایلیا محمد صاحب سے مسئلے کے تجزیئے تک تو اتفاق کرتی تھی لیکن ان کے مجوزہ حل سے متفق نہیں تھی۔ اس کے علاوہ خط نویسوں میں سے بعض "سفید شیطان" کی اصطلاح سے خاصے خائف ہوتے تھے۔ میں اس کی وضاحت کے لیے اپنی تقریر کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"جب تک ہم کسی خاص سفید آدمی کو 'شیطان کہہ کر نہ پکاریں تب تک اس اصطلاح سے کوئی ایک سفید فام مراد نہیں ہے۔ ہم مجموعی طور پر سفید فام کے تاریخی ریکارڈ کی بات کرتے ہیں۔ ہم بات کرتے ہیں سفید فام کی کہ اجتماعی ہوس مظالم اور ان برائیوں کی جس نے اسے غیر سفیدفاموں کے لیے شیطانی افعال پر مجبور کیا ہے ہر ذہین ایماندار اور نکتہ سنج شخص تسلیم کرے گا کہ سفیدفام کی غلاموں کی تجارت اور اس کے نتیجے میں کئے گئے شیطانی اقدامات نہ صرف امریکہ میں سیاہ فاموں کی موجودگی کا باعث بنے ہیں بلکہ جس حال میں یہاں سیاہ فام رہ رہا ہے اس کا باعث بھی ہیں۔ آپ کو ایک سیاہ فام بھی ایسا نہیں ملے گا چاہے کوئی بھی ہو، جو ذاتی طور پر سفید فام معاشرے کے شیطانی افعال کا نشانہ نہ بنا ہو۔"

تقریباً ہر روز کسی نہ کسی اخبار میں “سیاہ مسلمانوں” پر کوئی نہ کوئی حملہ کیا جاتا اور ان کا واضح نشانہ “میلکم ایکس” ہوتا تھا۔ مجھے اپنی ذرا پرواہ نہیں تھی لیکن ایلیا محمد صاحب پر کیے گئے حملے مجھے مشتعل کر دیتے۔

سماجی کارکن اور دانشور مجھے اس مسئلے سے الگ رکھنے کی کوشش کرتے خصوصاً سیاہ فام کیونکہ ان کے تنخواہوں کے چیکوں پر سفید فام دستخط کرتا تھا۔ ان کے بقول اگر میں معاشرے کو تقسیم نہیں کر رہا تھا تو نادانستگی میں نسلی تعصب کو ہوا ضرور دے رہا تھا اور اگر میں انہیں اپنی سچائی سے لاجواب کر دیتا تو وہ کہتے “میلکم ایکس اپنے مفاد کے لیے کام کر رہا ہے۔”

ایک بار ایک مسلمان بھائی نے جو ہارلم کے ایک معروف کمیونٹی سنٹر میں نوجوانوں کے ساتھ کام کرتا تھا مجھے ایک خفیہ رپورٹ دکھائی۔ جس میں چند بزرگ سیاہ فاموں کو ایک ماہ کی چھٹی اس غرض سے دی گئی تھی کہ وہ “سیاہ مسلمانوں” کی تفتیش کریں۔ اس کے ہر پیراگراف پر مجھے لغت دیکھنا پڑتی تھی۔

سوال یہ ہے کہ ہم میں سے کون ہارلم کے سب کلچر سے زیادہ واقف تھا۔ میں جو کہ سالہا سال تک ان گلیوں بازاروں میں اُچکا رہ چکا تھا یا وہ نام نہاد پڑھے لکھے چھچھورے سیاہ فام سماجی کارکن؟ لیکن میں اسے اہم نہیں سمجھتا۔ امریکہ کے بائیس ملین سیاہ فام لوگوں میں وہ خوش قسمت معدودے چند ہی تھے جنہیں کالج جانا نصیب ہوا۔ لیکن ان پڑھے لکھے نیگروز نے بھی سفید فاموں کی نسبت تعلیم کا مقصد نہیں سمجھا، یہ ایسی جامد تعلیم تھی جس میں لفظوں کے علاوہ کچھ نہیں سکھایا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے سفید فام نے اتنی آسانی سے امریکی سیاہ فاموں کو قابو کر رکھا ہے اور دبا رکھا ہے۔ ان پڑھے لکھے سیاہ فاموں میں سے شاید ہی کسی نے اپنی تعلیم کے ذریعے میری طرح، سفید فام معاشرے کی مادہ پرستی، مقابلے اور کتے کا دشمن کتا پر مشتمل نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی ہو۔ نسلوں سے ہمارے نام نہاد سیاہ فام پڑھے لکھے، سفید فاموں کے خیالات پھیلا رہے ہیں۔

یہ بات حقیقت ہے کہ سفید فام غیر معمولی ذہین اور ہوشیار ہے اس کی دنیا اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ ایسی کسی چیز کا نام بتایئے جو وہ نہ بنا سکتا ہو، ایسا کونسا سائنسی مسئلہ ہے جو وہ حل نہ کر سکتا ہو بلکہ اب تو وہ انسانوں کو خلا میں بھیجنے اور پھر حفاظت سے واپس لانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن انسانی تعلقات کے اکھاڑے میں سفید فام کی ذہانت کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں اور اگر وہ انسان غیر سفید ہوں تو اس کی عقل بالکل جواب دے جاتی ہے۔ اس کے جذبات اس کے عقل پر غالب آ جاتے ہیں وہ غیر سفید فاموں کے خلاف ناقابل یقین جذباتی اور وقتی اقدامات کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے اندر سفید فام کی برتری کا احساس بہت گہرا ہے۔

کیا ایٹم بم گرانے کا مقصد صرف امریکی زندگیوں کو بچانا تھا؟ کیا سفید فام اتنا بھولا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی حقیقت دنیا کی دو تہائی غیر سفید فام آبادی سے چھپی رہی۔ بم گرائے جانے سے پہلے یہاں امریکہ میں ایک لاکھ وفادار اور مقامی پیدائشی جاپانی امریکیوں کو ریوڑ کی طرح ہانک کر خاردار تاروں کے پیچھے کیمپوں میں بند کر دیا گیا۔ اس کے مقابلے میں جرمنی میں پیدا شدہ امریکن شہریت رکھنے والے جرمنوں کو کیمپوں میں بند نہیں کیا گیا۔ وجہ؟ کیونکہ وہ سفید فام تھے۔

تاریخی اعتبار سے بھی غیر سفید فام نے ہمیشہ سفید فام کی فطرت میں چھپے شیطان کو ننگا کیا ہے۔ اسے امریکہ کی سفید دانش کے اندھے پن کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ اسے یہ بھی نظر نہیں آیا کہ لاکھوں سیاہ فام غلاموں کو آزادی اور پھر محدود تعلیم حاصل کرنے کا موقع دے کر وہ امریکہ ہی میں ایک بہت بڑے عفریت کو پال رہا ہے جو ایک نہ ایک دن ضرور سر اٹھائے گا۔ سفید فام آدمی کا خلا کھنگالنے والا ذہن اسے یہ نہیں بتا پایا کہ اگر غلاموں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے تو وہ اپنے آقا سے ڈرنا چھوڑ دیتے ہیں تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ پڑھے لکھے غلام پہلے سوال کرنے لگتے ہیں پھر اپنے آقا کے ساتھ برابری کا تقاضہ کرنے لگتے ہیں۔

آج جس انداز سے سیاہ فام امریکی، سیاہ فاموں کو دیکھتے ہیں اس طرح خود سفید فام بھی اپنے آپ کو نہیں دیکھ پاتے۔ بائیس ملین سیاہ فاموں میں یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ قطع نظر امریکہ کے عالمی تاثر کے اگر سیاہ فام اٹھ کھڑے ہوں تو وہ سیاسی معاشی اور کسی حد تک سماجی طور پر امریکہ میں اچھی خاصی پریشانی پیدا کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو بتا رہا تھا کہ کس طرح1963ء میں ایلیا محمد کی تعلیمات کو شکست دینے کے خواہش مند اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے رپورٹروں سے میں کس طرح تنہا لڑ رہا تھا۔ مجھے یہ رپورٹرز “فیرٹس“(Ferrets) لگتے تھے جو مجھے کونے میں لگانے کے لیے ہر وقت کسی نئے حیلے کی ٹوہ میں رہتے تھے۔

اگر کبھی کوئی سماجی حقوق کا راہ نما کوئی ایسا بیان دیتا جو سفید عوام کے اختیاراتی ڈھانچے کے لیے ناموزوں ہوتا تو یہ رپورٹرز اسے اس کے مقام پر پہنچانے کے لیے میری آڑ لیتے اور مجھ سے اس طرح کے سوال پوچھتے “جناب میلکم ایکس آپ دھرنوں اور اس طرح کے دیگر نیگرو احتجاجی مظاہروں کے خلاف ہیں آپ کی منٹگمری بائیکاٹ کے متعلق کیا رائے ہے، جس کی سربراہی ڈاکٹر کنگ کر رہے ہیں؟“

اگرچہ سماجی حقوق کے راہ نما مسلمانوں پر حملے کرتے رہتے تھے لیکن میرا خیال تھا کہ وہ آخر میری ہی نسل اور میری ہی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اگر میں سفید فام کو سماجی حقوق کے خلاف منصوبہ بندی کی اجازت دوں تو یہ

محض بیوقوفی ہوگی۔ میں جواب دینے سے پہلے بائیکاٹ کے پس منظر پر غور کرتا بیگم روز اپارکس بس میں سوار گھر آ رہی تھی۔ ایک سٹاپ پر سفید فام بس ڈرائیور نے اسے نشست خالی کرنے کا حکم دیا تاکہ سوار ہونے والا سفید فام بیٹھ سکے۔ میں ان سے جواباً کہتا۔ "دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایک مہذب ، محنت کش اور عیسائی سیاہ فام عورت ہے جس نے کرایہ ادا کیا ہے اور اپنی نشست پر بیٹھی ہے اسے کھڑا ہونے کا حکم صرف اس بنا پر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ سیاہ فام ہے۔ کبھی کبھی تو اس سفید فام کا تکبر میری سمجھ سے بالا ہو جاتا ہے۔" یا میں کہتا" کوئی شخص یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سے واقعات تھے جنہوں نے منٹگمری کے نیگروز کے جذبات اس اندوہ ناک واقعہ سے بھڑکا دیئے۔ جنوبی سیاہ فام صدیوں سے انتہائی الم ناک زندگی گزارتے چلے آتے ہیں۔ اجتماعی قتل، عصمت دری، گولی کا نشانہ بنانا، مارپیٹ، لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ تاریخ کبھی کبھی کم الم ناک واقعات ہی سے تحریک پکڑتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک گم نام ہندوستانی وکیل کو ٹرین سے اتارا گیا تھا۔ اس ناانصافی سے تنگ آکر اس نے برطانوی شیر کی دم مروڑ کر گانٹھ لگا دی تھی۔ اس کا نام مہاتما گاندھی تھا۔"

یا میں کبھی ایک کرتب کا استعمال کرتا جسے میں نے عام زندگی میں یا ٹیلی ویژن پر وکیلوں کو کرتے دیکھا تھا۔ میں منطقی طور پر بات بڑھا کر سوال کی شکل میں انہی کے آگے رکھ دیتا۔ "جناب میرے خیال میں تو ان لوگوں کو بھی بائیکاٹ میں شامل ہو جانا چاہیے جنہیں بری، بحری اور فضائی فوج میں شامل کیا جاتا ہے۔ ہم کسی ایسی "جمہوریت" کے لیے جان کیوں دیں جو چار سو سال سے غلامی اور ملکی خدمت کرتے سیاہ فام پر ایک دن پہلے آئے سفید فام مہاجر کو فوقیت دیتی ہے؟"

سفید فام ایسے درجنوں مقامی بائیکاٹ قبول کر سکتا تھا مگر اسے یہ منظور نہیں تھا کہ 22 ملین نیگروز میری طرح سوچنا شروع کر دیں۔ یہ بتانے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے کہ میرا کہا کبھی چھاپا نہیں جاتا تھا اور اگر چھپتا بھی تھا تو اس کی شکل بدل دی جاتی تھی۔ ایسے مواقع پر سفید فام رپورٹرز سر جوڑ کر بیٹھ جاتے اور سوال پوچھنا ختم کر دیتے۔

اگر میرے ذہن میں کوئی اچھا نکتہ ہوتا تو میں ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر میزبان کو خود اس کی طرف لے آتا۔ بظاہر یوں محسوس ہوتا کہ میں بھول کر نام نہاد معاشرتی حقوق میں بہتری کا ذکر کر بیٹھا ہوں۔ مثلاً کسی بڑی صنعت میں دس شو پیس نیگروز کی ملازمت یا کسی نئے ہوٹل کا پیسے کمانے کی خاطر نیگروز کے لیے ایک نئی شاپ کھولنا کسی جنوبی یونیورسٹی کا نوجوان سیاہ فاموں کو داخلہ دینا وغیرہ وغیرہ یہ سنتے ہی پروگرام کا میزبان خوشی سے اچھل پڑتا اور میرے دام میں پھنس جاتا اور کہتا۔ "واقعی جناب میلکم ایکس آپ اپنی نسل کے لیے ان بہتری کے اقدامات سے انکار نہیں کر سکتے۔"

”کوئی ایسا دن نہیں جاتا جب آپ معاشرتی حقوق میں بہتری کی بات نہ سنتے ہوں۔ سفید فام چاہتا ہے کہ سیاہ فام ہر وقت ”ہیلے لویا“(Hallelujah تعریف، خوشی یا تشکر کا عیسائی انداز۔ مترجم) کے نعرے لگاتے پھریں۔ چار سو سال سے سفید فاموں نے فٹ بھر لمبی چھری سیاہ فاموں کی پیٹھ میں گھونپ رکھی ہے۔ اب سفید فام اس چھری کو تھوڑا سا باہر نکال رہا ہے۔ غالباً پانچ چھ انچ تو کیا سیاہ فام کو اس بات پر شکر گزار ہونا چاہیے؟ اگر سفید فام نے یہ چھری نکال بھی لی تو زخم کا نشان پھر بھی رہ جائے گا۔“

اسی طرح جب کوئی میئر یا کوئی سٹی کونسل یہ دعویٰ کرتی کہ اس کے علاقے میں کوئی نیگرو مسئلہ نہیں ہے تو اس کا بیان میرے آگے رکھ دیا جاتا۔ میں جواب دیتا کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس علاقے میں نسبتاً بہت کم نیگروز رہتے ہیں اور یہ ایک عالمی سچائی ہے مثلاً جمہوری انگلینڈ ہی کو لیں۔ جب ایک لاکھ ویسٹ انڈین وہاں پہنچے تو انگلینڈ نے سیاہ فام مہاجرین پر پابندی لگا دی۔ فن لینڈ نیگرو امریکی سفیر کا استقبال تو کرتا ہے مگر دیگر سیاہ فاموں کو اپنے ملک میں نہیں آنے دیتا یا روس میں جب خروشیف اقتدار میں تھا اس نے ان سیاہ فام افریقی طلباء کے ویزے کینسل کرنے کی دھمکی دی تھی جنہوں نے نسلی امتیاز کے خلاف مظاہرے کر کے دنیا کو بتایا تھا کہ روس بھی...“

اندرون جنوب کی سفید فام پریس عام طور پر میرا بلیک آئوٹ رکھتی تھی۔ لیکن جب میں نے شمالی سفید فاموں اور سیاہ فام فریڈم رائیڈرز کے جنوبی علاقے میں جانے اور مظاہرے کرنے کے متعلق رائے دی تو مجھے صفحہ اول پر چھاپا گیا۔ میں نے اس صورت حال کو مضحکہ خیز قرار دیا۔ کیونکہ شمالی علاقوں میں، ان کے اپنے گھر میں ایسی کچی بستیاں موجود تھیں جو ان کی توجہ چاہتی تھیں۔ میرا کہنا تھا کہ غیر معمولی آزاد خیال نیویارک میں ایسے مسائل مسی سپی سے بھی زیادہ تھے۔ اگر یہ شمالی فریڈم رائیڈرز چاہتے تو ان کچی بستیوں کی بنیادی مشکلات پر کام کر سکتے تھے جہاں آدھی رات کو چھوٹے بچے اپنے گھر کی چابیاں گلے میں پہنے سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں کیونکہ ان کے ماں باپ شرابی نشے کے عادی چور اور عصمت فروش ہیں یا یہ شمالی فریڈم رائیڈرز ناردرن سٹی ہالز یونینز اور بڑی صنعتوں کی طرف توجہ دے سکتے تھے۔ کم از کم وہ نیگروز کو نوکریاں فراہم کر کے اس بیروزگاری وظیفے سے نجات دلائیں جو محض کاہلی پیدا کرتا ہے اور جس نے ان کچی بستیوں کو اتنا تباہ کر دیا ہے کہ وہ انسانوں کے رہنے کے لائق نہیں رہیں۔ یہی سچ تھا اور ہے۔ لیکن ایسی بات کہنے پر آزاد خیال، سانپوں سے بھی زیادہ سرعت سے مجھ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان آزاد خیالوں کے اردگرد سے وہ مقدس ہالہ نوچ پھینکتا جو انہوں نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ شمال کے یہ آزاد خیال ایک مدت سے جنوب والوں پر انگلیاں اٹھا رہے تھے لیکن جب میں نے ان کا پردہ چاک کر کے بتایا کہ وہ دنیا کے بدترین

منافق ہیں تو وہ مٹھیاں بھینچ کر مجھ پر چڑھ دوڑے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی اس منافقت کا ایک آئینہ ہے۔ میں شمالی سفید فام کی تخلیق ہوں مجھے جنوبی علاقے کے متعلق کچھ علم نہیں۔ جناب ایلیا محمد نے سفید فام جنوبیوں کو ان کا حق ضرور ادا کیا ہے۔

جنوبی سفید فام کے متعلق آپ ایک بات کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایمان دار ہے۔ وہ سیاہ فام پر دانت نکوستا ہے اور ان کے منہ پر کہتا ہے کہ جنوبی سفید فام اس جعلی یگانگت کو کبھی قبول نہیں کرے گا بلکہ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ اسے اگر لڑنا بھی پڑا تو دریغ نہیں کرے گا۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ جنوبی سیاہ فام اپنے مخالف کے متعلق کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہے۔ آپ بہت سے ایسے جنوبی سفید فاموں سے واقف ہونگے جو انفرادی طور پر بہت سے نیگروز کی پدرانہ انداز میں مدد کرتے ہیں لیکن شمالی سفید فام بظاہر مسکراتا ہے لیکن اس کے منہ میں جھوٹ اور مکاری سے بھرے ہوئے "برابری اور "یگانگت" کے الفاظ ہیں۔ دراصل امریکہ کا سب سے خطرناک سیاہ فام وہ ہے جسے شمالی سفید فام کے نظام اختیار نے جمہوریت کے دعوے کر کر کے کچی بستیوں میں مقید کر رکھا ہے۔

یک جہتی یا یگانگت کا لفظ شمالی آزاد خیال کی ایجاد ہے جس کے کوئی حقیقی معنیٰ نہیں ہیں۔ آپ خود سوچیں کہ موجودہ نسلی مفہوم میں اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ "یگانگت" کا لفظ مکار شمالی آزاد خیالوں نے امریکی سیاہ فاموں کو ان کی اصل ضروریات سے گمراہ کرنے کے لیے بنایا ہے۔ امریکہ بھر کی پچاس نسل پرست اور غیر نسل پرست ریاستوں کے لاکھوں افراد اس لفظ کی وجہ سے مخمصے میں ہیں اور سخت ناراض ہیں۔ انہیں غلط فہمی ہے کہ سیاہ فام عوام سفید فاموں کے ساتھ گھل مل کر رہنا چاہتی ہے حالانکہ یہ آرزو ان مٹھی بھر "یگانگت کے دیوانے نیگروز" کے علاوہ اور کسی کی نہیں جو سفید فاموں کی محبت میں ان سے بھی زیادہ سیاہ مخالف اور سفید پرست واقع ہوئے ہیں۔ امریکی عوام کی آرزو صرف انسانی حقوق کا حصول اور بطور انسان عزت ہے اور یہی اصل مسئلہ ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ لوگ انہیں کوڑھی سمجھ کر ان سے اجتناب کریں۔ وہ جانوروں کی طرح کچی بستیوں اور جھونپڑ پٹیوں میں نہیں رہنا چاہتے۔ وہ ایسے آزاد اور کھلے معاشرے کے خواہش مند ہیں جہاں وہ مردوں عورتوں کی طرح سر اٹھا کر جی سکیں۔ بہت کم سفید فاموں کو اس بات کا احساس ہے کہ سیاہ فام ان کے ساتھ وقت گزارنا پسند نہیں کرتے اس یک جہتی یا یگانگت کے تاثر نے سفید فام کو وہم ڈال دیا ہے کہ سیاہ فام اس کے گھر میں شراکت چاہتا ہے۔ جو کہ غلط ہے اوسط سفید فام یہ بات کبھی تسلیم نہیں کرے گا کہ سیاہ فام کی سب سے بڑی خواہش سفید عورت کا حصول نہیں ہے۔ زیادہ تر سیاہ فام اپنے جیسے لوگوں میں رہنا پسند کرتے ہیں اور یہ بورژوا نیگروز جب نام نہاد یگانگت سے بھرپور کاک ٹیل

پارٹیوں سے گھر واپس آتے ہیں تو اپنے جوتے ادھر ادھر اچھالتے ہوئے آزاد خیال سفید فاموں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے کتوں کا ذکر کر رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ سفید فام آزاد خیال بھی ان کا ذکر اسی طرح کرتے ہوں لیکن یہ بات میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ مجھے تنہائی میں انہیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا البتہ بورژو / نیگروز جانتے ہیں کہ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا جب کوئی سچائی میرے علم میں آتی ہے تو میں اسے زبان پر لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس وقت ضرورت ہے اس بات کی کہ سیاہ فام اور سفید فام تلخ اور برہنہ سچائیوں کا تبادلہ کریں تاکہ پچھلے چار سو سال سے چھائی ہوئی دھوکے جھوٹ اور کلیشے کی فضا صاف ہو سکے۔ بہت سی چھوٹی کمیونیٹیز میں سفید فاموں نے ہم سیاہ فاموں کی بھلائی کے حوالے سے اپنا تاثر بڑا اچھا بنا رکھا ہے۔ لیکن جب کبھی کوئی مقامی نیگرو کسی مقامی سفید فام کو یہ بتاتا ہے کہ وہ دوسرے درجے کی زندگی اور ووٹ کے حق سے محرومی سے تنگ آ چکا ہے تو اسے جواب ملتا ہے ”بدقسمتی سے تمہاری انہی باتوں پر تمہارے ہمدرد سفید فام تمہارے خلاف ہو رہے ہیں... کتنے افسوس کی بات ہے اچھی بھلی بہتری ہو رہی تھی لیکن تمہارے رویے سے باہمی ابلاغ منقطع ہو گیا ہے۔“

حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ دونوں گروہوں میں کبھی کوئی ابلاغ تھا ہی نہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے پورے یونائٹڈ سٹیٹس میں ایک طبقہ بھی ایسا نہیں تھا جس کی زبانی سفید فام کو یہ علم ہوتا کہ نیگروز ان حالات کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں جو سفید فام کے پیدا کردہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب نیگروز نے امریکہ بھر میں ردعمل کا آغاز کیا تو سارے امریکہ کو صدمہ اور حیرانی ہوئی۔

یہ وہ حالات ہیں جو نیگروز کے غصے کو نکتہ انقلاب تک لے آئے ہیں اور سفید فام کو اس کا ادراک ہی نہیں۔ تمام مقامی نیگرو رہنما اپنی لیڈری بچانے کے لیے سفید فام کو یقین دلاتے رہتے ہیں۔ ”سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے آقا“ جب یہ لوگ ڈرتے ڈرتے کوئی چھوٹی موٹی رعایت مثلاً علاقے میں بہتر سکول کا قیام مانگتے ہیں تو اگر ان آقاؤں کو مقامی نیگروز سے کوئی شکایت نہ ہو تو وہ انہیں اسکول یا کوئی نوکری عطا کر دیتے ہیں۔

امریکہ بھر میں ہزاروں کمیونیٹیز کے صاحب اختیار لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں بالکل درست کہہ رہا ہوں کیونکہ اناپرست سفید فام نیگروز کے استحصال پر شرمندگی محسوس کرنے کی بجائے اس بات کو باعث وقار سمجھتا ہے کہ نیگروز اس کے ٹکڑوں پر پلتے رہیں۔ لیکن میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ خوشامد اور جھوٹ کا جو نظام امریکی سفید فام نے بنایا ہے وہ اس کے لیے کسی دوسرے ملک کے حملے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اس رویے نے امریکی سفید فام کی نفسیات میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ وہ ”برتر“ ہے۔ سکول سے بھاگا ہوا سفید فام بھی خود کو یونیورسٹی سے

فارغ التحصیل سکولوں کے پرنسپلز، اساتذہ، ڈاکٹروں اور دوسرے لوگوں سے برتر سمجھتا ہے۔ اس نظام کو سفید فام نے تمام دنیا کے غیر سفید فام لوگوں پر مسلط کر رکھا ہے۔ اسی لیے وہ دن بدن خطرات اور مسائل میں گھرتا جا رہا ہے۔ اس کی بقا کا دارومدار اس سچائی کا سامنا کرنے یا نہ کرنے میں ہے۔ آج ہمیں غیر سفید فام لوگوں میں جو انقلابی تبدیلی نظر آ رہی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سینکڑوں سالوں سے کم تری اور استحصال کا عذاب بھگتنے والے سیاہ 'بھورے، سرخ اور زردلوگ سفید فاموں کی ریڈیوں تلے سسک سسک کر تنگ آ گئے ہیں اور زندگی یا موت کے مقام پر آ کھڑے ہیں۔

امریکی حکومت غیر سفید اقوام کو کس طرح "جمہوریت" اور "بھائی چارے کی تبلیغ کر سکتی ہے جبکہ ساری دنیا ہر روز اخبارات کے ذریعے ہزاروں بیانات پر بھاری ایسی تصاویر دیکھتی ہے جن میں امریکیوں کے دعویٰ جمہوریت اور "بھائی چارے کی قلعی کھل جاتی ہے اور لوگ دیکھتے ہیں کہ امریکی امریکہ ہی میں پیدا ہونے والے غیر سفید فاموں کے خلاف کیا سلوک کرتے ہیں؟ دنیا بھر کے غیر سفید فام جانتے ہیں کہ نیگروز نے کس طرح امریکی سفید فام کی "غلامی اور دیکھ بھال" کی ہے۔ اس نیگرو نے وردی پہن کر امریکہ کے لیے اپنی جان کی قربانی دی ہے۔ ایسے قابلِ اعتماد اور وفادار غیر سفید فام سے ایسی نفرت کہ اس پر کتے چھوڑے جاتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں قید کیا جاتا ہے، بری طرح پیٹا جاتا ہے اور اسے اسی طرح کے دیگر جرائم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

یہی وجوہات ہیں جن کی بناء پر ہر روز دنیا بھر کے غیر سفید فاموں کے زخم ہرے ہوتے ہیں اور نتیجتاً کہیں کسی سفید فام کی لیموزین جلائی جاتی ہے۔ کہیں سفارت خانوں پر پتھراؤ کیا جاتا ہے کہیں "سفید فاموں۔ واپس جاؤ" کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ کہیں سفید فام مبلغوں پر حملے ہوتے ہیں اور کہیں جھنڈے جلائے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر میں کھل کر کہتا ہوں کہ امریکی سفید فام کو جتنا نقصان اس کے سرطان زدہ احساسِ برتری نے پہنچایا ہے کسی اور حملہ آور فوج نے بھی نہیں پہنچایا۔

امریکی سیاہ فام کو اپنی تمام توجہ ذاتی کاروبار کرنے اور معقول گھر کے حصول پر رکھنی چاہیے، جیسا کہ دیگر نسلی گروہوں نے کیا ہے۔ کیونکہ عزت کے حصول کا یہی واحد ذریعہ ہے اور عزتِ نفس ہی ایسی چیز ہے جو سفید فام ہمیں نہیں دے سکتا۔ جب تک سیاہ فام کو وہ سب کچھ حاصل نہ ہو جائے جو دوسرے لوگوں کو حاصل ہے اور جب تک وہ اپنے لیے وہی کچھ نہ کرنے لگے جو دوسرے اپنے لیے کرتے ہیں تب تک وہ آزادی اور بطور انسان شناخت حاصل نہیں کر سکتا۔

سرِ دست کچی بستیوں میں رہنے والے کالوں کو اپنی مادی، اخلاقی اور روحانی اصلاح کرنا چاہیے۔ ضرورت ہے کہ سیاہ فام شراب، منشیات اور رنڈی بازی سے جان چھڑوانے کا خود ساز منصوبہ شروع کرے۔ اسے اپنی اقدار بلند کرنا ہوں گی۔

محض چند ہزار نیگروز، جو نسبتاً تعداد میں بہت کم ہیں، اس “یگانگت” میں حصہ لے رہے ہیں۔ یہی وہ بورژوا نیگروز ہیں جو اپنی محدود کمائی سفید فاموں کے اعلیٰ ہوٹلوں، پرتعیش نائٹ کلبوں اور عمدہ اور مہنگے ریستورانوں میں ضائع کر آتے ہیں۔ اس طرح وہ “یک جہتی” ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر آپ واقعی اس “یک جہتی” پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ کو “باہمی شادی” تک آنا ہو گا۔

میں جنوب کے سفید فاموں کا حامی ہوں جو نام نہاد “یگانگت” کو بے معنی سمجھتا ہیں یا محض ایک وقتی چیز تاآنکہ باہمی شادیوں کو فروغ دیا جائے۔ سفید فام اپنے منفی رویے کا تاثر اپنے اردگرد بسنے والے سیاہ فام گھرانوں کو اکثر دیتے رہتے ہیں اور جو جذبات آج کل زیادہ تر نیگروز کے ہیں ان کے پیش نظر کسی دوغلے جوڑے کو گوروں کی نسبت کالوں سے زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لہٰذا یک جہتی والی شادیوں کو کہیں خوش آمدید نہیں کہا جائے گا اور ایسا جوڑا کسی بھی گروہ میں رہنے کے لیے ناموزوں ہو گا اور بالآخر یہ یگانگت سفید فام نسل کو بھی تباہ کر دے گی اور سیاہ فام نسل کو بھی سفید فام آدمی کی سیاہ فام عورت کے ساتھ اس یگانگت نے پہلے ہی امریکہ بھر میں سیاہ نسل کی خصوصیات اور رنگ بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب تک ان کالوں کے وجود سے کیا ثابت ہوا ہے جن کے رنگ “زیادہ سفید” ہو چکے ہیں؟ میرے علم کے مطابق اس وقت امریکہ میں دو سے پانچ ملین “سفید نیگروز” ایسے ہیں جو سماجی تبدیلی سے گزر رہے ہیں۔ وہ ہر وقت خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہیں کوئی دوسرا سیاہ آدمی ان کی حقیقت نہ آشکار کر دے۔ ان کی زندگی ایک جھوٹ بن کر رہ جاتی ہے۔ تصور کیجیے کہ ایسے سفید شوہر اپنی سفید بیویوں کے ساتھ اپنے سفید بچوں سے “ان نیگروز” کا ذکر کرتے کیسے لگتے ہونگے؟

سفید فاموں کے متعلق جتنی تلخ گفتگو میں نے نیگروز سے سنی ہے شاید ہی کسی نے سنی ہو لیکن ان سے بھی تلخ جذبات ان “سفید نیگروز” کے تھے جو سفید فاموں کے درمیان گورے بن کر رہتے ہیں اور نیگروز کے بارے میں گوروں کے خیالات سنتے رہے ہیں۔ وہ خیالات جو عام کالا سننا برداشت نہ کر سکے۔ اس لیے جب نسلی مسئلہ کھڑا ہوتا ہے تو یہ “سفید نیگرو” سیاہ فاموں کے لیے بے حد قیمتی جاسوس اور اتحادی ثابت ہوتا ہے۔

یورپ بھر کے “بھورے بچے” جو اب جوان ہو کر شادیاں کر رہے ہیں زندگی بھر نسلی مسائل سے خوفزدہ رہتے ہیں۔

اگر صرف سفید نسلی گروہوں کے حوالے سے بھی دیکھا جائے تو وہ بھی اس "یک جہتی" کو "ملاوٹ" سمجھتے ہیں اور اپنے ورثے کو بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں جس طرح آئیرش لوگوں نے انگریزوں کو آئیرلینڈ سے اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انگریز انہیں نگل جائیں گے۔ دوسری طرف فرنچ کینیڈین جھگڑے پر نگاہ ڈالیں تو دونوں گروہ اپنی شناخت کے تحفظ کے لیے دیوانوں کی طرح آپس میں لڑ رہے ہیں۔

درحقیقت تاریخ کے سب سے المناک نسلی ادغام کا تجربہ جرمن یہودی کو ہوا جس نے جرمنی کی خدمت جرمنوں سے بھی زیادہ کی آدھے سے زیادہ نوبل انعام جیتنے والے جرمن یہودی ہیں۔ جرمنی میں ثقافت کو یہودیوں نے ترقی دی۔ انہیں نے سب سے اعلیٰ اخبار چھاپے۔ یہودی عظیم ترین فنکار عظیم ترین شاعر موسیقار اور سٹیج کے ہدایت کار ہوئے۔ لیکن ان یہودیوں سے ایک بڑی غلطی ہوئی...ادغام کی۔

جنگ عظیم اول سے ہٹلر کے عروج تک جرمن یہودیوں نے باہمی شادیوں کو مسلسل فروغ دیا۔ بہت سوں نے اپنے نام بدلے تو کئیوں نے اپنا مذہب ہی بدل ڈالا۔ انہوں نے اپنا یہودی مذہب اپنی شاندار یہودی نسل اور ثقافت کی جڑیں اس حد تک کاٹیں کہ خود کو "جرمن" ہی سمجھنے لگ گئے اور پھر "آرین حاکم قوم" کا جذباتی نظریہ لے کر ہٹلر آ گیا اسے سب سے پہلے "Scapegoat" کے طور پر جرمن یہودی ہاتھ آئے۔

بے حد حیرانی کی بات ہے کہ اپنی تمام تر ذہانت اور جرمنی کے تمام معاملات میں قوت اختیار کے باوجود تمام یہودی تقریباً مسحور ہو کر اپنے قتل کا خوفناک منصوبہ بنتے دیکھتے رہے حالانکہ یہ منصوبہ راتوں رات وجود میں نہیں آ گیا تھا۔ آج بھی جب کوئی یہودی ہٹلر کے متعلق سوچتا ہے کہ اگر وہ ساری دنیا فتح کر لیتا جیسا کہ وہ چاہتا تھا تو کانپ جاتا ہے۔

اس سبق کو یہودی کبھی نہیں بھولیں گے۔ اب وہ ہر نئی نازی آرگنائزیشن جو وجود میں آتی ہے تو یہودی انٹیلی جنس اس کی نگرانی کرتی ہے۔ جنگ کے فوراً بعد Jews, Haganah نے برطانوی حکومت کے ساتھ مذاکرات شروع کیے اور انہیں چت کر دیا اور برطانیہ نے فلسطین کو اس کے حقیقی مالک عربوں سے چھیننے کے لیے یہودیوں کی مدد شروع کر دی۔ یہودیوں نے اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا یعنی اپنا ملک...اور یہ ایسی چیز ہے جس کا دنیا کی ہر نسل احترام کرتی ہے اور اس کی ضرورت کو سمجھتی ہے۔

میں اس یک جہتی کے فریب کو صرف "Farce on Washington" کے عنوان سے پکارتا ہوں۔ احتجاجی مارچ کا خیال اصل میں لگ بھگ بیس سال سے واشنگٹن کے نیگروز میں گردش کر رہا تھا اور پھر اچانک اس خیال نے تحریک پکڑ لی۔ تمام جنوبی نیگروز چھوٹے قصباتی نیگروز، شمال کے کچی بستیوں کے نیگروز حتیٰ کہ سابق ہزاروں انکل ٹام نیگروز مارچ کی باتیں کرنے لگے۔ جولوئیس کے وقت سے لے کر آج تک اتنی بڑی سطح پر نیگروز نے اتحاد کا مظاہرہ نہیں کیا نیگروز کے گروہ ہر صورت میں واشنگٹن پہنچنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے وہ پرانی کاروں میں بسوں کے ذریعے ہچ ہائی کنگ کر کے اور اگر مجبوری ہو تو پیدل ہی واشنگٹن پہنچ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ گلیوں میں، سڑکوں پر، ائر پورٹ رن ویز، اور سرکاری باغیچوں میں دھرنا دینگے اور کانگرس اور وائٹ ہاؤس سے مطالبہ کریں گے کہ ٹھوس قسم کے سول رائٹس بنائے جائیں۔ یہ ایک قومی تلخی کا اظہار تھا۔ یہ ایک غیر منظم، بے قیادت اور جنگ جویانہ صفات کا حامل مارچ تھا اور اس کی غالب اکثریت ان نوجوان نیگروز پر مشتمل تھی جو سفید فام کی ایڑی تلے سسک سسک کر تنگ آ چکے تھے اور اب ہر قسم کے نتائج سے بے پرواہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اور ظاہر ہے سفید فام کے لیے پریشان ہونے کی معقول وجہ تھی کیونکہ کوئی بھی جذباتی چنگاری کالوں کو جگا سکتی تھی۔ حکومت کو اچھی طرح علم تھا کہ ہزاروں سیاہ فام ناراض اور مشتعل لوگ واشنگٹن کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے ہیں۔

وائٹ ہاؤس نے سماجی حقوق کے نیگروز ”راہ نمائوں“ کو فوراً مدعو کیا اور انہیں یہ مارچ روکنے کے لیے کہا مگر انہوں نے بے حد خلوص کے ساتھ انہیں بتایا کہ اس کا آغاز انہوں نے نہیں کیا ہے اور نہ اس پر ان کا کوئی اختیار ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سیاہ بارود کا ایک ڈھیر تھا۔ یہ سارا کچھ کسی فلم کی طرح تھا۔ سماجی حقوق کی چھ تنظیموں کے نام نہاد نیگرو راہنما نیو یارک میں سفید فاموں کے زعماء سے ملے۔ جنہیں آٹھ لاکھ ڈالر دیئے گئے جو فوراً ہی آپس میں بانٹ لیے گئے گویا سفید فام کی دولت کے ذریعے سیاہ فاموں کا اتحاد حاصل کیا گیا اور اس دولت کے ساتھ ایک ”نصیحت“ وابستہ تھی۔ ناصرف عطیہ کی رقم ادا کی گئی بلکہ مارچ کے بعد اگر سب کچھ ٹھیک رہا تو مزید رقم کا وعدہ بھی کیا گیا۔ یہ واشنگٹن کے حقیقی مارچ کی شکل تبدیل کرنے کی کوشش تھی، عالمی پیمانے پر مارچ کی سربراہی کرنے والے چھ بڑوں کو خوب شہرت دی گئی جو حقیقی ناراض نیگروز کے لیے ایک خبر کی حیثیت رکھتی تھی۔ انہوں نے فرض کر لیا کہ یہ مشہور راہنما بھی ان کے ساتھ شامل ہو رہے ہیں اس کے بعد چار سفید فام عوامی شخصیات کو شامل کیا گیا جن میں ایک کیتھولک تھا، ایک یہودی، ایک پروٹسٹنٹ اور ایک لیبر جو باس تھا۔ اس کے بعد مشہور کیا گیا کہ یہ ”دس بڑے“ جلوس کی نگرانی کریں گے اور اس کے رجحان کا تعین بھی کریں گے۔ بہت جلد یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور نام نہاد آزاد خیال کیتھولکس، یہودی، پروٹسٹنٹس اور لیبرز ”جمہوریت“ کے لیے مارچ میں شامل ہونے لگے۔ جو

لوگ اس سے قبل جلوس کے مخالف تھے وہ بھی اس کے حق میں بولنے لگے اور یہ جلوس ایک سفید فام جلوس کی شکل اختیار کر گیا، تاکہ ان غریب، مظلوم، بھوکے، بیکار نیگروز کو کچلا جا سکے۔ ”یک جہتی“ پرست نیگروز قرار داد پر دستخط کرنے کے لیے ٹوٹے پڑتے تھے۔ یہ مشتعل جلوس ایک فیشن کی چیز بن گیا۔ گویا کنٹکی ڈربی شروع ہو گئی ہو۔ سٹیٹس کے جویائوں کے لیے یہ سٹیٹس کی علامت بن گیا اور ہر شخص دوسرے سے پوچھتا ”تم گئے تھے؟“ جلوس کا تاثر، سیر اور پکنک کا سا ہو کر رہ گیا۔

جلوس کی صبح غریب اور ناراض نیگروز کی شکستہ گاڑیاں، جیٹ جہازوں، ریل کاروں، اور ایئر کنڈیشنڈ بسوں میں دکھائی بھی نہیں دیتی تھیں۔ جس جلوس کو ”سرکش طوفان“ ہونا تھا وہ ایک انگریزی اخبار کے لفظوں میں ”پرسکون طغیان“ بن گیا۔

جلوس کے شرکاء کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے ہمراہ کتبے لے کر نہ آئیں کتبے انہیں مہیا کئے جائیں گے۔ انہیں صرف ایک ترانہ گانے کی ہدایت کی گئی ”ہم غالب آئیں گے۔“ انہیں مقامِ آغاز تک پہنچنے کا طریقہ کب اور کہاں پہنچنا ہے، کہاں اکٹھا ہونا ہے کب مارچ شروع کرنا ہے اور اس کا روٹ کیا ہونا ہے وغیرہ بتایا گیا۔ ابتدائی طبی امداد کے مراکز منصوبہ بندی کے تحت مختلف مقامات پر قائم کیے گئے، گویا بے ہوش ہونے کے مقامات بھی بتا دیئے گئے۔

میں خود بھی وہاں تھا۔ میں نے خود یہ سرکس دیکھا۔ کبھی کسی نے دیکھا سنا ہے کہ مشتعل انقلابیوں میں اتنی ہم آہنگی ہو کہ جن کے خلاف انہوں نے بغاوت کی انہی کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ”ہم غالب آئیں گے...ایک دن“ گاتے، جھومتے چلے جاتے ہوں؟

ان مشتعل انقلابیوں نے آخری ہدایت ”جلوس جلد ختم کر دیں“ کی بھی پوری اطاعت کی۔ ان ہزارہا انقلابیوں میں سے بہت ہی کم لوگ اگلی صبح تک واشنگٹن میں ٹھہرے۔ اگلے روز ”واشنگٹن ہوٹل ایسوسی ایشن“ نے کمرے خالی رہ جانے سے ”بھاری خسارے“ کی رپورٹ دی۔

ہالی ووڈ اس سے بہتر کارکردگی نہیں دکھا سکتا تھا۔

بعد میں سماجی حقوق کے مخالف کانگریس کے آدمیوں اور سینیٹروں کے بیانات سے واضح ہوا کہ کسی نے بھی اپنی رائے تبدیل نہیں کی۔ اس کے علاوہ اور توقع بھی کیا کی جا سکتی تھی؟ کیا ایک روزہ یک جہتی سے بھرپور پکنک، چارسو سال پرانے، امریکی سفید فام کی نفسیات میں شامل تعصب کو متاثر کر سکتی تھی؟ یہ ”یادگار مضحکہ“ (Farce) ثابت

کرتا ہے کہ یہ ملک اپنے پیچیدہ اور گہرے مسائل کو نیک نیتی سے حل کرنے کی بجائے محض ظاہری چمک دمک اور دکھاوے سے کام لیتا ہے۔

واشنگٹن مارچ سے نیگروز کچھ عرصہ سوئے رہے لیکن بالآخر انہیں احساس ہونے لگا کہ سفید فام نے انہیں ایک بار پھر دھوکہ دیا ہے۔ نتیجتاً ان کا غصہ پھر بیدار ہونے لگا اور پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ چنانچہ 1964ء کے موسم گرما میں مختلف شہروں کے اندر نسلی فسادات پھوٹنا شروع ہو گئے۔

واشنگٹن کے مضحکہ خیز مارچ سے ایک ماہ پہلے نیویارک ٹائمز کے رپورٹر نے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلباء کی رائے لے کر مجھے بتایا کہ میں "دوسرا پسندیدہ ترین مقرر" ہوں۔ پہلا نمبر سینیٹر بیری گولڈ واٹر کا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میری شہرت کے پیچھے ڈاکٹر لنکن کی کتاب "امریکہ میں سیاہ فام مسلمان" (The Black Muslim in America) کا ہاتھ ہے۔ اسے بہت سے کالجوں کے نصاب میں شامل کیا گیا۔ اس کے بعد میرا ایک طویل انٹرویو "پلے بوائے" میں چھپا جس کی فروخت کالجوں میں کسی بھی میگزین سے زیادہ ہے اور بہت سے طلبا جو اس کتاب کو پڑھ چکے تھے میرا انٹرویو پڑھ کر مجھ "شعلہ نوا سیاہ فام مسلمان" کو سننے کے خواہش مند تھے۔

نیویارک ٹائمز کی رائے شماری کے نتیجے میں مجھے پچاس سے زائد کالجوں اور جامعات کی طرف سے جن میں 'براؤن، ھارورڈ، ییل، کولمبیا اور رجرز وغیرہ شامل تھیں، خطاب کی دعوت دی گئی۔ اس کے علاوہ آئی وی لیگ اور ملک بھر کی جامعات کی طرف سے بھی دعوت دی گئی۔ اس وقت بھی "پرنسٹن" "کارنل" اور درجن بھر اداروں کی طرف سے دعوت موجود ہے، جونہی مجھے وقت ملا میں وہاں جاؤں گا۔ ان کے علاوہ مجھے نیگرو اداروں میں سے اٹلانٹا یونیورسٹی اور کلارک کالج، واشنگٹن میں ھاورڈ یونیورسٹی اور چند دیگر چھوٹے اداروں میں جانے کا موقع بھی ملا ہے۔

مکمل سیاہ فام سامعین کے بعد مجھے کالجوں کے سامعین زیادہ پسند ہیں۔ کالجوں میں ایسے اجلاس دو سے چار گھنٹے اور کبھی اس سے بھی زیادہ دورانیہ کے ہو جاتے ہیں۔ علم کے متلاشیوں اور متجسس طلبا کی طرف سے مجھ پر سوالات و اعتراضات کئے جاتے ہیں جو میرے لیے بے حد خوشی کا باعث ہوتے ہیں کیونکہ یہ اجلاس میری تربیت اور تعلیم کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں۔ ان سے میری کارکردگی اور جناب ایلیا محمد کی تعلیمات کا دفاع بہتر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ بعض اوقات مباحثوں یا پینل مذاکرات میں میں تنہا سامعین سے کھچا کھچ بھرے ہال میں چھ یا آٹھ طلبا یا شعبہ جات کے علماء کا سامنا کرتا۔ وہ لوگ، سوشیالوجی، نفسیات، فلسفہ، تاریخ اور مذہب کے شعبوں میں کمال رکھتے تھے۔ میں اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح سے کرتا "معززین! میں نے میسن، مشی گن سے آٹھویں پاس کی تھی۔ میرا ہائی سکول راکس

بیری میساچیوسٹس کی کچی بستی تھا۔ میرا کالج ہارلم کے بازار تھے، میں نے ماسٹر کی ڈگری جیل سے حاصل کی، جناب ایلیا محمد نے مجھے سکھایا کہ مجھے کسی ایسے شخص سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں جو غیر سفید فام لوگوں کے خلاف سفید فاموں کے مجرمانہ ریکارڈ کا دفاع یا اس کی توجیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے خصوصاً شمالی امریکہ کے سیاہ فام اور سفید فام۔"

یہ ایک طرح کا میدان جنگ تھا جس میں دانش وری اور فلسفے کی گولیاں چلتی تھیں۔ نظریات کی جنگ لڑنا بڑا دل چسپ کام تھا اور میرے سامعین اس سے بہت متاثر ہوتے۔ میں دوسرے مقررین سے بھی ملا ہوں۔ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ لوگوں تک پہنچنا اور انہیں متاثر کرنا خداداد چیز ہے۔ یہ ایک طرح کا روحانی یا غیر مرئی رے ڈار ہے۔ جس طرح ڈاکٹر کو نبض پر ہاتھ رکھتے ہی دھڑکن کا علم ہو جاتا ہے اسی طرح دوران تقریب میں بھی اپنی بات کا ردِعمل محسوس کر سکتا ہوں۔

اگر میری آنکھوں پر پٹی بھی باندھ دی جائے تو میں ٹھیک پانچ منٹ بعد بتا سکتا ہوں کہ میرے سامعین سیاہ فام ہیں یا سفید فام کیونکہ دونوں میں بہت واضح فرق ہے۔ کالے سامعین میں حرارت اور گرمجوشی ہوتی ہے اور حتیٰ کہ ان کی خاموشی میں بھی ایک لے اور ردھم ہوتا ہے۔ سوال و جواب کا وقفہ دوسرا مقام ہے جہاں میں پھر آنکھوں پر پٹی باندھ کر سوال کا نسلی ماخذ بتا سکتا ہوں۔ سامعین میں سب سے آسان شناخت یہودی اور بورژوا نیگرو کی ہوتی ہے۔ تمام نسلی گروہوں میں یہودی اپنے خیالات اور تفکرات کے اظہار میں انتہائی متعصب ہوتے اس کے ساتھ ساتھ وہ غیر معمولی حساس بھی ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان کے سامنے انہیں صرف "یہودی" (Jew) بھی کہہ دیں تو وہ آپ پر فوراً یہود دشمنی کا الزام لگا دیں گے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ پیشے کے اعتبار سے ایک یہودی کیا ہے؟ وہ ڈاکٹر، تاجر، خاتونِ خانہ، طالب علم کچھ بھی ہو لیکن وہ پہلے نظریاتی طور پر یہودی ہوتا ہے۔

مجھے یہودیوں کی غیر معمولی حساسیت کی وجہ سمجھ آتی ہے۔ دو ہزار سال تک یہودیوں کے خلاف مذہبی اور ذاتی سطح پر وہی تعصبات روا رکھے گئے جو سفید فاموں نے غیر سفید فاموں کے ساتھ روا رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن مجھے علم ہے کہ امریکہ کے ساڑھے پانچ ملین یہودی (جن میں سے دو ملین نیویارک میں رہتے ہیں) اس مسئلے کو بہت عملی انداز میں دیکھتے ہیں۔ انہیں شاید یہ احساس ہے یا نہیں کہ وہ نفرت اور محکومی جو سیاہ فاموں کا مقدر ہے سیاہ فاموں کی عدم موجودگی میں ان کا مقدر ہو گی۔

سیاہ فاموں کی ہر کچی بستی میں تمام بڑے کاروبار، یہودیوں کی ملکیت ہیں۔ ہر رات یہودی غریبوں کی دولت سمیٹ کر گھر کی راہ لیتا ہے اور بستیاں غربت میں ڈوبتی جاتی ہیں۔ لیکن جب کبھی اس حقیقت کا اظہار میں نے مجمعے میں کیا تو مجھ پر اعتراضات کئے گئے اور مجھے یہودی مخالف کہا گیا۔ لیکن یہ بات میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ یہودی بطورِ قوم کسی اقلیت کو اس کے وسائل آزاد مرضی سے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ میں سچ اس لیے نہیں بولتا کہ میں یہودی مخالف ہوں بلکہ اس لیے بولتا ہوں کہ میں استحصال مخالف ہوں۔ سفیدفام آزاد خیال اس بات پر یقینا حیران ہوں گے کہ میں نے تمام نیگرو سامعین کے جلسوں میں سفیدفاموں کے حق میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام نیگروز سفید فاموں کے مجرمانہ ریکارڈ سے بخوبی واقف ہیں۔ ہو سکتا ہے انہیں تفصیلات کا علم نہ ہو جتنا کہ مجھے ہے۔ لیکن عمومی صورت حال سے واقف ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ جب بورژوا نیگرو عام نیگروز کے درمیان ہوتا ہے تو کبھی سفید فام کا دفاع کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور یہی نیگرو جب سفید اور سیاہ ملے جلے سامعین میں بیٹھتا ہے جہاں اس کے خیالات اس کا محبوب ”مسٹر چارلی“ سن سکتا ہے تو وہ ناصرف مجھ پر حملے شروع کر دیتا ہے بلکہ سفید فام کا دفاع کرنے یا اس کے جرائم کو معاف کرنے کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ میرا ایک بنیادی اصول ہے کہ میں کبھی دوران خطابت زیادہ جذباتی یا مشتعل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بورژوا نیگروز مجھے اس اصول شکنی کے بہت قریب لے آتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اسٹیج سے اُتر کر سفید فاموں کے طوطوں، پتلیوں اور اوزاروں سے دست و گریبان ہو جاؤں۔ کالجوں میں انہیں جواب دینے کے لیے میں نے ایک طریقہ وضع کر رکھا تھا۔ میں ان سے پوچھتا ”کیا آپ قانون کے طالب علم ہیں؟“ وہ ہاں یا ناں میں جواب دیتے جس پر میں کہتا ”میرا خیال تھا کہ آپ ہیں کیونکہ آپ سفید فام مجرم کا اتنا دفاع کر رہے ہیں جتنا وہ خود نہیں کرتا۔“

خاص طور پر ایک یونیورسٹی کا سیاہ فام پی ایچ ڈی ایسوسی ایٹ پروفیسر مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ اس نے مجھے اتنا اشتعال دلایا کہ مجھے مارے غصے کے نظر آنا بند ہو گیا۔ وہ اس طرح گفتگو کر رہا تھا جیسے بائیس ملین تعلیم سے محروم سیاہ فاموں کو اس جیسے ذہین آدمی کی ہی ضرورت ہے وہ سفید فاموں کے درمیان دودھ میں مکھی کی طرح نمایاں تھا۔ وہ مجھے شدت پسند اور معکوس نسل پرست کہہ رہا تھا۔ میں اس احمق کو چت کرنے کے لیے اپنا دماغ دوڑا رہا تھا۔ بالآخر میں نے اپنا ہاتھ کھڑا کیا اور وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے اس سے پوچھا ”کیا تم جانتے ہو کہ سفید فام نسل پرست سیاہ فام پی ایچ ڈیز کو کیا کہتے ہیں؟“ اس نے کچھ اسی طرح کا جواب دیا جس طرح کا عام طور پر غیر معمولی مکالمہ کار نیگروز دیتے ہیں۔ یعنی ”میرے خیال میں مجھے اس کا علم نہیں ہے۔“

میں نے بلند آواز میں وہ لفظ اس کے سامنے رکھا "نگر" (Nigger)۔

میں نے جناب ایلیا محمد کو بتایا کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں خطبات قوم اسلام کے لیے بے حد فائدہ مند ہیں کیونکہ شیطان صفت سفید فام کے بہترین اذہان وہیں ترقی پاتے اور متاثر ہوتے ہیں لیکن بعض وجوہ کی بنا پر جن کی سمجھ مجھے بعد میں آئی ایلیا محمد یونیورسٹی اور کالجوں میں میرے خطبات کو کبھی پسند نہیں کرتے تھے۔

بعد میں ایلیا محمد کے صاحبزادے نے مجھے خود بتایا کہ اسے مجھ پر رشک آتا خود میں بھی یہ سمجھتا تھا کہ یہاں کے سامعین زیادہ کشادہ ذہن اور معروضی ہوتے ہیں اور برہنہ اور تلخ سچائیوں کو آسانی سے قبول کر سکتے ہیں۔ میں انہیں بتاتا "بھوری، سرخ اور زرد نسلیں بارہا اس بات کی شہادت دے چکیں اور خمیازہ بھگت چکی ہیں کہ سفید فام کے اندر روح کی آواز سننے کی صلاحیت کس قدر کم ہے۔ یہ سفید فام زمزمہ انسانیت کو سننے سے قطعاً محروم ہے۔ جس کا ثبوت ہر روز دنیا بھر کے اخبارات کے اول صفحات ہیں۔ جو اس کی تخلیق کردہ دنیا کا چہرہ ہمیں دکھاتے ہیں۔ روحانی اندھیرے، بدی اور مکاری میں اندھوں کی طرح ٹھوکریں کھاتے اس سفید فام پر اللہ کا قہر نازل ہونے ہی والا ہے۔

آج دو بڑی سفید اقوام باقی ہیں امریکہ اور روس اور دونوں کے ہمراہ کچھ شکی اور خوف زدہ چھوٹی اقوام ہیں۔ امریکہ بچی کھچی سفید فام دنیا کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ فرنچ، بیلجیمز، ڈچ پرتگیز، اسپینش اور دوسری سفید اقوام کمزور ہو رہی ہیں کیونکہ غیر سفید ایشیائی اور افریقی اپنی مقبوضہ ریاستیں حاصل کر رہے ہیں۔ ماضی کی عظیم برطانوی مملکت کی بچی کھچی عظمت اور قوت کو سہارا دینے کے لیے امریکہ بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ حالانکہ اس کی عظمت کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا ہے وہ دن ہوا ہوئے جب برطانوی امراء غیر سفید نو آبادیات میں لوٹ مار کے بعد اپنی نفیس سی بیگم صاحبہ کے ساتھ بیٹھ کر یک عدسی عینک لگا کر چائے کی چسکیاں لیا کرتے تھے۔ اب برطانیہ کے فضول خاندان شاہی اور طبقہ امراء کی گزر بسر سیاحوں کو قدیم قلعے دکھا کر ہوتی ہے یا اپنی یاداشتیں، عطریات، آٹو گرافس، القاب حتیٰ کہ خود کو بھی فروخت کر کے ہوتی ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ سفید فام میں ایک اور جنگ کی تاب نہیں ہے۔ دونوں بڑی طاقتوں میں سے کسی نے بھی بٹن دبایا تو سفید تہذیب ختم ہو جائے گی۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ نسل انسانی کو نظریات نہیں بلکہ رنگ و نسل ہی متحد کرتے ہیں۔ کیا یہ محض اتفاق ہے کہ سرخ چینی افریقی اور ایشیائی ممالک کے دورے کرتے ہیں جبکہ امریکہ اور روس مسلسل ایک دوسرے کے قریب ہو رہے ہیں؟

سفید فاموں کی مجموعی تحریک نے غیر سفید فاموں کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں چھوڑا کہ وہ ایک دوسرے کے قریب ہوں۔ شیطان صفت سفید فام میں اتنی اخلاقی جرات اور حوصلہ نہیں کہ وہ اپنے تکبر سے پیچھا چھڑا سکے۔ اس لیے آج وہ غیر سفید فاموں میں اپنے دوست، خریدنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ماضی کے ریکارڈ کو چھپانے کا خواہش مند ہے۔ اس کے اندر اعتراف جرم کرنے اور اپنے جرائم کا کفارہ ادا کرنے کی عاجزی نہیں ہے۔ سفید فام نے محبت کے اس سادہ پیغام کو بالکل تبدیل کر دیا ہے جس کی تبلیغ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی میں کرتے رہے۔

سامعین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر سن کر حیران رہ جاتے۔ میں وضاحت کرتا کہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ دین اسلام کے تین انتہائی اہم پیغمبروں میں سے ایک ہیں۔ دیگر دو کے نام محمدؐ اور موسیٰؑ ہیں۔ یروشلم میں مسلمانوں کی زیارات بھی ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ عیسائیت نے حضرت عیسیٰ کی تعلیمات پر عمل نہیں کیا۔ ایسے موقع پر میں بلی گراہم کا حوالہ ضرور دیتا جس نے کہا تھا ”میں عیسیٰؑ کو مانتا ہوں عیسائیت کو نہیں۔“

مجھے وہ سنہرے بالوں والی لڑکی کبھی نہیں بھولے گی جس نے نیو انگلینڈ کالج میں میرا خطاب سنا اور میرے پیچھے دوسرے جہاز سے نیویارک پہنچ گئی تھی۔ ہارلم میں اس نے مسلم ریسٹوران کا پتہ پوچھا اور ابھی میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ وہ آ گئی۔ اس کے کپڑوں سامان اور لہجے سے جنوبی سفید نسل اور دولت کا پتہ چلتا تھا۔ کالج میں خطاب کے دوران میں نے بتایا تھا کہ کس طرح مکاری سے کام لیتے ہوئے اس سفید آقا نے اپنی ہی عورتوں کو استحصال کیا۔ اس نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس قدر ”پاکیزہ“ ہے کہ اسے اس گھٹیا ”جانوروں والی جبلت“ سے واسطہ نہیں رکھنا چاہیے چنانچہ یہ ”نازک اندام بیگم“ بیٹھی ہلکی رنگت والے بچوں کو رقبے پر بھاگتے پھرتے دیکھتی رہتی ہے۔ جن کی پیدائش کے ذمے دار اس کا باپ، شوہر، بھائی اور بیٹے ہوتے ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ امریکی سفید فاموں کے احساس جرم میں یہ احساس بھی شامل ہے کہ نیگروز سے نفرت کرتے وقت دراصل وہ اپنے ہی خون سے انکار کر رہے ہوتے ہیں، نفرت کر رہے ہوتے ہیں اور اسے رد کر رہے ہوتے ہیں۔

میں نے اس سفید فام کالج کی طالبہ سے زیادہ کبھی کسی کو متاثر نہیں دیکھا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے پوچھا ”تمہیں یقین ہے کہ سفید فاموں میں کوئی آدمی بھی اچھا نہیں ہے؟“ میں اس کے جذبات مجروح کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا ”میں لوگوں کے افعال پر ایمان رکھتا ہوں اقوال پر نہیں“ اس نے پوچھا ”میں کیا کر سکتی ہوں؟“ میں نے کہا ”کچھ نہیں“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اسی طرح باہر نکل گئی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی۔

جب بھی میں ایلیا محمد کو ملنے شکاگو یا فینکس جاتا تو وہ مجھ پر اعتماد اور تائید کا اظہار کرتے۔ جب وہ عمرہ کرنے کے لیے مقدس شہر مکہ گئے تو قوم اسلام کے معاملات کا نگران مجھے بنا گئے۔ میرا ایمان ان پر اتنا پختہ تھا کہ میں ان کی جگہ جان دینے کو بھی تیار تھا۔

ایک اتفاقی واقعہ ایسا پیش آیا جس سے ان کی عظمت کئی گنا بڑھ گئی۔ میں ہاورڈ لاء سکول فورم میں مدعو تھا۔ یونہی میری نگاہ کھڑکی سے باہر پڑی تو مجھے اچانک وہ مکان نظر آیا جسے میں لوٹ مار کے دنوں میں چھپنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ میں ہل کر رہ گیا اور میرے ماضی کے واقعات میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ جب میں جانوروں کی طرح رہتا اور جانوروں کی طرح سوچتا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ اسلام نے مجھے کس پستی سے اٹھا کر کس مقام پر پہنچا دیا ہے؟ بصورت دیگر میں ایک مجرم کی موت مر چکا ہوتا یا اگر زندہ ہوتا تو ایک سینتیس سالہ بدترین مجرم کی شکل میں کسی جیل یا پاگل خانہ میں داخل ہوتا اور اگر بہت اچھا بھی ہوتا تو عمررسیدہ کمزور ڈیٹ رائیٹ ریڈ ہوتا اور اپنی خوراک اور نشے کے لیے چوری چکاری کرتا اور مجھے ہر وقت نوجوان اُچکوں اور چوروں سے خطرہ لاحق رہتا۔ لیکن اللہ کی مہربانی سے میں دینِ اسلام سے آشنا ہو گیا جس نے مجھے اس لائق کیا کہ میں اس ذلت کی زندگی سے اٹھ سکوں۔

جب میں ہارورڈ میں خطاب کے لیے کھڑا ہوا تو جیل کے ایام میں پڑھی ہوئی یونانی دیومالائی کہانی میرے ذہن میں آ گئی۔

ایک لڑکا تھا آئکارس، اس کے باپ نے کچھ نقلی پر بنا کر موم سے اس کے جسم پر چپکا دیئے اور اس سے کہا ”ان پروں سے زیادہ اونچا اُڑنے کی کوشش مت کرنا“ ادھر ادھر اڑتے ہوئے آئکارس اتنا خوش ہوا کہ پرواز کو اپنا کمال سمجھنے لگا اور اتنا اونچا اڑا کہ سورج کی تپش نے اس کے پروں کا موم پگھلا دیا اور وہ قلابازیاں کھاتا نیچے آ گرا۔

وہیں کھڑے میں نے اللہ سے عہد کیا کہ میں یہ کبھی نہیں بھولوں گا کہ آج مجھے جو بلند ملی ہے ان پروں کے طفیل ملی ہے جو دین اسلام نے مجھے عطا کیے ہیں۔ یہ حقیقت میں کبھی نہیں بھولا... لمحہ بھر کے لیے بھی۔

!

باب: 16

برطرف

1961ء میں ایلیا محمد کی حالت اچانک بہت خراب ہو گئی۔ وہ باتیں کرتے کرتے بُری طرح کھانسنے لگتے اور تکلیف سے دوہرے ہو جاتے حتیٰ کہ انہیں بستر تک لے جانا پڑتا۔ ان کے گھر والوں اور ہم نے جو ان کے بہت قریب تھے جہاں تک ممکن ہو سکا صورت حال کو اپنے تک رکھا۔ عام لوگوں کو صورت حال کا اندازہ اس وقت ہوا جب چند بڑی مسلم ریلیاں جن میں ایلیا محمد نے خود شریک ہونا تھا ملتوی کرنا پڑیں۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کے ذہنوں میں سوالات پیدا کرنا شروع کیے۔ جن کا جواب دیا جانا ضروری تھا۔ اس طرح ہمارے رہنما کی بیماری کی خبر پوری قوم اسلام میں تیزی کے ساتھ پھیل گئی۔

کسی غیر مسلم کو اندازہ نہیں تھا کہ ایلیا محمد کے نہ ہونے سے ان کے پیروکاروں کا کتنا نقصان ہو گا۔ ہمارے لیے قوم اسلام دراصل ایلیا محمد کی ذات تھی۔ یہ سیاہ فام امریکیوں کے اخلاقی دینی اور روحانی مصلح ایلیا محمد سے وابستگی ہی تھی جس نے امریکی سیاہ فاموں کو بہترین تنظیم میں تبدیل کر دیا جس کی اس سے قبل کوئی مثال نہ تھی۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم مسلمان اپنے آپ کو دوسرے سیاہ فام امریکیوں سے اخلاقی دینی اور روحانی طور پر بہتر سمجھتے تھے اور ہم ایلیا محمد کی ذات کو اپنے لیے مثالی تصور کرتے تھے۔ سیاہ فام کمیونیٹیز اس بات کا تذکرہ بڑے احترام سے کرتیں کہ مسلمانوں میں جھوٹ بولنے، جواء کھیلنے، دھوکہ دینے یا سگریٹ پینے والے کی رکنیت معطل کر دی جاتی ہے زیادہ بڑے جرائم مثلاً زنا وغیرہ کی سزا کا تعین ایلیا محمد خود کرتے تھے۔ جو قوم سے علیحدگی یا ایک سے پانچ سال تک تنہائی ہو سکتی تھی۔ جناب ایلیا محمد نو مسلموں کی نسبت پرانے عہدے داروں کو سزا دینے میں جلدی کرتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ ناقص عہدے دار نا صرف اپنے رب کو بلکہ بطور رہنما اپنے عہدے کو بھی دھوکہ دیتا ہے۔ اور دیگر

مسلمانوں کے لیے غلط مثال قائم کرتا ہے۔ ہر مسلمان کے لیے غیر اخلاقی ترغیب سے بچاؤ کی واحد شکل ایلیا محمد کی روشنی تھی۔ اور تمام مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ان کی روشنی کے بغیر ہم تاریکی میں رہ جائیں گے۔

ڈاکٹروں نے ایلیا محمد کی بحالی صحت کے لیے خشک آب و ہوا تجویز کی۔ فوری طور پر ہم نے فی نکس میں مشہور سیکسو فون پلیئر لوئی جارڈن کے گھر برائے فروخت کا پتہ چلا لیا قوم کے خزانچی نے وہ گھر خریدا اور ایلیا محمد فوراً وہاں منتقل ہو گئے۔

میں نے قوم اسلام کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ میں نے ایلیا محمد کو امریکی سیاہ فاموں میں سب سے طاقتور ثابت کیا۔ ایلیا محمد اور ان کے دوسرے وزرا میری معاونت سے اس لائق ہوئے کہ امریکی سیاہ فاموں کی سوچ میں ایسا انقلاب لا سکیں جو انہیں دوبارہ کبھی ماضی کا انداز فکر اختیار نہ کرنے دیں۔ میں نے سفید فاموں کی برتری کا سراب دور کرنے اور سچائی پھیلانے میں اچھا کردار ادا کیا۔ میں ایک طرح سے چھپی ہوئی سیاہ روح پر ایک دستک تھا۔ اگر مجھے کوئی ذاتی مایوسی تھی تو صرف اتنی تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ اگر قوم اسلام زیادہ متحرک ہو تو ہم امریکی سیاہ فاموں کی جدوجہد میں زیادہ بڑی قوت بن سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ ہمیں مزید تبدیلیوں کے ہمراہ عمومی غیر وابستگی کی پالیسی کو بھی نرم کرنا چاہیے۔ میں چاہتا تھا کہ جہاں جہاں بھی سیاہ فام موجود ہیں مثلاً لٹل راکس اور برمنگھمز وغیرہ وہاں عسکری طور پر منظم مسلمانوں کو بھی ہونا چاہیے تاکہ دیگر لوگ انہیں دیکھیں، ان کی عزت کریں اور ان پر گفتگو کریں۔

نیگرو کمیونٹیز میں یہ بات اکثر سننے میں آتی تھی کہ ”مسلمانوں کی باتیں تو سخت ہیں لیکن جب تک انہیں کوئی تنگ نہ کرے وہ الجھتے نہیں“ چونکہ میں دیگر مسلم عہدے داروں کی نسبت لوگوں سے زیادہ گھلتا ملتا تھا اس لیے مجھے سیاہ عوام کی متلون مزاجی کا بخوبی اندازہ تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ لوگ مسلمانوں کو گفتار کے غازی سمجھنے کی بجائے دیگر ہر اول رہنمائوں سے مختلف سمجھیں۔ ان باتوں کے علاوہ مجھے اللہ سے کسی اور چیز کی طلب نہ تھی۔ نیویارک میں اسلام پورے امریکہ سے زیادہ تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ابتدائی چھوٹی سی مسجد سے لے کر اب تک میں نے تین انتہائی طاقتور اور جارح مساجد قائم کی تھیں جو مین ہٹن، کوئنز اور بروکلن میں تھیں۔ قومی سطح پر میں نے بلاواسطہ یا بالواسطہ پچاس ریاستوں میں سو کے قریب مساجد قائم کیں بعض اوقات ہفتے میں چار چار بار مجھے شمالی امریکہ کا دورہ کرنا پڑتا۔ ان دنوں میں اپنی نیند جہاز میں پوری کرتا تھا۔ میں طویل تھکا دینے والے معمولات مثلاً صحافیوں سے گفتگو،

ریڈیو، ٹیلی ویژن اور عوامی اجتماعات سے خطاب کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا اور ان سب کاموں کی قوت مجھے ایلیا محمد نے دی تھی۔

1961ء میں ایلیا محمد کی حالت زیادہ خراب ہوگئی۔ مجھے دیگر ساتھیوں میں اس حسد اور رقابت کا احساس ہونے لگا تھا جس کی نشان دہی ایلیا محمد پہلے ہی کر چکے تھے۔ مثلاً یہ سننے میں آتا تھا کہ "وزیر میلکم ایکس قوم اسلام پر قابض ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔" یا یہ کہ میں ایلیا محمد کی تعلیمات کا فائدہ خود حاصل کر رہا ہوں۔ یا پھر کہا جاتا کہ میں اپنے لیے سلطنت بنا رہا ہوں یا یہ کہ مجھے دنیا بھر میں تیس مار خاں بننے کا شوق ہے۔

مجھے یہ باتیں سن کر غصہ نہیں آتا تھا۔ یہ باتیں مجھے اندر سے بہت مضبوط کرتیں۔ کیونکہ مجھے ایلیا محمد نے پہلے ہی اس حسد اور رقابت سے آگاہ کر دیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ایلیا محمد ان افواہوں پر کان نہیں دھریں گے۔ غیر مسلموں میں یہ بات بھی عام تھی کہ میلکم ایکس دولت کے ڈھیر لگا رہا ہے۔ دولت اور میں؟ ایف بی آئی، سی آئی اے اور آئی آر ایس تمام مل کر بھی میرے سات کمروں کے مکان اور گاڑی کے علاوہ کوئی چیز دریافت نہیں کر سکیں(اور اب قوم اسلام محض حسد اور لالچ کی وجہ سے مجھ سے گھر بھی چھیننے کی کوشش کر رہی ہے) دولت تک میری رسائی تھی۔ ایلیا محمد نے مجھے دل چاہی رقم نکلوانے کا اختیار دے رکھا تھا لیکن ایلیا محمد اور عہدیدار جانتے تھے کہ میں ایک ایک پیسہ قوم اسلام کی ترویج کے لیے استعمال کرتا ہوں۔

دولت کے متعلق میرے رویئے کی وجہ سے میرا اپنی بیوی کے ساتھ جھگڑا بھی ہوا۔ بچوں کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ میری بیوی نے کچھ رقم گھر کے لیے پس انداز کرنے کے اشارے دینا شروع کر دیئے تھے۔ لیکن میں نے انکار کر دیا جس سے جھگڑا بنا۔ میں جانتا تھا کہ بیٹی (Betty) ایسی بیوی ہے جو میرے خاطر جان بھی قربان کر سکتی ہے لیکن پھر بھی میں نے اسے بتایا کہ بہت ساری تنظیمیں صرف اس لیے برباد ہوگئیں کیونکہ ان کے رہنمائوں نے بیویوں کے ترغیب دلانے پر ذاتی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے بیٹی (Betty) کو یقین دلایا کہ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو قوم اسلام زندگی بھر اس کی اور ہمارے بچوں کی دیکھ بھال کریگی۔ تب میں کتنا بیوقوف تھا۔

ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر اور ہر اخباری انٹرویو میں میں واضح کرتا تھا کہ میں صرف ایلیا محمد کا نمائندہوں۔ میں دوران خطاب تقریباً ہر منٹ بعد کہتا "عزت مآب ایلیا محمد کا فرمان ہے..." میں ایسے شخص سے بات بھی نہیں کرتا تھا جو ایلیا محمد کا حوالہ دینے پر مجھ سے مذاق کرنے کی کوشش کرتا۔ جب بھی کوئی یہ لکھتاکہ میں ایلیا محمد کے بعد دوسرے درجہ پر ہوں تو مجھے غصہ آتا۔ میں تمام صحافیوں ریڈیو ٹیلی ویژن کے خبریں پڑھنے والوں سے کہتا "ایلیاء محمد کے بعد

تمام مسلمان دوسرے درجے پر ہیں" میرا بریف کیس ایلیا محمد کی تصویروں سے بھرا رہتا تھا جو بھی میری تصویر لینے کی کوشش کرتا میں اسے اس میں سے ایک تصویر دے دیتا اور ایڈیٹروں سے فون پر کہتا "مہربانی فرما کر میری جگہ ایلیا محمد کی تصویر استعمال کرلیں" اور جب ایلیا محمد نے سفید فام صحافیوں کو انٹرویو دینے کی حامی بھری تو میں بہت خوش ہوا اور پھر میں نے شاید ہی کسی گورے یا کالے صحافی کو انٹرویو دیا ہو اور اسے یہ نہ کہا ہو کہ اسے شکاگو میں ایلیا محمد سے ملنا چاہیے تاکہ وہ ان سے ذاتی طور پر سچائی حاصل کر سکے میرے مشورے پر صحافی ان سے جا کر ملے اور انٹرویو کیا۔

سفید فام اور نیگروز بشمول مسلمان قوم اسلام کی ترقی کا سہرا میرے سر باندھتے ہیں جس سے مجھے الجھن ہوتی ہے میں ہمیشہ کہتا ہوں تمام تعریف اللہ کے لیے ہے اور جو کچھ میں نے کہا ہے وہ صرف ایلیا محمد کی وجہ سے ہے۔

قوم اسلام میں مجھے جتنی بھی شہرت ملی وہ صرف ایلیا محمد کی حوصلہ افزائی سے ملی۔ انہوں نے مجھے فیصلے کرنے اور کوئی قدم اٹھانے کی آزادی دی اور میں آج بھی ان کا اتنا ہی وفادار ہوں جتنا کبھی تھا۔

1962ء کی بات ہے کہ میں نے محسوس کیا کہ ہمارے قومی اخبار "محمد سپیکس" میں میرا ذکر کم سے کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ایلیا محمد کے بیٹے ہربرٹ نے جو اخبار کا پبلشر ہے یہ ہدایت جاری کی ہے کہ میرے متعلق کم سے کم چھاپا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس اسلامی اخبار میں یک جہتی کے علمبردار نیگرو "راہنمائوں" کا ذکر مجھ سے زیادہ ہوتا تھا جبکہ میرے متعلق یورپی ایشیائی اور افریقی پریس میں زیادہ چھپتا تھا۔ میں یہ شہرت کے حصول کے لیے نہیں کہہ رہا میں پہلے ہی دنیا بھر میں کئی لوگوں سے زیادہ مشہور ہوں۔ مجھے دکھ صرف اس بات کا تھا کہ مسلمانوں کا پریس کچھ اہم خبروں کو محض اس لیے نظر انداز کر رہا تھا کہ ان کا باعث میں تھا۔ میں ریلیاں نکال رہا تھا۔ ایلیا محمد کی تعلیمات کو فروغ دے رہا تھا لیکن صرف حسد اور تنگ نظری کی وجہ سے مجھے کوئی کوریج نہیں دی جا رہی تھی حتیٰ کہ ایک حکم کے ذریعے میرا مکمل بائیکاٹ کر دیا گیا۔ جب یونیورسٹی آف کیلی فورنیا میں میں نے آٹھ ہزار طلباء سے خطاب کرتے ہوئے ایلیا محمد کی قوت اور منصوبے کے متعلق بتایا تو مجھے پریس میں بہت کوریج دی گئی لیکن جب میں شکاگو پہنچا تو ہمدردانہ ردعمل اور معمولی سی کوریج کی بجائے سرد مہری کا مظاہرہ کیا گیا۔ یہی صورت حال اس وقت پیش آئی جب میں نے ہارلم میں سات ہزار افراد کی ریلی نکالی حالانکہ اس وقت شکاگو ہیڈ کوارٹرز کے لوگ مجھ سے ناراض تھے۔ لیکن اگلے ہی ہفتے میں نے اس سے بھی بڑی اور زیادہ کامیاب ریلی نکالی جس پر شکاگو ہیڈکوارٹرز میں زیادہ ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔

جہاں تک انسان کے لیے ممکن ہے میں ان چیزوں کو نظر انداز کرتا رہا۔ میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بن رہا صرف سچائی بیان کر رہا ہوں، کیونکہ میں قوم سے اور ایلیا محمد سے محبت کرتا تھا۔ میرا جینا قوم اور ایلیا محمد کے لیے تھا۔

اخبارات میں اکثر میری تصاویر چھپنے پر مسلم افسران حسد محسوس کرتے۔ وہ یہ بات بھول جاتے کہ میری تصویریں ان کوششوں کی وجہ سے چھپتی ہیں جو میں ایلیا محمد کی سیاست کے لیے کرتا ہوں۔ انہیں یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ قوم اسلام کے خلاف پھیلائی جانے والی افواہوں اور جھوٹ کا جواب دینے کے لیے ایک مستقل عوامی سپوکس مین کی ضرورت ہے اور عقل سلیم رکھنے والا ہر شخص یہ بات جانتا تھا کہ ایلیا محمد ملک بھر میں اپنے سپوکس مین کے طور پر بھاگے نہیں پھر سکتے اور جو کوئی بھی ان کا سپوکس مین ہوگا وہ پریس کی توجہ تو لے گا۔

جب کبھی میرے ذہن میں تلخی پیدا ہوتی تو مجھے اپنی بشری کمزوری پر شرمندگی ہوتی۔ مجھے علم تھا کہ کم از کم ایلیا محمد یہ بات ضرور جانتے ہیں کہ میری زندگی ان کی نمائندگی کے لیے وقف ہے۔

1963ء میں قوم کے اکابرین کی تنقید نے مجھے مشتعل کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے چند قریبی رفقاء کو دوسرے شہروں میں مساجد کے قیام کے لیے رقوم دینا بند کر دیں کیونکہ میرے رفقاء کو میلکم کے وزراء کہا جانے لگا تھا۔ ان دنوں جب امریکہ میں عسکری سیاہ فام آواز کا عوام تک پہنچنا انتہائی ضروری تھا لائف میگزین نے میری ذات کے متعلق مضمون چھاپنے کا ارادہ کیا، میں نے انکار دیا۔ میں نے اس وقت بھی انکار کیا جب نیوز ویک نے مجھ پر کورسٹوری چھاپنے کی پیشکش کی۔ میں نے بے حد مقبول ٹیلی ویژن پروگرام میٹ دی پریس میں مہمان بننے سے انکار کر دیا اور ہر انکار عام سیاہ آدمی اور قوم اسلام کا نقصان تھا اور اس انکار کی وجہ شکاگو والوں کا رویہ تھا۔

جب این اے اے سی پی کے فیلڈ سیکرٹری میڈگر ایورز کو مسی سپی میں گولی کا نشانہ بنایا گیا تو میں تلخ سچائیوں کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ جب برمنگھم ایلاء باما میں نیگرو عیسائی گرجے میں بم دھماکے سے چار پیاری سیاہ فام لڑکیاں جاں بحق ہوئیں تو میں نے تبصرہ تو ضرور کیا لیکن امریکی سفید فام نفرت کی جس فضا کو پیدا کر رہا ہے اور فروغ دے رہا ہے اس کے متعلق میں نے کچھ نہیں لکھا۔ نفرت کو جتنی آزادی دی گئی نفرت اتنی ہی بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ سفید فام نسل کے لوگ بھی اس کا نشانہ بننے لگے۔ ڈیلاس ٹیکساس میں اس وقت کے وائس پریذیڈنٹ جونسن اور ان کی بیگم کی بہت بے عزتی کی گئی۔ اقوام متحدہ میں امریکی سفیر ایڈلائی سٹفین سن کو ایک عورت نے نہ صرف سر پر چپٹی ماری بلکہ اس کے چہرے پر تھوکا بھی۔

جناب ایلیا محمد نے مجھے پہلا قومی وزیر مقرر کیا۔ 1963ء میں فلاڈیلفیا میں مجھے گلے لگا کر سامعین سے کہا "یہ میرا سب سے زیادہ وفادار اور محنتی وزیر ہے۔ جو تاحیات میرا پیروکار رہے گا۔" انہوں نے ایسی تعریف کبھی کسی مسلمان کی نہیں کی تھی اور میرے لیے کسی دوسرے انسان کی تعریف اتنی اہم نہ تھی۔

لیکن یہ جناب ایلیا محمد اور میری اکٹھے آخری Public Appearance تھی۔

اس سے کچھ عرصہ پہلے میں بوسٹن میں جیری ولیمز کے ریڈیو پروگرام میں شریک تھا کہ کسی نے ایسوسی ایٹڈ پریس کی مشین سے گرم گرم خبر لا کر دی جس سے مجھے علم ہوا کہ لوزی آنا سٹی رنز کونسل نے میری موت پر دس ہزار ڈالر کا انعام رکھا ہے۔

لیکن موت کا خطرہ تو لوزی آنا کی نسبت یہاں میرے سر پر منڈلا رہا تھا۔ میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں جب مجھے علم ہوا کہ کون میری موت کا خواہش مند ہے تو میں ہکا بکا رہ گیا۔

مسلم وزیر کے طور پر بارہ سالہ عرصہ میں میں اخلاقیات پر اتنا زور دیتا تھا کہ کچھ لوگ مجھ پر "عورت دشمن" ہونے کا الزام لگانے لگے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ میں اس بات پر انتہائی یقین رکھتا تھا کہ جناب ایلیا محمد امریکی سیاہ فاموں کی اخلاقی، ذہنی اور روحانی اصلاح کی علامت تھے اور میں نے اس اصلاح کے معاملہ میں ہمیشہ ایلیا محمد کی قوت کے زیر اثر اپنی کایا کلپ کی مثال سامنے رکھی ہے۔ جیل جانے سے لے کر اپنی شادی تک اور بارہ سال بعد تک ایلیا محمد کے زیر اثر میں نے کسی عورت کو چھوا تک نہیں تھا۔ 1963ء کے آس پاس میری گفتگو کا موضوع مذہب کی بجائے سماجی اصول، حالت حاضرہ اور سیاست رہا جب کہ اخلاقی موضوعات سے میں مکمل طور پر کنارہ کش رہا۔

اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا ایمان متزلزل ہوگیا تھا کیونکہ مجھے پتہ چلا تھا کہ ایلیا محمد بذات خود مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے تھے۔ میں اس بات کو مختصر رکھنے کی کوشش کروں گا تاکہ آپ میری کیفیت اور ردعمل کو سمجھ سکیں۔ رہا افشاء کا مسئلہ تو اب ساری عوام اس کو جانتی ہے۔ میں ایک اخباری خبر کا حوالہ دوں گا جو پورے امریکہ کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر سنی گئی:

"لاس اینجلس 3 جولائی (UPI) سیاہ فام مسلم تحریک کے راہنما 67 سالہ ایلیا محمد کو آج اپنی دو سابق سیکرٹریوں کی طرف سے دعویٰ جات کا سامنا ہے۔ ان پر الزام ہے کہ وہ سیکرٹریوں کے چار بچوں کے باپ ہیں... دونوں خواتین بیس کی دھائی میں ہیں... مس روزری اور مس ولیمز نے الزام لگایا کہ ان کے ایلیا محمد کے ساتھ 1957ء سے اب تک

قریبی تعلقات رہے ہیں۔ مس روزری کا الزام تھا کہ وہ اس کے دو بچوں کے باپ ہیں جب کہ وہ انہی کہ تیسرے بچے کی امید سے ہے… دوسری مدعیہ کا کہنا تھا کہ وہ اس کی بچی کے باپ ہیں۔"

جہاں تک ماضی کا تعلق ہے1955ء کے آس پاس مجھے کچھ اشارے ملے تو تھے لیکن ایلیا محمد کے متعلق معمولی سی اخلاقی بے راہروی کا تصور بھی مجھے پاگل پن لگتا تھا اور میں اس تصور سے بھی لرز جاتا تھا اور زنا تو ایسا جرم تھا کہ مجرم کو فوراً بے عزت کرکے نکال باہر کیا جاتا تھا۔ قوم کی تاریخ میں اس حوالے سے سب سے خفیہ رکھا جانے والا سکینڈل یہ تھا کہ ایلیا محمد کی ذاتی سیکرٹری میں سے کچھ حاملہ ہوگئی تھیں انہیں مسلم عدالت میں زنا کے الزام میں پیش کیا گیا۔ جس کا انہوں نے اعتراف کرلیا۔ جزل باڈی کے سامنے ان کی بے عزتی کی گئی اور پانچ سال تک تنہائی کی سزا سنائی گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی مسلمان کے ساتھ کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھیں گی۔

اپنے ایمان کی حد تک میں نے عقل لگانے کی بجائے میں نے حقیقت ماننے سے قطعی انکار کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایلیا محمد کے خلاف خیالات رکھنے کی وجہ سے اللہ میرا دماغ بھی میرے بھائی ریگی نالڈ کے دماغ کی طرح جلا دے۔ آخری بار ریگی نالڈ مسجد نمبر7 کے ریسٹورنٹ میں آیا میں نے اسے دروازے سے آتے دیکھا۔ میں اس کے پاس گیا اور کہا کہ یہاں غیر مسلموں کا داخلہ منع ہے اور وہ چلا گیا اور میں نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا۔ اپنے خونی بھائی کے ساتھ میرا ایسا رویہ اس لیے تھا کہ سالوں پہلے ایلیا محمد نے ریگی نالڈ کو تنہائی کی سزا دی تھی اور اسے سب مسلمانوں سے الگ کر دیا تھا اور میں اپنے آپ کو ریگی نالڈ کے بھائی سے پہلے مسلمان سمجھتا تھا۔

مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ایلیا محمد ان غریب اور بھروسہ کرنے والے مسلمانوں سے غداری کریں گے جو قوم اسلام کی امداد کے لیے پیسے اور روپے چندے میں دیتے ہیں جن سے ہماری مسجدیں آباد ہیں اور بعض اوقات وہ اتنے غریب ہوتے ہیں کہ اپنے کرائے بھی ادا نہیں کر سکتے۔

1962ء کے آخر میں مجھے معتبر ذرائع سے پتہ چلا کہ بہت سے مسلمان شکاگو کی مسجد نمبر2 چھوڑ رہے ہیں۔ کیونکہ یہ غلیظ افواہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم نیگروز میں بھی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ پریس والے یوں بھی قوم اسلام کی بدنامی کی تاک میں رہتے تھے اور میں ڈرتا تھا کہ یہ بات کسی گورے کالے رپورٹر تک نہ پہنچ جائے مجھے اخباری سرخیوں پر مشتمل ڈراؤنے خواب آتے امریکہ بھر میں دوران خطاب مجھے یہ ہی فکر رہتی کہ اگر کسی صحافی نے مجھ سے اس رپورٹ کے متعلق سوال کر لیا تو میں اسے کیا جواب دوں گا۔

بالآخر میں نے اس گندی حقیقت کو تسلیم کرنا شروع کر دیا۔ نیویارک اور شکاگو میں میرے جاننے والے غیر مسلموں نے بلواسطہ مجھے اس افواہ کے متعلق بتانا شروع کر دیا یا براہ راست مجھ سے پوچھنا شروع کر دیا۔ میں مکمل لا علمی کی اداکاری کرتا۔ جس کے جواب میں وہ بھی وضاحت سے گریز کرتے۔ میں اپنے آپ کو خود بھی احمق ترین محسوس کرتا کہ میں صبح و شام تبلیغ کرتا پھرتا ہوں اور اپنی ناک کے نیچے اپنی تنظیم میں ہونے والے واقعات جن میں میرا ممدوح ملوث ہے سے لاعلم ہوں۔ اس احساس نے کچھ ایسے جذبات کو انگیخت کر دیا جو ہارلم میں اٹھائی گیری کے زمانے میں بھی نہیں جاگے تھے۔ جہاں سب سے بدترین چیز بے وقوف ہونا تھا۔

مثال کے طور پر ایک روز ہارلم میں اپالو تھیٹر میں سٹیج کے پیچھے مزاحیہ اداکار ڈک گریگری نے مجھ سے کہا "جناب یہ (ایلیایٔ) محمد کچھ بھی نہیں سوائے..." میں وہ لفظ نہیں بتا سکتا جو اس نے کہا۔ میرے اسلامی جذبات نے اس پر حملہ کرنا چاہا لیکن مجھے اس کی ہمت نہیں ہوئی اور ڈک نے بھی صورتحال کو دیکھتے ہوئے موضوع بدل دیا۔ وہ ایک منہ پھٹ آدمی تھا میں اس سے درخواست کرنا چاہتا تھا کہ وہ یہ بات کسی سے نہ کہے لیکن میں اس سے نہ کہہ سکا۔ یہ ایک طرح سے میرا اعتراف شکست تھا۔ میری اذیت بیان سے باہر تھی۔

کسی بھی پریشانی میں ہمیشہ میں ایلیا محمد سے رابطہ کرتا تھا اور آج میں جو کچھ تھا انہی کی وجہ سے تھا۔ چنانچہ میں نے ان کے دفاع کا فیصلہ کیا میرے پاس ایلیا محمد کو ملنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ لیکن پہلے میں شکاگو میں ان کے چھوٹے بیٹے والس محمد سے ملا کیونکہ میرا خیال تھا کہ وہ روحانی طور پر ان کے سب بیٹوں سے زیادہ قوی ہے۔ ہمارے مابین قربت اور اعتماد کا رشتہ بھی تھا۔ والس مجھے دیکھتے ہی میری آمد کا مقصد جان گیا۔ اس نے بتایا کہ اسے بھی علم ہے۔ میں نے تجویز دی کہ ہمیں اس کے والد کی امداد کے لیے جلوس نکالنا چاہیے۔ لیکن والس نے جواب دیا کہ اس کے والد ایسی کسی امدادی کوشش کو پسند نہیں کریں گے۔ مجھے یوں لگا جیسے والس پاگل ہوگیا ہو۔

اس کے بعد میں نے اصول شکنی کرتے ہوئے ایلیا محمد کی تین سابق سیکرٹریوں سے بات کی جو تنہائی کی سزا بھگت رہی تھیں۔ میں نے ان کے منہ سے بچوں کی ولدیت کی کہانیاں سنیں اور مجھے انہی کی زبانی علم ہوا کہ ایلیا محمد کا کہنا تھا کہ میں ان کا سب سے اچھا وزیر ہوں لیکن ایک روز میں انہیں چھوڑ دوں گا اور ان کا مخالف ہو جائوں گا لہٰذا میں "خطرناک" ہوں۔ انہی سابق سیکرٹریوں نے مجھے بتایا کہ جس وقت ایلیا محمد میرے منہ پر مجھے سراہ رہے ہوتے تھے اسی وقت پیٹھ پیچھے میرے بخیے ادھیڑ رہے ہوتے تھے۔ یہ بات سن کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ ہر روز مجھے مائیکرو فونز،

کیمروں، صحافیوں اور دیگر مصروفیات بشمول اپنی مسجد نمبر7 کے مسلمانوں کا سامنا کرنا ہوتا تھا مجھے لگتا تھا میرے حواس جواب دے گئے ہیں۔

آخر کار مجھ پر حقیقت روشن ہوگئی کچھ نہ کرنا بھی غداری محسوس ہوتا تھا اور بیٹھ رہنے سے ایلیا محمد کی مدد نہیں ہو سکتی تھی کسی کو تو کھڑا ہونا ہی تھا۔

ایک رات میں نے انہیں خط میں ان کے خلاف پھیلائے جانے والے زہر کے متعلق لکھا۔ انہوں نے جواباً مجھے نیویارک میں فون کرکے کہا کہ ملاقات ہونے پر اس کی بابت گفتگو کریں گے۔

مجھے کسی ایسے راستے کی، ایسے سہارے کی شدید ضرورت تھی جس سے قوم اسلام کو تباہی سے بچایا جا سکے۔ مجھے قوم پر اعتماد تھا ہم کوئی ناچتے، چلاتے اور گناہوں سے بھرے عیسائی نیگروز نہیں تھے۔

مجھے ایک راستہ سجھائی دیا جسے عوام میں خبر پھیل جانے کے بعد اختیار کیا جا سکے۔ وفادار مسلمانوں کو یہ سمجھایا جا سکتا تھا کہ انسانی بڑائیاں اس کی فطری کمزوریوں سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ اس دستاویز کی تیاری کے لیے والس محمد نے الہامی کتاب انجیل مبارک اور قرآن مجید کی تفسیر سے حوالے ڈھونڈنے میں میری مدد کی۔

وہ تمام حوالہ جات حضرت دائودؑ، حضرت لوطؑ، حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعلق موجودہ بائبل میں ملتے ہیں۔ ان تمام حوالوں میں مثبت منفی پر غالب آتا تھا۔

اسے معجزہ ہی کہیئے کہ جہاں شکاگو میں زنا کی بات زبان زد عام تھی وہاں بوسٹن، ڈیرائٹ اور نیویارک میں بہت کم لوگوں کو اس کی خبر تھی۔ بظاہر ملک کی دوسری مساجد کو بھی یہ اطلاع نہیں پہنچی تھی۔ میرے سننے میں آیا تھا کہ شکاگو میں بہت سے مسلمانوں نے مسجد نمبر2 میں جانا ترک کر دیا تھا اور وہ غیر مسلم جو قوم سے ہمدرانہ رویہ رکھتے تھے اب علی الاعلان مسلم مخالف بن چکے تھے۔ فروری 1963ء میں میں نے یونیورسٹی آف اسلام میں گریجویشن شروع کروائی اور جناب ایلیا محمد کے بہت سے اہل خانہ کو متعارف کروایا تو مسلم حاضرین نے کافی سردمہری کا مظاہرہ کیا۔

اپریل 1963ء میں ایلیا محمد نے مجھے ملاقات کے لیے فی نکس بلوایا۔ ہم حسب روایت گلے ملے اور وہ مجھے فوراً باہر تیراکی کے تالاب کے کنارے لے گئے اور چہل قدمی کرنے لگے۔

وہ میرے مذہبی رہنما تھے اور میں ایک گمراہ، گناہ گار مجرم تھا۔ میں اتنا برا تھا کہ دوسرے مجرم بھی مجھے شیطان کہتے تھے۔ اس شخص نے مجھے بچایا تھا، مجھے پر لگا دیئے جن سے میں وہاں وہاں پہنچا وہ وہ کام کیے جو میرے تصور میں بھی نہیں تھے۔ میں جذبات کے گرد باد میں چکر کھاتا ان کے ساتھ چل رہا تھا۔

"جی بیٹے!" ایلیا محمد نے مجھ سے کہا "کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے بغیر لگی لپٹی کے سب کچھ ان کے آگے رکھ دیا اور ان کے جواب سے قبل یہ بھی بتا دیا کہ میں نے اور والس نے بائبل اور قرآن سے ایسے حوالے تلاش کیے ہیں جو مسلمانوں کو بتائے جانے چاہئیں اگر یہ ضروری ہو تو۔

"بیٹے، مجھے تمہاری بات پر حیرانی نہیں ہوئی" جناب ایلیا محمد نے کہا۔ "تم ہمیشہ سے مذہبی قیادت اور دیگر روحانی معاملات کافی بہتر سمجھتے ہو۔ تم پہچان سکتے ہو کہ یہ سب کچھ۔۔۔ تم وہ سمجھ رکھتے ہو جو بڑھاپے کو پہنچ کر ہی حاصل ہوتی ہے۔

انہوں نے بھی وہی خرافات اُگلیں جو ان کے بیٹے والس محمد نے مذہبی کتب سے حوالے ڈھونڈتے ہوئے بکی تھیں۔

میں نے فیصلہ کیا کہ مشرقی ساحل(East Coast) کے چھ منتخب مسلمان افسران کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جائے۔ میں نے انہیں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ میں نے انہیں اس لیے بتایا ہے کہ وہ مساجد میں مسلمانوں کو تعلیم دینا اپنا فرض بنا لیں کہ یہ "تکمیل قیادت" کی کڑی ہے۔ مجھے علم ہوا کہ وہ مسلمان افسران پہلے سے سب کچھ سن چکے ہیں۔ ان میں سے وزیر لوئی ایکس جو بوسٹن سے تھا سات ماہ پہلے سے آگاہ چلا آتا تھا اور وہ سب کشمکش میں تھے۔

میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ شکاگو کے مسلمان افسران میری کوششوں کو جلتی پر تیل ڈالنے کا نام دیں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ مجھے اس وبا کے آغاز کا باعث بھی قرار دیں گے۔ شکاگو کے مسلمانوں کی توجہ اصل مسئلہ سے ہٹا کر مجھ پر مرتکز کرنے کا کام شروع ہو چکا تھا۔ متزلزل ایمان کے لوگوں کو میرے خلاف نفرت پر ابھارا جانے لگا۔

مجھے اچھی طرح جاننے والے غیر مسلم نیگروز اور چند قریبی سفید فام صحافی مجھے مسلسل تلقین کر رہے تھے کہ "میلکم ایکس! تم بہت تھکے ہوئے دکھائی دیتے ہو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

ان میں سے کچھ تو واقعی مخلص اور بے لوث تھے۔ انہی میں سے ایک سفید فام نے جس کا نام میں نہیں لے سکتا مبادا اسے نوکری سے ہاتھ دھونا پڑیں، مجھ سے کہا کہ "میلکم ایکس، نیگروز سے کہیں زیادہ سفید فاموں کو تمہاری

ضرورت ہے۔" یہ جملہ مجھے اس لیے یاد رہ گیا کیونکہ میں نے پہلی بار کسی سفید فام سے قوم اسلام سے ہٹ کر بات کی تھی۔

یونہی باتوں باتوں میں اس نے بحر مردار کی دستاویزات کا ذکر چھیڑ دیا جس پر میں نے کہا "ہاں وہ مخطوطے عیسیٰؑ کے سفید ہونے کے تاثر کو بدل دیں گے اور انہیں اس Main Stream میں شامل کریں گے جہاں وہ ایک غیر سفید فام کے طور پر پہچانے جائیں گے" یہ سن کر وہ صحافی بے حد حیران ہوا جس پر میں نے اس سے کہا کہ "عیسیٰؑ" مصری Seers کی برادری سے تھے جس کا ذکر مشہور مصری مورخ "فی لو" نے بھی کیا ہے جو حضرت عیسیٰ کا ہم عصر تھا۔ اس کے بعد ہم کوئی دو گھنٹے تک آثار قدیمہ، تاریخ اور مذہب پر باتیں کرتے رہے۔ گفتگو اتنی خوشگوار تھی کہ کچھ دیر کے لیے تمام پریشانیاں میرے ذہن سے محو ہوگئیں۔ ہماری گفتگو اس نکتہ پر منتج ہوئی کہ سن2000ء تک مکتب جانے والے ہر بچے کو دور قدیم کے عظیم لوگوں کی درست رنگت کے بارے ضرور پڑھایا جائے۔

ڈیلاس ٹیکساس میں 22 نومبر 1963ء کو ہونے والے قتل کی یاد دہانی ضروری نہیں ہے۔ اس قتل کے چند گھنٹوں بعد ہی مسلم وزراء کو جناب ایلیا محمد کی طرف سے دو ڈائریکٹوز(Directives) موصول ہوئے جن میں جناب ایلیا محمد نے ہدایت کی تھی کہ قتل کے متعلق بیان ہر گز نہ دیا جائے اگر بہت مجبور کیا جائے تو "بلاتبصرہ"(Nocomments) کہہ دیا جائے۔

ان تین دنوں میں جب مقتول صدر (کینیڈی) کے علاوہ کوئی موضوع سخن تھا ہی نہیں، ایلیا محمد نے نیویارک کے مین ھٹن سنٹر میں ایک خطاب کرنا تھا جو پہلے سے طے تھا انہوں نے اس خطاب سے انکار کر دیا چونکہ سنٹر کا کرایہ ہم ادا کر چکے تھے اس لیے ایلیا محمد نے مجھے اپنی جگہ خطاب کرنے کے لیے کہا چنانچہ میں نے لوگوں سے خطاب کیا۔ اس خطاب کے بعد میں آج بھی ان شذرات(Notes) کو کئی بار دیکھتا ہوں جو مذکورہ قتل سے ایک ہفتہ قبل تیار کیے گئے تھے۔ میری تقریر کا عنوان تھا۔ "سفید امریکہ کے متعلق اللہ کا فیصلہ" یہ میرا جانا پہچانا موضوع تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ "جیسا کرو گے ویسا بھروگے یا کس طرح امریکی سفید فام منافق وہی کاٹ رہا ہے جو اس نے بویا تھا۔"

سوال وجواب کا آغاز لامحالہ ایک ہی سوال سے شروع ہونا تھا۔ کسی نے پوچھا "صدر کینیڈی کے قتل کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اور آپ کی رائے کیا ہے؟" میں نے بلاتوقف جواب دیا کہ "میری رائے میں اس کا جواب یہ ہے کہ چاہ کن راچاہ درپیش۔"

جب مجبور سیاہ فام لوگوں کی جان لینے والی نفرت کو نہیں روکا گیا بلکہ اسے بے لگام پھیلنے کا موقع دیا گیا تو آخر اس کا نشانہ سربراہ مملکت کی ذات بنی۔ بالکل اسی طرح میڈ گرایور، پیٹرس لامبا اور محترمہ Nhu کے شوہر کے ساتھ ہوا۔"

میرا بیان فوراً شہہ سرخیوں اور نمایاں خبروں کی زینت بنا:

"چاہ کن راچاہ درپیش۔ سیاہ مسلمانوں کے میلکم ایکس کا بیان۔"

مجھے یہ سب سوچ کر وحشت ہوتی ہے کہ امریکہ بھر میں اور ساری دنیا میں بعض نمایاں ترین شخصیات سمیت سب لوگ یہ بات مجھ سے کہیں زیادہ سخت الفاظ میں کہہ رہے تھے کہ صدر کی موت کی ذمہ دار امریکہ پر چھائی ہوئی نفرت کی فضا ہے۔ لیکن جب میلکم ایکس نے یہ کہا تو طوفان برپا ہو گیا۔

اگلے روز میری ایلیا محمد سے معمول کی ملاقات تھی اور میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کچھ ہونے کو ہے۔

ایلیا محمد مجھ سے بغل گیر ہوئے مگر مجھے گرم جوشی میں تھوڑی سی کمی محسوس ہوئی۔ میں نے بھی خود میں تناؤ محسوس کیا جو اپنی جگہ عجیب بات تھی۔ سالہا سال سے مجھے اس بات پر فخر رہا تھا کہ میں اور ایلیا محمد اتنے قریب ہیں کہ میں ان کے احساسات کو اسی طرح جان لیتا ہوں جس طرح اپنے احساسات کو۔ اگر میں پریشان ہوتا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ پریشان ہیں۔ اگر وہ پرسکون ہوتے تو میں بھی پرسکون ہوتا اور اب میں تناؤ کا شکار تھا۔۔۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے پوچھا "تم نے آج کے اخبار دیکھے؟" میں نے کہا "جی، دیکھے ہیں۔" "یہ بہت برا بیان تھا۔" انہوں نے کہا۔ "سارا ملک اس سے پیار کرتا تھا۔ امریکہ اس وقت سوگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ ایک بے وقت بیان تھا۔ اس سے عام مسلمانوں کے لیے مسائل پیدا ہوں گے۔"

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی آواز کہیں دور سے آ رہی ہو "مجھے آئندہ نوّے روز کے لیے تمہاری زبان بندی کرنا پڑے گی تاکہ مسلمان اس حماقت سے لاتعلق ہو سکیں۔"

میں سن ہو کر رہ گیا تھا۔

لیکن میں ان کا مقلد تھا کئی بار میں نے اپنے ماتحتوں سے کہا تھا کہ دوسرے سے نظم و ضبط کے آرزو مند کو پہلے خود نظم و ضبط کا پابند ہونا چاہیے۔

میں نے انہیں جواب دیا"جناب میں آپ سے متفق ہوں اور سزا تسلیم کرتا ہوں۔ سو فیصد"

میں نیویارک واپسی پر خود کو نفسیاتی طور پر تیار کرتا آیا کہ کس طرح مسجد نمبر 7 کے ماتحتوں کو بتانا ہے کہ مجھے معطل یا "خاموش" کر دیا گیا ہے لیکن حیرانی کی بات یہ ہوئی کہ میرے پہنچنے تک یہ اطلاع ماتحتوں کو ہو چکی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرانی اس بات پر ہوئی کہ نیویارک کے ہر اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو بھی بذریعہ تار اطلاع دے دی گئی تھی غالباً یہ شکاگو کے زعماء کی جانب سے اب تک کا تیز ترین اقدام تھا۔ لندن پیرس، اے پی، یو پی آئی، ٹیلی ویژن، ہر ریڈیو نیٹ ورک اور ہر اخبار مجھ سے رابطہ کر رہا تھا میں نے انہیں بتایا "میں نے ایلیا محمد کی نافرمانی کی تھی میں ان کی حکمت کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔ ہاں میں توقع رکھتا ہوں کہ نوے دن کے بعد دوبارہ بات کر سکوں گا۔"

اخباروں نے سرخیاں لگائیں "میلکم ایکس خاموش کر دیا گیا۔"

مجھے اس بات کی فکر تھی کہ اگر نوے دن کے اندر قوم اسلام میں کوئی اور سکینڈل کھڑا ہو گیا تو کیا ہو گا؟ میں لب بستہ ہونگا اور ذرائع ابلاغ کو اپنے تجربے کی بنیاد پر وضاحت نہ دے سکوں گا جس سے معاملہ گمبھیر ہو سکتا ہے۔

اگلے روز مجھے علم ہوا کہ میری زبان بندی میرے تصور سے بھی زیادہ سخت ہے۔ مجھے نہ صرف پریس کے ساتھ بات کرنے کی اجازت نہ تھی بلکہ مجھے اپنی مسجد نمبر7 میں تعلیم دینے کی اجازت بھی نہ تھی۔

پھر قوم اسلام میں اعلان کیا گیا کہ "اگر اس نے اعتراف کر لیا" تو نوے دن کے اندر اندر اسے دوبارہ قوم اسلام میں شامل کر لیا جائے گا۔

اس بات سے مجھے پہلی بار شک ہوا کیونکہ میں نے مکمل طور پر اعتراف کر لیا تھا لیکن جان بوجھ کر سب مسلمانوں کو یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ میں نے بغاوت کی۔

میں نے سالوں تک سڑکوں پر یونہی اٹھائی گیری نہیں کی تھی مجھے علم تھا کہ مجھے پھنسایا جا رہا ہے۔

تین دن بعد میرے علم میں یہ بات آئی کہ مسجد نمبر7 میں میرے ماتحت مسلمانوں بھائیوں کو یہ کہہ رہے ہیں کہ "اگر تمہیں وزیر (میلکم) کے کرتوت کا علم ہو جائے تو تم خود اس کی جان لے لو گے" تب میں نے جانا کہ میرے متعلق موت کی گفتگو کی اجازت قوم اسلام میں صرف ایک شخص دے سکتا ہے۔

مجھے سخت ذہنی صدمہ ہوا میں اپنی گھریلو ڈاکٹر لیونا اے ٹرنر کے پاس گیا جو ایسٹ ایلم ھرسٹ، لانگ آئی لینڈ میں پریکٹس کرتی تھی اور اسے اپنے دماغی معائنے کے لیے کہا اس نے میرا معائنہ کیا اور بتایا کہ میں شدید ذہنی دباؤ میں تھا اور مجھے آرام کی سخت ضرورت تھی۔

کیسیئس کلے اور میں اگرچہ آج ساتھ ساتھ نہیں ہیں لیکن میں اس کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا کہ اس نے ان دنوں جب وہ میامی میں سونی لسٹن کے ساتھ مقابلے کی تیاری کر رہا تھا مجھے بیٹی اور بچوں کو ہماری شادی کی چھٹی سالگرہ کے تحفے کے طور پر اپنے گھر مدعو کیا۔

کیسیئس کلے سے میری ملاقات 1962ء میں ڈیٹ رائٹ میں ہوئی تھی جہاں وہ اور اس کا بھائی رڈولف ڈیٹ رائیٹ کی مسجد میں ایک بڑی ریلی سے ایلیا محمد کا خطاب سننے طلباء کے ظہرانے پر آئے تھے۔ ان کی موجودگی سے سب موجود مسلمانوں کو بہت خوشی ہوئی اور سب لوگ انعام یافتہ وجیہہ اور مقبول بھائیوں کو اپنے درمیان پا کر بہت متاثر ہوئے۔ کیسیئس کلے میرے پاس آیا اور میرا ہاتھ دبا کر اپنا تعارف کروایا "میں کیسیئس کلے ہوں" اس نے اپنا تعارف اس طرح کروایا جیسے سب لوگوں کو اس سے پہلے ہی سے آشنا ہونا چاہیے اور میں نے بھی یہی ظاہر کیا حالانکہ میں اس سے قبل اس سے واقف نہیں تھا ہم دونوں دو مختلف دنیاؤں کے آدمی تھے۔ دراصل ایلیا محمد نے ہمیں ہر طرح کے کھیلوں سے دور رہنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔

ایلیا محمد کی تقریر سن کر دونوں بھائی سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اس کے بعد کیسیئس کلے کے مختلف شہروں میں مسلم مساجد اور ریسٹورنٹس میں آنے کی خبریں مجھ تک پہنچتی رہیں اور اگر میرا خطاب کسی قریبی علاقے میں ہوتا تو کیسیئس ضرور سننے آتا۔ میں بھی اسے پسند کرتا تھا اس میں کوئی خوبی ایسی تھی کہ میں نے اسے اپنے گھر مدعو کیا۔ بیٹی نے بھی اسے پسند کیا اور بچے تو اس کے دیوانے تھے۔ وہ ایک پسندیدہ دوستانہ مزاج کا صاف ستھرا اور سادہ نوجوان تھا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات کے متعلق بھی بہت چوکنا رہتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ عوام میں مسخروں جیسی حرکتیں کرنا اس کے منصوبے میں شامل تھا اس نے میرے شک کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ اس کی ہر ممکن کوشش ہے کہ سونی لسٹن اکھاڑے میں آنے سے پہلے ضرورت سے زیادہ خود اعتماد، مشتعل اور نامکمل تربیت یافتہ ہو اور ذہنی طور پر اس لڑائی کو بھی اپنی مشہور "ون رائونڈ ناک آئوٹ" سمجھے۔ کیسیئس کلے نہ صرف نصیحت سن لیتا تھا۔ بلکہ مشورہ بھی کر لیتا تھا ابتدائی طور پر میں نے اسے یہ سمجھایا کہ کسی بھی سماجی شخصیت کی کامیابی کا بہت حد تک دارومدار اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کے مقاصد اور ان کی حقیقی

فطرت کے بارے میں کتنا آگاہ اور ہوشیار ہے۔ میں نے اسے "لومڑیوں" سے ہوشیار کیا جو اس کے ارد گرد اکٹھی رہتی تھیں اور اسے بتایا کہ یہ خوبصورت لڑکیاں لومڑیاں نہیں بلکہ درحقیقت بھیڑیے ہیں۔

بیٹی اور میری بچیوں نے اس کی دعوت سے بہت لطف اٹھایا۔

مجھے اندازہ نہیں کہ اس نازک وقت میں اگر میں نیو یارک میں ہوتا تو کیا کرتا۔ سارے ذرائع ابلاغ نے میرا محاصرہ کر رکھا تھا میں جذباتی صدمے کی حالت میں تھا۔ جیسے شادی کے خوشگوار بارہ سال گزرنے کے بعد کوئی شریک حیات صبح ناشتے کی میز پر اچانک طلاق کے کاغذ آگے رکھ دے۔

مجھے یوں لگتا تھا جیسے قوانین فطرت میں تبدیلی آگئی ہو۔ یہ سب کچھ اتنا ناقابل یقین تھا کہ میرا ذہن اسے قبول کرنے سے انکاری تھا۔ میں اپنے آپ کو بالکل بری ذمہ قرار نہیں دے رہا۔ کیسیئس کلے کے فائیٹ کیمپ اور دوسری جگہوں پر جو کچھ میں نے اپنی بیوی سے اور دیگر لوگوں سے کہا اس کا مجھے مکمل شعور نہیں تھا۔ میرا ذہن بارہ سالوں پر پھیلی ہزاروں یادوں اور منظروں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے مسلم مساجد۔۔۔ مسٹر (ایلیائی) محمد اور ان کے خاندان سے ملاقاتیں۔۔۔ سماجی مجالس میں مسلمانوں سے انفرادی اور اجتماعی ملاقاتیں۔۔۔ سفید فام سامعین اور صحافیوں سے گفتگو کی یادوں نے گھیر رکھا تھا۔

میں چلتا تھا باتیں کرتا تھا کام کرتا تھا اور کیسیئس کلے کے فائٹ کیمپ میں موجود بہت سے صحافیوں سے بار بار کہتا تھا کہ میں نوے دن میں بحال کر دیا جاؤں گا۔ بتدریج مجھے احساس ہونے لگا کہ یہ جھوٹ ہے۔ لیکن میں نفسیاتی طور پر اس حقیقت کا سامنہ نہیں کر سکتا تھا کہ میرے اور قوم اسلام کے درمیان واقعتاً علیحدگی ہو چکی ہے کیا آپ میری بات سمجھ رہے ہیں؟ یعنی ایک جج کے دستخطوں سے ایک جوڑے میں جسمانی طور پر طلاق ہو جاتی ہے لیکن اگر دونوں میں سے ایک یا دونوں ہی ازدواجی زندگی میں ایک دوسرے سے بہت وابستہ رہے چکے ہوں تو انہیں نفسیاتی طور پر علیحدگی اختیار کرنے میں سالہا سال بھی لگ سکتے ہیں۔ لیکن اس جسمانی علیحدگی کے باوجود میں ان سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے غافل نہیں رہ سکتا تھا جو شکاگو میں مجھے اگر اس دنیا سے نہیں تو کم ازکم قوم اسلام سے ختم کرنے کے لیے کی جا رہی تھیں۔ اور میرا خیال تھا کہ میں سازش کی ہیئت کو سمجھ رہا تھا اس سلسلے میں پہلا قدم میرے خلاف اٹھایا جا چکا تھا۔ تمام مسلمانوں کو یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ میں نے جناب (ایلیائی) محمد سے بغاوت کی ہے میں دوسرے قدم کا اندازہ لگا سکتا تھا یعنی مجھے معطل رکھا جائے گا(اور بعد میں مجھے الگ کر دیا جائے گا) اس کے بعد

تیسرے قدم کے طور پر یا تو کسی جاہل مسلمان کو اشتعال دلایا جائے گا کہ وہ مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے مجھے قتل کر دے یا مجھے مسلسل الگ رکھ کر بتدریج سماجی منظر سے غائب کر دیا جائے گا۔

صرف میری بیوی کو صورتحال سے آگاہی تھی۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ سہارے یا توانائی کے لیے میں کبھی کسی عورت پر اتنا انحصار کروں گا جتنا کہ میں بیٹی پر کر رہا تھا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں کہتی تھی نہ ہم دونوں کے درمیان اس حوالے سے کوئی بات چیت ہوتی لیکن جس معیار کی وہ بیوی تھی اور اس میں جتنی گہرائی افہام و تفہیم کی تھی اس بنا پر میں اس کی قربت میں بہت آسودگی محسوس کرتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بھی اللہ کی اتنی ہی اطاعت گزار ہے جتنا میں تھا اور مجھے یہ بھی علم تھا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ میرا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔

موت کی باتیں میں خوف کی وجہ سے نہیں کر رہا تھا۔ گزشتہ بارہ سال میں ہر لمحہ اپنی جان(ایلیائ) محمد کی خاطر قربان کرنے کے لیے تیار رہا ہوں۔ غداری مجھے موت سے بھی بدتر محسوس ہوتی تھی۔ میں موت کو تو سمجھ سکتا تھا لیکن جتنی وفاداری میں نے قوم اسلام اور (ایلیائ) محمد کے ساتھ کی تھی اسے دیکھتے ہوئے غداری کا خیال میرے تصور سے ماوراء تھا۔ گزشتہ بارہ سال میں اگر جناب(ایلیائ) محمد کوئی ایسا جرم کرتے جس کی سزا موت ہوتی تو میں بطور خدمت گار ان کی جگہ بجلی کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے بخوشی تیار تھا۔

میامی میں کیسیئس کلے کے مہمان کے طور پر میں نے بے حد کوشش کی کہ میں اپنے ذاتی مسائل کو نظرانداز کر کے قوم اسلام کے مسائل پر توجہ مرتکز کر سکوں۔ میں اب تک اپنے آپ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جناب (ایلیائ) محمد محض پیش گوئی کی تکمیل کر رہے ہیں کیونکہ مجھے یقین کامل تھا کہ اگر جناب (ایلیائ) محمد بذات خود اوتار نہیں ہیں تو یقینا ہمارے مذہبی لیڈر ہیں۔

جس چیز نے میری تمام تر کوشش کے باوجود میرے ایمان کو متزلزل کر دیا وہ یہ تھی کہ جناب (ایلیائ) محمد نے اپنے پیروکاروں کے سامنے اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے یا پیش گوئی کی تکمیل کے حوالے سے وضاحت کرنے کی بجائے جیسے یقینا مسلمان سمجھ لیتے یا کم ازکم مان لیتے" اپنے عمل کو چھپانے اور اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

یہ میرے لیے بہت بڑا جھٹکا تھا۔

اس موقع پر مجھے محسوس ہوا کہ جناب (ایلیائ) محمد کو اپنی ذات پر اتنا یقین نہیں ہے جتنا مجھے ان کی ذات پر ہے۔ اس طرح بارہ سال کے بعد میں اس قابل ہوا کہ حقائق کا سامنا کرنے اور اپنے متعلق سوچنے کی ہمت اور جرأت کر سکوں۔

میں فلوریڈا سے واپس اپنے گھر لونگ آئی لینڈ آ گیا۔ یہاں آ کر مجھے علم ہوا کہ شکاگو کے مسلم افسران کیسیئس کلے کے کیمپ کے حوالے سے میری خبریں پڑھ کر مجھ سے بہت ناراض تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کیسیئس کے جیتنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ میری کیسیئس کے ساتھ وابستگی سے مسلمانوں کو پریشانی ہو گی۔ (پتہ نہیں ہمارے چیمپئن کو یہ بات آج یاد بھی ہے کہ نہیں کہ پورے امریکہ کے اخبارات مقابلے سے پہلے اسے کوریج دے رہے تھے سوائے "محمد سپیکس" کے حالانکہ کیسیئس ہمارا مسلمان بھائی تھا لیکن مسلم اخبار اس کے مقابلے کو قابل اشاعت نہیں سمجھتا تھا) میں واپس میامی گیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ اللہ کی رضا اسی میں ہے کہ میں اسلام کی برتری ثابت کرنے کے لیے کیسیئس کی مدد کروں۔ جس سے یہ ثابت ہو کہ ذہن کو جسمانی طاقت پر برتری حاصل ہے۔ مجھے یہ بات یاد کروانے کی ضرورت نہیں ہے کہ کس طرح لوگ کیسیئس کلے کی جیت کے امکانات کا مذاق اڑاتے تھے۔

اس مرتبہ میں نیویارک سے اپنے ہمراہ فلائیڈ پیٹرسن اور سونی لسٹن کی کچھ تصاویر لیتا آیا تھا جس میں کچھ سفید فام پادری بطور "روحانی مشیر" ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ بطور مسلمان کسیئیس کو یہ بتانے کی ضرورت نہ تھی کہ عیسائیت نے امریکی سیاہ فاموں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ میں نے کیسیئس کو بتایا کہ "یہ ایک حقیقی لڑائی ہے پہلی بار صلیب اور ہلال ایک دوسرے کے مقابل آئے ہیں۔ یہ جدید صلیبی جنگیں ہیں۔ ٹیلی ویژن کے ذریعے پہلی بار ساری دنیا ایک عیسائی اور ایک مسلم کو آمنے سامنے دیکھے گی۔" میں نے "کیسیئس" سے پوچھا "کیا تم سمجھتے ہو کہ اللہ نے یہ صورتحال تمہاری فتح کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے پیدا کی ہے؟"

(آپ کو یاد ہو گا کہ مقابلے سے قبل "کیسیئس" چِلاّ رہا تھا کہ "میری کامیابی کی پیشگوئی ہو چکی ہے۔ مجھے کوئی نہیں ہرا سکتا")

سونی لسٹن کے مشیروں نے اسے "کیسیئس" سے مقابلے کے بجائے "سفید فاموں سے یک جہتی" کی زیادہ تربیت دی تھی۔ اس کے لیے اس نے سفید فاموں کے علاقے میں ایک اعلیٰ گھر کرائے پر حاصل کیا تھا جہاں اس کا پڑوسی "نیویارک یینکیز" بیس بال کلب کا مالک "ڈان ٹوپنگ" تھا۔ کبھی کبھار جب شام کو میں اور "کیسیئس" سیاہ فاموں کے

علاقے میں چہل قدمی کے لیے جاتے تو مقامی لوگوں کے منہ ایک چیمپئین کو سفید فاموں کی بجائے اپنے درمیان دیکھ کر حیرت سے کھلے کے کھلے رہ جاتے۔ "کیسیئس" ان سے کہتا "تم میرے اپنے لوگ ہو اور اپنے سیاہ فام لوگوں میں رہ کر مجھے طاقت حاصل ہوتی ہے۔"

درحقیقت سونی لسٹن کو ایک بہت بڑے خطرے کا سامنا تھا یعنی ایک ایسے شخص کا سامنا جو اللہ کی عبادت کرتا ہے اور کسی سے نہیں ڈرتا۔

میامی کے کنونشن ہال میں آٹھ ہزار سے زائد حاضرین میں میری نشست کا نمبر 7 تھا۔ سات ہمیشہ سے میرا پسندیدہ ہندسہ رہا ہے اور جس نے ساری زندگی میرا تعاقب کیا ہے۔ میں نے اسے "کیسیئس" کی کامیابی کا اللہ کی طرف سے ایک اشارہ سمجھا "کیسیئس" کے ساتھ مجھے اس کے چھوٹے بھائی رڈولف کی فکر بھی تھی جو ابتدائی مقابلوں میں حصہ لے رہا تھا۔ جس وقت رڈولف چار رائونڈ کے مقابلے میں جیت رہا تھا اس وقت "کیسیئس" آڈیٹوریم میں سیاہ سوٹ پہنے بڑے تحمل کے ساتھ سب سے پیچھے کھڑا رڈولف کو فلوریڈا کے نیگرو "چپ جانسن" کے ساتھ مقابلہ کرتے دیکھ رہا تھا۔ گزشتہ مہینوں کے غیر سنجیدہ رویئے کے بعد "کیسیئس" کی سنجیدگی نے کئی ایسے صحافیوں کو جو "کلے" کی عبرت ناک شکست کی پیش گوئی کر رہے تھے پریشان کر دیا۔

جب "کیسیئس" کپڑے تبدیل کرنے کے لیے گیا تو طے شدہ پروگرام کے تحت میں اس کے ساتھ خصوصی دعا میں شامل ہوا اور اللہ کی مدد چاہی۔ بالآخر کلے اور لسٹن اکھاڑے میں اپنے اپنے کونوں میں پہنچ گئے۔ میں ہاتھ باندھے سب سے سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ ٹیلی ویژن کیمرہ کسی بھی وقت آپ کو احمقوں کی طرح چلاتے دکھا سکتا تھا۔

سوائے چوتھے اور پانچویں چکر (Round) کے جس میں "کیسیئس" کی آنکھوں میں کوئی کیمیائی مادہ پڑ جانے سے عارضی طور پر اس کی بینائی متاثر ہوئی باقی مقابلہ اس کے منصوبے کے مطابق ہی ہوا۔ وہ لسٹن کے طاقتور مکوں سے بچتا رہا۔ تیسرے رائونڈ میں لسٹن تھکنا شروع ہو گیا کیونکہ اس نے زیادہ خوداعتمادی کی بنا پر صرف دو چکروں کی تربیت یا مشق کی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ لسٹن ھار گیا۔ تاریخ کی اتنی بڑی تبدیلی کا راز یہ تھا کہ اس رات سے مہینوں پہلے کلے، لسٹن کو ذہنی طور پر ہرا چکا تھا۔

شائد کسی نئے چیمپیئن کی اس طرح خاموش دعوت نہ ہوئی ہو۔ اکھاڑے کا نوعمر بادشاہ میرے موٹل آیا۔ آئسکریم کھائی دودھ پیا فٹ بال کے ستارے جمی براؤن اور دوسرے دوستوں اور چند صحافیوں سے باتیں کیں۔ تھوڑی دیر میرے بستر پر سویا اور اپنے گھر چلا گیا۔ اگلی صبح پریس کانفرنس سے پہلے ہم نے ناشتہ اکٹھے کیا اس کے بعد ”کلے“ نے اعلان کیا جو عالمی شہ سرخی بنا کہ وہ ”سیاہ فام مسلم“ ہے۔

میں آپ کو ایک بات بتا دوں وہ یہ کہ ”کیسیئس“ نے کبھی اپنے آپ کو ”سیاہ فام مسلمانوں“ کا رکن قرار نہیں دیا۔ صحافیوں نے اس کے جس بیان پر اسے ”سیاہ فام مسلم“ قرار دیا وہ یہ تھا ”میں دین اسلام پر ایمان رکھتا ہوں جس کا مطلب ہے کہ میرا ایمان ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول (Apostle) ہیں۔ یہ وہی دین ہے جس پر افریقہ اور ایشیا کے سات سو ملین سے زیادہ سیاہ فام ایمان رکھتے ہیں۔“

اس سارے غلغلے میں سب سے احمقانہ بیان فلائیڈ پیٹرسن کا تھا کہ وہ بطور کیتھولک ”کیسیئس کلے“ سے مقابلہ کرنا چاہتاہے تاکہ ہیوی ویٹ کا تاج کسی مسلمان کے سر پر نہ سج سکے۔ اس سے آپ اس ذہنی تطہیر کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو سیاہ فام عیسائیوں کی سفید فاموں نے کر رکھی تھی جس کی بنا پر وہ ان کی خاطر لڑنے مرنے کو بھی تیار تھے' بمشکل تین ہفتوں بعد اخبارات نے خبر دی کہ پیٹرسن اپنا مکان جس کی قیمت ایک لاکھ چالیس ہزار ڈالر تھی بیس ہزار (20000) ڈالر کے نقصان پر فروخت کر رہا ہے۔ اس نے سفید فاموں کے ساتھ ربط قائم کر کے دیکھ لیا تھا وہ سفید فام اس کی زبوں حالی کے ذمہ دار تھے۔ وہ اس کے دوست نہیں تھے ان کے بچے اس کے بچوں کو ”نیگرو“ کہتے تھے۔ پیٹرسن نے صحافیوں کو بتایا کہ ”ایک پڑوسی نے اپنے کتے کو سدھایا کہ وہ پیٹرسن کے مکان کو نقصان پہنچائے۔ دوسرے پڑوسی نے اپنی باڑ اونچی کر لی تاکہ نیگروز نظر بھی نہ آئیں میں نے ربط بڑھانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔“

میری موت کے براہ راست احکامات ساتویں مسجد کے سربراہ کے ذریعے جاری کیے گئے جو قبل ازیں میرا قریبی ماتحت رہ چکا تھا۔ میرے ایک اور سابق ماتحت کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ اس کے پاس تباہی پھیلانے کا کافی علم تھا۔ اسے کہا گیا کہ وہ میری کار کے ساتھ دھماکہ خیز مواد اس طرح لگائے کہ جب میں چابی اگنیشن میں گھماؤں تو وہ پھٹ جائے لیکن خوش قسمتی سے وہ نیشن کے ساتھ میری وابستگی اور وفاداری سے بخوبی واقف تھا۔ اس لیے وہ سیدھا میرے پاس آیا۔ میں نے اپنی جان بچنے پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ شکاگو میں دراصل کیا ہو رہا ہے جسے سن کر بے یقینی کے عالم میں اسے ایک بار سکتہ ہو گیا۔ اس کے تعلقات ساتویں مسجد کے ان اہلکاروں کے ساتھ بھی تھے

جنہیں اس کے انکار کے بعد یہ ذمہ داری سونپی جا سکتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ خیال رکھے گا کہ دوسرے لوگ بھی اس معاملے میں ذمہ داری نہ لیں۔ اس پہلے حکم کے بعد میری "نیشن آف اسلام" کے ساتھ نفسیاتی علیحدگی کا آغاز ہوا۔ مجھے ہر جگہ گلیوں' کاروباری مراکز' لفٹوں' فٹ پاتھ پر گزرتی گاڑیوں میں آشنا مسلمانوں کے چہرے دکھائی دیتے اور میں جانتا تھا کہ ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو مجھے گولی مارنے کے لیے موقع کی تاک میں ہے۔

میں نے بہت سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میری زندگی سیاہ فام امریکیوں کی جدوجہد سے وابستہ تھی۔ مجھے عام طور پر "لیڈر" سمجھا جاتا تھا۔ میں نے کئی نام نہاد سیاہ فام رہنمائوں پر تنقید کی تھی۔ اب مجھے ایمانداری سے سوچنا تھا کہ میں سیاہ فام لوگوں کی انسانی حقوق کے حصول کی جدوجہد میں ان کی کس طرح مدد کر سکتا ہوں؟ ایک اچھے منتظم کے لیے ضروری ہے کہ وہ حقائق کا بے لاگ تجزیہ کرے۔

مجھے علم تھا کہ میں ایک عالمی شخصیت ہوں۔ اگر میں کچھ کہوں گا تو لوگ اسے پڑھیں گے اور سنیں گے۔ ممکن ہے کہ بات کی نوعیت کے پیش نظر دنیا بھر کے لوگ اس پر توجہ دیں۔ نیویارک سٹی میں جہاں سے میں کام کا آغاز کر سکتا تھا میرے کافی تعداد میں غیر مسلموں سے براہ راست تعلقات تھے اور یہ تب سے بن رہے تھے جب پولیس کے ہاتھوں ہنسٹن پر تشدد کے بعد میں نے مسلمانوں کی اجتماعی ریلی نکالی تھی۔ ہارلم کے سینکڑوں نیگروز نے اسے دیکھا تھا اور لاکھوں نے بعد میں جانا کہ اگر سیاہ فام بے خوف ہو کر سفید فام کے آگے کھڑا ہو جائے تو وہ کچھ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ سارے ہارلم نے دیکھا کہ اس کے بعد پولیس مسلمانوں کی عزت کرنے لگی تھی۔ (انہی دنوں آٹھائیسویں پری سینکٹ کے ڈپٹی چیف انسپکٹر نے میرے متعلق کہا تھا کہ "کسی شخص کو اتنا طاقتور نہیں ہونا چاہیے")

بعد کے سالوں میں میں نے دیکھا کہ نیویارک سٹی کے سیاہ فاموں کی بہت بڑی تعداد میرے کہے پر کان دھرتی تھی۔ یہی وجہ ہے جب میں کسی جلوس سے خطاب کرتا تو نام نہاد نیگرو رہنمائوں سے دس بارہ گناہ زیادہ لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ مجھے علم تھا کہ بڑے بڑے نام نہاد رہنمائوں میں صرف ایک کمی تھی وہ یہ کہ انہیں کچی بستی کے نیگروز کے ساتھ سچی ہمدردی نہیں تھی اور ہو بھی کیسے سکتی تھی جب کہ وہ اپنا زیادہ وقت سفید فاموں کے ساتھ مربوط ہونے میں گزارتے تھے۔ کچی بستیوں کے لوگ جانتے تھے کہ میں نے دلی طور پر ان بستیوں کو نہیں چھوڑا اور جسمانی تعلق بھی اتنا ہی توڑا جتنا مجبوری تھی۔ میرے اندر انہی لوگوں والی جبلت تھی اور میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ کچی بستیوں کے سامعین کا ہیجان کب معمول سے بڑھ جاتا ہے۔ میں ان کی زبان بول اور سمجھ سکتا تھا جب کہ دوسرے بڑے بڑے سیاہ فام رہنما کچی بستیوں کے سیاہ فاموں کے لیے بولنے کا محض دعویٰ ہی کرتے تھے۔

ایک بار میں ایسے ہی ایک رہنما کے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ ہارلم کا ایک اچکا ہمارے پاس آیا۔ اس نے بازاری زبان میں کچھ کہا مجھے تو اس کی بات سمجھ میں آ گئی لیکن دوسرا رہنما اسے اس طرح گھور رہا تھا جیسے وہ سنسکرت بول رہا ہو۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے میں نے اسے اس کی بات کا مفہوم سمجھایا۔

مقصد یہ ہے کہ میں بطور راہنما ”اے۔ بی۔ سی“، ”سی۔ بی۔ ایس“ یا ”این۔ بی۔ سی“ یا ھارورڈ اور ٹسکیجی وغیرہ میں خطاب کرنے کے ساتھ ساتھ نام نہاد متوسط طبقے کے نیگروز اور کچی بستیوں کے لوگوں سے بھی بات چیت کر سکتا تھا۔ (جن کے متعلق باقی راہنما صرف باتیں کرتے تھے) کیونکہ میں خود ایک اچکا رہ چکا تھا اس لیے سارے گوروں سے اور تقریباً تمام سیاہ فام راہنمائوں سے زیادہ بہتر جانتا تھا کہ امریکہ کا سب سے خطرناک آدمی دراصل کچی بستیوں کا اچکا یا اٹھائی گیرا ہے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کچی بستیوں کے جنگل میں یہ اٹھائی گیرا ہی وہ واحد طاقت ہے جو سفید فام کے طاقتی ڈھانچے کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے اندر ایسی کوئی چیز نہیں جو اسے کسی کام سے روکے۔ اس کا کوئی مذہب نہیں نہ اس کے پاس کوئی اخلاقی تصور ہے اس پر کوئی سماجی ذمہ داری نہیں اور نہ وہ کسی سے ڈرتا ہے۔ وہ زندہ رہنے کے لیے مستقل دوسروں کی تاک میں رہتا ہے اور ہمیشہ انسانی کمزوریوں کو کھوجتا رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ ”کچھ“ کرنے کے لیے بے چین‘ بے قرار اور مضطرب رہتا ہے۔ وہ جس چیز کا عہد کر لیتا ہے اپنے آپ کو مکمل طور پر اس سے وابستہ کر لیتا ہے۔

کچی بستیوں کے اس اچکے کو جو بات اور زیادہ خطرناک بناتی ہے وہ اس کا رومانی تصور ہے۔ کچی بستیوں کے نوجوان اپنے ماں باپ کو کسی مقام پر پہنچنے کی جدوجہد کے جہنم میں مبتلا دیکھتے ہیں یا وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ماں باپ نے متعصب اور ناقابل برداشت سفید فام آدمی کے مقابلے میں جدوجہد مکمل ترک کر دی چنانچہ یہ نوجوان اس اٹھائی گیرے جیسا بننا چاہتے ہیں جنہیں وہ بہترین کپڑے پہن کر دولت میں کھیلتا دیکھتے ہیں اور اس بات کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں کہ وہ کسی شخص یا کسی چیز کا احترام نہیں کرتے۔ یہ بات نوجوانوں کو بہت دلکش لگتی ہے اور وہ اچکے پن، منشیات، چوری، عصمت فروشی اور دیگر اخلاقی و قانونی جرائم کی دنیا میں گم ہو جاتا ہے۔

جب مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ اگر یہ نوجوان تشدد کا راستہ اختیار کر لیں تو کتنا بڑا خطرہ بن سکتے ہیں تو میں ڈر گیا۔ گرمیوں کی ایک سہ پہر میں نے ہارلم میں ایک جلوس میں شرکت کی جس میں نوجوان بہت تعداد میں تھے۔ مجھے کچھ معروف نیگرو رہنمائوں نے مدعو کیا تھا جو مجھ سے بات بھی کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ انہوں نے میرا نام صرف لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ راستے میں میں اس نکتے پر جتنا سوچتا مجھے اور

غصہ آتا اور جب میں سٹیج پر پہنچا تو میں نے صاف کہہ دیا کہ میں یہاں مطلوب نہیں تھا صرف میرا نام استعمال کیا گیا ہے۔ یہ کہہ کر میں سٹیج سے اتر آیا۔ یہ سن کر نوجوان نیگروز غصے میں آ گئے اور چیخنا چلانا اور توڑ پھوڑ شروع کر دی جس سے بوڑھے نیگروز پریشان ہو گئے چاروں طرف ٹریفک بند ہو گئی۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں اپنی کار کی چھت پر چڑھا اور بازو ہلا کر نوجوانوں کو خاموش ہونے کے لیے کہا تو وہ خاموش ہو گئے پھر میں نے انہیں منتشر ہونے کے لیے کہا تو وہ منتشر ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد یہ کہا جانے لگا کہ میں امریکہ کا واحد نیگرو ہوں جو کسی بھی نسلی فساد کو رکوا سکتا ہے____ یا شروع کروا سکتا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ میں ان دونوں میں سے کوئی کام بھی کر سکتا ہوں لیکن میں ایک بات جانتا ہوں کہ اس توانائی اور آتش' جو ان کے اندر دہک رہی ہے جو سینکڑوں سال سے موجود شمالی علاقے کے سفیدفام کی نفرت کا نتیجہ ہے کا حصول مشکل نہیں۔

1964ء کی طویل گرمیوں میں میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ اگر ہارلم' روچسٹر وغیرہ جہاں فسادات صرف انہی علاقوں تک محدود رہتے ہیں جہاں نیگرو بستیاں ہیں۔ اگر یہ فسادات اپنی حدوں سے باہر نکل کر سفیدفاموں تک پہنچ جائیں تو کیا ہو گا۔ نیویارک' شکاگو' واشنگٹن' ڈی۔ سی' ڈیٹ رائیٹ غرض آپ کسی شہر کا نام لیں۔ کلیولینڈ' فلاڈالفیا' سان فرانسسکو' لاس اینجلس ہر جگہ سیاہ فاموں کا غصہ بارود کی طرح سلگ رہا ہے اور بڑھ رہا ہے۔

بات ذرا دور نکل گئی اور ان کے واقعات کا ذکر بھی آ گیا جنہوں نے مجھے کچی بستیوں کے خطرے کی عزت کرنا سکھایا۔ دراصل میں وضاحت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے سیاہ فاموں کا ایک حقیقی آزاد راہنما بننے کے لیے اپنی اہلیت کا نہایت سنجیدگی سے تجزیہ کیا۔ بالآخر میں نے مان لیا کہ فیصلہ تو ہو چکا ہے۔ کچی بستیوں کے لوگ پہلے ہی مجھ پر بطور راہنما اعتماد کرتے تھے اور میں جبلی طور پر جانتا تھا کہ یہ لوگ صرف اسی پر اعتماد کرتے ہیں جو انہیں سفیدفاموں کے ہاتھ فروخت نہ کرے۔ نہ صرف میری ایسی کوئی نیت نہیں تھی بلکہ یہ میری فطرت کے بھی خلاف تھا۔ مجھے ایک ایسی تنظیم کا قیام جو سفیدفام کی ایڑی کے تلے سسکتے ہوئے شمالی امریکہ کے سیاہ فاموں کے مسائل حل کر سکے' ایک چیلنج محسوس ہوا۔ شمالی امریکہ کا سیاہ فام مریض ہونے کے حد تک سرجھکائے بھیڑ کی طرح سفیدفام کی ثقافت کو قبول کرنے والا تھا۔ وہ روحانی طور پر بھی بیمار تھا کیونکہ وہ صدیوں سے اس سفیدفام کی عیسائیت کو قبول کرتا آ رہا تھا۔ جس نے اسے دوسرے عیسائیوں کے برابر حقوق تو نہیں دلوائے لیکن اسے نام نہاد سفیدفام عیسائیوں کے ظلم سہنے کا عادی کر دیا۔ عیسائیت نے سیاہ فاموں کے خیالات کو مبہم غیرمربوط اور پریشان کر دیا۔ عیسائیت نے

اسے سکھایا کہ اگر اس کے پاس جوتے نہیں اور وہ بھوکا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جنت میں اسے دودھ ’ شہد اور تلی ہوئی مچھلیاں ملیں گی۔

شمالی امریکہ کا سیاہ فام معاشی طور پر بھی بیمار تھا کیونکہ بطور صارف اسے اپنے حصے سے کم ملتا تھا اور بطور پیداکار بھی اس کا کوئی خاص حصہ نہ تھا۔ آج کے امریکی سیاہ فام کو پیراسائیٹ ظاہر کیا جاتا ہے۔ اسے بہت موٹی گائے جو سفید امریکہ ہے کے تھن سے چمٹا دکھایا جاتا ہے جسے دیکھ کر سیاہ فام سمجھتے ہیں کہ وہ ترقی کر رہے ہیں۔ مثلاً سیاہ فام سالانہ تین ارب ڈالر گاڑیوں کی خرید پر صرف کرتا ہے لیکن پورے امریکہ میں شاید ہی کوئی فرنچائزڈ سیاہ فام ڈیلر نظر آئے۔ میں ایک اور مثال دیتا ہوں۔ امریکہ میں درآمدشدہ مہنگی سکاچ وہسکی کا چالیس فیصد سٹیٹس کے مارے سیاہ فاموں کے پیٹ میں جاتا ہے لیکن سیاہ فاموں کے ملکیتی یونٹ ان کے غسلخانوں یا کہیں دور جنگلوں تک محدود ہیں۔ ایک اور مثال جو کافی قابل شرم ہے دیکھیے نیویارک سٹی میں جہاں نیگروز دس لاکھ سے زیادہ ہیں وہاں آپ کو سیاہ فاموں کی ملکیت ایسے بیس کاروبار بھی نہیں ملیں گے جس میں دس سے زیادہ ملازم ہوں کیونکہ سیاہ فام اپنی کمیونٹی میں بھی کوئی تھوک کا روبار کر کے اپنی کمیونٹی کو مستحکم نہیں کر سکتے۔

شمالی امریکہ کا سیاہ فام سیاسی طور پر بھی بیمار ہے۔ اس نے اپنی حماقت سے سفیدفام کو موقع دیا کہ وہ اسے سیاہ ڈیموکریٹ’ سیاہ ری پبلکن’ سیاہ کنزرویٹو یا سیاہ لبرل میں تقسیم کر دے۔ چونکہ سفیدفام کا ووٹ تقریباً ہمیشہ مساوی طور پر تقسیم ہوتا ہے اس لیے ایک کڑور سیاہ فاموں کا ووٹ امریکی سیاست میں فیصلہ کن ہو سکتاہے۔ صرف انتخابات ہی واحد جگہ ہیں جہاں سیاہ فام اپنے مقصد کے لیے عزت طاقت اور ایسے ہی دوسرے ہتھیاروں کے ساتھ جن کی سفیدفام عزت کرتا ہے’ سمجھتا ہے’ ڈرتا ہے اور تعاون کرتا ہے’ لڑ سکتاہے۔ میری بات غور سے سنیں اگر سیاہ فاموں کی کمیٹی واشنگٹن میں سیاہ فاموں سے شدید نفرت کرنے والی کسی گورے سے یہ کہے ”ہم ایک کروڑووٹوں کے نمائندہ ہیں“ تو وہ اچھل کے کھڑا ہو جائے گا اور کہے گا ”کیسے مزاج ہیں؟ اندر تشریف لے آیئے“ اگر مسی سپی کے سیاہ فام اجتماعی ووٹ ڈالیں تو یا تو ایسٹ اینڈ اپنے آپ کو جیکب جیوٹس سے زیادہ آزاد خیال ظاہر کرے گا یا اپنے دفتر میں نہیں رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نسل پرست سیاست دان سیاہ فام کو ووٹوں سے دور رکھنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔

جہاں ووٹرز اجتماعی طور پر ووٹ استعمال کر کے الیکشن کے نتائج کا فیصلہ کر سکتے ہوں اور ایسا نہ کریں تو ایسے گروہ کو سیاسی طور پر بیمار کہا جائے گا۔ ایک بار مہاجرین نے امریکی سیاست میں ٹیمی حال کو واحد طاقتورترین قوت بنا دیا تھا۔

1880ء میں پہلا آئیرش کیتھولک نیویارک سٹی کا میئر منتخب ہوا اور1960ء میں امریکہ کا پہلا آئیرش کیتھولک صدر کا انتخاب جیتا۔ امریکی سیاہ فام اجتماعی ووٹ کے ذریعے اس سے بھی کہیں بڑی طاقت بن سکتے ہیں۔

امریکی سیاست پر خصوصی مفادات سے وابستہ گروہوں اور لابیوں کا غلبہ ہے اور سیاہ فاموں کے علاوہ کونسا گروہ ایسا ہے جسے فوری مفادات کے لیے گروہ بندی اور لابنگ کی ضرورت ہے؟ لیبر پارٹی نے وہائیٹ ہاوس کے بالکل سامنے ایک بہت بڑی عمارت بنا رکھی ہے۔ جہاں وہ سیاسی اقدامات پر نگاہ رکھتے ہیں۔ کسان اس وقت اپنی لابی کے ذریعے حکومتی رعاتیں حاصل کرنے والا سب سے بڑا گروہ ہے کیونکہ دس لاکھ (1000000) کسان بطور ڈیموکریٹس' ری پبلکنس' لبرلز یا کنزر ویٹوز ووٹ نہیں دیتے بلکہ بطور کسان ووٹ ڈالتے ہیں۔

ڈاکٹرز بھی واشنگٹن میں مضبوط لابی رکھتے ہیں اور کامیابی سے لاکھوں لوگوں کی ضرورت یعنی میڈی کیئر پروگرام پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ امریکہ میں چقندر اگانے والوں کی لابی ہے۔ گندم اگانے والوں کی' مویشی پالنے والوں کی لابیاں ہیں۔ حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے ممالک جن کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں واشنگٹن میں اپنی لابی رکھتے ہیں جو ان کے مفادات کی نگرانی کرتی ہے۔ حکومت نے خصوصی شعبے بنا رکھے ہیں جو مشترک مفادات والے گروہوں سے معاملات طے کرتے ہیں۔ شعبہ زراعت کسانوں کی ضروریات کا دھیان رکھتاہے اس طرح صحت یا تعلیم اور بہبود کے شعبے ہیں ایک شعبہ برائے داخلی امور ہے جس میں انڈینز زیادہ ملوث ہیں۔ کیا امریکہ کا سب سے بڑا مسئلہ کسان ڈاکٹر یا انڈین ہیں؟ نہیں سب سے بڑا مسئلہ سیاہ فام ہیں۔ واشنگٹن میں پینٹاگان کے برابر ایک شعبہ ہونا چاہیے جو سیاہ فاموں کے ہر مسئلہ کو حل کرے۔ دو کروڑ بیس لاکھ (22000000) سیاہ فام جو چار سو سال سے امریکہ کی خدمت کر رہے ہیں۔ جنہوں نے انقلاب کے بعد ہر جنگ میں خون بہایا ہے اور جانیں دی ہیں۔ جو امریکہ میں عظیم ہجرت بلکہ پلگرمز سے بھی پہلے یہاں آئے تھے آج بھی سب سے نچلے طبقے میں زندگی گزار رہے ہیں۔

اس ملک کا ڈھانچا تین ستونوں پر قائم ہے۔ معیشت' سیاسی مضبوطی اور طاقت۔ سیاہ فام آدمی کے پاس معاشی قوت نہیں ہے اور اس کے حصول میں بہت وقت لگے گا لیکن اس وقت امریکی سیاہ فام کے پاس سیاسی طاقت وقوت ہے جو راتوں رات اس کی تقدیر بدل سکتی ہے۔

میرے ذہن میں جو تنظیم تھی وہ ایک بہت بڑا قدم تھا۔ اس کے ذریعے امریکی سیاہ فام انسانی حقوق حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا جواسکی ذہنی روحانی معاشی اور سیاسی بیماری کو دور کر دیتی۔ اگر آپ کوئی اہم کام کرنا چاہیں تو اس کا آغاز بھی اہم منصوبہ بندی سے ہونا چاہیے۔ جو تنظیم میں بنانا چاہتا تھا وہ میری توقع کے مطابق نیشن آف اسلام

(Nation of Islam) سے مختلف ہونی چاہیے تھی جس میں تمام عقائد کے حامل سیاہ فاموں کو قبول کرنے کی گنجائش ہو اور جو نیشن آف اسلام کے برعکس محض تبلیغ کی بجائے عمل پر یقین رکھتی ہو۔

خاص طور پر مشرقی ساحلی شہروں میں میرے اقدام کے متعلق افواہیں اڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ مجھے اس کام کے لیے اپنے سے بھی زیادہ سرگرم لوگ چاہئیں تھے۔ آئے روز عسکری مزاج کے حامل مسلم جنہیں میرے ساتھ مسجد نمبر7 میں کام کرنے کا موقع مل چکا تھا نیشن آف اسلام سے تعلق توڑ کر میرے ساتھ شامل ہونے لگے۔ ہر روز غیر مسلم نیگروز بھی جو متوسط اور اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور دکھاوے کی زندگی سے تنگ آ چکے تھے میری مدد کرنے لگے اور اس بات کا اصرار بڑھنے لگا کہ میں باقاعدہ تنظیم سازی کا اعلان کروں۔ اپنی تنظیم کا پہلا اجلاس بلانے کے لیے میں نے ہوٹل تھریسا میں کارور بال روم کرائے پر حاصل کیا۔ یہ ہوٹل 125 سٹریٹ اور 7th ایونیو کے موڑ پر واقع تھا جو کہ ہارلم کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔

ایمسٹرڈیم نیوز کے صحافی نے خبر لگائی کہ ہم تھریسا میں ابتدائی مسجد قائم کرنے لگے ہیں جس پر ملک بھر سے تار خطوط اور ٹیلیفون آنے لگے۔ عمومی تاثر یہ تھا کہ لوگ اس اقدام کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ لاتعداد اجنبی لوگ مجھ پر اعتماد کا اظہار کر رہے تھے۔ جن کا کہنا یہ تھا کہ وہ نیشن آف اسلام کے سخت اخلاقی ضابطوں سے تنگ آ کر میرے گروہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے ہماری پالیسی کے اعلان سے پہلے ہی عطیات بھیجنا شروع کر دیئے۔ دوسرے شہروں کے مسلمان اپنے خطوط میں اظہار شمولیت کے ساتھ ساتھ اکثر یہ بات لکھتے کہ "اسلام میں ٹھہراؤ آ گیا ہے اور "نیشن" کا سفر بہت آہستگی سے طے ہو رہا ہے۔ حیران کن طور پر بہت سے سفید فاموں نے بھی خطوط لکھے اور عطیات کی پیشکش کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا وہ بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ میرا جواب تھا "نہیں" ہماری رکنیت صرف سیاہ فاموں کے لیے تھی البتہ اگر ان کا ضمیر انہیں مجبور کرے تو وہ معاشی طور پر ہماری مدد کر کے امریکہ کے نسلی مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ مجھے خطاب کے لیے مدعو کیا جانے لگا جس میں زیادہ تعداد عیسائی سفید فام وزراء کی تھی۔ میں نے ایک پریس کانفرنس بلائی اور دنیا بھر کے صحافی اس میں شریک ہوئے۔ جس میں میں نے اعلان کیا کہ میں نیویارک سٹی میں ایک نئی مسجد کا آغاز کرنے جا رہا ہوں جو کہ "مسلم موسک ان کارپوریشن" کہلائے گی۔ اس سے ہمیں ایک مذہبی بنیاد حاصل ہو گی اور ہمارے لوگوں کو اخلاقی برائیوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے روحانی طاقت میسر آئے گی۔ عارضی طور پر "مسلم موسک ان کارپوریشن" کا ہیڈکوارٹر ہوٹل

تھریسا ہارلم میں ہو گا جو کہ سیاسی دبائو ،معاشی استحصال اور سماجی تحقیر جس سے کہ 22ملین افرو امریکن سیاہ فاموں کو روز سابقہ پڑتا ہے کو ختم کرنے کے لیے کام کرے گا۔ اس کے بعد صحافیوں نے سوال کرنا شروع کر دیئے۔

ابتداء میں بغیر احتیاط کے ہر جگہ چلا جاتا تھا اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ نیشن آف اسلام میں میرے کچھ بھائی سمجھتے ہیں کہ اگر وہ مجھے قتل کر دیں تو انہیں ہیرو کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایلیا محمد کے پیروکار کس طرح سوچتے ہیں کیونکہ ان میں سے بہت سوں کو میں نے خود سوچنا سکھایا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جان لینے میں اس مسلمان سے زیادہ مستعد اور کوئی نہیں ہو سکتا جو یہ سمجھتا ہو کہ یہ عمل رضائے الٰہی کا باعث ہے۔ ایک اور چیز بہت عرصے سے میرے ذہن میں تھی لیکن پیسے کی کمی سے باعث میں اسے حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے میں بوسٹن میں اپنی بہن ایلاء کے پاس گیا جو مجھ سے کچھ ناراضی کے باوجود میرے لیے اپنے دل میں جگہ رکھتی تھی۔
میں نے اسے کہا ”ایلاء میں حج کے لیے مکہ جانا چاہتا ہوں“ ایلاء نے پوچھا ”تمہیں کتنے پیسے چاہئیں؟“

!

باب: 17

مکّہ

مکّہ کی زیارت جسے حج کہا جاتا ہے ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اگر معاشی اعتبار سے وہ اس قابل ہو تو زندگی میں اسے کم از کم ایک بار اس کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے ”حج کعبہ اللہ کی طرف سے لوگوں پر فرض ہے ان میں سے جو استطاعت رکھتے ہوں وہ سفر کریں“ اللہ کا فرمان ہے ”اور لوگوں کو حج کے لیے بلائو وہ تمہارے پاس پیدل اور اونٹوں پر آئیں گے اور دوردراز کی وادیوں سے آئیں گے۔“

کبھی کسی کالج یا یونیورسٹی میں عام طور پر میرے خطاب کے بعد غیر رسمی گفتگو کے دوران لگ بھگ درجن کے قریب گورے رنگ کے لوگ مجھے ملتے اوربتاتے کہ وہ عرب یا مشرق وسطیٰ یا شمالی افریقہ کے مسلمان ہیں۔ وہ یا تو امریکہ کے رہائشی ہوتے یا یہاں پڑھنے یا گھومنے کے لیے آئے ہوئے ہوتے۔ وہ مجھے کہتے کہ سفیدفاموں کے خلاف میری فردجرم سن کر وہ سمجھتے ہیں کہ میں ایک مخلص مسلمان ہوں اور اگر میں ”حقیقی اسلام“ کا مطالعہ کروں تو یقینا میں اسے بہترطور پر سمجھ سکوں گا اور اپنا لوں گا لیکن میں ایلیا محمد کا پیروکار ہونے کے ناطے ان سے ناراض ہوتا لیکن کئی بار میں تنہائی میں اپنے آپ سے سوال کرتا کہ اگر کوئی شخص خلوص کے ساتھ کسی مذہب کا پیروکار ہے تو وہ اس مذہب سے متعلق اپنے علم کو وسعت دینے سے کیوں ڈرے؟

ایک بار دورانِ گفتگو میں نے ایلیا محمد کے بیٹے والس محمد کے سامنے یہ سوال رکھا تو اس نے کہا یقینا ایک مسلمان اسلام سے متعلق جو کچھ بھی سیکھ سکے اور علم حاصل کر سکے کرنا چاہیے۔ میں پہلے بھی والس محمد کی رائے کو اہمیت دیتا تھا۔

ان آرتھوڈوکس مسلمانوں نے جو مجھے ملتے رہتے تھے مجھے ترغیب دی کہ میں ڈاکٹر محمودیوسف شواربی سے ملوں اوربات کروں جو کہ معروف مسلم عالم’ قاہرہ یونیورسٹی کے گریجوایٹ’ یونیورسٹی آف لندن سے پی ایچ ڈی’ اسلام پر

لیکچر دینے والے ’اقوام متحدہ کے سفیر اور بہت ساری کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ قاہرہ یونیورسٹی میں مکمل پروفیسر تھے اور آج کل چھٹی پر نیویارک میں فیڈریشن آف اسلامک ایسوسی ایشن کے ڈائریکٹر کے طور پر یونائیٹڈ سٹیٹس اور کینیڈا میں فرائض ادا کر رہے تھے۔ کئی بار اس طرف سے گزرتے ہوئے ایف۔ آئی۔ اے کی بھوری بلڈنگ جو کہ 1۔ ریور سائیڈ ڈرائیو پر واقع ہے میں جانے کی خواہش کو دباتا رہا پھر ایک روز ایک صحافی کے توسط سے میری ملاقات ڈاکٹر شواربی سے ہوئی۔ وہ بہت مہذب آدمی تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اخبار میں میرے متعلق پڑھتے رہتے ہیں۔ ہم پندرہ بیس منٹ تک باتیں کرتے رہے۔ ہم دونوں کے پاس وقت کم تھا لیکن جانے سے پہلے انہوں نے ایک ایسی بات کہی جو میرے دل میں بیٹھ گئی انہوں نے کہا ”کسی آدمی کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔“

دوسری طرف میری بہن ایلاء تھی وہ ایک مضبوط ’بڑی‘ جارجیا کی پیدائش سیاہ فام عورت تھی۔ اس کے حاکمانہ انداز کی وجہ سے اسے بوسٹن کی مسجد نمبر گیارہ سے الگ کر دیا گیا تھا۔ بعد میں اسے بحال کر دیا گیا لیکن پھر اس نے خود علیحدگی اختیار کر لی۔ ایلانے بوسٹن کے آرتھوڈوکس مسلمانوں کے ماتحت مطالعہ شروع کیا پھر اس نے ایک سکول قائم کیا جہاں عربی سکھائی جاتی تھی۔ وہ خود تو عربی نہیں بول سکتی تھی مگر اس نے ایسے اساتذہ ملازم رکھ لیے جو عربی بول سکتے تھے۔ یہ تھی ایلاء جو جائیداد کی خرید وفروخت کا کام کرتی تھی اور حج کے لیے پیسے جوڑ رہی تھی۔ تقریباً رات بھر ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ اس کا کہنا تھا کہ میرا بلاتوقف حج پر جانا ضروری ہے۔ نیویارک واپسی پر دوران پرواز میں مسلسل اس کے متعلق سوچتا آیا کہ وہ کتنی مضبوط عورت ہے۔ وہ تین شوہروں کی خودی کچل چکی تھی اور توانائی اور قوت کے اعتبار سے ان تینوں سے مجموعی طور پر زیادہ مضبوط تھی۔ اس نے میری زندگی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس کے سوا کسی اور عورت میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میری راہنمائی کر سکے۔ ہمیشہ میں نے ہی عورتوں کو راہ دکھائی تھی۔ ایلاء کو میں اسلام میں لایا تھا اور اب وہ مجھے مکہ بھیجنے کے اخراجات اٹھا رہی تھی۔

اگر آپ اللہ سے وابستہ ہو جائیں تو وہ بھی اپنی قربت کا احساس دلانے کے لیے آپ کو نشانیاں دکھاتا ہے۔ جب میں نے مکہ کے ویزے کے لیے سعودی عرب کے سفارت خانے میں درخواست دی تو سعودی سفیر نے مجھے بتایا کہ کسی امریکی نومسلم کو اس وقت تک حج کے لیے ویزہ نہیں مل سکتا جب تک ڈاکٹر محمود شواربی اس کی تحریری اجازت نہ دیں لیکن یہ تو اللہ کی پہلی نشانی تھی۔ جب میں نے ڈاکٹر شواربی کو فون کیا تو انہوں نے حیرانی سے کہا ”میں تم سے رابطہ کرنے ہی والا تھا فوراً میرے پاس پہنچو۔“ جب میں ان کے دفتر پہنچا ڈاکٹر شواربی نے مجھے حج کے لیے تحریری

اجازت نامہ اور ایک کتاب دی جس کا نام تھا "The Eternal Message of Muhammad" (محمدؐ کا ابدی پیغام) اس کے مصنف عبدالرحمان اعظم تھے۔ ڈاکٹر شواربی نے بتایا کہ کتاب کے مصنف نے انہیں اس کتاب کا نسخہ مجھے دینے کے لیے بھجوایا تھا۔ مصنف مصری نژاد سعودی شہری ہیں۔ بین الاقوامی سٹیٹس مین اور سعودی عرب کے حکمران شہزادہ فیصل کے قریب ترین مشیر ہیں۔ جب ڈاکٹر شواربی نے مجھے بتایا کہ مصنف بھی میرے متعلق چھپنے والی خبروں پر نگاہ رکھتے ہیں تو میری حیرانی کی حد نہ رہی۔

ڈاکٹر شواربی نے مجھے اپنے بیٹے محمد شواربی کا ٹیلیفون نمبر دیا جو قاہرہ میں طالب علم تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے مجھے مصنف کے بیٹے عمر اعظم کا فون نمبر بھی دیا جو جدہ میں رہتا تھا۔ جو مکہ سے پہلے آخری قیام ہے۔ ڈاکٹر شواربی نے مجھے دونوں سے بہر صورت رابطہ کرنے کے لیے کہا۔

میں نے نہایت خاموشی سے نیویارک چھوڑا (مجھے احساس نہیں تھا کہ میری واپسی کتنی ہنگامہ خیز ہو گی) میری روانگی کے متعلق بہت کم لوگ جانتے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی سرکاری ادارہ یا کوئی اور رکاوٹ آخری وقت پر میری راہ میں کھڑی کر دی جائے۔ صرف میری بیوی بیٹی، بہن اور میری تین بیٹیاں اور چند قریبی لوگ کینیڈی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر میرے ساتھ آئے۔ جب ”لفتھانسا ایئر لائنز“ کا جیٹ فضا میں بلند ہوا تو میں اپنے ہمرائیوں سے متعارف ہوا۔ ایک اور اشارہ' وہ دونوں مسلمان تھے۔ ایک میری طرح قاہرہ جا رہا تھا اور دوسرا جدہ جہاں مجھے کچھ دن بعد جانا تھا۔ فرینکفرٹ' جرمنی کا سارا راستہ میں ان سے باتیں کرتا یا دی گئی کتاب پڑھتا رہا۔ جب ہم فرینکفرٹ اترے تو جدہ جانے والے بھائی نے گرمجوشی کے ساتھ مجھے اور قاہرہ والے بھائی کو الوداع کہا۔ قاہرہ کے لیے دوسرے جہاز کے روانہ ہونے میں ابھی دیر تھی اس لیے ہم نے فرینکفرٹ کی سیر کا پروگرام بنایا۔ ایئرپورٹ کے مردانہ غسل خانے میں مجھے پہلا غیر ملکی امریکی ملا جس نے مجھے پہچان لیا وہ ایک سفید فام طالب علم تھا جو رہوڈز آئی لینڈ کا رہنے والا تھا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر میرے قریب آ کر بولا ”تم ایکس ہو؟“ میں نے ہنس کر کہا ”ہاں میں ہی ہوں“ اس نے خوشی سے کہا ”نہیں تم نہیں ہو سکتے بوائے! مجھے پتہ ہے جب میں دوسروں کو بتاؤں گا تو کوئی میری بات پر یقین نہیں کرے گا“ اس نے بتایا کہ وہ فرانس میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

دوسرا مسلمان بھائی اور میں دونوں فرینکفرٹ کے لوگوں کی شائستہ مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوئے۔ ہم بہت سی دکانوں میں گھومتے رہے۔ ہم کسی بھی دکان میں داخل ہوتے تو اجنبی ہونے کے باوجود ہر دکان پر ہمارا ”ہیلو“ کہہ کر استقبال کیا جاتا اور جب ہم بنا کچھ خریدے باہر نکلتے تو بھی اسی شائستگی کا مظاہرہ کیا جاتا۔ امریکہ میں آپ ایک دکان

میں جاتے ہیں سوڈالر کی خریداری کرتے ہیں پھر بھی اجنبی ہی رہتے ہیں۔ کلرکس اور آپ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے پیش آتے ہیں جیسے دونوں احسان کر رہے ہوں۔ یورپی لوگ زیادہ بہتر انسان ہیں میرا مسلمان بھائی جو جرمن بول سکتا تھا جب بتاتا کہ ہم مسلمان ہیں تو مجھے امریکہ کی طرح یہاں بھی ایک نیگرو کی بجائے ایک مسلمان کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ لوگ جب آپ کو ایک مسلمان کی نظر سے دیکھتے ہیں تووہ آپ کو ایک انسان سمجھ کے دیکھ رہے ہوتے ہیں ان کا انداز نظر اور انداز گفتگو سب کچھ بدل جاتا ہے۔ ایک چھوٹی سی دکان میں سٹور کیپر نے کاؤنٹر پر جھک کر جرمن لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا ”آج اس راستے پر ہیں کل دوسرے راستے پر ہوں گے“ میرے مسلمان بھائی نے مجھے وضاحت کی کہ اس کا مطلب ہے کہ جرمن لوگ ایک بار پھر عروج حاصل کریں گے۔

واپس فرینکفرٹ ائیرپورٹ پر آ کر ہم ”یونائیٹڈ عرب ائیرلائنز“ پر بیٹھ کر قاہرہ روانہ ہو گئے۔ بہت سے مسلمانوں کے گروہ جو حج پر جا رہے تھے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ ان میں ہر رنگ کے لوگ تھے لیکن فضا میں ایک گرمجوشی اور محبت گھلی ہوئی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ یہاں رنگ کا کوئی مسئلہ نہیں مجھے یوں لگا جیسے میں نے ابھی جیل سے باہر قدم رکھا ہو۔

میں نے اپنے مسلمان بھائی دوست سے کہا کہ جدہ جانے سے پہلے میں دو دن قاہرہ کی سیاحت کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے اپنا نمبر دیا اور رابطہ کرنے کے لیے کہا۔ وہ مجھے اپنے دوستوں سے ملوانا چاہتا تھا جو انگریزی بول سکتے تھے اور حج پر جا رہے تھے۔

میں نے دو دن قاہرہ کی سیاحت میں گزارے۔ میں جدید سکولوں’ سڑکوں’ رہائشی تعمیرات اور صنعتی ترقی سے بہت متاثر ہوا۔ میں نے کہیں پڑھا اور سنا تھا کہ صدرناصر کی انتظامیہ نے مصر کو براعظم افریقہ کے انتہائی صنعتی ممالک میں سے ایک ملک بنا دیا ہے۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ حیران کیا وہ قاہرہ میں گاڑیوں اور بسوں کی مینوفیکچرنگ تھی۔

ڈاکٹر شواربی کے بیٹے محمد شواربی سے بھی ملاقات ہوئی ایک انیس سالہ نوجوان جو قاہرہ یونیورسٹی میں اکنامکس اور پولیٹیکل سائنس پڑھ رہا تھا اس نے بتایا کہ اس کے والد کا خواب ہے کہ وہ امریکہ میں یونیورسٹی آف اسلام قائم کریں۔

مسلمان بھائی کے دوستوں سے ملاقات ہوئی تو وہ یہ جان کر کہ میں ایک مسلمان ہوں اور وہ بھی امریکہ سے' بہت حیران ہوئے۔ ان لوگوں میں ایک مصری سائنسدان اور ان کی بیگم بھی تھے جو حج کرنے مکہ جا رہے تھے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ میں ان کے ساتھ قاہرہ کے مضافاتی علاقے ”ہیلیوپولس“ میں واقع ریستوران میں کھانا کھاؤں۔ وہ بے حد ذہین اور انتہائی باعلم جوڑا تھا۔ ”مصر کی بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی کے باعث ہی مغربی طاقتوں میں مصر مخالف جذبات پیدا ہو رہے ہیں اور دوسرے افریقی ممالک کے لیے اس بات کا اشارہ ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔“ یہ اس سائنس دان کے خیالات تھے۔ اس کی بیوی نے مجھ سے کہا ”امریکہ کے پاس اتنی اضافی خوراک کے ہوتے ہوئے دنیامیں لوگ بھوکے کیوں مر رہے ہیں؟ اس کا وہ کریں گے کیا؟ سوائے اس کے کہ سمندر میں میں پھینک دیں؟“ میں نے جواب دیا ”ہاں۔ لیکن وہ اس میں سے کچھ فالتو جہازوں میں رکھ دیں گے اور غلے کے گوداموں میں ٹھنڈی جگہوں پر جمع کر لیں گے جہاں ایک فوج ظفرفوج اس کی دیکھ بھال کرتی رہے گی تاآنکہ یہ کھانے کے لائق نہ رہے اس کے بعد ایک اور فوج کی فوج اسے ضائع کرنے کے لیے جُت جائے گی تاکہ اگلے اضافی ذخیرے کے لیے جگہ بنائی جا سکے۔“ اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں لیکن امریکہ کے ٹیکس دہندگان جانتے ہیں کہ یہ سچ ہے۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ خود امریکہ کے اندر بھی بھوکے لوگ رہتے ہیں۔

میں نے اپنے مسلمان دوست کو فون کیا جہاں اس کے حاجی دوست میرے منتظر تھے۔ مجھ سمیت ہم آٹھ تھے جس میں ایک جج اور وزارت تعلیم کے ایک افسر بھی شامل تھے۔ وہ خوبصورت انگریزی بولتے تھے۔ مجھ سے بھائیوں جیسا سلوک کیا گیا۔ میں نے اسے بھی اللہ کی ایک نشانی سمجھا کہ مجھے ہر موڑ پر ایک مددگار اورراہنما مل جاتا ہے۔

عربی میں حج کے لغوی معنی کسی خاص مقصد کے لیے نکل پڑنا ہے جبکہ اسلامی فقہ میں اس کا مطلب ہے اللہ کے مقدس گھر یعنی کعبہ کے لیے نکلنا اور حج کے فرائض سرانجام دینا۔ قاہرہ ایئرپورٹ پر لاتعداد حجاج احرام باندھ رہے تھے جو کہ دراصل ایک روحانی اور جسمانی حالت تقدس کی علامت ہے دوستوں کی نصیحت پر میں نے اپنا تمام سامان چاروں کیمرے بشمول مووی کیمرہ قاہرہ ہی میں چھوڑ دیئے۔ میں نے ایک چھوٹا سا سفری تھیلہ قاہرہ سے خرید لیا جس میں ایک سوٹ' ایک شرٹ' دوزیرجامے اور ایک جوڑا جوتوں کا آ سکتا تھا۔ ایئرپورٹ جاتے ہوئے میں گھبراہٹ محسوس کرنے لگا کیونکہ مجھے علم تھا کہ اب سے مجھے ان لوگوں کی نقل کرنا ہے جو ان واجبات سے بخوبی آگاہ ہیں۔

حالت احرام میں آنے کے لیے ہم نے اپنے کپڑے اتار دیئے اور دو سفید تولیے پہن لیے۔ ایک کو ازار کہا جاتا تھا جسے کمر کے گرد باندھ لیا گیا۔ دوسرا جسے رِدا کہتے تھے وہ گردن اور کندھوں پر ڈال لی گئی لیکن دائیں کندھے اور

بازو کو برہنہ چھوڑ دیا۔ ایک سادہ سی چپل جسے نعل کہتے تھے پہن لی گئی جس سے ٹخنے کھلے رہتے تھے۔ ازار کے اوپر کمر کے گرد ایک چھوٹا سا تھیلہ اور پیسے رکھنے کی پیٹی بھی پہن لی گئی اور ایک بڑے سے زنانہ ہینڈبیگ کی طرح کا تھیلہ ڈاکٹر شوار بی کی تجویز کے مطابق کاندھے سے لٹکالیا تاکہ اس میں پاسپورٹ اور دیگر کاغذات رکھے جا سکیں۔

حج پر جانے والے ہزاروں افراد انہی کپڑوں میں ملبوس تھے۔ آپ کے حلیہ سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ آپ بادشاہ ہیں یا غریب کسان۔ کچھ صاحبانِ اختیار بھی اس حلیے میں نظر آئے۔ یہ لباس پہن لینے کے بعد ہم سب مسلسل ”لبیک لبیک“ (اللہ میں حاضر ہوں) پکارنے لگے اور ایئرپورٹ حجاج کی آوازوں سے سے گونجنے لگے۔

حجاج سے بھرے ہوئے جہاز ہر چند منٹ بعد پرواز کرتے تھے لیکن ایئرپورٹ کی بھیڑ میں کوئی کمی نہ آتی تھی۔ الوداع کہنے والے جانے والوں سے دعائوں کی درخواست کر رہے تھے۔ جہاز میں بیٹھ کر ہوا میں بلند ہونے کے بعد مجھے علم ہوا کہ جہاز میں میرے لیے جگہ نہیں تھی لیکن کچھ صاحبانِ اختیار نے کسی اور کا پروگرام ملتوی کروا کے میرے لیے جگہ بنائی تھی تاکہ ایک امریکی مسلمان کو مایوسی نہ ہو۔ مجھے افسوس' شرمندگی اور شکرگزاری کے ملے جلے جذبات نے گھیر لیا کہ میری وجہ سے کسی دوسرے کو تکلیف اٹھانا پڑی اور یہ کہ میری اتنی عزت اور احترام کیا گیا۔

جہاز میں گورے' کالے' بھورے' سرخ اور زرد سبھی نسلوں کے لوگ تھے۔ نیلی آنکھوں' سنہرے بالوں والے اور میری طرح سرخ بالوں والے بھی لیکن سب اکٹھے تھے۔ بھائیوں کی طرح سب ایک ہی پروردگار یعنی اللہ کے نام لیوا تھے اور سب ایک دوسرے کو برابری اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کسی طرح یہ بات جہاز میں پھیل گئی کہ میں امریکی مسلمان ہوں۔ مسکراتے ہوئے استقبالی چہرے مڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔ ایک کھانے کا ڈبہ مجھ تک پہنچا جسے ہم نے کھا لیا۔ امریکی مسلمان کی خبر کاک پٹ تک پہنچ گئی۔ جہاز کا کپتان مجھے ملنے کے لیے آیا۔ وہ مصری تھا اور اس کا رنگ مجھ سے بھی زیادہ کالا تھا۔ اگر وہ ہارلم میں ہوتا تو کوئی اسے دوبارہ مڑ کر بھی نہ دیکھتا وہ ایک امریکی مسلمان سے مل کر بہت خوش ہوا اور جب اس نے مجھے کاک پٹ کے دورے کی دعوت دی تو میں فوراً تیار ہو گیا۔

کوپائلٹ اس سے بھی زیادہ سیاہ تھا میں اپنے جذبات بیان نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے اس سے قبل کسی سیاہ فام کو جیٹ اڑاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ سامنے آلات کے پینل پر بے شمار ڈائلز تھے جن کا اللہ جانے کیا مصرف تھا دونوں پائلٹ مسکرا کر مجھے اس عزت اور احترام سے پیش آ رہے تھے جو امریکہ چھوڑنے کے بعد مجھے مسلسل مل رہی تھی۔ میں وہاں کھڑا شیشے کے پار آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ امریکہ میں شاید میں کسی بھی سیاہ فام سے زیادہ مرتبہ جہاز میں

سفر کر چکا تھا مگر آج تک کسی نے مجھے کاک پٹ میں مدعو نہیں کیا تھا اور یہاں میں دو مسلمانوں کے ساتھ کھڑا تھا جن میں سے ایک مصری تھا اور ایک عربی۔ ہم سب مکہ جا رہے تھے مجھے پتہ تھا کہ اللہ میرے ساتھ ہے۔

میں اپنی نشست پر واپس آ گیا۔ گھنٹہ بھر کی پرواز میں تمام راستہ سبھی حجاج بلند آواز میں "لبیک لبیک' پکارتے رہے۔ جہاز جدہ میں اترا۔ یہ بحر احمر کے کنارے ایک ساحلی شہر تھا اور حج کے لیے عرب آنے والے لوگوں کے لیے داخلی شہر ہے۔ مکہ اس سے تقریباً چالیس میل مشرق میں واقع ہے؟

جدہ ایئرپورٹ قاہرہ سے بھی زیادہ پُرہجوم تھا۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے ہر نسل کے لوگوں میں ہمارا گروہ بھی گھل مل گیا۔ کسٹم تک پہنچنے کے لیے طویل قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ کسٹم پر پہنچنے سے قبل حجاج کا ہر گروہ ایک مطواف (Mutawaf) کے حوالے کر دیا جاتا جو اسے جدہ سے مکہ پہنچانے کا ذمہ دار تھا۔ کچھ حجاج "لبیک" پکار رہے تھے جبکہ دیگر بڑے گروہ ہم زبان ہو کر دعا پڑھ رہے تھے جس کا ترجمہ تھا کہ "اے اللہ میں تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتا۔ اے اللہ میں تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتا۔' میں تیری عبادت کرتا ہوں کیونکہ تیرا کوئی شریک نہیں۔ ساری برکتیں اور رحمتیں تیری طرف سے ہیں اور اپنی سلطنت کا تو ہی واحد بادشاہ ہے۔" اس ساری دُعا کی روح' توحید تھی۔

سرکاری افسران نے احرام نہیں باندھے ہوئے تھے اور نہ انہوں نے سفید رنگ کے نائٹ گاؤن نما لباس پہنے ہوئے تھے۔ عربی میں اگر کسی فعل سے پہلے میم لگا دی جائے تو وہ فعلیہ اسم میں تبدیل ہو جاتا ہے چنانچہ مطواف کا مطلب یہ تھا کہ وہ آدمی ہو حجاج کی طواف کے لیے رہنمائی کرتا ہے جو مکہ میں موجود کعبہ کے گرد چکر لگانے کو کہتے ہیں۔

میں تھوڑا سا گھبرایا ہوا تھا اور بے چینی سے اپنے پاسپورٹ کے معائنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے اندر تھوڑی سی گھبراہٹ بھی تھی کہ میں انہیں کونسا پاسپورٹ پیش کروں گا۔ میں اس وقت اسلامی دنیا میں تھا بلکہ عین اس کے منبع میں کھڑا تھا اور میں ان کے سامنے امریکی پاسپورٹ پیش کرنے والا تھا جو اسلام کے قطعی متضاد نظریے کی نمائندگی کرتا ہے۔

ہمارے گروہ میں موجود جج صاحب نے میرے تناؤ کو محسوس کرتے ہوئے میرے کندھے کو تھپکا۔ میں جدھر بھی رُخ کرتا تھا محبت' عاجزی اور سچے بھائی چارہ پر مشتمل جذبات کا سامنا ہوتا تھا۔ پھر ہمارا گروہ کلرکوں کے پاس پہنچا وہ بہت احتیاط سے ہمارے پاسپورٹ اور سوٹ کیس کی چھان بین کرتے اور حجاج کو آگے جانے کا اشارہ کرتے۔ میں اتنا

گھبرایا ہوا تھا کہ مجھ سے اپنے بیگ میں چابی بھی صحیح نہیں لگی اور میں نے اس خوف سے کہ کہیں وہ سمجھیں کہ میں بیگ میں کوئی ناجائز سامان لے جا رہا ہوں اپنا تالا توڑ دیا۔ پھر میں نے کلرک کے سامنے اپنا امریکی پاسپورٹ رکھا اس نے اسے تھام کر میری طرف دیکھا اور عربی میں کچھ کہا۔ میرے ارد گرد موجود تمام دوست تیز تیز عربی میں کچھ بولنے لگے جو غالباً میری حمایت میں تھا۔ جج صاحب نے مجھ سے انگریزی میں ڈاکٹر شواربی کے خط کے متعلق پوچھا اور وہ خط کلرک کو تھما دیا گیا۔ اس نے اسے پڑھ کر واپس کر دیا مجھ سے متعلق ایک بحث چل رہی تھی جس کا مجھے ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا نہ میں کچھ کہہ سکتا تھا میں خود کو انتہائی احمق محسوس کر رہا تھا۔ آخرکار جج صاحب میری طرف پلٹے اور دُکھ سے کہا کہ مجھے محکمہ شریعت کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ یہ ایک مسلم عدالت عالیہ تھی جو مکہ میں داخل ہونے کے خواشمند تمام عیرمصدقہ نومسلموں کی چھان بین کرتی تھی۔ یہ بات طے تھی کہ کوئی غیر مسلم مکہ میں داخل نہیں ہوسکتا۔

میرے دوستوں کو میرے بغیر ہی مکہ جانا پڑنا تھا۔ وہ سب میرے لیے بہت پریشان تھے اور میں خود بھی بہت پریشان تھا۔ میں نے ان سے صرف اتنا کہا ”پریشان مت ہوں کچھ نہیں ہو گا اللہ میرے ساتھ ہے“ انہوں نے کہا کہ وہ میرے لیے دعا کریں گے۔ سفید لباس پہنے ہوئے مطواف نے میرے دوستوں کو چلنے کے لیے کہا اور میں انہیں ہاتھ ہلاتے ہوئے رخصت ہوتا دیکھتا رہا۔

صبح کے تین بجے تھے۔ جمعہ کا روز تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک میں نے اتنی بھیڑ میں اپنے آپ کو کبھی اس قدر تنہا محسوس نہیں کیا تھا۔ مسلمانوں میں جمعہ کے دن کو وہی اہمیت حاصل ہے جو عیسائی دنیامیں اتوار کو حاصل ہے۔ اس روز تمام مسلمان اجتماعی عبادت کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اسے ”یوم الجمعہ“ کہا جاتا ہے یعنی اکٹھے ہونے کا دن۔ اس کا مطلب تھا کہ جمعہ کے روز کوئی عدالت نہیں کھلے گی اور مجھے ہفتہ تک انتظار کرنا پڑے گا۔

ایک افسر نے نوجوان عرب مطواف کو اشارہ کیا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اسے بتایاکہ مجھے ایئرپورٹ پر موجود ایک جگہ لے جایا جائے گا۔ میرا پاسپورٹ کسٹم والوں نے رکھ لیا۔ میں اعتراض کرنا چاہتا تھا کیونکہ مسافروں کے قانونی حقوق میں یہ بات شامل ہے کہ انہیں ان کے پاسپورٹ سے الگ نہ کیا جائے لیکن میں چپ رہا۔ میں نے سرکاری افسر کے پیچھے چلنا شروع کیا۔ ہمارے ارد گرد لوگ ہر قسم کی زبانیں بول رہے تھے مگر میں کوئی زبان نہیں بول پا رہا تھا۔ میری حالت کافی خراب تھی۔ ایئرپورٹ کے ساتھ ایک مسجد تھی اور ایئرپورٹ کے اوپر چار منزلہ عمارت تھی۔ صبح کاذب قریب تھی جہاز باقاعدگی کے ساتھ روشنیاں جھپکاتے رن وے پر اتر چڑھ رہے تھے۔ گھانا' انڈونیشیا' جاپان اور

روس وغیرہ کے حجاج اس بلڈنگ کی طرف سے آ جا رہے تھے جدھر مجھے لے جایا جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے آج تک کسی فلم میں بھی دنیابھر کی انسانی نسلوں کا اتنا بڑا اجتماع نہیں دکھایا گیا تھا۔ ہم عمارت میں پہنچ کر چوتھی منزل کی طرف چل پڑے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نیشنل جیوگرافک میگزین کے صفحات میں داخل ہو گیا ہوں۔

چوتھی منزل پر میرا راہنما مجھے ایک ایسے کمرے میں لے گیا جس میں تقریباً پندرہ لوگ موجود تھے جن میں سے اکثر گدوں پر سو رہے تھے۔ ان میں سے کچھ خواتین تھیں جو سر سے پائوں تک مستور تھیں۔ ایک بوڑھے روسی میاں بیوی جاگ رہے تھے' دو مصری اور ایک ایرانی مسلمان بھی جاگ گئے اور مجھے دیکھنے لگے۔ میرا راہنما مجھے ایک کونے میں لے گیا اور مجھے اشارے سے بتایا کہ وہ مجھے نماز کا درست طریقہ بتائے گا۔ تصور کیجیے کہ ایک مسلمان وزیر اور ایلیا محمد کی "نیشن آف اسلام" کا راہنما نماز کے درست طریقے سے ناواقف تھا۔

میں نے اس کی نقل کرنے کی کوشش کی۔ میں جانتا تھا کہ میں درست نقل نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے دوسرے مسلمانوں کی نگاہیں چبھ رہی تھیں۔ مغرب والوں کے گھٹنے ٹخنے وہ سب نہیں کر سکتے جس کے مسلمان گھٹنے ٹخنے شروع ہی سے عادی ہو جاتے ہیں۔ ایشیائی لوگ جب بیٹھتے ہیں تو دوزانو ہو کر بیٹھتے ہیں جب کہ مغرب والے کرسیوں پر بیٹھتے ہیں جب میرے راہنما نے بیٹھنے کا انداز اختیار کیا تو میں باوجود کوشش کے اس طرح نہ بیٹھ سکا لگ بھگ ایک گھنٹہ بعد وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ پھر واپس آئے گا۔

نیند کا دوردور تک پتہ نہ تھا۔ میں دوسرے مسلمانوں کی نگرانی میں نماز کی مشق کرتا رہا تھوڑی دیر بعد میں اس قابل تو ہو گیا کہ تھوڑی دیر کے لیے فرش پر بیٹھ سکوں لیکن اس سے اگلے دو تین روز میں میرے ٹخنے سوج گئے۔

صبح ہونے پر سونے والے مسلمان جاگ اٹھے اور اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ اس دوران ہم ایک دوسرے کا جائزہ بھی لیتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں مجموعی طور پر غالیچہ کی بہت اہمیت ہے۔ ہر مسلمان کے پاس اپنا چھوٹا سا نماز پڑھنے کا غالیچہ تھا جبکہ گروہ کی صورت میں وہ ایک بڑا اجتماعی غالیچہ استعمال کرتے تھے۔ یہ مسلمان اپنے کمرے ہی میں اپنے غالیچے پر عبادت کرتے پھر وہ غالیچہ پر دسترخوان بچھاکر کھانا کھا لیتے اور غالیچہ ان کی طعام گاہ بن جاتا پھر برتن کپڑے اٹھاکر وہ اس پر بیٹھ جاتے اور غالیچہ ان کی نشست گاہ بن جاتا پھر وہ غالیچہ کے اوپر لیٹتے اور سوجاتے یہ ان کی خواب گاہ بن جاتا۔ کمرہ چھوڑنے سے پہلے مجھ پر یہ راز کھلا کہ بوسٹن میں میرے ڈاکہ زنی کے ایام میں لوگ مشرقی غالیچوں کی اتنی قیمت کیوں دے دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جن ممالک میں قالین کی معاشرتی طور پر اتنی اہمیت ہو وہاں اس کی نفاست اور عمدگی پر خصوصی دھیان دیا جاتا ہے۔ بعد

میں مَیں نے قالین کا ایک اور استعمال دیکھا اگر کوئی جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوتا تو ایک معزز اور غیر جانبدار شخص قالین پر بیٹھ جاتا اور جھگڑے کا فیصلہ کرتا اس طرح یہ قالین عدل گاہ میں بدل جاتا۔ دیگر جگہوں پر یہ بطور مکتب بھی استعمال ہوتا تھا۔

ایک مصری مسلمان مجھے خاص طور پر کن اکھیوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ میں اس کی طرف مسکرایا تو وہ اٹھ کر میری طرف آ گیا۔ میں نے اس کا نام پوچھا لیکن اُسے میری بات سمجھ نہیں آئی۔ میرا خیال تھا اس کی انگریزی بیس الفاظ سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے اسے اپنی بات سمجھانے کی مکمل کوشش کی لیکن وہ میرے الفاظ دوہرا تو سکتا تھا مگر سمجھ نہیں رہا تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں ایک انسان سے بات کر رہا ہوں میرے منہ میں جو آتا گیا میں اسے کہتا گیا میں نے کہا "محمد علی کلے" یہ سنتے ہی سب مسلمانوں کے چہرے کرسمس کے درخت کی طرح چمک اٹھے۔ مصری دوست نے میری طرف حیرانی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "تم؟ تم؟" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں نہیں محمد علی کلے میرا دوست ہے__ دوست" انہیں میری بات بمشکل آدھی سمجھ آئی اور بہت جلد سارے میں افواہ پھیل گئی کہ میں "کیسیئس کلے" ہوں عالمی چیمپیئن۔ بعد میں مجھے پتہ لگا کہ مسلم دنیا کا ہر مرد' عورت اور بچہ سمجھتا تھا کہ سونی لسٹن (جو مسلم دنیا میں آدم خور بلا کے نام سے مشہور تھا) کو کیسیئس کلے نے ڈیوڈ گولائتھ قسم کے مقابلے میں شکست دی تھی اور اعلان کیا تھا کہ اس کا نام محمد علی ہے اور اس کا مذہب اسلام ہے اور اللہ نے اسے یہ فتح دلائی ہے۔

اس جذبے نے پورے کمرے کا ماحول تبدیل کر دیا۔ ہر شخص مجھے دیکھ کر مسکراتا تھا اور مجھ سے قریب اور بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں مریخ سے آیا ہوں۔

مطواف واپس آیا اور مجھے اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے صبح کی نماز کے لیے مسجد میں لے گیا جسے "الصبح" کہتے ہیں اور ہمیشہ سورج نکلنے سے پہلے ادا کی جاتی ہے۔ ہر طرف ہزاروں حجاج بے شمار زبانیں بول رہے تھے سوائے انگریزی کے۔ مجھے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ امریکہ چھوڑنے سے پہلے میں نے مذہبی عبادات کے متعلق زیادہ آگہی حاصل کیوں نہ کی۔ ایلیا محمد کی نیشن آف اسلام میں ہم لوگ نماز عربی میں ادا نہیں کرتے تھے۔ بارہ چودہ سال پہلے جب میں جیل میں تھا تو اس وقت بوسٹن سے عبدالحمید نامی ایک شخص جیل میں آیا تھا اور اُس نے مجھے عربی میں نماز کی کتاب بھیجی تھی تب میں نے وہ الفاظ تو یاد کر لیے تھے مگر انہیں کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ جو کچھ میرا راہنما کرے گا میں اس کی تقلید کرتا رہوں گا۔ مسجد کے باہر ٹونٹیوں کی ایک طویل قطار لگی ہوئی تھی نماز سے قبل وضو کیا جانا تھا اگرچہ مجھے اس کا علم تھا مگر پھر بھی میں صحیح طور پر نقل نہیں کر پا رہا تھا ایک صحیح مسلمان یہ کام ایک خاص ترتیب سے کرتا ہے اور یہ خاص ترتیب بے حد اہم ہے۔ میں اس سے ایک قدم پیچھے مسجد میں داخل ہوا اور اس کا مشاہدہ کرتا رہا۔ اس نے زمین پر ماتھا ٹیک کر سجدہ کیا میں نے بھی کیا۔ ''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' (اللہ کے نام سے جو بہت مہربان نہایت رحم والا ہے) تمام مسلم عبادات اس سے شروع ہوتی ہیں اس کے بعد میں منہ ہی منہ میں پڑھتا رہا جو اگرچہ درست نہیں تھا مگر میں پھر بھی پڑھتا رہا۔ میں کوئی مزاحیہ بات نہیں بتا رہا ہوں اور میرے نزدیک یہ کوئی مزاحیہ بات تھی بھی نہیں میں اتنے خلوص سے کوشش کر رہا تھا کہ کوئی دیکھنے والا یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ میں دوسروں سے مختلف پڑھ رہا ہوں۔

اس کے بعد میرا راہنما دوبارہ مجھے چوتھی منزل پر چھوڑ گیا اور اشارے سے مجھے بتایا کہ وہ تین گھنٹے بعد دوبارہ آئے گا۔ دن کی روشنی میں اوپر سے ایئرپورٹ کا بہت خوبصورت منظر نظر آتا تھا میں کھڑا جہازوں کو چڑھتے اترتے دیکھتا رہا دنیا بھر سے ہزارہا مختلف النسل لوگ آ رہے تھے۔ میں گروہوں کو بسوں، ٹرکوں اور کاروں میں مکہ کے لیے روانہ ہوتے دیکھتا رہا۔ میں نے کچھ لوگوں کو پیدل عازمِ مکہ ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں بھی پیدل چل پڑوں۔ کم از کم یہ کام تو مجھے آتا تھا مجھے آنے والے حالات سے خوف آ رہا تھا کہیں مجھے مکہ کے حج سے روک نہ دیا جائے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں جب مسلم عدالتِ عالیہ میں پیش ہوں گا تو وہاں مجھ سے کس قسم کا امتحان لیا جائے گا۔

ایرانی مسلمان میرے پاس آئے اور ہچکچاتے ہوئے کہا ''اَمر- امریکن؟'' پھر اس نے مجھے اپنے قالین پر ناشتہ کی دعوت دی جہاں اس کی بیوی بھی موجود تھی یہ اس کی بہت بڑی پیشکش تھی کیونکہ آپ اس طرح کسی مسلمان کی بیوی کے ساتھ چائے نہیں پی سکتے۔ میں نے اس پر مسلط ہونے کی بجائے مسکرا کر شکریے اور انکار کے انداز میں سر ہلایا تو وہ میرے لیے چائے اور چند بسکٹ لے آیا تب تک میرے ذہن میں کھانے کا خیال بھی نہیں آیا تھا دیگر لوگ بھی میرے ساتھ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میرا واحد دوست جو تھوڑی بہت انگریزی جانتا تھا جا چکا تھا۔ مسلمان احرام پہنے یا اپنے قومی لباسوں میں آ جا رہے تھے۔ میں سب کی توجہ کا مرکز تھا۔

میں ہمیشہ سے مضطرب اور متجسس رہا ہوں جب مطواف حسب وعدہ تین گھنٹوں کے بعد نہ آیا تو مجھے پریشانی محسوس ہوئی مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے چھوڑ نہ گیا ہو۔ مجھے بھوک بھی لگنا شروع ہو گئی تھی۔ کمرے میں سب لوگوں نے مجھے کھانے

کی پیشکش کی تھی مگر میں انکار کر چکا تھا۔ سچ پوچھیں تو میری اصل مشکل یہ تھی کہ مجھے ان کے کھانے کے آداب کا علم نہ تھا۔ ان کا کھانا قالینی طعام گاہ پر رکھے ایک برتن میں تھا جس میں سے وہ براہِ راست ہاتھ ڈال ڈال کر کھا رہے تھے۔ میں برآمدے میں کھڑا نیچے صحن کو دیکھتا رہا پھر میں نے خود سے کوئی راہ ڈھونڈنے کی کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں پہلی منزل پر گیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ مجھے زیادہ دور نہیں جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کوئی مجھے لینے کے لیے آ جائے۔ میں واپس کمرے میں آ گیا۔ پینتالیس منٹ بعد میں دوبارہ نیچے گیا نسبتاً زیادہ دور تک مجھے صحن میں ایک ریستوران نظر آیا۔ میں سیدھا اُس میں داخل ہو گیا یہ بالکل بھرا ہوا تھا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح اشاروں کی مدد سے بھنا ہوا مرغِ مُسلم اور موٹی موٹی آلو کی ورقیاں حاصل کر لیں۔ میں واپس صحن میں آیا اور ہاتھوں سے مرغ کھانے لگا تمام مسلمان میرے اردگرد ایسے ہی کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ستر سالہ بوڑھے اپنی ٹانگوں کو اس طرح تہہ کر کے بیٹھتے ہیں کہ ان میں گرہ سی پڑ جاتی ہے اور وہ اتنے اطمینان اور سکون سے کھانا کھا رہے تھے جیسے کسی بہت اچھے ریستوران میں بیروں کے ہجوم میں کھانا کھا رہے ہوں۔ سب ایک طرح کھاتے تھے اور ایک سا سوتے تھے۔ حج کے ماحول میں اللہ کی یکتائی کے ماتحت سب لوگ ایک اکائی کی صورت میں تھے۔ دن بھر میں کئی بار کمرے سے صحن تک آیا گیا ایک بار میں نے دو سیاہ فام آدمیوں کو سر سے اشارہ کیا اور جواباً برطانوی لہجے کی انگریزی سن کر خوشی سے اچھل پڑا۔ ان کے دیگر ساتھی آنے سے قبل میں نے ان کو بتایا کہ میں امریکی ہوں اور انہوں نے بتایا کہ وہ ایتھوپیا کے ہیں۔ وہ مکہ جانے والے تھے مَرمَر کے دو انگریزی بولنے والے مسلمان ملے تھے اور وہ بھی جانے والے تھے یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ ان ایتھوپیئنز نے قاہرہ سے تعلیم حاصل کی تھی اوراب ریاض میں رہ رہے تھے جو سعودی عرب کا سیاسی دارالخلافہ ہے۔ مجھے جان کر سخت حیرانی ہوئی کہ ایتھوپیا کی آبادی اٹھارہ ملین ہے جس میں سے دس ملین مسلمان ہیں بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ایتھوپیا عیسائی ملک ہے جو غلط ہے صرف ان کی حکومت عیسائی ہے اور مغرب نے ہمیشہ عیسائی حکومتوں کو اقتدار میں رکھنے میں مدد دی ہے۔

میں چوتھی منزل پر اپنے کمرے میں مغرب کی نماز جسے ''المغرب'' کہتے ہیں پڑھ کر اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور خود کو بہت تنہا اور اداس محسوس کر رہا تھا کہ اچانک اندھیرے میں ایک روشنی دکھائی دی۔ یہ ایک خیال تھا نیچے صحن میں گھومتے پھرتے میں نے ایک میز پر چار سرکاری افسروں کو ٹیلیفون سامنے رکھے بیٹھے دیکھا۔ اچانک میرے ذہن میں اس واسطے کا خیال آیا جس کا حوالہ ڈاکٹر شواربی نے مجھے نیویارک میں دیا تھا یعنی اس کتاب کے مصنف کے بیٹے کا نام جو انہوں نے مجھے پڑھنے کے لیے دی تھی عمر اعظم جدہ ہی میں قیام پذیر تھے۔

چند ہی منٹوں میں مَیں سیڑھیوں سے دوڑتا ان چار سرکاری افسروں کی طرف لپکا ان میں سے ایک ضرورت کے مطابق انگریزی بول لیتا تھا۔ میں نے اسے ڈاکٹر شواربی کا خط دکھایا جو اس نے باقی تین افسروں کو پڑھ کر سنایا لیکن ایک ”امریکی مسلمان“ کے مسئلہ پروہ کچھ گومگو کی کیفیت میں تھے اور بہت متاثر بھی۔ جب میں نے ان سے درخواست کی کہ مجھے ڈاکٹر عمراعظم سے بات کرنے کی اجازت دی جائے تو اس نے بخوشی اجازت دے دی اور نمبر ملا کر کسی سے عربی میں باتیں کرنے لگا۔

ڈاکٹر عمراعظم سیدھے ائیرپورٹ آ گئے اور آتے ہی مجھ سے استقبالی مصافحہ کیا۔ وہ ایک جوان طویل قامت اور اچھی جسمانی ساخت کے آدمی تھے۔ میرا خیال ہے ان کا قد چھ فٹ تین انچ تھا اور وہ بے حد مہذب اور شائستہ آدمی تھے۔ اگر وہ امریکہ میں ہوتے تو انہیں سفیدفام سمجھا جاتا لیکن انہوں نے اپنے رویّے سے کسی طرح بھی سفیدفام ہونے کا ثبوت نہیں دیا اور مجھ سے شکایت کی کہ میں نے ان سے پہلے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ انہوں نے چاروں افسران کو اپنی شناخت کروائی اور ان کا فون استعمال کرنے لگے۔ انہوں نے عربی میں ائیرپورٹ کے افسران سے کچھ باتیں کیں اور پھر مجھ سے کہا ”آئو۔“

آدھ گھنٹہ سے بھی کم وقت میں انہوں نے مجھے آزاد کروا لیا۔ میرا سوٹ کیس اور پاسپورٹ بھی کسٹم والوں سے واپس لے لیا اور ہم ڈاکٹر اعظم کی کار میں جدہ شہر میں سے گزر رہے تھے۔ میں نے احرام اور چپلی پہنی ہوئی تھی‘ میں ان کے رویّے پر مہربَلَب تھا کہ وہ میرے اور اپنے درمیان بطور انسان کوئی فرق روا نہیں رکھے ہوئے تھے۔ میں بہت سالوں سے مسلمانوں کی خوش اخلاقی کے متعلق سن رہا تھا مگر اتنی گرم جوشی میرے تصور سے بھی باہر تھی میں ان سے سوال پوچھنے لگا۔ وہ سوئٹزرلینڈ سے تربیت یافتہ انجینئر اور شہری منصوبہ سازی کے ماہر تھے۔ سعودی عرب کی حکومت نے تمام مقامات مقدسہ کی تزئین وتعمیر نو کے لیے ان کی خدمات اقوام متحدہ سے مستعار لی تھیں۔ ڈاکٹر اعظم کی بہن شہزادہ فیصل کی بہو تھی۔ میں اس وقت گاڑی میں سعودی عرب کے حکمران کے سالے کے ساتھ سفر کر رہا تھا کیا یہ سب اللہ کا کرنا نہیں تھا؟ ”میرے والد آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔“ ڈاکٹراعظم نے اپنے مصنف والد کے متعلق بتایا۔

میں اس کے والد کے متعلق سوالات پوچھنے لگا۔ عبدالرحمن اعظم انقلاب مصر سے پہلے اعظم پاشا یالارڈاعظم کے لقب سے پہچانے جاتے تھے۔ بعد میں صدر ناصر نے تمام القابات ختم کر دیئے۔ ڈاکٹر اعظم نے کہا کہ ”جب ہم گھر پہنچیں

گے تو والد صاحب ہمارے منتظر ہوں گے وہ زیادہ تر وقت نیویارک میں اقوام متحدہ کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں صرف کرتے ہیں اور آپ سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔" میں خاموش تھا۔

ہم علی الصبح ڈاکٹر اعظم کے گھر پہنچ گئے۔ ان کے والد' والد کے بھائی جو کیمسٹ تھے اور ایک دوست اتنی صبح میرے منتظر تھے۔ ان میں سے ہر ایک مجھے یوں گلے ملا جیسے میں کوئی کھویا ہوا بچہ ہوں۔ میں ان سے زندگی میں پہلے کبھی نہیں ملا تھا لیکن وہ مجھ سے اتنا اچھا سلوک کر رہے تھے۔ سچ پوچھیں تو میری اتنی عزت افزائی زندگی بھر نہیں ہوئی اور نہ ہی اتنی مخلصانہ مہمان داری کبھی ہوئی تھی۔

ایک ملازم چائے اور کافی رکھ کر غائب ہو گیا۔ انہوں نے مجھے آرام سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ کوئی عورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ عرب میں آپ کے ذہن میں یہ خیال باآسانی آ سکتاہے کہ یہاں عورتیں نہیں ہوتیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمن اعظم گفتگو پر چھائے رہے۔ انہیں اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں نے ان سے پہلے رابطہ کیوں نہیں کیا تھا؟ کوئی مسئلہ تو نہیں تھا؟ وہ اس بات سے پریشان تھے کہ ایئرپورٹ پر وقت گزارنے سے مکہ پہنچنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ میں نے انہیں بارہا یقین دلایا کہ مجھے کوئی تنگی نہیں ہوئی میں بالکل ٹھیک تھا مگر انہیں یقین نہ آیا۔ ڈاکٹر اعظم مجھے آرام کرنے کا کہہ کر ٹیلیفون پر مصروف ہو گئے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ یہ معزز آدمی کیا کر رہا ہے پھر مجھے بتایا گیا کہ آج رات کا کھانا مجھے یہیں کھانا ہے اور اس دوران مجھے سفر کرنا ہے تو میرے تصور میں نہیں تھا کہ میں اسلامی میزبانی کا مثالی نمونہ دیکھنے والا ہوں۔ عبدالرحمن اعظم جدہ پیلس ہوٹل کے ایک سوئٹ میں رہائش رکھتے تھے لیکن جب انہیں پتہ چلا کہ میں ان کے دوست کا خط لے کر آیا ہوں تو وہ اپنا سوئٹ میرے حوالے کر کے اپنے بیٹے کے ہاں منتقل ہو گئے تاکہ میں مکہ جانے تک وہاں رہ سکوں۔ میرے احتجاج کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا اور مجھے وہاں رہنا پڑا۔ تین کمروں پر مشتمل سوئٹ کا غسل خانہ نیویارک ہلٹن کے غسل خانے سے دگنا بڑا تھا۔ سوئٹ کا نمبر دو سوچودہ تھا۔ باہر کی طرف ایک پورچ بھی تھا جس سے آپ بحیرہ احمر کے کنارے آباد قدیم شہر کا نظارہ کر سکتے تھے۔

اس سے پہلے کبھی میرے دل میں نماز کی ایسی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی میں بے اختیار لی ونگ روم کے قالین پر سجدے میں گر گیا۔ میری جبلّت بے ساختہ ان وجوہات اور مقاصد کا تجزیہ کر رہی تھی کہ یہ سب لوگ میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہیں؟ کیونکہ میں نے ساری زندگی میںدیکھا تھا کہ کوئی سفیدفام اپنی غرض کے بغیر کسی کے کام نہیں آتا لیکن یہاں اس ہوٹل میں سوچ رہا تھا کہ یہ سفید آدمی جو امریکہ میں ہوتا تو سفیدفام ہی سمجھا جاتا جو

سعودی عرب کے حکمران کا قریبی رشتہ دار اور قریبی مشیر تھا اور حقیقتاً ایک عالمی شخصیت' اس نے میرے آرام کے لیے بلاوجہ اپنا سوئٹ میرے حوالے کر دیا تھا اسے مجھ سے کوئی غرض تھی نہ میری ضرورت۔ اس کے پاس سب کچھ تھا وہ امریکی ذرائع ابلاغ میں میرے متعلق سنتے پڑھتے آئے تھے اور اگر ایسا ہی تھا تو انہیں یہ بھی علم ہو گا کہ میں ایک بدنام شخص ہوں جس کے سر پر سینگ ہونے چاہئیں میں ایک نسل پرست تھا ایک اینٹی وائٹ (سفید فام مخالف) اور ڈاکٹر صاحب ظاہری لحاظ سے مکمل سفید تھے۔ مجھے مجرم سمجھا جاتا تھا۔ مجھ پر الزام تھاکہ میں نے اپنی مجرمانہ سرگرمیوں اور نظریات کے اوپر اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اگر وہ مجھے استعمال کرنا ہی چاہتے تھے تو انہیں یہ بھی علم ہو گا کہ میں ایلیا محمد اور اس کی نیشن آف اسلام سے الگ ہو چکا ہوں جو کہ امریکی پریس کے مطابق میری طاقت کی بنیاد تھی میری اپنی تنظیم کی عمر ابھی صرف چند ہفتے تھی۔ میں بے روزگار تھا اور قلاش اور یہاں تک آنے کے لیے میں نے اپنی بہن سے پیسے ادھار لیے تھے۔

اس صبح میں نے پہلی بار ”سفید فام“ کی اصطلاح کا دوبارہ تجزیہ کیا اور پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ”سفید فام“ محض رنگ کا مسئلہ نہیں ہے وہ تو ایک ثانوی چیز ہے۔ بنیادی طور پر اس کا تعلق رویے اور اعمال کے ساتھ ہے۔ امریکہ میں ”سفید فام“ سے مراد وہ رویے اور اعمال ہیں جو سیاہ فام اور تمام دیگر غیرسیاہ فاموں کے ساتھ روا رکھے جاتے ہیں جبکہ اسلامی دنیامیں مَیں نے دیکھاکہ سفید رنگت والے لوگ دوسروں کی نسبت زیادہ برادرانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اس صبح سفید فاموں کے متعلق میرے نظریات میں انقلابی تبدیلی کا آغاز ہوا اور میں نے اس دوپہر اپنی نوٹ بک میں جو لکھا اس کا اقتباس یہاں درج کرتا ہوں:

”حج کمیٹی کے سامنے پیش ہونے سے پہلے جو میرے جذبات ہیں میں انہیں بیان نہیں کر سکتا۔ میری کھڑکی مغرب میں سمندر کے رُخ پر کھلتی ہے۔ گلیاں دنیابھر سے آنے والے حجاج سے بھری ہوئی ہیں۔ وہ سب اللہ کی عبادت کر رہے ہیں اور ان کے ہونٹوں پر قرآن کی آیات ہیں۔ اتنا خوبصورت نظارہ اور ایسی فضا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ میں ہزاروں میل دور ایک بالکل مختلف دنیا میں ہونے کے باوجود اپنے آپ کو محفوظ اور مامون سمجھ رہا ہوں۔ تصور کیجیے کہ چوبیس گھنٹے پہلے میں ایئرپورٹ پر چوتھی منزل پر واقع ایک ایسے کمرے میں تھا جہاں پر کوئی میری بات سمجھ نہیں سکتا تھا۔ مستقبل غیر محفوظ دکھائی دیتا تھا اور پھر ایک فون کال جو ڈاکٹر شواربی کی ہدایت پر کی گئی اور میری ملاقات مسلم دنیا کے انتہائی موثر لوگوں سے ہوئی جلد ہی میں جدّہ پیلس میں ان کے بستر میں سو رہا ہوں گا اب میں ایسے دوستوں میں گھرا ہوا ہوں جن کے خلوص اور دینی جذبہ کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس مہربانی پر مجھے

اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور امریکہ میں موجود اپنے بچوں اور بیوی کی قربانیوں پر اللہ سے ان کے واسطے رحمت کی دعا مانگنا چاہیے۔"

میں نے نماز پڑھی اور دعائیں کیں جیسا کہ میں نے اپنی نوٹ بک میں لکھا تھا پھر میں چار گھنٹے تک سوتا رہا حتیٰ کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے جگایا۔ نوجوان ڈاکٹر اعظم کا فون تھا جو ایک گھنٹہ میں مجھے عشائیہ پر لے جانے کے لیے آ رہے تھے۔ میں نے بے سروپالفظوں میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن انہوں نے "ماشاء اللہ" کہہ کر میری بات کاٹ دی جس کا مطلب تھا کہ "یہ وہی کچھ ہے جو اللہ چاہتا ہے۔"

میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر اعظم کی آمد سے پہلے لابی دیکھنے کا منصوبہ بنایا جب میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو میرے سامنے ایک شخص تقریباتی لباس میں خُدّام میں گھرا سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے چلتا رہا۔ لابی کے باہر گاڑیوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ اس کا انتظار کر رہا تھا جب وہ شخص جو یقینا میرا پڑوسی تھا۔ ہوٹل کے داخلی دروازے سے باہر نکلا تو لوگوں کی بھیڑ اس کے گرد اکٹھی ہو گئی اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دینے لگے۔ وہ یروشلم کے مفتی اعظم تھے بعد میں مجھے ان سے تقریباً آدھ گھنٹہ گفتگو کا موقع ملا وہ ایک مہذب اور پروقار شخصیت تھے اور عالمی حالات اور امریکہ کے تازہ ترین واقعات سے بخوبی واقف۔

ڈاکٹر اعظم کے گھر پر عشائیہ ناقابل فراموش تھا میں پھر اپنی نوٹ بک سے اقتباس تحریر کرتا ہوں:

"میں ذہنی طور پر یہ بات تسلیم نہیں کر سکا کہ یہ "سفید آدمی" ہیں کیونکہ یہ لوگ مجھ سے اس طرح پیش آرہے ہیں جیسے میرے بھائی ہوں اور بزرگ ڈاکٹر اعظم مجھ سے پدرانہ سلوک کر رہے ہیں۔ ان کی پدرانہ اور عالمانہ گفتگو سے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میرے والد ہی ہوں وہ اعلیٰ درجے کے سفیر اور کشادہ ذہن کے مالک ہیں اور دنیاوی علوم پر دسترس رکھتے ہیں اور عالمی حالات سے اس طرح واقف ہیں جس طرح کوئی اپنے گھر کے حالات سے واقف ہوتا ہے۔ میں جتنا ان سے باتیں کرتا مجھے ان کا علم اور اس کا تنوع اتنا ہی لامحدود محسوس ہوتا انہوں نے رسول محمدؐ کی نسل کے متعلق بتایا کہ ان کے اخلاف میں گورے اور کالے دونوں آتے ہیں۔ انہوں نے اس کی وضاحت بھی کی کہ رنگ اور اس کی پیچیدگی اور مسائل اسلامی دنیا میں صرف انہی خطوں میں وجود رکھتے ہیں جو مغرب کے زیراثر رہے ہیں اور رنگ کے متعلق تفریق کا درجہ مغربی اثر کے تناسب سے ہوتا ہے۔"

کھانے کے دوران مجھے علم ہوا کہ حج کمیٹی کورٹ صبح میرے مقدمے کی سماعت کرے گی اور مجھے صبح وہاں پہنچنا ہے اور میں وہاں پہنچ گیا۔

منصف کا نام شیخ محمد حارکون تھا۔ عدالت میں میرے اورایک ہندوستانی بہن' جو پہلے پروٹسٹنٹ تھی اور اسلام قبول کر کے میری طرح حج کی خواہشمند تھی' کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ وہ سانولے رنگ کی تھی اور اپنے چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ منصف ایک مہربان اورمتاثرکن شخصیت تھے۔ ہم نے باتیں کیں انہوں نے مجھ سے کچھ سوالات کیے جو میں نے حتیٰ المقدور سچائی کے ساتھ جواب دیئے۔ اس نے نہ صرف میرے مسلمان ہونے کی تصدیق کی بلکہ مجھے دو کتابیں بھی دیں جن میں ایک انگریزی میں تھی دوسری عربی میں۔ انہوں نے میرا نام سچے مسلمانوں کے مقدس دفتر (رجسٹر) میں لکھ لیا۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے مجھ سے کہا ”میں امید کرتا ہوں کہ تم امریکہ میں اسلام کے عظیم مبلّغ بنو گے۔'' میں نے جواب دیا ”میں بھی یہی امید کرتا ہوں اور اسے پورا کرنے کی مکمل کوشش کروں گا۔“

میری اس کامیابی پر اعظم صاحب کا خانوادہ بہت خوش ہوا کہ مجھے مکہ جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ میں نے جدّہ پیلس میں دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر کئی گھنٹوں تک سویا اور آخر فون کی گھنٹی سے میری آنکھ کھلی۔ فون پر محمد عبدالعزیز ماجد جو شہزادہ فیصل کے پروٹوکول ڈپٹی چیف تھے مجھ سے مخاطب تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ”رات کے کھانے کے بعد ایک خصوصی کار مکہ لے جانے کے لیے آپ کی منتظر ہو گی۔“ انہوں نے مجھے سیر ہو کر کھانے کی نصیحت کی کیونکہ حج کے ارکان کی ادائی کے لیے کافی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میری حیرت کی کوئی حد نہ تھی۔

دوجوان عربوں نے مکہ تک میری مصاحبت کی۔ ایک جدید اور روشن سڑک نے ہمارا سفر آسان بنا دیا۔ مختلف جگہوں پر محافظ کار پرایک نگاہ ڈالتے' ڈرائیور انہیں اشارہ کرتا اور ہمارے لیے راستہ کھل جاتا حتیٰ کہ ہمیں گاڑی بھی آہستہ نہیں کرنا پڑتی تھی۔ میں اپنے آپ کو بہت پرجوش' اہم عاجز اور شکرگزار محسوس کر رہا تھا۔

مکہ میں داخل ہوئے تو وہ مجھے اتنا ہی قدیم لگا جتنا کہ وقت، بل کھاتی ہوئی گلیوں میں ہماری کار کی رفتار آہستہ ہو گئی۔ ہمارے دونوں جانب دکانیں تھیں' بسیں' کاریں اور ٹرک تھے اور دنیابھر سے آئے ہوئے لاکھوں زائرین۔

کار کچھ دیر کو ایک جگہ رُکی جہاں مطوف میرا منتظر تھا اس کا نام محمد تھا۔ اس کا قد چھوٹا اور رنگ کالا تھا اوروہ کسی قسم کی انگریزی نہیں بول سکتا تھا۔

ہم نے بڑی مسجد کے پاس گاڑی روکی اور وضو کر کے اندر داخل ہو گئے۔ یہاں آدمی پر آدمی سوار نظر آتا تھا۔ لوگ لیٹے، بیٹھے، سوتے، چلتے پھرتے اور عبادت کرتے نظر آ رہے تھے۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جو کعبہ کے گرد تعمیر ہونے والی اس نئی مسجد کی خوبصورتی بیان کر سکیں اور میں یہ سوچ کر بہت مسرور ہوا کہ یہ ان تعمیراتی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری ہے جو نوجوان ڈاکٹر اعظم کی زیر نگرانی پایہ تکمیل تک پہنچ رہی ہے۔ مکہ کی اس عظیم مسجد کی خوبصورتی تکمیل کے بعد ہندوستان کے تاج محل سے بھی بڑھ جائے گی۔

اپنی چپل اٹھائے اٹھائے میں مطواف کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ پھر میں نے کعبہ دیکھا، عظیم مسجد کے مرکز میں سیاہ پتھر کا بڑا سا گھر تھا۔ اس کے گرد ہزارہا حجاج جن میں ہر قامت، جسامت، رنگ اور نسل کے دنیا بھر سے آئے ہوئے مرد وزن شامل تھے، چکر لگا رہے تھے۔ جو دعا کعبہ پر پہلی نگاہ پڑتے وقت پڑھی جاتی ہے، مجھے یاد تھی۔ جس کا ترجمہ یہ ہے “اے اللہ تو امن ہے اور امن بخشنے والا ہے۔ سوائے مالک! ہمیں بھی امن عطا فرما۔” مسجد میں داخلہ کے بعد زائر کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ کعبہ کو بوسہ دے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اسے چھو لے اور اگر ہجوم اس میں بھی مانع ہو تو ہاتھ اٹھا کر زور سے کہا جائے “تکبیر” (اللہ اکبر)۔ میں کعبہ کے قریب بھی نہ پہنچ سکا۔ “تکبیر۔”

اللہ کے گھر میں میرے احساسات ایسے تھے گویا میں سُن ہو گیا ہوں۔ میرا مطواف مصروفِ دعا ہجوم میں میری رہنمائی کر رہا تھا۔ لوگ دعائیں پڑھتے ہوئے کعبہ کے گرد سات چکر لگا رہے تھے۔ کچھ لوگ بہت عمر رسیدہ اور کبڑے تھے۔ یہ ایسا منظر تھا جو میرے ذہن پر نقش ہو گیا۔ میں نے بہت سے معذور زائرین کو دیکھا جنہیں دوسرے اٹھائے ہوئے تھے جن کے چہروں پر ایمان کی مُسرّت تھی۔ ساتویں چکر میں مَیں نے زمین پر جھک کر اپنا ماتھا رکھتے ہوئے دو رکعتیں ادا کیں۔ پہلے سجدہ میں میں نے قرآن کی آیات پڑھیں۔ “کہو وہی اللہ ہے، یکتا وتنہا”__ دوسرا سجدہ “کہو اے وہ لوگو جو ایمان نہیں رکھتے، میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔” جب میں سجدہ کر رہا تھا تو مطواف مجھے کچلے جانے سے بچانے کے لیے زائرین کو مجھ سے پرے رکھ رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے اور مطواف نے زم زم کے کنویں سے پانی پیا پھر ہم دو پہاڑیوں “صفا اور مروہ” کے درمیان دوڑے۔ جہاں بی بی حاجرہ اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کی خاطر پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں۔

اس کے بعد تین بار میں نے الگ سے کعبہ کے طواف کیے۔ اگلے روز سورج نکلنے کے بعد ہم لوگ کوہِ عرفات کی طرف روانہ ہوئے۔ ہزاروں لوگ یک زبان ہو کر “لبیک لبیک” اور “اللہ اکبر” پکار رہے تھے۔ مکہ انتہائی سخت اور بنجر پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے جن پر گھاس کی ایک پتی تک نہیں اُگتی۔ تقریباً دوپہر کو پہنچ کر ہم نے نماز پڑھی اور دوپہر

سے لیکر سہ پہر تک تلبیہ پڑھتے رہے اور عصر اور مغرب کی نمازیں بھی ادا کیں۔ آخر ہم نے ہاتھ اٹھا کر شکر اور دعا شروع کی "کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے 'کوئی اس کا شریک نہیں سب اختیار اور تعریف اسی کے لیے ہے۔ ساری بھلائی اسی کی طرف ہے اور وہ ہر چیز پر غالب ہے۔"

کوہِ عرفات پر حج کے اہم اراکین مکمل ہو جاتے ہیں اور کسی سے اگر یہ رکن چھوٹ جائے تو وہ اپنے آپ کو حاجی نہیں سمجھ سکتا۔

احرام ختم ہو گیا تھا ہم نے شیطان کو روایتی سات کنکر مارے۔ کچھ لوگوں نے اپنی داڑھیاں اور بال کٹوائے۔ میں نے داڑھی برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سوچا کہ جب میں واپس نیویارک پہنچوں گا تو میری بیوی اور بیٹیاں مجھے داڑھی کے ساتھ دیکھ کر کیا کہیں گی۔ نیویارک چھوڑنے سے اب تک مجھے ایسا اخبار نظر نہیں آیا تھا جسے میں پڑھ سکوں۔ مجھے وہاں کے حالات کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ہارلم میں پچھلے بارہ سال سے قائم ایک نیگرو رائفل کلب پولیس نے "دریافت" کیا تھا اور شور مچایا جا رہا تھا کہ "اس کے پیچھے" میں ہوں۔ ایلیا محمد کی نیشن آف اسلام نے میرے خلاف ایک مقدمہ دائر کیا تھا جس کا مقصد مجھ سے اور میرے خاندان سے لانگ آئی لینڈ والا مکان خالی کروانا تھا۔ ریڈیو' ٹیلی ویژن' پریس اور دیگر امریکی ذرائع کے نمائندے میرے خلاف نیویارک میں لگائے جانے والے الزامات کے لیے قاہرہ میں مجھے ڈھونڈتے پھر رہے تھے جبکہ مجھے اس کی کوئی خبر نہ تھی۔

مجھے صرف اتنا علم تھا کہ جو کچھ میں نے امریکہ میں چھوڑا ہے اور جو کچھ مجھے مسلم دنیا میں ملا ہے دونوں میں کس قدر تضاد تھا۔ تقریباً ہم بیس مسلمان اس وقت حج مکمل کرنے کے بعد کوہِ عرفات پر ایک بڑے خیمے میں بیٹھے تھے۔ ایک امریکی مسلم ہونے کے ناطے میں توجہ کا مرکز تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے حج میں کس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟ ان میں سے بہت سے جو انگریزی بول سکتے تھے مجھ سے سوال پوچھتے اور دوسروں کو میرا سوال ترجمہ کر کے بتاتے۔ میں نے ان کی توقع کے برعکس جواب دیا لیکن وہ میرا نکتہ سمجھ گئے۔ میں نے کہا "بھائی چارہ" دنیا بھر کے رنگ اور نسلوں کے لوگ یہاں پہنچ کر ایک ہو جاتے ہیں جس سے مجھے اللہ واحد کی طاقت کا یقین ہو گیا ہے۔

اگرچہ اس کا محل تو نہ تھا لیکن میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں امریکہ کی نسل پرستی اور اس کے نقصانات پر ایک چھوٹا سا خطاب کیا۔ میں ان کے چہروں سے اثر کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ انہیں امریکہ میں سیاہ فام کی بری حالت کا اندازہ تو تھا لیکن اتنی غیر انسانی اور نفسیاتی آخنگی کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ دنیا کے مختلف

حصوں سے آئے ہوئے یہ لوگ صدمے کی کیفیت میں تھے اور بطور مسلمان وہ انصاف اور سچائی کے لیے حساس خیالات رکھنے کے ساتھ ساتھ تمام مظلوموں کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے اور جب تک میں ان سے گفتگو کرتا رہا میں انہیں سمجھاتا رہا کہ روئے زمین پر سب سے زیادہ تباہ کن بدی نسل پرستی ہے یعنی زمین پر خصوصاً مغربی دنیا میں اللہ کی مخلوق کا برابری کی سطح پر نہ جی سکنا۔

مسلم دنیا کے مذہبی معاشرے اور انسانی معاشرے میں رنگ کوری (Color Blindness) کے اثرات ہر روز مجھ پر گہرے ہوتے جا رہے تھے اور میرے ماضی کے خیالات کو مسلسل تبدیل کر رہے تھے۔ بالآخر جب میں خط لکھنے بیٹھا تو مجھے احساس ہوا کہ اس کا مضمون لاشعوری طور پر پہلے سے میرے ذہن میں تشکیل پا رہا تھا۔ پہلا خط میں نے اپنی بیوی بیٹی کو لکھا۔ مجھے یقین تھا کہ ابتدائی حیرانی کے بعد وہ بھی اپنے خیالات تبدیل کر لے گی کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ بیٹی مجھ پر غیر متزلزل یقین رکھتی ہے اور جو مجھے دکھائی دیا ہے اسے بھی دکھائی دے گا یعنی محمدؐ اور ابراہیمؑ کی سرزمین پر اللہ نے مجھے حقیقی اسلام کے متعلق جو درست آگہی عطا کی ہے اس سے مجھے امریکی کشمکش کی زیادہ بہتر سمجھ آ گئی ہے۔

بیوی کو خط لکھ کے دوسرا خط اسی مضمون کا مَیں نے اپنی بہن ایلاء کو لکھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ بھی حج کے لیے پیسے جمع کر رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے ڈاکٹر شواربی کو خط لکھا جن کے اعتماد نے میرے لیے مکہ کے پاسپورٹ کا حصول آسان بنایا۔ رات بھر میں اس نفسِ مضمون کے خطوط اپنے قریبی لوگوں کو لکھتا رہا جن میں ایلیا محمد کا بیٹا والس محمد بھی شامل تھا۔ جس نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ “نیشن آف اسلام” کی نجات یا بہتری اسی میں ہے کہ وہ حقیقی اسلام کے متعلق درست سمجھ بوجھ پیدا کرے۔ میں نے اپنے وفادار ماتحتوں کو ہارلم میں اس شُذرہ کے ساتھ خطوط لکھے کہ میرا خط نقل کروا کے پریس والوں میں بانٹ دیا جائے۔

مجھے معلوم تھا کہ جب میرا خط امریکہ میں چھپے گا تو میرے پیارے دوست اور دشمن سب یکساں حیران رہ جائیں گے اور اس کے علاوہ ایسے لاکھوں لوگ جو مجھ سے ناواقف ہیں اور پچھلے بارہ سالوں سے میری ایلیا محمد کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے مجھ سے نفرت کرتے تھے‘ بھی حیران رہ جائیں گے۔ خود مَیں بھی حیران تھا لیکن میری ساری زندگی تبدیلی کے نظائر سے بھری ہوئی تھی۔ ذیل میں مَیں اپنا خط پیش کرتا ہوں:

”میں نے اس سے قبل کبھی بھی اتنی پرخلوص میزبانی اور اس قدر پرجوش سچا بھائی چارہ نہیں دیکھا جس پر اس مقدس زمین ’جو ابراہیمؑ، محمدؐ اور دیگر انبیاءؑ کا گھر رہی ہے‘ کے تمام رنگوں اور نسلوں کے لوگ عمل کرتے ہیں۔ گزشتہ

سارا ہفتہ میں مکمل طور پر مہر بلب اور انگشت بدنداں رہا ہوں۔ مجھے مقدس شہر مکہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے محمد نامی نوجوان مطوف کی پیروی میں کعبہ کے گرد سات چکر لگائے’ چاہِ زمزم کا پانی پیا’ سات بار کوہ الصفا اور المروہ کے درمیان دوڑا۔ منیٰ کے قدیم شہر اور کوہِ عرفات پر نماز پڑھی جہاں لاکھوں حجاج تھے جو دنیابھر سے آئے تھے۔ ان میں ہر رنگ کے لوگ تھے۔ نیلی آنکھوں’ سنہرے بالوں والوں سے لے کر افریقہ کے سیاہ فاموں تک لیکن ہم سب ایک ہی طرح کی عبادات کر رہے تھے اور اتحاد اور بھائی چارہ کی جو فضا مجھے وہاں دیکھنے کو ملی اس کا میں امریکہ میں رہتے ہوئے تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ امریکہ اسلام کو سمجھے کیونکہ یہی وہ واحد مذہب ہے جو اس کے معاشرے سے نسلی مسائل ختم کر سکتا ہے۔ مسلم دنیا کے سفر کے دوران مَیں نے ایسے بے شمار لوگوں کے ساتھ کھانا کھایا جنہیں امریکی’ سفید فام سمجھ سکتے ہیں لیکن اسلام کی وجہ سے ان کے ذہن سے “سفید” رویہ ختم ہو چکا تھا۔ رنگ و نسل سے ماوراء ایسا پُرخلوص اور حقیقی بھائی چارہ میں نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میرے الفاظ سے آپ کو یقینا صدمہ پہنچے گا لیکن دوران حج جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں نہ صرف اپنا ماضی کا طرزفکر تبدیل کروں بلکہ کچھ سابق فیصلے ترک کر دوں۔ میرے لیے یہ کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا کیونکہ اپنی تمام تراولوالعزمی کے باوجود میں ہمیشہ سے ان تمام حقائق کا سامنا اور ان حقیقتوں کو تسلیم کرتا آیا ہوں جو نیا تجربہ اور نیا علم میرے سامنے پیش کرتا ہے۔ میں ہمیشہ کشادہ ذہنی پر عمل کرتا آیا ہوں جو کہ حقیقت اور سچائی کی تلاش کے لیے بے حد ضروری ہے۔

مسلم دنیا میں گزشتہ گیارہ دنوں میں مَیں نے انتہائی سفید رنگ والے’ بے حد سنہرے بالوں والے اور بہت زیادہ نیلی آنکھوں والے مسلمانوں کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھایا ہے۔ ایک گلاس میں پیا ہے اور ایک ہی بستر میں (یعنی ایک قالین پر) سویا ہوں۔ سفید فام مسلمانوں کے اقوال وافعال میں وہی خلوص محسوس ہوتا تھا جو نائیجیریا’ گھانا اور سوڈان کے افریقی مسلمانوں میں ہوتا تھا۔ ہم سب اس لیے بھائیوں کی طرح تھے کیونکہ اللہ واحد پر ایمان نے ان کے ذہنوں سے ان کے رویوں سے اور ان کی عادات میں سے سفیدپن دور کر دیا تھا۔

اس سے مجھے لگتا ہے کہ اگر سفید فام امریکی اللہ کی توحید کو قبول کر لیں توشاید وہ انسان کی برابری تسلیم کرتے ہوئے اس کی راہ میں رکاوٹ بننے سے باز آ جائیں گے اور نسلی فرق کی بنیاد پر دوسروں کو نقصان پہنچانا بند کر دیں۔

امریکہ میں نسل پرستی کا طاعون ناقابل علاج سرطان کی شکل اختیار کر چکا ہے اور یہ نام نہاد سفیدفام عیسائی امریکیوں کے قلب کی تباہ کن بیماری کے لیے آزمودہ نسخہ ہے اور شاید امریکہ کی ناگزیر تباہی سے بچاؤ کی بروقت ضرورت بھی ہے۔ یہی تباہی نسلی پرستی کی وجہ سے جرمنی پر بھی آئی تھی جس نے بالآخر جرمنوں کو بھی تباہ کر دیا تھا۔

اس مقدس سرزمین پر گزرنے والا ہر لمحہ امریکہ میں گورے اور کالے کی تفریق کے متعلق میرے روحانی شعور میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ اس سلسلہ میں امریکی نیگرو پر نسل پرستی کا الزام نہیں رکھا جاسکتا کیونکہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ امریکی سفیدفاموں کی شعوری نسل پرستی پر مشتمل چار سو سالہ مدت کا ردعمل ہے۔ امریکہ جس خودکشی کے راستہ پر چل رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ ایک روز یونیورسٹیوں میں پڑھنے والی نوجوان نسل اس نوشتہ دیوار کو پڑھ کر سچائی کے روحانی راستہ کو اختیار کرے گی۔ یہی ایک راستہ ہے جو امریکہ کو تباہی سے بچا سکتا ہے۔

کبھی مجھے ایسی عزت نہیں ملی تھی اور میں نے کبھی اپنے آپ کو اتنا عاجز اور احقر نہیں سمجھا تھا ان رحمتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے جو ایک امریکی نیگرو پر برس رہی تھیں۔ چند راتیں پہلے وہ آدمی جسے امریکہ میں سفیدفام سمجھا جاتا، اقوام متحدہ کا ڈپلومیٹ ایک سفارت کار' شاہ کا مصاحب مجھے رہنے کے لیے اپنے ہوٹل کا سوئٹ اور اپنا بستر دے دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے عزت مآب شہزادہ فیصل جو اس مقدس سرزمین کے حکمران ہیں جدّہ میں میری موجودگی سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اس سے اگلی صبح شہزادہ فیصل کا صاحبزادہ بذات خود مجھے مطلع کرتا ہے کہ ان کے محترم والد صاحب کے حکم اور خواہش کے مطابق مجھے سٹیٹ گیسٹ کا مرتبہ دیا جاتا ہے۔ ڈپٹی چیف آف پروٹوکول مجھے خود حج کورٹ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مقدس شیخ محمد حارکن میرے مکہ کے ویزے کی خود توثیق کرتے ہیں اور مجھے اسلام پر دو کتابیں دیتے ہیں۔ جن پر ان کے دستخط اور ان کی ذاتی مہر موجود ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ دعا کریں گے کہ میں امریکہ میں اسلام کا ایک کامیاب مبلغ ہوں۔ ایک کار' ایک ڈائیور اور ایک راہنما میرے لیے مہیا کر دیا گیا تاکہ میں حسب منشاء اس مقدس سرزمین پر سفر کر سکوں۔ میں جس شہر کا دورہ بھی کرتا ہوں مجھے ایئر کنڈیشنڈ رہائش گاہ اور ملازمین سرکاری طور پر مہیا کیے جاتے ہیں۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میں ایسی عزت کا سزاوار بھی ہوں گا وہ عزت جو امریکہ میں ایک بادشاہ کو تو مل سکتی ہے۔ نیگرو کو نہیں۔

تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام عالموں کا مالک ہے۔

مخلص

الحاج ملک الشہباز

(میلکم ایکس)

!

باب: 18

الحاج ملک الشہباز

شہزادہ فیصل مجھے سرکاری مہمان قرار دے چکے تھے اور اس کے نتیجہ میں جو فوائد اور احترام مجھے ملا۔ اس میں خاص طور پر مجھے شوفر والی کار کا بہت لطف آیا (جو کافی شرم کی بات ہے) مجھے شوفر نے مکہ کے گرد ونواح میں گھمایا اور کچھ خصوصی اہمیت کے مقدس مقامات دکھائے۔ یہ مقدس شہر کہیں تو وقت کی طرح قدیم نظر آتا اور کہیں اس کے جدید حصے میامی کے مضافات سے مشابہ نظر آتے۔ میں ان احساسات کو بیان نہیں کر سکتا جو اس سرزمین، جسے چار ہزار سال سے پیغمبروں کے پائوں نے چھوا تھا کے لمس نے میرے اندر پیدا کیے۔

امریکہ سے آئے ہوئے مسلمان کو دیکھ کر سب جگہ تجسس اور دلچسپی کی لہر دوڑ جاتی۔ اکثر جگہ مجھے "کیسیئس کلے" سمجھا جاتا۔ ایک مقامی اخبار نے میری اور کیسیئس کی تصویر اکٹھی چھاپ دی جو اقوام متحدہ میں لی گئی تھی۔ میرے شوفر/راہنما/مترجم کے توسط سے مجھ سے "کیسیئس" کے متعلق بہت سوال پوچھے گئے حتیٰ کہ مسلم دنیا میں بچے بھی اسے جانتے اور اس سے محبت کرتے تھے اور عوامی مقبولیت کے پیش نظر پورے افریقہ اور ایشیا کے سینمائوں میں اس کا مقابلہ دکھایا گیا تھا۔ اس لمحے "کیسیئس" پوری سیاہ فام دنیا کے حواس پر چھا چکا تھا اور انتہائی مقبول تھا۔

میں اپنی کار کے ذریعے ہی کوہِ عرفات اور منیٰ کی خصوصی نمازوں میں شامل ہوا۔ سڑکوں پر مَیں نے اپنی زندگی کی انتہائی خوفناک ڈرائیونگ دیکھی۔ بریکیں چیخ رہی تھیں، کاریں پھسل رہی تھیں اور ہارن بج رہے تھے (میرا خیال ہے اس شہر میں اس طرح کی ڈرائیونگ بھی اللہ کے آسرے پر ہی ہو رہی تھی) اب میں نے عربی میں نماز سیکھنا شروع کر دی تھی لیکن نماز کا سب سے ادق مرحلہ جسمانی مشکل تھی۔ میرا پائوں کا انگوٹھا نماز میں بیٹھنے کے انداز سے سوج چکا تھا اور تکلیف دے رہا تھا۔ البتہ مسلم دنیا کے رسم ورواج میرے لیے اب اجنبی نہ رہے تھے۔ اب میرے ہاتھ بلاجھجک مشترک پلیٹ میں سے چیز اٹھا لیتے جس میں سے دوسرے مسلمان بھائی کھا رہے ہوتے۔ میں بلاجھجک اُسی

گلاس میں پانی پی لیتا جس سے دوسرے پیتے تھے اور ایک ہی چٹائی پر آٹھ دس افراد کے ساتھ کھلے میں سو جاتا۔ ایک رات مزدلفہ میں کھلے آسمان تلے میں رات بھر جاگتا رہا۔ میرے اردگرد تمام مسلمان بھائی سوئے پڑے تھے۔ اس رات میں نے جانا کہ ہر خطہ ارض کے حجاج چاہے وہ کسی رنگ' طبقے یا عہدے سے تعلق رکھتے ہوں، اعلیٰ افسران ہوں یا بھکاری سب کے سب ایک ہی زبان میں خراٹے لیتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اس ارضِ مقدس میں سافٹ ڈرنکس کی لاکھوں بوتلیں استعمال ہوتی ہیں اور کروڑوں سگریٹ پھونکے جاتے ہیں۔ خصوصاً عرب مسلمان دوراج حج بھی مسلسل سگریٹ پیتے رہتے ہیں۔ سگریٹ نوشی کی یہ لعنت پیغمبر محمدؐ کے زمانے میں ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو وہ یقینا اس پر پابندی لگا دیتے۔

یہ تاریخ کا سب سے بڑا حج تھا۔ ترکی کی پارلیمنٹ کے قاسم گلک نے مجھے بتایا کہ صرف ترکی سے چھ سو بسیں پچاس ہزار سے زائد مسلمانوں کو حج کے لیے لائیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میری آرزو ہے کہ ایک روز امریکی مسلمانوں سے بھرے ہوئے بحری اور ہوائی جہاز بھی حج کے لیے مکہ آئیں۔

اس عظیم بھیڑ میں مجھے رنگوں کا ایک خاص انداز محسوس ہوا اور محسوس ہونے کے بعد میں نے اس کا غور سے جائزہ لیا کیونکہ امریکی ہونے کے ناطے میں رنگ کے معاملے میں کافی حساس تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہم رنگ لوگ زیادہ تر ایک دوسرے کے قریب اور ساتھ رہتے تھے اور یہ سب کچھ فطری طور پر تھا۔ افریقی افریقیوں کے ساتھ اور پاکستانی پاکستانیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ میں نے اپنے ذہن میں فیصلہ کیا کہ امریکہ واپس پہنچ کر اپنا یہ مشاہدہ بیان کروں گا کہ جہاں تمام رنگ کے لوگوں میں حقیقی بھائی چارہ موجود ہوتا ہے اور کوئی اپنے آپ کو دوسرے سے الگ نہیں سمجھتا نہ کسی کو احساس برتری کا زعم ہوتا ہے نہ احساس کمتری، وہاں بھی فطری طور پر لوگ مشترک خصائل کی بناء پر ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ میری نیت تھی کہ اگلے حج سے پہلے میں اپنی عربی کی استعداد کو بہتر بنائوں گا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے اتنے باصبر دوست ملے جو میرے مترجم کی ذمہ داری ادا کرتے رہے۔ میں نے اپنی زندگی میں خود کو ایسا گونگا بہرہ محسوس نہیں کیا تھا جیسا میں یہاں مترجم کے بغیر محسوس کرتا تھا۔ میں نے امریکی انداز میں غور وفکر کرتے ہوئے سوچا کہ اگر اس رنگارنگی اور حج کے روحانی پہلوکی معقول طریق پر تشہیر کی جائے اور بیرونی دنیا کو آگاہ کیا جائے تو قبول اسلام کی شرح دگنی تگنی ہو سکتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ عرب، سماجی تعلقات کی اہمیت اور غیرعرب نفسیات کی تفہیم کے متعلق کافی نااہل ہیں۔ وہ انشاء اللہ (اگر اللہ کی مرضی ہوئی) کہہ کر انتظار

میں بیٹھ جاتے ہیں کہ لوگ خود ہی اسلام قبول کر لیں گے۔ اگرچہ اس طرح بھی اسلام پھیل رہا ہے لیکن ”تعلقاتِ عامہ“ کے طریقے سے یہ تعداد کروڑوں تک پہنچ سکتی ہے۔

میں جہاں بھی جاتا مجھ سے امریکہ کے نسلی تعصب کے متعلق پوچھا جاتا۔ اس مقدس سرزمین پر اور دنیابھر میں دیگر جگہوں پر خصوصاً جب بعد میں مَیں سیاہ افریقہ پہنچا' میں نے سینکڑوں مذاکروں میں بلاجھجک ان جرائم 'برائیوں اور ذلتوں کا ذکرکیا جن کا نشانہ امریکی سیاہ فام بن رہا ہے۔ اپنے مترجم کے ذریعے میں نے امریکی سیاہ فام کے مصائب کی تشہیر کا کوئی موقع ضائع نہیں کیا۔ کوہِ عرفات ہو یا جدّہ پیلس ہوٹل کی لابی' میں ایک ایک آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہتا کہ ”تم... تم... تم، اگر تم امریکہ میں ہوتے تو تمہیں بھی نیگرو کہہ کے پکارا جاتا، تم پر بم برسائے جاتے ،گولیاں ماری جاتیں' سنگینوں کے آگے چلایا جاتا اور تمہاری رنگت کی وجہ سے ہرطرح کا تشدد تم پر روا رکھا جاتا۔“ میری گفتگو جہاں غریب حجاج سنتے وہاں پر اہم شخصیات بھی سنتیں۔ میں نے نیلی آنکھوں سنہرے بالوں والے یروشلم کے مفتی اعظم حسین امینی سے بات کی ہمارا تعارف ترکی کی پارلیمنٹ کے رکن قاسم گلک نے کوہِ عرفات پر کروایا تھا۔ وہ دونوں پڑھے لکھے خاص طور پر امریکہ کے حوالے سے کافی باعلم تھے۔ قاسم گلک نے مجھ سے پوچھاکہ میں نے ایلیا محمد سے علیحدگی کیوں اختیار کی؟ میں نے جواباً گزارش کی کہ امریکی سیاہ فاموں کے اتحاد کی ضرورت کے پیش نظر میں اپنے اختلافات کو بیان نہیں کرنا چاہتا۔ دونوں میری بات سمجھ گئے اور جواب پر اصرار نہیں کیا۔

میں نے مکہ کے میئر شیخ عبداللہ سے گفتگو کی جو اپنے دور صحافت میں مکہ میونسپلٹی کے نقاد رہے تھے۔ چنانچہ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ خود کیا بہتری لا سکتے ہیں انہیں میئر بنا دیا گیا اور ہر شخص یہ تسلیم کرتا تھاکہ پہلے سے حالات بہتر ہو گئے ہیں۔ تیونس ٹیلی ویژن سٹیشن کے اسد محمد اور احمد حریۃ اللہ نے ”امریکہ سے مسلمان“ نامی فلم بنائی۔ احمد حریۃ اللہ نے ایک بار شکاگو میں ایلیا محمد کا انٹرویو بھی کیا تھا۔ جدّہ پیلس ہوٹل کی لابی میں اکثر اوقات بہت سے دیگر ممالک کے اہم لوگ ”امریکی مسلمان“ کی گفتگو سننے کے لیے جمع ہو جاتے۔ مجھے بہت سے افریقی ملے جو یا تو امریکہ میں وقت گزار چکے تھے یا امریکہ میں سیاہ فاموں کے ساتھ ہونے والے سلوک کے متعلق سُن چکے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک بار ایک بڑے اجتماع میں سیاہ افریقہ کے ایک کیبنٹ منسٹر سے ملاقات ہوئی جس کا حالات حاضرہ کا علم حیران کن حد تک عمدہ تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اکثر اوقات امریکہ کا سفر کرتا ہے اور جان بوجھ کراپنا قومی لباس نہیں پہنتا کیونکہ لوگ اس انتہائی پڑھے لکھے اور معزز سرکاری عہدے دار سے ناشائستہ سلوک کرتے تھے۔ یہ ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں غصے سے دہکنے لگیں اور وہ جوش سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہنے لگا: ”امریکی سیاہ فام کچلے جانے پر مطمئن

کیوں ہے؟ وہ انسان بننے کے لیے مقابلہ کیوں نہیں کرتا؟" ایک سوڈانی اعلیٰ افسر مجھے گلے لگا کے کہنے لگا "تم نے امریکی سیاہ فاموں کے دل جیت لیے ہیں" ایک ہندوستانی افسر جذبات کی شدت کی تاب نہ لا کر رونے لگا۔ میں اس بات پر بہت سوچتا رہا کہ امریکی نیگرو کی اس حد تک ذہنی تطہیر (Brain Washing) ہو چکی ہے کہ وہ دنیا کے دیگر غیر سفید فام لوگوں کی طرح اپنے مقام کو سمجھنے کی بجائے بالکل بے حس ہو چکا ہے۔ اُسے ان کروڑوں غیر سفید فاموں کا کوئی تصور ہی نہیں ہے جو اس کے متعلق پریشان ہیں اور نہ اسے ان بھائی چارے کے جذبات کا احساس ہے جو دیگر غیر سفید فام اس کے متعلق محسوس کرتے ہیں۔

اس ارضِ مقدس اور بعد میں افریقہ میں مَیں نے تہیہ کیا کہ کسی بھی امریکی نیگرو لیڈر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ غیر سفید ممالک کا بہت زیادہ سفر کرے اور دورانِ سفر ان ممالک کے اعلیٰ افراد سے ملاقات کرے۔ میں یہ ضمانت دیتا ہوں کہ کوئی بھی مخلص کشادہ ذہن نیگرو لیڈر جب واپس آئے گا تو نہ صرف یہ کہ اس کے خیالات زیادہ موثر ہو جائیں گے بلکہ وہ امریکی سیاہ فام کے مسئلہ کے حل کے لیے متبادل حل تلاش کرنے کے قابل ہو جائے گا اور ان سب سے بڑھ کر اس نیگرو لیڈر کو یہ علم ہو گا کہ بہت سے غیر سفید اعلیٰ سرکاری افسران خصوصاً افریقی' یونائیٹڈ نیشنز اور دیگر جگہوں پر "نیگرو کاز" کی پشت پناہی کرنا پسند کریں گے لیکن یہ سرکاری افسران سمجھتے ہیں کہ خود امریکہ نیگرو دبدھا میں مبتلاہو کر اتنا بٹ گیا ہے کہ اسے اپنے کسی Cause یا مقصد کا علم نہیں۔ ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ وہ کسی ایسے شخص کی مدد کر کے پریشانی مول لینا نہیں چاہیں گے جو مدد چاہتا نہ ہو اور اپنے مفاد کے لیے بھی تعاون پر تیار نہ ہو۔

امریکی سیاہ فام راہنمائوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے پاس قوت متخیلہ کی کمی ہے۔ اس کی سوچ اور حکمت عملی اگر ہے بھی تو انتہائی محدود ہے اور صرف اس حد تک ہے جس حد تک سفید فام اس کی اجازت دیتاہے اور امریکی طاقت کا ڈھانچہ یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ نیگروز عالمی سطح پر سوچنے کے لائق ہو جائیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ امریکی سیاہ فام تنظیمیں اور ان کے راہنما آزاد افریقی اقوام اور امریکی سیاہ فام لوگوں کے ساتھ براہِ راست برادرانہ بنیادوں پر ربط قائم کرنے میں ناکام رہی ہیں جو ان کی بدترین غلطی ہے۔ سیاہ فام افریقی سربراہان مملکت کو ہر روز علم ہونا چاہیے کہ امریکی سیاہ فاموں کی جدوجہد کسی درجہ پر پہنچ چکی ہے نہ کہ ان کے پاس امریکہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی جاری کردہ رپورٹ ہو کہ "امریکہ سیاہ فاموں کی جدوجہد کا مسئلہ حل کر لیا گیا ہے۔"

دو سیاہ فام امریکی ادیب جو ارضِ مقدس میں بہت مقبول ہیں' نے امریکی سیاہ فاموں کے بارے میں پریشانی اور فکر کا احساس پیدا کرنے میں کافی مدد کی ہے۔ جیمز بالڈون کی ترجمہ شدہ کتب نے جان گریفن کی کتاب "بلیک لائیک می" (Black Like Me) کی طرح بہت اثر ڈالا۔ اس کتاب میں سفید فام مسٹر گریفن نے اپنی جلد کالی کر کے نیگرو بن کر دو ماہ تک امریکہ میں سفر کیا پھر اپنے تجربات کو کتابی شکل میں لکھا اور اسی کے لفظوں میں "یہ ایک ہولناک تجربہ تھا۔" جن لوگوں نے اس مقبول کتاب کو پڑھ رکھا تھا میں ان سے ہمیشہ یہ کہتا کہ اگر ایک نقلی نیگرو ساٹھ دنوں میں ایسے ہولناک تجربے سے گزرتا ہے تو ان حقیقی نیگروز کی کیفیت کا اندازہ لگائیں جس سے وہ چار سو سال سے گزر رہے ہیں۔

ایک اور اعزاز جو مجھے ملا اور جس کے لیے میں نے دعا کی تھی وہ یہ تھا کہ شہزادہ فیصل نے مجھے روبرو گفتگو کا شرف بخشا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو طویل القامت اور وجیہہ شہزادہ فیصل میز سے اٹھ کر میرے استقبال کے لیے آئے۔ مَیں اس کیفیت کو نہیں بھول سکتا کہ دنیا کا اتنا اہم آدمی اپنی تمام تر عظمت کے باوجود کس قدر پرخلوص عاجزی کا حامل تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے مقابل کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہمارے مترجم کے فرائض ڈپٹی چیف آف پروٹوکول محمد عبدالعزیز مجید جو مصری نژاد عرب تھے اور دیکھنے میں ہارلم کے نیگرو لگتے تھے' نے سرانجام دیئے۔ جب میں نے ریاستی مہمان بننے پر اپنی شکرگزاری کے اظہار کے لیے الفاظ تلاش کرنے کی کوشش کی تو شہزادہ فیصل نے فوراً مجھے ہاتھ کے اشارہ سے منع کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک مسلمان کی طرف سے دوسرے مسلمان کے لیے معمول کی میزبانی ہے اور میں تو خیر امریکہ سے آیا ہوا ایک غیر معمولی مسلمان ہوں۔ انہوں نے مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جو کچھ انہوں نے میرے لیے کیا ہے وہ اپنی خوشی کے لیے بے لوث ہو کر کیا ہے۔ ایک ملازم نے آ کر دو طرح کی چائے پیش کی۔ ان کا شہزادہ محمد فیصل پہلے ہی امریکی ٹیلی ویژن پر مجھ سے مل چکا تھا جہاں پر وہ ناردرن کیلیفورنیا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ شہزادہ فیصل امریکی سیاہ فام مسلمانوں کے متعلق مصری ادیبوں کے مضامین پڑھ چکے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ ادیب ٹھیک کہتے ہیں تو امریکی سیاہ فام مسلمان غلط اسلام پر ہیں۔ میں نے ان کے سامنے گزشتہ بارہ سال میں "نیشن آف اسلام" کی تعمیر و تنظیم کے سلسلے میں اپنی خدمات پر روشنی ڈالی اور انہیں بتایا کہ میرا حج کرنے کا مقصد حقیقی اسلام کی تفہیم ہے۔ شہزادہ فیصل نے اس بات کو پسند کیا اور کہا کہ اسلام کے متعلق انگریزی میں ترجمہ شدہ کتب کی تعداد بہت زیادہ ہے لہٰذا لاعلمی کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی اور نہ ہی مخلص لوگوں کے پاس گمراہی کی کوئی وجہ رہ جاتی ہے۔

اپریل 1964ء کے آخری دن میں بیروت پہنچا جو لبنان کا ساحلی دارالخلافہ ہے۔ میں اپنا ایک حصہ شہر مقدس مکہ میں چھوڑ آیا تھا اور بدلے میں مکہ کا ایک حصہ ساتھ لے آیا تھا۔ میری اگلی منزل نائیجیریا اور گھانا تھے لیکن ارض مقدس میں بننے والے کچھ دوستوں نے اصرار کیا کہ مجھے راستے میں کہیں کہیں رکنا چاہیے جس سے میں نے اتفاق کیا مثلاً میں نے اپنا پہلا قیام اور خطاب امریکن یونیورسٹی آف بیروت کے اساتذہ اور طلباء کے سامنے کیا۔ بیروت کے پام بیچ ہوٹل میں میں نے امریکہ چھوڑنے کے بعد پہلی پرآسائش طویل نیند لی پھر پیدل نکل پڑا۔ فوری طور پر میری توجہ لبنانی خواتین کے لباس اورآداب کی جانب مبذول ہو گئی۔ ارض مقدس میں خواتین بہت دھیمی اور نسوانی مزاج کی حامل تھیں جبکہ یہاں اچانک بالکل اس کے برعکس نصف فرانسیسی نصف عرب لبنانی خواتین اپنے انداز اور لباس سے زیادہ آزاد اور بے جھجک نظر آتی تھیں۔ مجھے لبنانی ثقافت پر یورپ کے اثرات واضح نظر آئے۔ مجھے احساس ہوا کہ کسی بھی ملک کی اخلاقی قوت یا اخلاقی کمزوری کا اندازہ بازاروں میں خواتین بالخصوص نوجوان خواتین کے لباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ جہاں کہیں بھی اخلاقی اقدار دَب گئی ہوں اور مکمل ختم نہ ہوئیں ہوں___ لوگ مادی اشیاء پر زیادہ زور دیتے ہوں تو اس کا عکس آپ کو خواتین میں واضح نظر آئے گا۔ آپ امریکی جوان اور بوڑھی خواتین کو دیکھیں جن کی اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اکثر ممالک میں آپ کو دونوں انتہائوں میں سے ایک نظر آئے گی لیکن ایک حقیقی جنت آپ کو وہیں ملے گی جہاں مادی ترقی اور روحانی اقدار توازن میں ہوں گی۔

میں نے یونیورسٹی آف بیروت میں خطاب کرتے ہوئے امریکی سیاہ فاموں کی حالت سچائی کے ساتھ بیان کی جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ایک تجربہ کار مقرر کو سامعین کے ردعمل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ دوران خطاب مجھے امریکی سفید فام طالبعلموں کے دفاعی ردعمل کا احساس ہوا لیکن جب میں نے ناقابل تردید حقائق پیش کیے تو ان کا تنائو اور غصہ کچھ کم ہو گیا اور افریقیوں نے جن جذبات کا مظاہرہ کیا انہیں تو میں بیان ہی نہیں کر سکتا۔

بعدمیں مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ امریکی ذرائع ابلاغ نے کہانیاں شائع کیں کہ بیروت میں میری تقریر سے فساد ہو گیا۔ جانے کس صحافی نے جانتے بوجھتے سمندر پار ایسی خبر بھیجی۔ بیروت کے اخبار ”ڈیلی سٹار“ نے اپنے پہلے صفحے پر میری تقریر کا ذکر کیا اور کسی فساد کا ذکر نہیں کیا کیونکہ ایسا ہوا ہی نہیں تھا۔ میری تقریر کے بعد افریقی طلباء نے دستخطوں کے لیے مجھے گھیر لیا۔ ان میں سے کچھ تو مجھے گلے بھی ملے۔ امریکی نیگرو سامعین کبھی مجھے اس طرح قبول نہیں کر سکتے تھے جس طرح یہ افریقی قبول کر رہے تھے۔

بیروت سے میں قاہرہ گیا جہاں سے ٹرین کے ذریعے میں اسکندریہ مصر چلا گیا۔ میں اپنا کیمرہ ہر وقت تیار رکھتا تھا۔ بالآخر میں جہاز کے ذریعہ نائیجیریا روانہ ہو گیا۔ چھ گھنٹے کی پرواز میں میں پائلٹ سے محوِ گفتگو رہا جو 1960ء کے اولمپکس میں تیراکی کے مقابلوں میں حصہ لے چکا تھا۔ میرے ساتھ ایک جذباتی افریقی سیاستدان بیٹھا تھا جس کی آواز شدتِ جذبات سے بلند ہو جاتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ "جب لوگ ایک ساکن زندگی گزارتے ہوں اور انہیں اس سے باہر نکالنا ہو تو اس کے لیے ووٹنگ کی ضرورت نہیں ہوتی" اس کا بنیادی نکتہ نظر یہ تھا کہ نئی افریقی قوم جو نوآبادیاتی نظام سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہے اسے کسی ایسے سیاسی نظام کی ضرورت نہیں ہے جو اسے تقسیم کر دے۔ لوگوں کو معلوم نہیں کہ ووٹ کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ یہ راہنمائوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کا شعور بہتر کریں۔

لاگوس میں ابادان یونیورسٹی (Ibadan University) کے پروفیسر ایسئین اوڈوم (Essien–udom) نے میرا استقبال کیا۔ ہم اس سے قبل امریکہ میں مل چکے تھے جہاں وہ اپنی کتاب "بلیک نیشنل ازم" کی تصنیف کے سلسلہ میں نیشن آف اسلام پر تحقیق کر رہے تھے۔ اس رات میرے اعزاز میں ان کے گھر پر عشائیہ دیا گیا جس میں بہت سے دوسرے پروفیسرز اوراہم لوگ شامل ہوئے۔ کھانے کے دوران ایک نوجوان ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے علم ہے کہ نیویارک سٹی کا پریس ہارلم میں ایک سفید فام عورت کے قتل پر بہت ناراض ہے۔ پریس کے بقول بہت سے لوگ اس قتل میں بالواسطہ مجھ پر الزام لگا رہے تھے۔ ہارلم میں ایک سفید فام جوڑا کپڑوں کا سٹور چلاتا تھا۔ ان پر بہت سارے نوجوان نیگروز نے حملہ کیا اور اس کی بیوی کو چاقوئوں کے وار کر کے قتل کر دیا۔ ان میں سے کچھ نیگروز پولیس نے گرفتار کر لیے اور انہوں نے بتایا کہ وہ بلڈ برادرز (Blood Brothers) نامی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان نوجوانوں پر الزام لگایا گیا کہ یہ لوگ بلیک مسلمز نامی تنظیم سے وابستہ ہیں۔ جو نیشن آف اسلام سے الگ ہو کر میرے ساتھ وابستہ ہوئی ہے۔

میں نے انہیں بتایا کہ میں پہلی بار اس کے متعلق سن رہا ہوں لیکن امریکہ کی جھونپڑپٹیوں میں تشدد کے واقعات میرے لیے قطعاً حیران کن نہیں ہیں۔ اس لیے کہ وہاں یہ لوگ جانوروں کی طرح رہتے ہیں اور ان سے کوڑھیوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ میرے خلاف الزام مخصوص سفید فام نفسیات کا حصہ ہے۔ رہا بلڈ برادرز کا سوال تو میں سمجھتا ہوں کہ سارے نیگروز میرے بلڈ برادرز ہیں اور سفید فاموں کی مجھ پر کیچڑ اچھالنے کی یہ کوشش دراصل مجھے سیاہ فاموں میں "جولُوئیس" بنا رہی ہے۔

میں نے ابادان یونیورسٹی کے ٹرینچرڈ ہال میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ آزاد افریقی ریاستیں ایفرو امریکی مقدمہ اقوام متحدہ کے روبرو پیش کرنے میں معاونت کریں۔ جس طرح یہودی قوم سیاسی' معاشی اور ثقافتی طور پر عالمی سطح پر ہم آہنگی رکھتی ہے اسی طرح تمام ایفرو امریکینوں کو چاہیے کہ وہ پین افریقی نظریہ سے وابستہ ہو جائیں۔ میرا کہنا یہ تھا کہ بے شک جسمانی طور پر ہم امریکہ میں ہی رہیں مگر فلسفیانہ اور ثقاتی سطح پر ہمیں واپس افریقہ جانے کی انتہائی ضرورت ہے اور پین افریقین ازم کے سانچے میں عملی اتحاد کو فروغ دینا چاہیے۔ نوجوان افریقی مجھ سے ایسے چبھتے ہوئے سیاسی سوالات کرتے تھے جو امریکی بزرگ بھی نہیں کرتے تھے۔ پھر ایک حیران کن واقعہ پیش آیا وہ یہ کہ ایک ویسٹ انڈین نے امریکہ کے خلاف بولنے پر مجھ سے بگڑنا شروع کر دیا۔ جس پر طلباء نے اسے "شٹ اَپ شٹ اَپ" کہہ کر خاموش کرا دیا۔ ایک بوڑھے ویسٹ انڈین نے اس کے حق میں بولنا چاہا تو طلباء کا ایک گروہ مشتعل ہو کر اس کی طرف لپکا۔ اپنا آپ بچانے کے لیے اسے بھاگنا پڑا اور طلباء اسے کیمپس سے باہر نکال کر لوٹے۔ بعد میں مجھے علم ہوا کہ اس ویسٹ انڈین نے ایک سفید فام عورت سے شادی کر رکھی تھی اور وہ ایک ایسی ایجنسی میں نوکری حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو سفید فاموں کے زیر اثر تھی اور اس ایجنسی کے کہنے پر وہ مجھے چیلنج کرنے آیا تھا تب مجھے اس کا مسئلہ سمجھ میں آیا۔

بعد میں طلباء یونین میں مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ ہو گئی مجھے نائیجیرین مسلم سٹوڈنٹس سوسائٹی کا اعزازی رکن بنایا گیا۔ اس وقت بھی میرے بٹوے میں میرا رکنیتی کارڈ موجود ہے جس پر "الحاج میلکم ایکس رجسٹریشن نمبرM-138" تحریر ہے۔ مجھے ایک نیا نام دیا گیا "اوموویل" یوروبا زبان میں اس کا مطلب ہے" وہ بیٹا جو گھر واپس آ جائے" میں نے ان سے کہا کہ اس سے زیادہ قابل عزت خزانہ مجھے کبھی نہیں ملا۔ نائیجیریا میں امن افواج کے چھ سو اراکین تھے۔ ان میں سے کچھ سفید فام اراکین نے مجھ سے دورانِ گفتگو اپنے ہم نسل امریکیوں کے رویئے پر واضح طور پر شرمندگی اور پشیمانی کا اظہار کیا۔ بیس نیگرو امن فوجیوں میں ایک صاحب لیری جیکسن جو مارگن سٹیٹ کالج فورٹ لاڈرڈیل فلوریڈا کے گریجوایٹ تھے اور 1962ء سے امن فوج میں شامل تھے' نے مجھے بہت متاثر کیا۔

میں نے نائیجیرین ریڈیو اور ٹیلیویژن پروگراموں میں شرکت کی۔ آج بھی جب میں ذرائع ابلاغ کو آپریٹ کرتے سیاہ فاموں کے متعلق سوچتا ہوں تو میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ جاتی ہے۔ جن رپورٹرز نے مجھ سے انٹرویو کیے ان میں "نیوزویک" میگزین کا ولیمز نامی امریکی نیگرو بھی تھا۔

نائیجیرین آفیشلز نے مجھ سے نجی گفتگو کے دوران کہا کہ امریکی انفارمیشن ایجنسی نہایت کامیابی سے افریقیوں میں یہ تاثیر پھیلا رہی ہے کہ امریکی نیگروز مسلسل ترقی کر رہے ہیں اور نسلی مسئلہ پر جلد ہی قابو پا لیا جائے گا۔ ان میں سے ایک افسر نے کہا کہ "ہمارے راہنما اور بہت سے دوسرے لوگ جانتے ہیں کہ حالات اِس کے برعکس ہیں۔" ہر افریقی یو۔ این آفشل یہ بات جانتا ہے کہ ڈپلومیٹک فرنٹ کے پیچھے سفیدفاموں کی منافقت اور سازش پنہاں ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دنیابھر کے افریقیوں کو ماضی کے ورثے سے نظریاتی طور پر ہی نہیں بلکہ جسمانی طور پر بھی الگ الگ رکھا جائے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ "امریکہ میں کتنے سیاہ فام یہ بات سوچتے ہیں کہ جنوبی' مرکزی اور شمالی امریکہ میں 80 ملین لوگ افریقی النسل ہیں؟ جس روز یہ افریقی لوگ آپس میں بھائی بن کر اکٹھے ہو گئے اس دن دنیا کا رُخ تبدیل ہوجائے گا" میں نے امریکہ میں کسی سیاہ فام سے اس قسم کی عالمی سطح کی گفتگو نہیں سُنی تھی۔

لاگوس نائیجیریا سے میں عکرہ (Accra) گھانا روانہ ہوگیا۔ میرا خیال ہے کہ براعظم افریقہ میں دولت اور فطری خوبصورتی کے اعتبار سے گھانا سے زیادہ امیر ملک کوئی نہیں ہے۔ گھانا درحقیقت پَین افریقین اِزم کا سرچشمہ بھی ہے۔ جہاز سے باہر نکلتے ہی ایک سرخ چہرے والے امریکی سفیدفام نے میرا استقبال کیا۔ میرا ہاتھ تھام کر مجھے بتایا کہ وہ ایلاء باما سے ہے اور پھر اُس نے مجھے اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔ ہوٹل کے ڈائننگ روم میں جب میں ناشتہ کے لیے گیا تو وہاں سفیدفام لوگ بھرے ہوئے تھے جو افریقہ کی دولت کی ارزانی پر ایسے گفتگو کر رہے تھے جیسے سیاہ فام بیروں کے کان ہی نہیں ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر ناشتہ کرنا مشکل ہو گیا کہ امریکہ میں یہ لوگ کس طرح سیاہ فاموں پر پولیس یا کتے چھوڑتے ہیں۔ سیاہ گرجا گھروں میں بم پھینکتے ہیں سفید گرجاگھروں کے دروازے ان پر بند کرتے ہیں اور اب اُسی سرزمین پر' جہاں سے ان سیاہ فاموں کے آباؤاجداد کو اغوا کر کے غلام بنایا گیا' یہ سفید فام پھر پہنچ گئے ہیں۔ اپنے ناشتہ کی میز پر میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک میں افریقہ میں ہوں تب تک میں جب بھی کچھ کہوں گا تو افریقیوں کا استحصال کرنے والے سفیدفاموں کے لیے پریشانی پیدا کروں گا۔ پہلے یہ سفید فام یہاں سے انسانی دولت لوٹ چکے ہیں اور اب افریقہ کی معدنی دولت کے پیچھے ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ میرے ردِّعمل سے سفیدفام مسلمانوں کے حقیقی بھائی چارے میں کوئی فرق نہیں پڑے گا جبکہ کسی امریکی سفیدفام اور سیاہ فام میں بھائی چارہ ڈھونڈے نہیں ملے گا۔

مصنف جولین مے فیلڈ گھانا میں ایفروامریکن باشندوں کی چھوٹی سی کالونی کے راہنما تھے۔ جب میں نے انہیں ٹیلی فون کیا تو انہوں نے مجھے فوراً ہی اپنے گھر مدعو کر لیا۔ جہاں تقریباً چالیس سیاہ فام امریکی باشندے موجود تھے۔ وہ کاروباری

اور پیشہ ور طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن میں ایک سابق فوجی اور دو مسٹر اینڈ مسز رابرٹ ای لی شامل تھے جو دندان ساز تھے اور جنہوں نے امریکی شہریت ترک کر دی تھی۔ ان کے علاوہ ایلس ونڈم’ مایا اینجلومیک’ وکٹوریا گارون اور لیزلی لیسی بھی تھے۔ جنہوں نے میلکم ایکس کمیٹی قائم کی تھی جو میرے لیے تقریبات اور خطبات کا شیڈول مرتب کر رہی تھی۔ میرے بریف کیس میں ابھی تک ایسے اخبارات ہیں جن میں میرے متعلق مضامین چھپے تھے۔ ”میلکم ایکس کا نام گھانا کے لوگوں کے لیے اتنا ہی مانوس ہے جتنا بدنما نفرت سے بگڑے ہوئے سفید چہرے۔“

”میلکم ایکس کی جدوجہد کے مرکزی دھارے (Mainstream) میں شمولیت کے فیصلہ کی خبر مایوس کُن غیر متشدّد اور فعال تحریک مزاحمت کے لیے ایک امیدافزاء اشارہ ہے۔“

”یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ ڈاکٹر ڈوبوئس (Dr. Dubois) کے دورۂ گھانا کے بعد میلکم ایکس افریقہ کا دورہ کرنے والے پہلے قومی سطح کے افروامریکن راہنما ہیں اور ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہم ان پر اُتنی ہی توجہ دیں جتنا کہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ دے رہا ہے۔“

”میلکم ایکس ہمارے بے حد اہم اور عسکری راہنما ہیں۔ ہم حالت جنگ میں ہیں۔ ان پر کیچڑ اچھالنے اور اتہام بازی کی کوشش کی جائے گی۔“

میں امریکہ سے پانچ ہزار میل دور ایسے استقبال کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ پریس کے اعلیٰ افسران نے میرے تمام تر احتجاج کے باوجود ہوٹل کے اخراجات خود ادا کیے۔ اُن افسران میں گھانین ٹائمز کے ایڈیٹر انچیف ٹی۔ ڈی بیفو، گھانا نیوز ایجنسی کے مینجنگ ڈائیریکٹر جی ٹی انیم’ سپارک کے ایڈیٹر کوفی بتسا’ پین افریقین یونین آف جرنلسٹ کے سیکرٹری جنرل مسٹر کیمرون ڈواوڈو اور دیگر شامل تھے۔ میں صرف ان کا شکریہ ہی ادا کر سکتا تھا۔ اس کے بعد جولئین مے فیلڈ کی بیگم اینالیویا جو کہ عکرہ ڈسٹرکٹ ہیلتھ پروگرام کی انچارج تھی’ نے میرے اعزاز میں ایک بہت خوبصورت عشائیہ کا اہتمام کیا جس میں افریقہ آ بسنے والے امریکی نژاد سیاہ فاموں نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

میری خواہش تھی کہ کاش امریکی سیاہ فاموں کو میرے وہ کان’ وہ آنکھیں اور وہ جذبات مل سکتے جو گھانا کے دورے کے دوران مجھے میسر تھے اور میرا یہ استقبال میری شہرت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ مجھے یہ عزت بطور ایک عسکریت پسند امریکی سیاہ فام کے طور پر دی گئی۔

ٹھساٹھس بھرے ہوئے پریس کلب میں مجھ سے پہلا سوال ایلیا محمد اور نیشن آف اسلام سے علیحدگی کے بارے میں کیا گیا۔ افریقیوں میں مشہور تھا کہ ایلیا محمد نے ایریزونا میں ایک محل تعمیر کر رکھا ہے۔ میں نے اس افواہ کی تردید کی اور تنقید سے اجتناب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا اختلاف سیاسی اور انسانی حقوق کے حصول کے لیے اضافی مذہبی جدوجہد میں ملوث ہونے کی بنیاد پر تھا۔ میں نے کہا کہ نیشن آف اسلام کا اس لیے احترام کرتا ہوں کہ اس تحریک نے نفسیاتی حوالے سے اخلاقی اور سماجی اصلاحات کیں اور امریکی سیاہ فاموں پر ایلیا محمد کے اثرات بہت بنیادی نوعیت کے ہیں۔ میں نے اس بات پر زور دیا کہ افریقی اور ایفرو امریکی لوگوں کے درمیان جدوجہد کے حوالے سے رابطہ اور امداد ہونی چاہیے۔ میں نے کانفرنس کے درمیان کسی جگہ "نیگرو" کا لفظ استعمال کیا جس پر فوری طور پر میری اصلاح کی گئی اور کہا گیا "جناب میلکم ایکس یہ لفظ یہاں پسند نہیں کیا جاتا، ایفرو امریکن کی اصطلاح زیادہ بامعنی اور پُروقار ہے۔" میں نے خلوصِ دل سے معذرت کی اور جتنا عرصہ میں افریقہ میں رہا یہ لفظ دوبارہ استعمال نہیں کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ امریکہ میں رہنے والے بائیس ملین ایفرو امریکن افریقہ کے لیے ایک بہت بڑی قوت بن سکتے ہیں۔ جبکہ اس کے جواب میں افریقی اقوام کو چاہیے کہ وہ امریکی نسلی تعصب کے خلاف سفارتی سطح پر اپنی قوت کا مثبت استعمال کریں۔ سارے افریقہ کو پرتگال اور ساؤتھ افریقہ میں جاری سفیدفاموں کی جابر حکومتوں کے خلاف متحد ہونا چاہیے لیکن اگر تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہے کہ Verwoerd اور Salazar برطانیہ اور فرانس امریکی امداد کے بغیر ایک دن نہیں نکال سکتے تو تمہاری کوشش بے سود ہو گی۔ جب تک تم واشنگٹن ڈی۔ سی میں بیٹھنے والے شخص کو بے نقاب نہیں کرو گے کوئی کام پایہ تکمیل کو نہیں پہنچے گا۔

ان دنوں امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے "جی مینن ولیمز" سرکاری دورہ پر افریقہ آئے ہوئے تھے۔ میں نے اس حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ میری زبان پر یقین کرتے ہوئے آپ کو ہر امریکی عہدیدار کو شک کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے جو آپ سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا ہے کیونکہ امریکہ میں یہ ہمیں دیکھ کر رتّی بھر خوش نہیں ہوتے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرا باپ اُسی ریاست مشی گن میں سفیدفاموں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا جہاں جی مینن ولیمز ایک زمانے میں گورنر تھا۔ گھانا کلب میں مزید صحافی اور معززین نے میرا بھرپور استقبال کیا۔ مَیں ایک سیاہ فام امریکی ادیب رچرڈ رائٹ کی بیٹی جولیا جو ایک خوبصورت دُبلی اور میٹھی آواز والی لڑکی تھی جس کا فرانسیسی شوہر گھانا میں ایک اخبار شائع کرتا تھا' کی طرف سے مدعو کیا گیا تھا۔ بعد میں پیرس میں میں رچرڈ رائٹ کی بیوہ ایلن اور اس کی چھوٹی بیٹی راکیل سے بھی ملا۔

میں مختلف سفارتخانوں میں سفیروں سے ملا۔ الجیریا کے سفیر نے مجھے خاص طور پر بہت متاثر کیا۔ اس نے اپنی زندگی مکمل طور پر عسکریت پسندی اور عالمی انقلاب کے نام وقف کر رکھی تھی جس کا مقصد دنیا بھر کے پسے ہوئے ہوئے لوگوں کے مسائل کو حل کرنا تھا۔ چینی سفیر مسٹر ہو آنگ ہا بھی ایک حساس اور عسکری مزاج کے حامل شخص تھے جو اپنی تمام تر توجہ مغرب کی جانب سے افریقی لوگوں کو ان کے ورثے سے جدا کرنے کی کوششوں پر مرتکز کیے ہوئے تھے۔ نائیجیرین سفیر امریکہ میں ایفرو امریکن لوگوں کے مسائل کے متعلق بہت فکرمند تھے کیونکہ واشنگٹن ڈی۔ سی میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ان مصائب کا ذاتی تجربہ رکھتے تھے۔ بالکل اسی طرح سب سے زیادہ ہمدرد مالی کے سفیر تھے کیونکہ وہ خود نیویارک میں اقوام متحدہ کے دفتر میں رہ چکے تھے۔ ایک ناشتہ پر میری ملاقات برٹش گیانا کے ڈاکٹر میکینن سے ہوئی۔ ہم نے پین افریقہ قسم کے اتحاد کے متعلق باتیں کیں جس میں ایفرو امریکی بھی شامل ہوں۔ اسی طرح میں نے ایفرو امریکی مسائل پر گھانا کے وزیر ثقافت Nana Nketsia سے بھی بات چیت کی۔

ایک بار جب میں ہوٹل واپس آیا تو ٹیلی فون پر امریکن براڈکاسٹنگ کمپنی کے مال گُوڈ میرے منتظر تھے۔ مال گُوڈ نے مجھ سے "بلڈ برادراز" نیگروز کے رائفل کلبوں اور دوسرے موضوعات کے متعلق سوال کیے جو امریکہ ذرائع ابلاغ میں اٹھائے جا رہے تھے۔ میں نے ان کا حتیٰ المقدور جواب دیا جو وہ ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ کرتا رہا۔

یونیورسٹی آف گھانا کے گریٹ ہال میں مَیں نے افریقہ میں سب سے بڑے اجتماع سے خطاب کیا جس میں زیادہ تر افریقی تھے لیکن بہت سے سفیدفام بھی تھے۔ اس اجتماع میں مَیں نے اس جھوٹے تاثر کو زائل کرنے کی بھرپور کوشش کی جو نسلی تعلقات کے حوالے سے یو۔ ایس انفارمیشن ایجنسی پھیلا رہی تھی۔ میں نے ان کے سامنے سفیدفاموں کے ہاتھوں ایفروا مریکیوں پر توڑے جانے والے مصائب کی حقیقی تصویر پیش کی۔ میں نے ان سفیدفاموں سے خطاب کرتے ہوئے کہا "میں نے آج تک اتنے سفیدفاموں کو سیاہ فاموں کے ساتھ اس قدر حسنِ سلوک سے پیش آتے نہیں دیکھا جتنا آپ سفیدفام لوگ افریقہ میں ان سے پیش آتے ہیں۔ امریکہ میں ایفرو امریکی بھی اسی بھائی چارے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ انہیں یہاں افریقہ میں آ کر دیکھنا چاہیے کہ آپ کس طرح افریقیوں سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے ہیں۔ یہاں حقیقی یگانگت کا ماحول ہے لیکن کیا آپ ان افریقیوں کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم امریکہ میں بھی سیاہ فاموں کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے ہیں! نہیں اور یقینا نہیں اور سچ پوچھیں تو آپ ان افریقیوں کو امریکہ سیاہ فاموں سے بہتر بھی نہیں سمجھتے۔ جس چیز سے آپ کو محبت ہے وہ دراصل معدنیات ہیں جو افریقہ کی زمین کے اندر چھپی ہیں..."

سامعین میں موجود سفید فام غصے سے لال پیلے ہوتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں میں نے کہا۔ ”میں اینٹی امریکن نہیں ہوں اور نہ میں یہاں امریکہ کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے آیا ہوں۔ میں یہاں سچ بولنے آیا ہوں اور اگر سچ بولنے سے امریکہ کی خدمت ہوتی ہے تو اُسے ہونا ہی چاہیے۔“

ایک شام گھانا کے وزیرِ دفاع اور قومی اسمبلی کے رہنما عزت مآب کوفی باکو نے میرے اعزاز میں تقریب منعقد کی جس میں گھانا کے بہت سے سرکاری عہدیداران سے ملاقات ہوئی۔ مجھے بتایا گیا کہ ڈاکٹر ڈبلیو۔ ای۔ بی۔ ڈوبوائس کے بعد میں پہلا مہمان ہوں جس کے اعزاز میں ایسی تقریب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ تقریب میں موسیقی، رقص اور گھانا کے روایتی کھانوں کا انتظام تھا۔ میں نے بہت سے مہمانوں کو یہ کہہ کر ہنستے دیکھا کہ اس تقریب سے پہلے دی گئی ایک اور دعوت میں امریکی سفیر ماہوی دوستانہ اور خوشدلانہ رویہ ظاہر کرنے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اُس سچ کو جھٹلانے کی کوشش کر رہا تھا جو میں ہر جگہ بیان کرتا تھا۔ اس کے بعد مجھے ایک ایسا دعوت نامہ ملا جس کا تصور میں نے خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے گھانئین پارلیمنٹ سے خطاب کا موقع دیا گیا۔ میں نے اپنی گفتگو کو مختصر لیکن جامع رکھا میں نے کہا ”آپ پرتگال اور سائوتھ افریقہ کو کیسے ملامت کر سکتے ہیں جبکہ امریکہ میں سیاہ فاموں کو بیلچوں کے ساتھ پیٹا جاتاہے اور انہیں کتوں سے نُچوایا جاتا ہے۔“ میں نے عرض کی کہ سیاہ فام افریقیوں یعنی ہمارے بھائیوں کی خاموشی کی واحد وجہ امریکی حکومت کی پراپیگنڈہ ایجنسیوں کی غلط اطلاعات ہیں۔ میری گفتگو کے آخر پر مجھ سے کہا گیا ”ہاں اگر ضرورت پڑی تو ہم مادّی، معاشی اور اخلاقی ہر طرح کی امداد ایفرو امریکن لوگوں کے لیے مہیا کریں گے۔“

گھانا بلکہ تمام افریقہ میں میرے لیے سب سے زیادہ قابلِ فخر ملاقات اوساگائیفو (Osgyefo) کے قلعہ میں Dr. Kwame Nkrumah کے ساتھ تھی۔ ان سے ملاقات سے پہلے میں نے مکمل تحقیق کی۔ مجھے گھانئین لیڈر کی سیکیورٹی کے انتظامات دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ جب میں ان کے طویل کمرے میں داخل ہوا تو وہ میز سے اٹھ کر میرے استقبال کے لیے آگے آئے وہ عام لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کے حساس چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا جسے میں نے گرمجوشی سے دبایا۔ ہم ایک دیوان پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایفرو امریکن مسائل سے بخوبی واقف ہیں کیونکہ وہ تعلیم کے لیے امریکہ میں کئی سالوں تک رہ چکے ہیں۔ ہم نے افریقی لوگوں اور افریقی نژاد لوگوں کے اتحاد پر بات چیت کی۔ ہم نے اس بات پر اتفاق کیا کہ پین افریقین ازم دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ افریقی ورثے کو لاحق مسائل کے حل کی کلید بھی ہے۔ مجھے ان کی گرمجوشی، خلوص اور

عجز نے بہت متاثر کیا۔ ملاقات کا وقت بہت جلد ختم ہو گیا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ امریکہ پہنچ کر میں ان کے جذبات ایفرو امریکیوں تک پہنچاؤں گا۔

اُس سہ پہر مجھے کوامے نکروماآئیڈیالوجیکل انسٹی ٹیوٹ جو اتنالیس میل دور وینیبا میں واقع تھا خطاب کا موقع ملا۔ وہاں دو سو طلباء زیر تعلیم تھے جنہیں گھانا کے انٹلکچوئل ریوولیوشن (فکری انقلاب) کو آگے بڑھانے کی تربیت دی جاتی تھی۔ یہاں پر بھی مجھے افریقی سیاست میں نوجوانوں کی گرم جوشی کا بے مثال مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔ میرے خطاب کے بعد سوال وجواب کے وقفہ میں کچھ نوجوان ایفروا مریکی اٹھ کھڑے ہوئے جو تمام حاضرین کے لیے اجنبی تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنے امریکی نیگرو ہونے کا اعلان کیا اور امریکی سفیدفاموں کے دفاع میں بولنا شروع کر دیا۔ جس پر افریقی طلباء نے اس کا تمسخر اڑا کر اور اُسے ڈرا کر بٹھا دیا۔ اجلاس کے خاتمہ پر طلباء نے اس نوجوان کو گھیر لیا اور اُسے “تم راک فیلر کے ایجنٹ تو نہیں؟...” “ہمارے بچوں کو گمراہ کرنے کرنے سے باز رہو” کہہ کر لعنت ملامت کرنے لگے۔ بعد میں وہ شخص ایک لوکل سیکنڈری سکول کا استاد نکلا جسے ایک امریکہ ایجنسی کے توسط سے نوکری ملی تھی۔ نوجوانوں نے اُسے ذہنی تربیت کے لیے اس ادارے میں داخلے کی پیشکش کی۔ وقتی طور پر ایک اور استاد نے اُسے جوانوں کے ہاتھ سے بچایا لیکن پھر بھی طلباء نے اُسے “سی۔ آئی۔ اے”... اور “امریکن ایجنٹ” وغیرہ کہہ کر نکال دیا۔

چینی سفیر ہوانگ ہا اور ان کی بیگم نے میرے اعزاز میں سرکاری عشائیہ دیا۔ مہمانوں میں کیوبا اور الجیریا کے سفیر بھی تھے۔ وہیں میری ملاقات بیگم ڈبلیو۔ ای۔ بی۔ ڈوبوائس سے ہوئی۔ عشائیہ کے اختتام پر تین فلمیں دکھائی گئیں۔ ایک رنگین فلم تھی جس میں عوامی جمہوریہ چین کے لوگوں کو اپنی چودھویں سالگرہ مناتے دکھایا گیا تھا۔ اس فلم میں سابق نارتھ کیرولینا کے رہائشی عسکریت پسند ایفرو امریکی رابرٹ ولیمز کو نمایاں طور پر دکھایا گیا تھا جو کیوبا میں پناہ گزین تھا کیونکہ اس نے امریکی سیاہ فاموں کو مشورہ دیا تھا کہ انہیں اپنے دفاع میں ہتھیار اٹھا لینے چاہئیں۔ دوسری فلم میں ایفرو امریکی جدوجہد میں چین کی امداد پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ چیئرمین مائوزے تنگ کو اس امداد کے حوالے سے بیان دیتے دکھایا گیا تھا۔ اس فلم میں سفیدفاموں جن میں پولیس اور عام شہری شامل تھے کے ایفروامریکی باشندوں جو اپنے معاشرتی حقوق کے لیے امریکہ کے مختلف شہروں میں مظاہرے کر رہے تھے پر مظالم کے الم ناک واقعات دکھائے گئے اور تیسری فلم الجیرئین انقلاب سے متعلق تھی۔

چینی سفارت خانے کے عشائیے سے فارغ ہو کر میلکم ایکس کمیٹی نے مجھے پریس کلب پہنچایا جہاں میرے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی گئی تھی۔ یہاں عیش وطرب کا ماحول تھا اور حسب روایت مجھ سے ایک مختصر تقریر کے لیے درخواست کی گئی۔ میں نے حسب معمول افریقی اور ایفرو امریکی لوگوں کے درمیان اتحاد پر زور دیا۔ میں نے ان سے کہا "بے شک ناچو گاؤ لیکن منڈیلا کو یاد رکھو، لوممبا کو مت بھولو، جیلوں میں سڑنے والے سائوتھ افریقیوں کو مت بھلائو۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ میں رقص کیوں نہیں کر رہا؟ کیونکہ میں بائیس ملین ایفرو امریکیوں کی جانب تمہاری توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ گھانئین لوگوں نے اس طرح رقص وسرور میں حصہ لیا کہ ان پر جنونی ہونے کا گمان ہونے لگتا تھا۔ ایک خوبصورت افریقی لڑکی نے جس کی آواز سارہ وان سے ملتی تھی۔ 'بلیومون' گایا۔ کبھی کبھی بینڈ کی دھن سُن کر ملٹ جیکسن اور چارلی پارکر یاد آجاتے تھے۔

اگلی صبح مجھے علم ہوا کہ کیسیئس کلے اپنے دورے پر پہنچ رہا ہے۔ اس کے لیے ہوائی اڈے پر ایک بڑے استقبالیہ کا انتظام کیا گیا۔ میرا خیال تھا میری "کیسیئس" سے ملاقات اس کے لیے پریشانی کا باعث ہو گی کیونکہ اس نے ایلیا محمد کے اسلام کے ساتھ وابستہ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میرے لیے تو کوئی پریشانی نہیں تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ کیسیئس کو مجھ سے ملنے سے منع کیا گیا ہو گا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ کیسیئس اچھی طرح جانتا ہے کہ میں اُس وقت بھی اُس کے ساتھ تھا اور اُس پر یقین رکھتا تھا جب دوسرے اُس کے متعلق نا امیدی کا شکار تھے۔ چنانچہ میں نے اُسے پریشانی سے بچانے کے لیے نہ ملنے کا فیصلہ کیا۔ اُس شام نائجیریا کے ہائی کمشنر عزت مآب الحاجی عیسیٰ ولی نے مجھے دعوت پر مدعو کیا۔ وہ پست قامت 'مُعنک' اور بہت گرم جوش آدمی تھے اور دو سال واشنگٹن ڈی۔ سی میں رہ چکے تھے۔ طعام کے بعد انہوں نے مہمانوں سے گفتگو کرتے ہوئے افریقی اور ایفروامریکی باشندوں کے درمیان گہرے تعلق کی توثیق کرتے ہوئے ایفرو امریکی لوگوں کے ساتھ دوستی کے بندھن پر زور دیا۔ انہوں نے مہمانوں کے سامنے امریکی رسالہ ہورائزن (Horizon) کا شمارہ رکھا جس میں پرنسٹن یونیورسٹی کے ڈاکٹر مورو برجر کا تحریر کردہ نیشن آف اسلام کے بارے ایک مضمون چھپا تھا۔ پورے ایک صفحہ پر میری تصویر چھاپی گئی تھی جبکہ مقابل صفحہ پر سینکڑوں سال پرانے وجیہ اور پُرشکوہ سیاہ فام نائیجیرئین مُسلم کا رنگین خاکہ چھاپا گیا تھا۔ عزت مآب عیسیٰ ولی نے یہ تصویریں حاضرین کو دکھاتے ہوئے کہا "جب میں نے ان تصویروں کو دیکھا تو میں فوراً جان گیا کہ یہ دونوں ایک ہیں۔ ان میں واحد فرق لباس کا ہے۔ ایک امریکہ میں پیدا ہونے والے شخص کی تصویر ہے اور دوسری افریقہ میں پیدا ہونے والے کی چنانچہ ہر شخص کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم بھائی ہیں۔ میں اس تصویر سے ملتا جلتا لباس جو نائجیریا کے لوگ پہنتے ہیں الحاجی میلکم ایکس کو پیش کرنے جا رہا ہوں۔"

اس کے بعد عزت مآب عیسیٰ ولی نے مجھے ایک بہت خوبصورت نیلے رنگ کی خلعت اور کیسری رنگ کی پگڑی پیش کی۔ جس کی خوبصورتی نے مجھے حیران کر دیا۔ مَیں ان کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا اور انہوں نے وہ پگڑی میرے سر پر باندھ دی۔ انہوں نے مجھے دو جلدوں میں ترجمہ شدہ قرآن مجید بھی پیش کیا۔

اس ناقابل فراموش تقریب کے بعد بیگم شرلے گراھم ڈوبوائس مجھے اپنے گھرلے گئیں تاکہ میں اُس جگہ کو دیکھ اور کیمرے میں محفوظ کر سکوں جہاں اس کے مرحوم اور معروف شوہر ڈاکٹر ڈبلیو ای۔ بی۔ ڈوبوائس نے اپنے آخری ایام گزارے تھے۔ بیگم ڈوبوائس مصنفہ تھیں اور گھانئین ٹیلی ویژن کی ہدایتکار تھیں جو تعلیمی مقاصد کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ جب ڈاکٹر ڈوبوائس گھانا آئے تھے تو اس عظیم لیکن عمررسیدہ عسکریت پسند ایفرو امریکی عالم کو ڈاکٹر نکروما (Dr Nkrumah) نے بادشاہوں کی طرح رکھا اور انہیں ہر وہ چیز مہیا کی گئی جس کی انہوں نے خواہش کی۔ بیگم ڈوبوائس نے بتایا کہ ڈاکٹر ڈوبوائس کے آخری وقت میں Dr. Nkrumahان کی تیارداری کے لیے گھر آتے رہے اور آخری بار جب وہ ڈاکٹر ڈوبوائس سے مل کر گئے ہیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

گھانا میں آخری سماجی تقریب کیوبا کے سفیر عزت مآب جناب آرمانڈو انٹرالگوگون زے لز کی طرف سے دی گئی دعوت تھی۔ اگلی صبح اتوار تھا اور "میلکم ایکس کمیٹی" مجھے ہوائی اڈے تک الوداع کہنے کے لیے ہوٹل میں میری منتظر تھی۔ ہوٹل سے نکلتے وقت ہماری ملاقات کیسیئس کلے اور ان کے کچھ ہمراہیوں کے ساتھ ہوئی جو صبح کی سیر سے واپس آ رہے تھے۔ کیسیئس لمحہ بھر کے لیے ہچکچایا پھر اُس نے دبے لفظوں میں "کیسے ہو؟" قسم کا جملہ بولا۔ میں نے جواب دیا کہ میں ٹھیک ہوں۔ بعد میں مَیں نے کیسیئس کو ایک تار کے ذریعے پیغام بھیجا جس میں اُس سے کہا کہ امید ہے کہ اُسے اندازہ ہو گا کہ تمام مسلمان اُس سے کتنی محبت کرتے ہیں اور وہ کسی کی ترغیب پر ایسی کوئی بات یا کام نہیں کرے گا جس سے اُس کا تصور دُھندلا جائے۔

ہوائی اڈے پر میں نے "میلکم ایکس کمیٹی" کو الوداع کہا ہی تھا کہ پانچ سفیروں کا وفد بھی مجھے الوداع کہنے کے لیے پہنچ گیا۔ میرے پاس الفاظ ختم ہو چکے تھے۔

میری اگلی منزل مون رُوویا' لائیبیریا تھی جہاں مجھے ایک دن گزارنا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ارضِ مقدس کے عظیم تجربے کے بعد دوسری ناقابلِ فراموش یادافریقہ میں بیدار ہونے والی شعور کی وہ لہرہے جو دنیا میں اُس کے کردار کا تعین کرے گی۔

مون روویا سے مَیں ڈاکار’ سینی گال گیا جب سینیگالیوں کو ہوائی اڈے پر پتہ چلا کہ کوئی امریکی مسلمان آیا ہے تو سب قطار بنا کر کھڑے ہو گئے اور مجھ سے ہاتھ ملانے لگے۔ بہت سوں نے میرے دستخط بھی حاصل کیے۔ ایک سینیگالی نے کہا ”ہم عربی تو نہیں بول سکتے لیکن اسلام ہمارے دلوں میں ہے۔“ میں نے اُسے جواباً بتایا کہ ” ایفروامریکی مسلمانوں کی بھی بالکل یہی کیفیت ہے۔“

ڈاکار سے میں مورو کو پہنچا جہاں میں نے ایک دن سیر وسیاحت میں گزرا۔ میں نے مشہور قصبہ (Casbah) دیکھا جو ایک کچی بستی ہے۔ جہاں پر ہزارہا سیاہ فام محکوم مقامی لوگوں نے کاسابلانکا کے بعض حصوں میں سفیدفام فرانسیسیوں کی طرف سے داخلہ پر لگائی جانے والی پابندی کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح نیویارک سٹی میں واقع ہارلم کا علاقہ امریکی قصبہ بن گیا تھا۔

منگل 19 مئی 1964ء میری انتالیسویں سالگرہ کا دن تھا جب میں الجزائر پہنچا۔ ان سالوں میں بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا تھا اور بعض معاملات میں مَیں پہلے سے کہیں زیادہ تجربہ کار ہو چکا تھا۔ جب ٹیکسی ڈرائیور مجھے ہوٹل الیسٹی لے جا رہا تھا تو اُس نے مجھے ان مظالم کے متعلق بتایا جو فرانسیسیوں نے ان پر توڑے تھے اور یہ کہ اُس نے بدلہ لینے کے لیے کیا کیا، کیا۔ میں الجزائر میں گھومتا پھرتا رہا اور میں نے لوگوں میں امریکہ کے خلاف نفرت کے جذبات دیکھے جس کی وجہ جابر حکمرانوں کے ساتھ امریکی ہمدردی تھی۔ یہ سچے انقلابی لوگ تھے اور موت کے خوف سے آزاد ہو چکے تھے کیونکہ وہ ایک مدت سے موت کا سامنا کر رہے تھے۔

پَین امریکن جیٹ کی پرواز نمبر 115۔21 مئی کو چار بج کر پچیس منٹ پر سہ پہر کے وقت نیویارک کے کینیڈی ائیرپورٹ کے ٹرمینل نمبر 21 پر اتری۔ جب میں دوسرے مسافروں کے ساتھ قطار بنا کر جہاز سے اترا اور کسٹمز کی طرف بڑھا تو پچاس ساٹھ رپورٹروں اور فوٹوگرافروں کو دیکھ کر حیرانی سے یہ سوچنے لگا کہ ہمارے جہاز میں کون مشہور شخصیت آئی ہے لیکن میں وہ ”وِلن“ تھا جسے ملنے کے لیے لوگ آئے تھے۔

ہارلم میں بالخصوص اور یو۔ ایس کے دوسرے شہروں میں بالعموم 1964ء کا متوقع ردعمل شروع ہو چکا تھا۔ اخبارات میں سفیدفاموں کے آرٹیکل پر آرٹیکل چھپ رہے تھے جس میں مجھے کہیں بھی ہونے والے ”تشدد اور بغاوت“ کی اگر وجہ نہیں تو کم از کم علامت کے طور پر ضرور پیش کیا گیا تھا۔

میری زندگی کی سب سے بڑی کانفرنس میں رپورٹرز مجھ پر سوالات لے کر چڑھ دوڑے "مسٹر میلکم ایکس آپ کا "بلڈ برادرز" کے متعلق کیا خیال ہے؟ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آپ کی تنظیم سے وابستہ ہیں۔ جنہیں مبینہ طور پر تشدد کی تربیت دی گئی ہے اور جنہوں نے معصوم سفید فام لوگوں کو قتل کیا ہے؟"

"مسٹر میلکم ایکس آپ کی اپنے اُس بیان کے متعلق کیا رائے ہے جس میں آپ نے کہا ہے کہ نیگروز کو رائفل کلبز قائم کرنے چاہئیں؟"

میں نے سوالوں کے جوابات دیئے۔ مجھے معلوم تھا میں امریکہ واپس آ گیا ہوں اور سفید فام اپنے ضمیر کا بوجھ کم کرنے کے لیے ایسے سوال پوچھ رہا ہے۔ نیویارک کے سفید فام نوجوان لوگوں کو قتل کریں تو وہ ایک "سماجی" مسئلہ ہے لیکن اگر سیاہ نوجوان کسی کو قتل کرے تو طاقتی ڈھانچہ پھانسی کے جواز ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اگر کسی سیاہ فام کو کوئی قتل کر دیتا ہے تو ہمیشہ کہا جاتا ہے۔ "حالات بہتر ہو جائیں گے" جب سفید فام اپنے گھر میں اسلحہ رکھتا ہے تو آئین اُسے اپنی اور اپنے گھر کی حفاظت کا حق دیتا ہے لیکن جب سیاہ فام لوگ اپنے گھروں میں رائفلز رکھنے کی بات کرتے ہیں تو اسے "بدشگونی" سمجھا جاتا ہے۔

میں نے رپورٹرز کے سامنے ایک ایسی بات کی جس کی وہ توقع نہیں رکھتے تھے۔ میں نے کہا ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاہ فام اس طرح سے سوچنا ترک کر دیں جس طرح سفید فام نے اُسے سوچنا سکھایا ہے یعنی وہ یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کر دے کہ معاشرتی حقوق کے حصول کے لیے اُس کے پاس بھیک مانگنے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ امریکی سیاہ فام کو یہ بات سمجھنا ہو گی کہ اُس کے پاس اقوام متحدہ میں "انسانی حقوق کی خلاف ورزی" کا امریکہ کے خلاف بہت مضبوط دعویٰ ہے اور جب انگولا اور ساؤتھ افریقہ کے دعوئوں کی نظیریں موجود ہیں تو امریکہ کے پاس اپنی ہی سرزمین پر فرار کا کوئی راستہ نہیں رہ جائے گا۔

میری توقع کے عین مطابق سارا پریس مجھے اس موضوع سے ہٹانے کے لیے جُت گیا۔ مجھ سے پُوچھا گیا کہ جو مکہ سے خط لکھا گیا تھا اُس کا کیا مطلب ہے؟ میں نے جواب دیا "مجھے امید ہے کہ شہر مقدس مکہ کے حج نے ہمیں اور ہماری مسلم مسجد (Muslim Mosque) کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسلامی دنیا کے سات سو پچاس ملین مسلمانوں کے مستند مذہب سے وابستہ کیا ہے اور میں یہ بات وثوق سے کہتا ہوں کہ سیاہ فام افریقی امریکہ کے بائیس ملین سیاہ فاموں کو مدت سے بچھڑے بھائیوں کی طرح دیکھتے ہیں۔ وہ ہم سے محبت کرتے ہیں، وہ ہماری جدوجہد آزادی پر نگاہ رکھتے ہیں

اور وہ ہمیں اپنی طویل المیعاد نیند سے بیدار ہوتا دیکھ کر خوش ہیں جبکہ "نام نہاد عیسائی" سفیدفام امریکہ نے ہمیں ہمیشہ اپنے وطن اور افریقی بھائیوں سے شرمندہ ہونا سکھایا ہے۔

ہاں میں نے مکہ سے خط لکھا تھا جس میں بقول تمہارے مَیں نے سفیدفاموں کو بھی بطور بھائی قبول کیا تھا۔ اس سلسلہ میں میرا جواب یہ تھا کہ مسلم دنیا میں مَیں نے دیکھا اور محسوس کیا جس سے میرے خیالات میں کشادگی آئی کہ سفیدفام مسلمان میرے لیے حقیقی برادرانہ محبت رکھتاہے جو دوسرے مسلمان کی نسل یا رنگ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

حج نے میرے امکانات کو پھیلا دیا، اس نے مجھے ایک نئی آگہی عطا کی۔ ارضِ مقدس میں دو ہفتوں کے دوران میں نے وہ کچھ دیکھا جو انتالیس سالوں میں مجھے امریکہ میں دکھائی نہیں دیا۔ میں نے تمام نسلوں' تمام رنگوں' نیلی آنکھوں والے بلونڈز سے لے کر سیاہ جلد والے افریقیوں تک میں حقیقی بھائی چارہ دیکھا۔ ان میں اتحاد اور یگانگت ہے' وہ عبادت میں ایک ہیں۔ ان میں طبقات کے حامی نہیں ہیں نہ لبرل ہیں بلکہ وہ ان لفظوں کے معانی سے ہی واقف نہیں ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ماضی میں مَیں تمام سفیدفاموں کو قابلِ سزا کہتا رہا ہوں لیکن آئندہ مجھ سے یہ غلطی نہیں ہو گی کیونکہ اب مجھے پتہ چل چکا ہے کہ ان میں سے کچھ حقیقتاً مخلص ہیں اور سیاہ فاموں کے ساتھ بھائی چارے کے اہل ہیں۔ حقیقی اسلام نے مجھ پر واضح کیا کہ تمام سفیدفاموں کو غلط کہنا بھی اُسی طرح غلط ہے جس طرح سفیدفاموں کا تمام سیاہ فاموں کو بُرا کہنا۔

میں اس بات کا بھی قائل ہوں کہ کچھ سفیدفام امریکی ملک کو تباہی کے راستہ پر لے جانے والی نسلی منافرت کو ختم کرنے کے لیے مدد کرنا چاہتے ہیں۔

میرے رویے میں تبدیلی ارضِ مقدس میں آئی کیونکہ وہاں پر میں نے حقیقی بھائی چارے کا نہ صرف مشاہدہ بلکہ تجربہ بھی کیا۔ یہ بھائی چارہ صرف میرے ساتھ نہیں تھا بلکہ وہاں پر موجود تمام رنگوں اور تمام اقوام کے لوگوں کے مابین تھا۔ اب جبکہ میں امریکہ واپس آگیا ہوں تو سفیدفاموں کے ساتھ میرا رویہ وہی ہو گا جو کہ میرے سیاہ بھائی اور مَیں بھائی چارے کی شکل میں یہاں مشاہدہ اور تجربہ کریں گے۔ امریکہ میں مسئلہ یہ ہے کہ ایسے سفیدفام افراد کی بہت قلت ہے جنہیں "اچھا" اور "برادرانہ" کہا جا سکے۔ امریکہ میں چند اچھے سفیدفاموں کو چھوڑ کر بائیس ملین سیاہ فاموں کو ایک سو پچاس ملین سفیدفاموں سے اجتماعی طور پر معاملات طے کرنا پڑتے ہیں۔

امریکہ میں سفیدفاموں میں نسل پرستی کے بیج اتنے گہرے ہیں کہ اجتماعی طور پر وہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ دوسروں سے ”برتر“ ہیں اور اس احساس کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ قومی سطح پر سفیدفاموں کے لاشعور کا حصہ بن گئی ہیں۔ بہت سے سفید فاموں کو اپنی نسل پرستی کا احساس بھی نہیں ہوتا لیکن جونہی کوئی امتحان درپیش ہوتا ہے ان کی نسل پرستی کسی نہ کسی شکل میں سامنے آ جاتی ہے۔

سنو! امریکہ میں سفیدفاموں کی سیاہ فاموں کے خلاف نسل پرستی نے اُسے دنیابھرکے غیرسفیدفام لوگوں کے ساتھ مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے۔ سفیدفام اس داغ سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکتا اور دنیابھر کے غیرسفیدفام لوگ اس نامناسب رویے سے تنگ آ چکے ہیں۔ اسی لیے آپ کو مختلف جگہوں مثلاً ویت نام میں مشکل کا سامنا ہے اور یہاں مغربی نصف الارض میں لگ بھگ سوملین کو ایک دوسرے کے خلاف تقسیم کر دیا گیا ہے جنہیں سفیدفام نے ایک دوسرے سے نفرت کرنا اور اعتماد نہ کرنا سکھایا ہے۔ ویسٹ انڈیز' کیوبا' برازیل وینیزویلا' تمام سائوتھ امریکہ اور مرکزی امریکہ یہ سارے علاقے ان لوگوں سے بھرے ہوئے ہیں جنکی رگوں میں افریقی خون ہے حتیٰ کہ براعظم افریقہ میں سفیدفام نے سیاہ فام امریکیوں کو بھورے عربوں سے کاٹ رکھا ہے اور نام نہاد عیسائی افریقیوں کو مسلمان افریقیوں سے الگ کیا ہو اہے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس افریقی ورثے کے حامی لوگوں کو اپنے خونی رشتے کا احساس ہو جائے اور اپنے مشترک مقصد کا احساس ہو جائے تو کیا ہو گا... اگر کبھی وہ متحد ہو گئے تو؟“

اس روز صحافیوں کو مجھ سے جان چھڑا کر خوشی ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ سیاہ فام بھائی جنہیں میں افریقہ میں چھوڑ کر آیا تھا یہ محسوس کریں گے کہ میں نے موضوع سے انصاف کیا۔ رات بھر میرے گھر کا ٹیلیفون بجتا رہا۔ نیویارک اور دوسرے شہروں کے رہنے والے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر میری گفتگو سن کر مجھے مبارکباد دے رہے تھے اور لوگ جن میں زیادہ تر سفیدفام تھے یہ جاننا چاہتے تھے کہ میں دیگر جگہوں پر خطاب کرنا چاہوں گا یا نہیں۔

اگلے روز جب میں اپنی گاڑی میں جا رہا تھا تو سرخ اشارہ پر ایک کار میرے قریب آ کر رکی جسے ایک سفیدفام عورت چلا رہی تھی۔ ساتھ والی نشست پر ایک سفیدفام آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس آدمی نے ”میلکم ایکس“ کہہ کر آواز دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو اُس نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے مسکرا کر کہا ”کیا تم ایک سفیدفام سے ہاتھ ملانا پسند کرو گے؟“ ساتھ ہی اشارہ سبز ہو گیا اور میں نے اُسے کہا ”میں انسانوں سے ہاتھ ملانا برا نہیں سمجھتا کیا تم انسان ہو؟“

!

باب: 19

1965ء

سچ تو یہ ہے کہ نیگروز یعنی ایفرو امریکیوں نے امریکہ میں انصاف کے حصول کے لیے اقوام متحدہ سے رجوع کرنے کی خواہش تک نہیں کی۔ مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ وہ ایسا نہیں کریں گے کیونکہ امریکی سفیدفاموں نے سیاہ فاموں کی اتنی مکمل ذہنی تطہیر کر دی ہے کہ وہ اسے ”داخلی سماجی حقوق“ سے زیادہ بڑا مسئلہ نہیں سمجھتے۔ شاید میری زندگی میں انہیں یہ شعور حاصل نہ ہو کہ یہ ایک عالمی مسئلہ ہے۔

مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ نیگروز میرے پیچھے اندھادھند حقیقی اسلام قبول کرنے نہیں دوڑ پڑیں گے، وہ اسلام جس نے مجھے آگہی اور اتنا شعور بخشا کہ سفیدفام اور سیاہ فام حقیقی بھائیوں کی طرح مل کر رہ سکتے ہیں۔ امریکی نیگروز خصوصاً بوڑھے نیگروز عیسائیت کے جبر پر مبنی دوہرے معیار میں پوری طرح غرق ہیں۔

چنانچہ میں نے ہارلم کے مشہور آڈیوبون بال روم میں ہر اتوار کی سہ پہر یا شام کو اجتماعات کا سلسلہ شروع کیا۔ میرے خطبات میں زیادہ تعداد غیرمسلم نیگرو سامعین کی ہوتی تھی۔ میں نے ابتدا میں مسلمانوں پر زیادہ زور نہیں دیا بلکہ تمام مذاہب کے لوگوں کو دعوت دی۔

”میرا خطاب نہ مسلمانوں سے ہے نہ عیسائیوں سے، کیتھلک سے ہے نہ پروٹسٹنٹ سے ’بپٹسٹ سے نہ میتھڈسٹ سے ’ڈیموکریٹ سے نہ ری پبلکن سے ’میسن سے اور نہ ایلک سے۔ میرا خطاب امریکہ کے سیاہ فاموں اور دنیابھر کے سیاہ فاموں سے ہے کیونکہ سیاہ لوگ اجتماعی طور پر نہ صرف سماجی حقوق سے محروم ہیں بلکہ انسانی حقوق سے بھی وہ حق جو انسانی عظمت انہیں عطا کرتی ہے...“

اپنی تقریروں کے بعد جب میں گلیوں بازاروں میں لوگوں سے ملتا ان سے مصافحہ کرتا تو یں محسوس کرتا کہ وہ انتظار کرو اور دیکھو کا رویہ اپنائے ہوئے ہیں۔ میں یہ بات محسوس کرتا اور سمجھ سکتا تھا کہ وہ میرے متعلق بے یقینی کا شکار ہیں کیونکہ خانہ جنگی کے بعد کی آزادی سے آج تک سیاہ فام بہت سے بے منزل راستوں پر چل چل کر تھک چکے تھے۔ ان کے راہنمائوں نے انہیں مایوس کیا تھا۔ انہیں عیسائی مذہب نے مایوس کیا تھا۔ اس لیے سیاہ آدمی ڈراہوا اور محتاط تھا اور کشمکش میں تھا۔

اب میں اس بات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا۔ امریکہ کے نسلی مسائل سے دورارضِ مقدس میں مَیں پہلی بار امریکی سفیدفاموں کی بنیادی تقسیم کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہوا تھا کہ کس طرح ان کے رویے اور مقاصد نیگروز پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ اس زمین پر اپنے انتالیس سالوں میں شہرِ مقدس مکہ میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں خالقِ کُل کے سامنے کھڑا ہوں اور میں نے اپنے آپ کو مکمل انسان سمجھا۔

اُس ارضِ مقدس میں جب میں رات کو خراٹے لیتے ہوئے حجاج بھائیوں کے درمیان جاگ رہا تھا تو میرے ذہن میں وہ یادیں آئیں جو میں اپنی دانست میں ہمیشہ کے لیے بھول چکا تھا... میرے بچپن کی یادیں جب میں آٹھ نو سال کا چھوٹا سا لڑکا تھا۔ ہمارے گھر کے پچھواڑے لانسنگ’ مشی گن کے مضافات میں ایک سرسبز پہاڑی تھی جسے ہم ”ہیکٹر زہل“ کہتے تھے جو غالباً اب بھی وہیں ہو گی۔ مجھے یاد ہے میں اس پہاڑی کے اوپر جاکر لیٹ جاتا اور آسمان میں بادلوں کو اڑتے دیکھتا اور جاگتی آنکھوں دنیابھر کے خواب دیکھ ڈالتا اور بالکل اس کے برعکس کئی سال بعد جب میں جیل میں تھا تو میں اپنی کوٹھڑی کے بستر پر لیٹ جاتا خصوصاً جب مجھے قیدتنہائی دی جاتی جسے قدیوں کی زبان میں The Hole یعنی ہِل کہا جاتا تھا تو میں اپنے آپ کو بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے دیکھتا۔ جانے کیوں؟ لیکن ایسا ہوتا تھا اگر یہ بات میں کسی کو بتاتا تو وہ مجھے پاگل سمجھتا۔

مکہ میں بھی مجھے ایلیا محمد کے ساتھ گزارے ہوئے بارہ سال ایک فلم کی طرح یاد آتے۔ شاید کسی شخص کے لیے بھی ناممکن ہو کہ وہ ایلیا محمد پر میرے ایمان کی قوت کا صحیح اندازہ لگا سکے میں نہ صرف ان پر بطور ایک انسانی راہنما یقین رکھتا تھا بلکہ میں ان کے روحانی راہنما ہونے پر بھی یقین رکھتا تھا۔ میرا ایمان تھا کہ ان کے اندر انسانی کمزوریاں اور کوتاہیاں نہیں ہیں۔ وہ نہ کوئی غلطی کر سکتے ہیں اور نہ گناہ۔ ارضِ مقدس میں مجھے احساس ہوا کہ کسی انسان کو یہ مقام دینا کتنا خطرناک ہے خصوصاً کسی کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ ”الہامی راہنمائی“ کا حامل اور ”مامون شخص“ ہے۔

مکہ میں میرے خیالات میں وسعت آئی جو طویل خطوط میں نے اپنے دوستوں کو لکھے ان میں امریکی سیاہ فاموں کی جدوجہد اور ان کے مسائل کے متعلق اور سچائی اور انصاف کی تلاش میں میری آگہی میں جو اضافہ ہوا اس کے متعلق انہیں بتانے کی کوشش کی۔ میں نے ان کو لکھا "دوسروں کا پراپیگنڈہ میں بہت سن چکا ہوں۔ میں سچائی کی تلاش میں ہوں چاہے وہ کوئی بھی بیان کرے۔ میں انصاف کی تلاش میں ہوں چاہے وہ کسی کے بھی حق میں یا خلاف ہو۔ میں سب سے پہلے ایک انسان ہوں اور ہر اُس چیز پر اپنا حق سمجھتا ہوں جو انسانیت کے فائدے کے لیے ہے۔"

امریکی سفیدفاموں کی صحافت نے میرا یہ پیغام پہنچانے سے انکار کر دیا کہ میں نیگروز کو ایک نئی سمت دکھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چونکہ 1964 کے موسم گرما کے واقعات مسلسل نئے واقعات کو جنم دیتے رہتے تھے اس لیے مجھ پر بھی مسلسل نیگروز میں اشتعال پھیلانے کا الزام لگایا جاتا تھا۔ جب بھی ریڈیو یا ٹیلی ویژن کا مائیکروفون میرے سامنے ہوتا اور مجھ سے نیگروز میں اشتعال پھیلانے یا تشدد کو ہوا دینے کا سوال کیا جاتا تو مجھے غصہ آ جاتا۔

"جھونپڑپٹیوں میں پہلے سے موجود گھٹیا تعلیم، بری اور گندی رہائشیں اور بے روزگاری کے سماجی ڈائنامائیٹ کو آگ دکھانے کی کسی آدمی کو ضرورت نہیں۔ یہ تباہ کن مجرمانہ حالات ایک مدت سے موجود ہیں۔ انہیں ماچس لگانے کی ضرورت نہیں۔ یہ اندر ہی اندر خود ہی سلگتا رہتا ہے اور کسی بھی وقت خودبخود پھٹ پڑتا ہے..."

انہوں نے مجھے امریکہ کا "ناراض ترین نیگرو" کا لقب دیا جسے میں نے قبول کر لیا کیونکہ میں وہی کہتا تھا جو محسوس کرتا تھا۔ میں غصہ پر ایمان رکھتا تھا خود بائبل کا فرمان ہے کہ "ایک وقت غصہ کا بھی ہوتا ہے" انہوں نے مجھے تشدد کے معلّم اور مبلّغ کا لقب دیا جس پر میں نے صاف لفظوں میں کہا۔ "یہ جھوٹ ہے میں تشدد کا حامی نہیں ہوں، میں انصاف کا طلبگار ہوں۔ میرے خیال میں اگر سفیدفاموں پر نیگروز حملہ آور ہوں اور قانون کی قوتیں انہیں نیگروز سے تحفظ دینے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کریں، موزوں اقدام نہ کریں یا بے بس ثابت ہوں تو ان سفیدفاموں کو نیگروز سے اپنا دفاع خود کرنا چاہیے اور ضروری ہو تو اسلحہ بھی استعمال کرنا چاہیے۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ جب قانون نیگروز کو سفیدفاموں کے ہاتھ سے نہیں بچا سکتا تو پھر اگر ضروری ہو تو نیگروز کو اسلحہ بھی استعمال کرنا چاہیے۔"

اس پر سرخی لگائی جاتی "میلکم ایکس مسلح نیگروز کا حامی ہے۔"

آپ سوچیں گے اس میں کیا خرابی ہے؟ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ خرابی یہ ہے کہ ایک سیاہ فام سفیدفام کے مقابلے میں عملی دفاع کی بات کر رہا ہے۔ سفیدفاموں کا حق ہے کہ وہ نیگروز کو ماریں، جلائیں اور بے شک ان پر بم پھینکیں۔ اس

سے فرق نہیں پڑتا۔ ان سے کہا جائے گا "صبر سے کام لو"... "حالات بہتر ہو جائیں گے"... "یہ سارا کیا دھرا پرانے رواجوں کا ہے۔"

میں سمجھتا ہوں ظلم کے خلاف دفاع کیے بغیر ظلم سہتے چلے جانا بذات خود جُرم ہے۔ اگر یہ سارے فلسفے "عیسائی فلسفہ" یا "گاندھی فلسفہ" سکھاتا ہے تو میں انہیں معجزانہ فلسفے کہوں گا۔

میں اپنی ہر تقریر میں سفیدفاموں سے متعلق اپنے نئے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتا۔ "میں مخلص، خیر خواہ اور اچھے سفیدفام لوگوں کے خلاف نہیں بولتا۔ میں مانتاہوں کہ ایسے لوگ ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تمام سفیدفام نسل پرست نہیں ہیں۔ میں صرف اور صرف سفید نسل پرستوں کے خلاف لڑتا اور بولتا ہوں۔ میرا قطعی ایمان ہے کہ ان نسل پرستوں کے خلاف ہر ضروری ذریعہ سے لڑنا نیگروز کا حق ہے۔" لیکن اس کے باوجود سفیدفام رپورٹر مجھے "تشدد" سے وابستہ کرتے رہے اور شاید ہر انٹرویو میں مجھے اس الزام کا سامنا کرناپڑتا تھا۔

"اگر عدم تشدّد کا مطلب امریکی سیاہ فاموں کے مسائل کے حل کو ملتوی کیے چلے جانا ہے تو میں تشدّد کا حامی ہوں۔ اور اگر عدم تشدد سے مسئلہ کے حل میں تاخیر ہوتی ہو تو میں عدم تشدد کی حمایت نہیں کروں گا۔ میرے نزدیک مسئلہ کے حل میں تاخیر کوئی حل نہیں ہے یا اس بات کو میں دوسری طرح کہتا ہوں اگر سیاہ فاموں کو اس ملک میں انسانی حقوق کے حصول کے لیے تشدّد کا راستہ اختیار کرنا پڑے تومیں تشدّد کی حمایت کروں گا بالکل اُسی طرح جس طرح آئرش، پولز اوریہودی امتیازی سلوک کے خلاف کریں گے۔ نتائج سے لاتعلق ہوکر اور یہ غور کیے بغیر کہ ان کے تشدّد کا نشانہ کون بن رہا ہے۔"

سفیدفام معاشرہ سفیدفاموں کے ہاتھوں سیاہ فاموں پر توڑے جانے والے مظالم کے خلاف بات سننے سے نفرت کرتا ہے۔ بالخصوص جب وہ ایک سیاہ فام کر رہا ہو اور یقینا اسی وجہ سے مجھے اکثر "ایک انقلابی' کہا جاتا ہے اور ایسا تاثر دیا جاتا ہے جیسے میں نے کوئی جرم کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ امریکی سیاہ فاموں کوکسی حقیقی انقلاب میں ملوث ہونے کی واقعی ضرورت ہو۔ جرمن زبان میں انقلاب کو Umwalzung کہتے ہیں جس کا مطلب ہے مکمل مڑ جانا__ ایک مکمل کایاکلپ۔ مصر میں شہنشاہ فاروق کا تختہ الٹایا جانا اور صدر ناصر کا عنانِ حکومت سنبھالنا ایک حقیقی انقلاب کی مثال ہے جس کا مطلب ہے پرانے نظام کا خاتمہ اور نئے نظام کا نفاذ۔ دوسری مثال احمد بن بیلا کی سربراہی میں آنے والا الجزائر کا انقلاب ہے جس میں انہوں نے سو سال سے حکمران فرانسیسیوں کو اٹھا کر باہر پھینک دیا تو امریکہ میں اگر کوئی نیگروز کو انقلاب کے لیے کہتا ہے تو حیرت کس بات کی۔ وہ دراصل نظام کے خلاف بول رہا ہے وہ نظام کو تباہ کرنے

کی بات نہیں کر رہا۔ نیگروز کی نام نہاد ”بغاوت“ موجود نظام میں قبولیت کی درخواست ہے۔ ہو سکتا ہے ایک حقیقی نیگرو انقلاب ایک ایسی جدوجہد کی شکل اختیار کر لے جو اس ملک کے اندر سیاہ فاموں کے لیے علیحدہ ریاستوں کے تقاضے کی شکل اختیار کر لے لیکن یہ بات تو ایلیا محمد کے آنے سے پہلے بھی بہت سے افراد اور گروہ کہہ رہے تھے۔

سفید فام اس ملک کے اندر ”عدم تشدد ’ ’ کا مظاہرہ کر کے نہیں آئے حقیقت میں جس شخص کے نام کو آج ”عدم تشدد“ کی مثال بنا کر پیش کیا جاتا ہے اُس کا اپنا کہنا ہے۔

”ہماری قوم نسل کُشی کے نتیجہ میں وجود میں آئی کیونکہ اس نے یہ اصول بنا لیا تھا کہ حقیقی امریکی ”دی انڈینز“ ایک کمتر نسل ہے۔ اس سے بھی پہلے نیگروز بڑی تعداد میں ہمارے ساحلوں پر موجود تھے۔ نسلی منافرت کا داغ پہلے ہی نوآبادیاتی معاشرے کا چہرہ مسخ کر چکا تھا۔ سولہویں صدی سے آج تک نسلی برتری کی بنیاد پر جنگوں میں خون ریزی کی گئی۔ ہم شاید واحد قوم ہیں جس نے قومی پالیسی کی بنیاد پر حقیقی آبادی کو نیست ونابود کیا۔ مزید ہم نے اس افسوسناک واقعہ کو قابلِ فخر کروسیڈ کا درجہ بھی دیا۔ حقیقتاً آج بھی اس شرمناک واقعہ پر ہم نے شرمندہ ہونے یا اس سے لاتعلق ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارا ادب‘ ہماری فلمیں‘ ہمارا ڈرامہ‘ ہمارا فوک اس کی عظمت کے گن گا رہا ہے۔ ہمارے بچوں کو آج بھی اُس تشدد پر عمل پیرا ہونے کی تعلیم دی جا رہی ہے جس نے قدیم تہذیب کے حامل سُرخ جلد والے لوگوں کو بکھرے ہوئے گروہوں کی شکل میں ہانک کر بدترین زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔“

ایک اور لفظ جو سفید فام بہت کثرت سے دوہراتا ہے وہ ہے ”پرامن بقائے باہمی“ درست! لیکن سفید فام کے اپنے کرتوت کیا رہے ہیں؟ اپنے تمام تر تاریخی سفر میں وہ اپنے ایک ہاتھ میں عیسائیت کا جھنڈا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار اور بندوق تھامے رہا ہے۔

اگر آپ عیسائیت کے آغاز میں جائیں تو ہم دیکھیں گے کہ کیتھولک اِزم اپنے نظامِ مراتب کے ساتھ جیسا کہ آج کل رائج ہے پہلے پہل افریقہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے خالق وہ لوگ تھے جنہیں آج عیسائی چرچ ”صحرائی آبائ“ (The Desert Fathers) کہتا ہے۔ عیسائی چرچ کو نسل پرستی کا مرض یورپ میں داخل ہونے کے بعد لاحق ہوا۔ جب عیسائی چرچ صلیب کا عَلم اٹھائے دوبارہ افریقہ میں داخل ہوا تو انہوں نے اُسے فتح کرنے کے لیے قتل وغارت‘ استحصال‘ لوٹ مار‘ آبروریزی اور ظلم وتشدّد کا راستہ اختیار کیا تاکہ سفید فام کی برتری دکھائی جا سکے۔ اس ننگی طاقت کے استعمال سے سفید فام نے اپنے آپ کو عالمی لیڈرشپ کے مقام پر فائز کیا۔ وہ روحانی طور پر مکمل گمراہی کا شکار تھا اور دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ لیڈرشپ کا حقیقی معیار ہر خطے کے لیے صرف اور صرف روحانی ہوتا ہے۔ انسانوں کو

صرف روحانی طور پر راغب کیا جا سکتا ہے جبکہ طاقت سے انہیں صرف مجبور کیا جا سکتا ہے۔ محبت روحانی قوت سے پیدا ہوتی ہے طاقت سے صرف بے چینی پیدا ہوتی ہے۔

میں ان نسل پرستوں سے سو فیصد متفق ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ کوئی سرکاری قانون زبردستی بھائی چارہ لاگو نہیں کر سکتا۔ اس مسئلہ کا حقیقی حل مذہب کے پاس ہے نسلوں میں بٹے ہوئے امریکہ میں اسلام کی شدید ضرورت ہے۔ خصوصاً امریکی سیاہ فاموں کو سوچنا چاہیے کہ وہ امریکہ کے انتہائی پرجوش عیسائی رہے ہیں لیکن اس سے انہیں کیا مِلا اور سچ پوچھیں تو سفیدفاموں کے ہاتھوں اور سفیدفاموں کی تشریح وتوضیح کے بعد اس دنیا کو عیسائیت سے کیا ملا؟ اِسی نے دنیا کی دوتہائی غیرسفید آبادی کو بغاوت پر مجبور کیا۔ آج یہ دوتہائی آبادی ایک تہائی عالمی سفیداقلیت کو اپنے علاقوں سے نکل جانے کا کہہ رہی ہے اورجہاں جہاں سے یہ نکل رہے ہیں وہاں وہاں غیرسفیدفام لوگ اپنے حقیقی مذہب کی طرف لوٹ رہے ہیں جسے فاتح سفیدفام ”الحاد“ کہتا رہا ہے۔ صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ایک ہزار سال سے سفیدفاموں کی عیسائیت کے مقابلے میں کھڑا چلا آتا ہے۔ صرف اسلام ہی اس سفید عیسائیت کو اس کی حد میں رکھا سکا ہے۔ افریقی اور دیگر اقوام اسلام اور اپنے آبائی مذاہب کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ ایشیائی لوگ ہندومت' بدھ مت اور اسلام کی طرف واپس آ رہے ہیں جس طرح عیسائیت کی جنگ نے مشرق کا رُخ کیا تھا آج اُسی طرح اسلام مغرب کا رُخ کر رہا ہے۔ مشرق میں ایشیا کے دروازے عیسائیت کے لیے بند ہو چکے ہیں۔ افریقہ تیزی سے اسلام کی طرف راغب ہو رہا ہے اور یورپ کے لوگ تیزی کے ساتھ غیرعیسائی ہو رہے ہیں۔ آج یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ امریکہ کی عیسائی تہذیب' جس نے دنیا میں صرف سفیدنسل کو ترویج دی ہے' عیسائیت کا آخری مضبوط ترین قلعہ ہے۔

اگر ایسا ہی ہے اگر یہ نام نہاد عیسائیت' جس پر امریکہ میں عمل کیا جاتا ہے' یہی بہترین عیسائیت ہے تو کسی صحیح العقل شخص کو یہ دیکھنے کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے کہ عیسائیت کا انجام قریب ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ پروٹسٹنٹ علماء اپنی تحریروں میں ”زمانہ مابعد عیسائیت“ کی ترکیب استعمال کر رہے ہیں اور اس سے اُن کی مراد ”آج“ ہے؟

عیسائی چرچ کی ناکامی کی واحد وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ نسل پرستی کی جنگ میں ناکامی ہے۔ یہ وہی پرانی ”جیسا بؤو گے ویسا کاٹو گے“ کہانی ہے۔ عیسائی چرچ نے بھونڈے طریقے سے نسل پرستی بوئی اور آج نسل پرستی ہی کاٹ رہا ہے۔ سال 1965ء میں آپ اتوار کی صبح کسی عیسائی اجتماع میں جائیں تو آپ کو دروازے پر ڈیکنز نگہبانی کرتے ہوئے ملیں

گے جو سیاہ فام عبادت گزاروں سے کہہ رہے ہوں گے کہ "تم اس خانہ خدا میں داخل نہیں ہو سکتے۔" اور اس سے بڑا اور افسوسناک طنز کیا ہو گا کہ سینٹ آگسٹائن' فلوریڈا یعنی وہ شہر جس کا نام بھی اُس افریقی سیاہ فام سینٹ کے نام پر رکھا گیا جس نے کیتھلک ازم کو تباہی سے بچایا۔ حال ہی میں خونی نسلی فسادات کی آماجگاہ بنا رہا۔

مجھے یقین ہے کہ اللہ اس نام نہاد سفیدفام عیسائی معاشرے کو ان جرائم پر پچھتانے اور ان کا کفارہ ادا کرنے کا آخری موقع دے رہا ہے جو اُس نے دنیا کے غیر سفیدفام لوگوں کو غلام بنا کر اور ان کا استحصال کر کے کیے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ نے فرعون کو پچھتانے کا موقع دیا تھا لیکن فرعون نے پسے ہوئے لوگوں کے ساتھ انصاف کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ہم سب جانتے ہیں کہ فرعون بالآخر تباہ ہو گیا۔

کیا سفیدفام امریکہ کو سیاہ فام لوگوں کے خلاف کیے ہوئے جرائم پر کوئی پچھتاوا ہے؟ کیا سفیدفام امریکہ میں پچھتاوے اور کفارے کی اہلیت ہے؟ کیا پچھتاوے اور کفارے کی اہلیت اکثر یا نصف یا ایک تہائی سفید امریکی معاشرے میں ہے؟ بہت سے سیاہ فام لوگ جو اس کا شکار ہوئے ان جرائم کو معاف کرنے اور بھولنے کے قابل ہیں لیکن زیادہ تر امریکی سفیدفام لوگ کسی قسم کے کفارے کے لیے یا سیاہ فاموں سے انصاف برتنے میں سنجیدہ نظر نہیں آتے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ سفیدفام معاشرہ صدیوں تک کروڑوں انسانوں کو غلام بنائے رکھنے' آبروریزی کرنے' غیر انسانی سلوک کرنے اوران پر ظلم وستم کرنے کا کفارہ ادا کر بھی کیسے سکتا ہے۔ انصاف کرنے والا اللہ' سیاہ فاموں کی محنت' ان کی زندگیاں' ان کی شناختیں' ان کی ثقافت' ان کی تاریخ حتیٰ کہ ان کی انسانی عظمت لوٹنے کا کیا کفارہ مانگے گا؟

ایک اجتماعی کافی کا کپ' ایک تھیٹر' عوامی بیت الخلاء ایسے منافقانہ یک جہتی کے اقدامات کفارہ نہیں کہلا سکتے۔

امریکہ میں کچھ مدت گزارنے کے بعد میں دوبارہ بیرون ملک چلا گیا اور میں نے مشرق وسطیٰ اور افریقہ میں اٹھارہ ہفتے گزارے۔ اس بار جن عالمی سربراہان سے میری نجی ملاقات رہی ان میں مصر کے صدر جمال عبدالناصر' تنزانیہ کے صدر جولیس کے نائرے' نائیجیریا کے صدر ناموئی آزیکیوی' گھانا کے ڈاکٹر گوامے نکروما' گنی کے صدر سیکوتورے' کینیا کے صدر جوموکنیاٹا اور یوگنڈا کے وزیراعظم ڈاکٹر ملٹن ابوٹے شامل تھے۔

اس کے علاوہ میری ملاقاتیں افریقہ' عرب اور ایشیا کے مسلم اور غیر مسلم مذہبی راہنمائوں سے بھی ہوئیں اور ان تمام ممالک میں مَیں نے مختلف شعبوں اور مختلف پس منظر رکھنے والے ایفرو امریکیوں اور سفید فاموں سے بھی بات چیت کی۔

ایک افریقی ملک میں ایک ایسا سفیدفام امریکی سفیر بھی تھا جو پورے افریقہ میں انتہائی قابل احترام امریکی سفیر گردانا جاتا تھا اور یہ بات مجھے ایک اعلیٰ سطح کے افریقی راہنما نے بتائی۔ میں نے اس سے ایک سہ پہر طویل ملاقات کی۔ میں نے اُسے بتایا کہ لوگ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ جب اُس نے مجھ سے کہا کہ جب سے وہ براعظم افریقہ میں ہے وہ کبھی نسل کی بنیاد پر نہیں سوچتا۔ وہ صرف انسانوں سے معاملات کرتا ہے ان میں رنگوں کا امتیاز کیے بغیر تو مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ رنگ کے فرق کی نسبت زبان کے فرق سے زیادہ آگاہ تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جب میں امریکہ جاؤں گا تو مجھے رنگ کے فرق سے بھی آگاہی ہوجائے گی۔

میں نے عرض کی کہ ”آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نسل پرست امریکی سفیدفام آدمی نہیں ہے بلکہ امریکہ کا سیاسی’ معاشی اور سماجی ماحول ایسا ہے جو سفیدفام آدمی کے اندر خودبخود نسل پرستی کی نفسیات کی نشوونما کرتا ہے۔“ اُس نے مجھ سے اتفاق کیا۔

ہم دونوں نے اس بات پر بھی اتفاق کیا کہ امریکی معاشرے نے یہ بات امریکہ میں رہنے والے انسانوں کے لیے تقریباً ناممکن بنا دی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے رنگ کو نظرانداز کیے بغیر باہم مل جل سکیں اور ہم نے یہ بات بھی کی کہ اگر امریکہ میں سے نسل پرستی ختم ہو سکے تو امریکہ میں امیر ہی نہیں غریب بھی حقیقی انسانوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔

سفیر کے ساتھ اس گفتگو نے مجھے ایک نئی آگہی دی جو مجھے اچھی بھی لگی وہ یہ کہ سفیدفام فطری طور پر برا نہیں ہے لیکن امریکہ کا نسل پرست معاشرہ اُسے بداعمالی کے لے مجبور کرتا ہے۔ اس معاشرے نے ایک ایسی نفسیات کو پیدا کیا اور اُسے نشوونما دی ہے جس سے اس کا انتہائی پست اور گھٹیا پہلو ہی سامنے آتا ہے۔

افریقہ میں ہی میری ایک اور سفیدفام سے اس کے بالکل برعکس گفتگو ہوئی وہ انہیں منفی پہلوئوں کی تجسیم تھا جن پر میری اور سفیر صاحب کی گفتگو ہوئی۔ اپنے دورے کے دوران مجھے اچھی طرح علم تھا کہ میری مستقل نگرانی ہورہی ہے اور میری نگرانی کرنے والا جو خدا خبر کسی ایجنسی کا آدمی تھا بہت ہی واہیات اور اناڑی تھا۔ میرے لیے کسی ہوٹل میں اس کی نگرانی کے بغیر کھانا کھانا بھی دشوار ہو گیا۔ ایک صبح میں غصہ سے اپنی ناشتہ کی میز سے اٹھا اور سیدھا اس کے پاس چلا گیا اور اُسے کہا کہ میں اچھی طرح جانتاہوں کہ وہ میرا پیچھا کر رہا ہے اور یہ کہ اگر وہ کچھ پوچھنا چاہتا ہے تو مجھ ہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتا۔ اُس نے آگے سے کچھ بڑبڑانے کی اور حیرانی کا تاثر دینے کی کوشش کی۔ میں نے اُس سے کہا کہ تم ایک بے وقوف انسان ہو نہ مجھ سے واقف ہو نہ میرے مقصد سے۔ تم ان لوگوں میں سے ہو

جو دوسروں کے خیالات کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ آدمی کی نوکری جو بھی ہو' کم از کم اُسے خود سوچنے کے لائق تو ہونا چاہیے۔ اس بات سے اُسے کافی صدمہ ہوا۔ اُس کے بقول میں اینٹی امریکہ بلکہ غیر امریکی باغی' بد عتی اور شاید کمیونسٹ تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ تمہاری انہی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم مجھ سے کتنے واقف ہو۔ میں نے اُسے کہا کہ ایف۔بی۔آئی' سی۔آئی۔اے یا کوئی اور اگر مجھ پر کوئی الزام لگا سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف کشادہ ذہنی کا ہے۔ میں سچ کی تلاش میں ہوں اور میں ہر چیز کو معروضی طور پر اُس کے اپنے معیار پر پرکھتا ہوں۔ میں تنگ ذہنی اور معاشرتی گھٹن کے خلاف ہوں۔ میں ہر آدمی کے خیالات کا احترام کرتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ ہر آدمی مجھے بھی یہ حق دے۔

اس کے بعد یہ جاسوس مجھ سے "سیاہ فام مُسلم" مذہبی عقائد کے متعلق پوچھنے لگا۔ میں نے اُس سے جواباً پوچھا کہ کیا اس کے ہیڈکوارٹرز نے اسے یہ بتانے کی زحمت نہیں کی کہ میرا رویہ اور خیالات تبدیل ہو چکے ہیں۔ اب میں جس اسلام پر یقین رکھتا ہوں یہ وہ اسلام ہے جس کی تعلیم مکہ میں دی جاتی ہے اور اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمدؐ بن عبداللہ کی ولادت شہر مقدس مکہ میں چودہ سو سال قبل ہوئی، وہ اللہ کے آخری پیغمبر ہیں۔

میں نے اپنی توقع کے عین مطابق اُس جاسوس کو اپنی باتوں سے چونکا دیا۔ میں نے اُسے کہا کہ تم اپنے نام سے یہودی لگتے ہو۔ اُس نے حیرانی سے پوچھا کہ مجھے اس کا اندازہ کیسے ہوا؟ میں نے جواب دیا کہ یہ میرے تجربے کا نتیجہ ہے کہ میں مخاطب کے مشتعل رویے کی سطح سے اس کو شناخت کر لیتا ہوں۔ مجھے یہودیوں سے یہ اختلاف ہے کہ اکثر یہودی منافق ہوتے ہیں اور امریکی سیاہ فاموں سے دوستی کا صرف جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں اور جب میں ان کے متعلق سچ بولتا ہوں تو مجھ پر "یہودی مخالف" کا الزام لگایا جاتا ہے۔ میں اس بات کا اعتراف کرتاہوں کہ نیگروز کی سماجی حقوق کے حصول کی تحریکوں میں علمی' زبانی اور معاشی مدد کرنے والوں میں یہودی دیگر سفیدفاموں سے آگے ہیں لیکن مجھے یہ بھی علم ہے کہ یہودیوں کا یہ کردار ایک سوچی سمجھی اور بہت احتیاط سے تیار کی گئی منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔ امریکہ میں جتنا تعصب کالوں کے خلاف ہو گا اتنی ہی یہودی مخالفین کی توجہ یہودیوں سے ہٹی رہے گی اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ شمال میں سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ یہودی ہی سیاہ فاموں سے لاتعلقی اختیار کرتے ہیں۔ اگر آپ ہر اُس پہلو کا بغور جائزہ لیں جہاں جہاں سیاہ فام احساس محرومی کا شکار ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ اگر یہودی ان شعبوں کے مالک نہیں ہیں تو غالب حصہ دار ضرور ہیں کیا وہ اپنے اختیارات کو خلوص سے استعمال کرتے ہیں؟
ہرگز نہیں۔ اور نیگروز سے ان کے سلوک کا ثبوت چاہیے ہو تو آپ دیکھیں کہ یہودی آبادی کی اکثریت والے علاقوں

میں اگر کوئی نیگرو آ بسے تو کیا ہوتا ہے؟ سفید فاموں میں سب سے پہلے علاقہ چھوڑ کے جانے والا کون ہو گا؟ یہودی۔ اور عام طور پر ان حالات میں اگر کوئی سفید فام وہاں ٹھہرے گا تو وہ یا آئرش کیتھلک ہو گا یا اطالوی۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہودیوں کو تو ابھی معاشرے میں اپنی “قبولیت” کے مسئلہ کا سامنا ہے۔ اس بات پر مجھ پر ہر طرف سے “یہودی مخالف” ہونے کا الزام لگایا جائے گا لیکن میں کیا کروں سچ تو سچ ہی رہے گا۔

میرے بیرون ملک دورے کے دوران اس بار امریکی منظر پر سیاست کا غلبہ رہا۔ قاہرہ اور دوسرے علاقوں میں مجھ سے امریکی صحافی بذریعہ ٹیلیگرام مسلسل پوچھتے رہے کہ میں الیکشن میں کس کی حمایت کروں گا۔ جانسن کی یا گولڈواٹر کی؟ میں نے جواب دیا کہ جہاں تک امریکی سیاہ فاموں کا معاملہ ہے تو ان کے لیے یہ دونوں ایک سے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی سیاہ فام سے پوچھے کہ تم جانسن “لومڑی” کو پسند کرتے ہو یا گولڈواٹر “بھیڑیئے” کو۔

کنزرویٹ ازم کا امریکی سیاست میں مطلب ہے کہ “نیگروز کو ان کی اوقات میں رکھا جائے۔ اور “لبرل ازم کا مطلب ہے کہ نیگروز کو رکھو تو ان کی اوقات میں ہی، لیکن انہیں اچھے سلوک کا جھانسہ دیئے رکھو اور زیادہ وعدوں سے انہیں مزید بے وقوف بنائے جاؤ۔” امریکی سیاہ فام کو صرف یہ چننا ہے کہ اُسے کون کھائے گا “لبرل” لومڑی یا “کنزرویٹو” بھیڑیا۔ کیونکہ بالآخر دونوں نے اُسے ہی کھانا ہے۔ میں جانسن کی نسبت گولڈواٹر کا زیادہ حمایتی نہیں تھا لیکن میں سمجھتا تھا کہ بھیڑیے کی کھوہ میں رہنے کا فائدہ یہ ہے کہ آپ کو اپنے مقام کا اندازہ ہو گا اور آپ لومڑی کی مکاری سے بچتے ہوئے بھیڑیے کے خطرے کا زیادہ شعور کے ساتھ سامنا کر سکیں گے۔ بھیڑیئے کی غراہٹ مجھے چوکنا رکھتی ہے اور جہدللبقا پر مائل کرتی ہے، جبکہ لومڑی کی مکاری اور عیاری مجھے بے وقوف بنا کر غافل کر سکتی ہے۔ میں آپ کو لومڑی کی مکاری کی ایک مثال دیتا ہوں جب ڈلاس میں قتل کے نتیجہ میں جانسن صدر بنا تو اس نے سب سے پہلی ملاقات کس کے ساتھ کی؟ وہ تھا ان کا بہترین دوست جارجیا رچرڈ رسل۔ جانسن ہر شخص سے یہ کہتے رہے تھے کہ سماجی حقوق ایک بہت بڑا اخلاقی مسئلہ ہے اور اُس کا بہترین دوست جنوب کا وہ نسل پرست تھا جس نے سماجی حقوق کی مخالفت کی سربراہی کی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شیرف بینک ڈکیتی کے خلاف بیان بھی دے اور “جیسی جیمز” اس کا بہترین دوست بھی ہو۔

بطور انسان میں گولڈواٹر کی بے باکی کا احترام کرتا ہوں کیونکہ آج کی سیاست میں اس کا فقدان ہے۔ وہ ایسا نہیں کرتا کہ نسل پرستوں کے ساتھ مل کر سازشیں بھی کرتا رہے اور اتحاد والوں کو دیکھ کر مسکراتا بھی رہے۔ اس نے سیاہ فاموں کو صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ان کے لیے نہیں ہے اور یہ بات سیاہ فاموں کی ترقی کے لیے ہمیشہ بہتر رہی ہے

کہ انہیں معلوم ہو کہ انہیں کسی نظام کے خلاف اٹھنا ہے۔ شمال کے نیگرو روباہ صفت لبرلز کی لوریاں سن سن کر بھکاری بن گئے تھے جبکہ جنوبی نیگرو دانت نکوستے ہوئے ایماندار سفیدفام کے خلاف آزادی کی جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جبکہ شمال والوں کو یہ بات سمجھنے میں بہت دیر لگی۔ مختصر یہ کہ میرا انہیں خیال تھا کہ گولڈواٹر سیاہ فاموں کے لیے جانسن سے بہتر ہے یا جانسن گولڈواٹر سے بہتر ہے۔ میں انتخابات کے وقت یونائیٹڈ سٹیٹس میں نہیں تھا لیکن اگر میں ہوتا تو نہ میں خود فیصلہ کر پاتا۔ نہ میں کسی سیاہ فام کو مشورہ دے پاتا کہ کسے ووٹ دینا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جانسن وائٹ ہاؤس پہنچ گیا جس میں بنیادی حصہ سیاہ فام ووٹرز کا تھا۔ اگر اس کی جگہ گولڈواٹر جیتتا تو کم از کم سیاہ لوگوں کو یہ تو علم ہوتا کہ ان کا سابقہ ایک بھیڑیئے سے ہے نہ کہ ایک لومڑی سے جو ان کو احساس ہونے تک آدھا کھا چکی ہو گی۔

امریکی نیگرو کے لیے سیاہ فام پرست تنظیم کے انعقاد کی خاطر مجھے بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھ سے پوچھا جاتا سیاہ قوم پرستی کیوں؟ میں جواباً کہتا کہ مقابلے سے بھرپور امریکی معاشرے میں سیاہ فاموں کی یکجہتی سے پہلے سفید اور سیاہ یکجہتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ کو یاد ہو کہ بچپن ہی میں مَیں مارکس گاروی کی سیاہ قوم پرستی پر مبنی تعلیمات سے آگاہ ہو چکا تھا اور جس کے نتیجہ میں میرا باپ قتل ہوا تھا اور ایلیا محمد کا پیروکار ہونے کے باوجود میں اس بات کا سخت حامی ہوں کہ سیاہ قوم پرستانہ سیاسی’ معاشی اور سماجی فلسفوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ سیاہ فاموں کے اندر نسلی عظمت اور وہ اعتماد پیدا کریں جو آج بھی اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کر سکتا ہے اور ماضی کے داغوں کو دھو سکتا ہے اور اپنے موقف پر قائم رہنے کا حوصلہ دے سکتا ہے۔

لیکن اس تنظیم کے قیام میں میرا ابتدائی عوامی تاثر اور میرا سابق نام نہاد “سیاہ مسلم” ہونے کا تاثر سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ میں اپنی شناخت کو بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری ناراضی کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ارضِ مقدس کے مشاہدے نے مجھے یہ سمجھایا تھا کہ غصہ اور اشتعال انسانی بصیرت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ مجھے جتنا بھی فارغ وقت ملتا میں ہارلم میں اپنے واقفوں کے ساتھ گفتگو کی کوشش کرتا۔ میں نے بہت سی تقاریر بھی کیں جن میں مَیں نے کہا “حقیقی اسلام نے مجھے یہ بات سمجھائی ہے کہ انسانی معاشرے اور انسانی گروہ کی تکمیل کے لیے تمام مذہبی’ سیاسی’ معاشی’ نفسیاتی اور نسلی اجزاء کا باہم ہونا ضروری ہے۔ جب سے مکہ میں مجھے سچائی ملی ہے تب سے میرے بہترین دوستوں میں ہر طرح کے لوگ شامل ہیں ان میں عیسائی’ یہودی’ بدھ’ ہندو’ لاادری اور حتیٰ کہ دہریے بھی۔ میرے دوستوں میں کیپیٹلسٹ’ سوشلسٹ اور کمیونسٹ شامل ہیں۔ میرے دوستوں میں کچھ

اعتدال پسند' قدامت پسند اور شدت پسند بھی ہیں حتیٰ کہ ان میں کچھ "انکل ٹام" بھی ہیں۔ آج میرے دوستوں میں کالے 'بھورے' سرخ' زرد اور سفید شامل ہیں۔"

میں ہارلم کے سامعین سے کہتا جب تک انسانیت تمام مخلوقات کے خالق ایک اللہ کے سامنے نہیں جھکے گی تب تک اِسے وہ "امن" نصیب نہیں ہو گا جس کے متعلق باتیں تو بہت کی جاتی ہیں مگر کام بالکل نہیں کیا گیا۔ امریکہ میں نسلی سطح پر ہمیں سفید فام کی نسل پرستی کے خلاف سیاہ فام کی جدوجہد کو ایک انسانی مسئلہ کے طور پر لینا ہو گا اور منافقانہ سیاست اور پراپیگنڈہ کو بھولنا ہو گا۔ دونوں نسلوں کو بطور انسان امریکہ کے اس انسانی مسئلہ کے حل کے لیے اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو سمجھنا ہو گا۔ اچھے سفید فام لوگوں کو عملی اور براہ راست طور پر نسل پرست سفیدفاموں سے لڑنا ہو گا اور سیاہ فاموں کو اپنے اندر مساوی حقوق کے ساتھ ساتھ مساوی ذمہ داریوں کا شعور بھی پیدا کرنا ہو گا۔

مجھے معلوم تھا کہ بہت سے سفیدفام لوگ حقیقتاً امریکی نسل پرستی کے مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ بہت سے سفیدفام بھی نیگروز ہی کی طرح فرسٹریٹڈ ہیں۔ میرے پاس بعض اوقات ایک دن میں سفیدفاموں کے پچاس پچاس خطوط آتے ہیں۔ اجتماعات میں خطاب کے بعد سفیدفام سامعین مجھے گھیر لیتے اور پوچھتے "ایک مخلص سفیدفام شخص کیا کر سکتا ہے؟" ایسی ہی ایک طالبہ جو نیوانگلینڈ کالج میں زیرِتعلیم تھی، نیویارک آئی اور ہارلم میں "نیشن آف اسلام" کے ریستوران میں مجھ سے ملی تھی۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ اُس کے کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے لیکن آج مجھے اپنے کہے پر دکھ ہے۔ کاش مجھے اُس کا نام پتہ معلوم ہوتا تو میں اُسے اُس کی ذمہ داری سے آگاہ کر سکتا۔

سب سے پہلی بات جو میں سفیدفاموں کو بتاتا ہوں یہ ہے کہ جہاں تک میری "بلیک نیشنلسٹ آرگنائزیشن" کا تعلق ہے، اُس کا تعلق ایفروامریکن اتحاد سے ہے۔ اُس میں کوئی سفیدفام شامل نہیں ہو سکتا کیونکہ میرا خیال تھا کہ ایسی سیاہ فاموں کی تنظیموں میں شمولیت سفیدفام محض اپنے ضمیر کی خلش دور کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ وہ ہمارے اردگرد اس لیے منڈلاتے رہتے ہیں تاکہ ہمیں یقین دلا سکیں کہ وہ ہمارے ساتھ ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِس سے امریکہ کا نسل پرستی کا مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ انہیں اس مسئلہ کے حل کے لیے سیاہ فام مظلوموں کی صف میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی لڑائی کا میدان وہ ہے جہاں حقیقت میں نسل پرستی کا زہر موجود ہے یعنی اُن کے اپنے ہم نسل گروہ۔ "سفیدفام" اگر خلوص کے ساتھ اس کام کو مکمل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے سفیدفام ساتھیوں کے

درمیان کام کرنا ہوگا۔ جب میں یہ کہتا ہوں سیاہ فام تنظیموں میں سفیدفاموں کی موجودگی سے یہ تنظیمیں کم موثر ہو جاتی ہیں تو اس سے مراد مخلص سفیدفاموں کی مخالفت نہیں ہوتی۔ دراصل ان کی موجودگی سے نیگروز کی خود دریافتی کا عمل سست پڑ جاتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے طبقہ میں اپنے جیسے لوگوں میں اپنے لیے کام کر کے سیکھ سکتے ہیں نہیں سیکھ پاتے۔

میں کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتالیکن جو سفیدفام ضرورت سے زیادہ نیگروز سے وابستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں یا ان کے طبقوں میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں مجھے مشکوک لگتے ہیں۔ میں ان سفیدفاموں پر بھی اعتماد نہیں کرتا جو ہر وقت نیگروز کو اپنے ساتھ نتھی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس احساس کا تعلق ہارلم میں گزرے اٹھائی گیری کے سالوں کے تجربات سے ہو' جب نشے میں دھت سفیدفام کسی نیگرو کو یہ کہتا تھا “میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ہی جیسے انسان ہو۔” پھر وہ اپنی ٹیکسی میں یا سیاہ لیموزین میں بیٹھ کر اپنے گھر یا دفتر چلا جاتا جہاں سیاہ فاموں کی حیثیت نوکر اور خادم سے زیادہ نہیں ہوتی تھی اور جب کبھی کوئی سفیدفام کسی سیاہ فام تنظیم کا رکن بنتا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ بہت جلد سیاہ فام اس پر انحصار کرنے لگیں گے اور اس سے قبل کہ آپ کو پتہ چلے سفیدفام اپنی دولت کے بل بوتے پر حقیقی اختیارات کا مالک بن جائے گا۔

میں مخلص سفیدفاموں سے گزارش کرتا ہوں کہ ہمارے ساتھ مل کر کام کریں لیکن ہر آدمی اپنے طبقے میں کام کرے۔ ایک سفیدفام فرد ہی اپنے جیسے دوسرے سفیدفام تلاش کر سکتا ہے وہ چاہیں تو اپنے گروہ بنا کر دوسرے نسل پرستوں پر کام کر سکتے ہیں۔ سفیدفاموں کو چاہیے کہ وہ جائیں اور دوسرے سفیدفاموں کو عدم تشدد کا سبق سکھائیں۔

ہم اپنے معاون سفیدفاموں کا مکمل احترام کریں گے۔ اس کا سہرا اُنہیں کے سر بندھے گا۔ اس دوران ہم اپنے طبقے کے اپنے جیسے سیاہ فاموں کو اپنے انداز میں یہ سکھائیں گے کہ اُنہیں اپنی مدد آپ کرنا ہو گی۔ اس طرح مخلص سفیدفام اور مخلص سیاہ فام الگ الگ رہتے ہوئے بھی دراصل مشترک کام کر رہے ہوں گے اور اس باہمی خلوص سے ہم امریکی ضمیر کو نجات کا راستہ دکھانے میں کامیاب ہو سکیں گے اور یہ نجات کا راستہ سیاہ فاموں کو انسانی حقوق اور عزت حاصل ہونے تک نہیں ملے گا۔ ایسے بامعنی اقدامات جن کے پیچھے مخلصانہ جذبات جن کی بنیاد انسانیت اور اخلاقی ذمہ داری پر ہو۔ اس نسلی تباہی سے امریکہ کو بچا سکتے ہیں بصورت دیگر یہ نسلی منافرت کی آگ روز بروز بڑھتی جائے گی اور اس کا الزام مجھ پر یا کسی اور سیاہ فام نام نہاد وانتہاپسند پر دھرنے سے یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہو گا۔

کبھی کبھی میں یہ سوچنے کی جرات کرتا ہوں کہ شاید ایک روز تاریخ تسلیم کرے گی کہ میری آواز جس سے سفیدفام کے غرور اور سکون کو چوٹ لگی نے امریکہ کو ایک بہت مہلک تباہی سے بچا لیا۔ ہمارا مقصد ایک ہی ہے چاہے اس میں اتنا تضاد ہی کیوں نہ ہو جتنا میرے اور ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کے عدم تشدد کے مارچ میں ہے۔ جس میں کمزور سیاہ فاموں پر سفیدفاموں کے ہاتھوں توڑے جانے والے مظالم بطور تمثیل پیش کیے گئے تھے اور ملک میں موجود نسلی منافرت کی فضا کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ سیاہ فاموں کے مسائل حل کرنے کے خواہشمند ”انتہاپسندوں“ میں سے کون شخصی طور پر مہلک تباہی سے دوچار ہو گا یا ہو سکتا ہے۔ ”عدم تشددپسند“ ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ یا نام نہاد ”تشددپسند“ یعنی میں۔

آج میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں جلدی میں کر رہا ہوں۔ کسی آدمی کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق کاموں کی تکمیل کر سکے کیونکہ خاص طور پر میری زندگی نے مجھے زیادہ دیر کہیں ٹھہرنے نہیں دیا۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ میری تمام زندگی غیرمتوقع تبدیلیوں کی آماجگاہ رہی ہے۔ میں اس حقیقت کو سامنے رکھتا ہوں کہ کسی لمحے ’کسی دن‘ کسی رات مجھے موت آ سکتی ہے۔ خصوصاً جب سے میں نے بیرون ملک دورہ کیا ہے۔ میں حالات کی نوعیت کو سمجھ رہا ہوں اور مجھے چند باوثوق ذرائع سے کچھ معلومات بھی حاصل ہوئی ہیں۔ دیگر لوگوں کے برعکس مجھے موت سے کوئی خوف نہیں ہے۔ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ میں بڑھاپے تک جیوں گا۔ مسلمان ہونے سے پہلے جب میں جھونپڑپٹیوں کے جنگل میں ایک اُچکا تھا اورجب میں بطور مجرم جیل میں تھا تو یہ بات ہمیشہ میرے ذہن میں رہی کہ ایک روز مجھے بہت بے رحمی سے موت کی نیند سُلا دیا جائے گا۔ سچ پوچھیں تو قتل ہونا ہماری وراثت رہی ہے۔ میرا باپ اور اُس کے بہت سے بھائی تشدد کے نتیجہ میں جان بحق ہوئے اور میرے باپ کے مرنے کی وجہ اُس کا اعتقاد تھا اور اگر اس پہلو سے دیکھیں تو جو کچھ میرے نظریات ہیں اور جو میرا مزاج ہے اور اُس پر مزید اپنے نظریات سے جو میری سوفیصد وابستگی ہے ان سب کو دیکھتے ہوئے یہ بات ناممکن ہے کہ میں بڑھاپے کی عمر تک پہنچوں۔

میں نے اس کتاب کو اسی لیے اتنا وقت دیا ہے اور جس ایمانداری کے ساتھ اپنے حالات زندگی بیان کیے ہیں۔ ان کے پیش نظر میں محسوس کرتا اور امید رکھتا ہوں کہ اس کا معروضی مطالعہ کچھ نہ کچھ سماجی اہمیت کا حامل ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی معروضی قاری یہ بات سمجھ سکے گا کہ اُس امریکی معاشرے میں جہاں میں ایک سیاہ فام نوجوان کے طور پر پلابڑھا وہاں میرا انجام جیل ہونا ناگزیر تھا اور ہزاروں سیاہ فام نوجوانوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ قاری یہ بھی محسوس کرے گا کہ جب میں نے سنا کہ ”سفیدفام ہی اصل شیطان ہے“ اور اسے اپنے تجربات کی

روشنی میں جانچا تو میرا اثباتی ردعمل بھی جائز تھا اور اگلے بارہ سال میں نے اسی پیغام کو پھیلانے کے لیے وقف کر دیئے۔ قاری کو میری زندگی کے مطالعہ سے جھونپڑپٹی کی پیداوار ایک نیگرو کی زندگی کی صحیح تصویر بھی دیکھنے کو ملے گی۔ ان جھونپڑپٹیوں میں بائیس ملین امریکی نیگروز کی زندگیاں اور خیالات تشکیل پذیر ہیں۔ ہر سال یہاں ان نوجوانوں کی آبادی بڑھ رہی ہے جن کے ہیروز بھی غلط ہیں اور ان کے خیالات بھی منفی باتوں سے متاثر ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ تمام میری طرح "طفیلیئے" بن جائیں گے۔ خوش قسمتی سے اب تک ایسے نوجوانوں کی تعداد کم ہے لیکن ہر سال اس تعداد میں خطرناک جرام پیشہ نوجوانوں کا بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ ایف بی آئی نے حال ہی میں جنگ عظیم دوم کے بعد سے جرائم کے تناسب میں اضافہ کی افسوسناک رپورٹ پیش کی ہے جس کے مطابق جرائم کے بڑھنے کی رفتار دس سے بارہ فی صد سالانہ ہے۔ یہ رپورٹ تفصیلی نہیں ہے لیکن میرا کہنا ہے کہ ان جھونپڑپٹیوں میں جرائم کی شرح میں سالانہ اضافے کا ذمہ دار امریکی نسل پرست معاشرہ ہے۔ 1964 کی طویل اور دہکتی گرمیوں میں امریکہ کے بڑے شہروں میں جو فسادات ہوئے ان میں معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے سیاہ فام نوجوان پیش پیش تھے۔

اور اس سال یعنی 1965 میں ضمیر کی چبھن دور کرنے والے سماجی حقوق کے بل کے باوجود' مجھے یقین ہے کہ پہلے سے زیادہ شہروں میں اور پہلے سے کہیں بدتر فسادات ہوں گے۔ ان فسادات کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں نسل پرستی کے ناسور کو بہت عرصے سے نظرانداز کیا جا رہا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ امریکہ بھر میں شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو گا جس نے مجھ سے زیادہ پست زندگی گزاری ہو یا مجھ سے زیادہ جاہل رہا ہو یا مجھ سے زیادہ مصائب اٹھائے ہوں۔ لیکن شاید گہرے اندھیر کے بعد ہی روشنی پھوٹتی ہے، انتہائی غم کے بعد ہی عظیم ترین خوشی ملتی ہے، غلامی اور قید کے بعد ہی آزادی کی صحیح قدر معلوم ہوتی ہے۔

اپنے بائیس ملین امریکی سیاہ فام بھائیوں اور بہنوں کے خاطر' اپنی تمام ترخامیوں کے ساتھ' میں نے بساط بھر بہترین جنگ لڑی ہے اور مجھے اندازہ ہے کہ میری خامیاں لاتعداد ہیں۔ میری سب سے بڑی خامی میری دانست میں مناسب تعلیم کا نہ ہونا ہے جو میں وکیل بننے کے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ میں بہت اچھا وکیل بن سکتا تھا۔ مجھے ہمیشہ دلائل کی جنگ اور چیلنجز اچھے لگتے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ اگر آج بھی مجھے موقع ملے تو میں بلاجھجک نیویارک سٹی پبلک اسکول میں داخلہ لے لوں' جہاں میں نے نویں درجے سے پڑھائی چھوڑی تھی اور اپنی ڈگری مکمل کروں لیکن میری دلچسپیوں کا تنوع میری تعلیم میں رکاوٹ ہے۔ مثلاً مجھے زبانوں سے عشق ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں بہت بڑا زبان دان بنوں کیونکہ جب لوگ کچھ کہہ رہے ہوں اور مجھے سمجھ نہ آ رہی ہو تو بہت شدید احساس

محرومی ہوتا ہے۔ خصوصاً جب وہ لوگ بالکل مجھ جیسے ہی دکھائی دیتے ہوں۔ افریقہ میں جب میں نے اصل مادری زبانیں مثلا ھاسا (Hausa) اور سواہلی سنیں تو میں ننھے بچوں کی طرح منہ اٹھائے کھڑا تھا کہ کوئی مجھے اس کا مطلب بتائے۔ اس لمحے ہونے والا احساسِ جہالت ناقابل فراموش ہے۔

بنیادی افریقی لہجے سیکھنے کے علاوہ مجھے چینی زبان سیکھنے کا شوق ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ چینی مستقبل کی سب سے توانا سیاسی زبان ہو گی۔ عربی سیکھنا میں پہلے ہی شروع کر چکا ہوں کیونکہ میری رائے میں عربی مستقبل کی سب سے قوی روحانی زبان ہو گی۔

اور میں صرف مطالعہ کرنا چاہوں گا۔ مجھے ہر اس موضوع سے دلچسپی ہے جو آپ کے ذہن میں آئے۔ اسی لیے میں ریڈیو اور ٹی وی کے پینل پروگراموں کے چند میزبانوں کی علمی استعداد کا احترام کرتا ہوں کیونکہ نسل پرستی کے مسئلہ پر مجھ سے مستقل اختلاف رکھنے کے باوجود وہ دنیا میں ہونے والے واقعات کی حقیقت کو کشادہ ذہنی کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ ان میں شکاگو کے ارو کیپسی نٹ ' اور نیویارک کے بیری فربر ' بیری گرے اور مائک ویلس شامل ہیں۔ ان سے مل کر مجھے احساس ہوا کہ وہ میرے خیالات کا لاشعوری طور پر احترام کرتے ہیں۔ لاشعوری طور پر یوں کہ وہ کبھی کبھی نسل پرستی کے موضوع سے ہٹ کر بھی میری رائے لے لیتے تھے۔ بعض اوقات پروگرام کے بعد ہم گھنٹہ گھنٹہ بھر بیٹھتے اور حالات حاضرہ ودیگر موضوعات پر باتیں کرتے۔ اگرچہ زیادہ تر سفیدفام اگر کسی سیاہ فام کو ذہین سمجھیں تو بھی اسے نسل پرستی کے موضوع سے ہٹ کر بات کرنے کے لائق نہیں سمجھتے۔ وہ یہ بات کبھی نہیں مانیں گے کہ نیگروز دوسرے ذہنی میدانوں میں بھی عمل دخل رکھتے ہیں۔ آپ شاذ ہی کسی سفیدفام کو کسی نیگرو سے عالمی صحت کے مسئلے یا چاند پر پہنچنے کی دوڑ کے متعلق سوال کرتے دیکھیں گے۔

ہر صبح جب میں بیدار ہوتا ہوں تو میں اسے قرض پر ملا ایک اور دن سمجھتا ہوں۔ میں جہاں بھی جس شہر بھی تقریر کرنے 'تنظیمی اجلاس میں شرکت کرنے یا دوسرے معاملات کے لیے جاتا ہوں۔ وہاں سیاہ فام مجھے قتل کرنے کے موزوں موقع کے انتظار میں میری ہر حرکت کی نگرانی کر رہے ہوتے ہیں۔ میں کئی بار علی الاعلان کہہ چکا ہوں کہ مجھے علم ہے کہ انہیں حکم مل چکا ہے جو شخص میری بات پر یقین نہیں کرتا وہ نیشن آف اسلام کے مسلمانوں کو نہیں جانتا۔

اللہ کی مہربانی سے میرے پاس بھی ایسے وفادار پیروکار ہیں جو مجھ سے ویسی ہی وابستگی رکھتے ہیں جیسی میں کبھی ایلیا محمد سے رکھتا تھا۔ ایسے پیروکار جو اس شکاری کو یاد کروائیں گے کہ جنگل میں کچھ باسی ایسے بھی ہوتے ہیں جو شکاریوں کا شکار کرتے ہیں۔

مجھے یہ بھی علم ہے کہ میں کسی بھی وقت کسی سفیدفام نسل پرست کے ہاتھوں بھی قتل ہو سکتا ہوں یا کسی سفیدفام کے زرخرید نیگرو قاتل کے ہاتھ سے یا کسی ایسے نیگرو کے ہاتھ سے جسے ذہنی تطہیر کے ذریعے مجھے راہ سے ہٹانے پر قائل کر لیا گیا ہو۔

چنانچہ میں ہر روز فرض کر لیتا ہوں کہ میں پہلے ہی مر چکا ہوں۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد آپ کو کیا کرنا ہے؟ جب میں مر جائوں اور یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اپنی اطلاعات کے مطابق میں شاید اتنے دن نہ جی پائوں کہ اس کتاب کو مکمل شکل میں دیکھ سکوں تو آپ کا کام صرف یہ ہے کہ آپ دیکھیں کہ سفیدفام اپنے ذرائع ابلاغ میں میرا ذکر ”نفرت“ کے حوالے سے کرے گا۔ وہ میری موت کو بھی میری زندگی کی طرح ”نفرت“ کی علامت کے طور پر پیش کرے گا۔ اس طرح وہ اس سچائی سے گریز کرنے کی کوشش کرے گا جس کا آئینہ میں اسے دکھاتا رہا ہوں جس کے عکس میں اسے میری نسل کے خلاف اپنی نسل کے ناقابل بیان جرائم کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ آپ دیکھیے گا کہ مجھ پر ”غیر ذمہ دار“ سیاہ فام کا ٹھپہ لگایا جائے گا کیونکہ جن سیاہ فام راہنمائوں کو سفیدفام ”ذمہ دار“ سمجھتا ہے وہ ایسے سیاہ فام راہنما ہیں جن کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اگر سفیدفام آپ کو ”غیر ذمہ دار“ قرار دیتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ عملی آدمی ہیں اور یہ بات میں لڑکپن میں ہی سیکھ گیا تھا اور تب ہی سے میں امریکہ کے اس نسل پرست معاشرے میں سیاہ فاموں کے ایک ”راہنما“ کے طور پر رہا ہوں اور جب جب سفیدفام نے زیادہ مزاحمت کی یا بڑھ کر حملہ کیا تب تب مجھے یقین ہوا کہ میں امریکی سیاہ فام کے بہترین مفاد کے درست راستے پر گامزن ہوں۔ نسل پرست سفیدفام کی مخالفت نے مجھے احساس دلایا کہ میں سیاہ فاموں کی بہتری کے لیے کچھ کر رہا ہوں۔

ہاں میں اپنی ”اشتعال انگیز خطابت“ کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ جو لوگ معاشرے میں تبدیلی لانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں معاشرہ اکثر انہی کو قتل کر دیتا ہے۔ اگر میں کسی روشنی کا باعث بن کر اور کسی ایسی بامعنیٰ سچائی کے اظہار کی وجہ سے مر سکوں جو امریکہ کے وجود میں نسل پرستی کے سرطان کو ختم کر دے تو___ تو یہ صرف اور صرف اللہ کا کرم ہو گا۔ البتہ تمام خامیوں کا ذمہ دار میں ہوں!

باب:20

”لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا“

یہ 21فروری1965 اتوار کا دن تھا۔ موسم صاف اور دوپہر گرم تھی۔ میلکم ایکس (الحاج ملک الشہباز) ”دی آڈیوبون بال روم“ کے لیے روانہ ہوا۔ جو دومنزلہ عمارت تھی اور اکثر رقص یا تنظیمی تقریبات وغیرہ کے لیے کرائے پر حاصل کی جاتی تھی۔ میلکم ایکس کی دبلی‘ سیاہ فام خوبصورت ماتحت ڈیڑھ بجے ہی پہنچ گئی تھی۔ بہت سے لوگ وقت سے پہلے پہنچ کر سامنے کی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے لیکن اس نے اس بات پر اس لیے توجہ نہیں دی کہ کچھ لوگ میلکم ایکس کی سحرانگیز تقریر سننے کے لیے ہمیشہ وقت سے پہلے آ کر اسٹیج کے قریب والی کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ اسٹیج پر مائک کے پیچھے آٹھ کرسیاں رکھی گئی تھیں جو دیگر مہمان مقررین کے لیے تھیں جن میں محترم ملٹن گلیمیسن بھی شامل تھے جو بروکلین کے عسکریت پسند پرسبیٹیرین تھے اور 1964 میں ”نسلی عدم توازن“ کے خلاف نیویارک سٹی کے پبلک اسکولوں میں دوبار‘ ایک روزہ بائیکاٹ کی سربراہی کر چکے تھے۔ ان کے علاوہ چند دیگر معروف نیگرو شخصیات کو بھی مدعو کیا گیا تھا تاکہ وہ میلکم ایکس کی تنظیم ”مسلم ماسک‘ انکارپوریشن“ (Muslim Mosque, Inc.) کی مالی امداد کے لیے حاضرین سے درخواست کریں۔

ہال میں داخل ہونے والے لوگوں کی تلاشی نہیں لی گئی تھی کیونکہ میلکم ایکس کو اس سے الجھن ہوتی تھی ان کے بقول ”لوگ اس سے تنگ ہوتے تھے۔“ نیز اس سے انہیں ایلیا محمد کا دھیان آتا تھا۔ میلکم ایکس دوبجے کے قریب ہال میں داخل ہوئے۔ حاضرین کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ میلکم ایکس نے اپنے معاونین سے کہا ”ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج مجھے حاضرین کے سامنے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں سیاہ فاموں سے کہوں گا کہ ہمیں باہر لڑنا نہیں چاہیے ہمیں باہم دگر لڑوانا بھی سفیدفاموں کی منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔ میں مزید کسی سے لڑنا نہیں چاہتا اور نہ ہم اس

مقصد کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔“ وہ محترم گلیمیسن کا بے چینی سے منتظر تھے۔ ان کی ماتحت نے ان کے سب سے قابل مقرر بنجمن ایکس کو اسٹیج پر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ محترم گلیمیسن اور دیگر مدعوئین تین بجے تک نہیں پہنچے۔ برادر بنجمن ایکس اپنی تقریر کے اختتام پر تھا اور میلکم ایکس کا تعارف کروا رہا تھا۔ اب میں آپ کے سامنے اس شخصیت کو پیش کر رہا ہوں جو آپ کے لیے ہر قربانی دے سکتی ہے جو آپ کی خاطر اپنی جان بھی نذر کر سکتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ اسے سنیں' غور کریں اور سمجھیں__ وہ سیاہ فام آدمی کے لیے ٹروجن (Trojan) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہال سے تالیوں کا شور بلند ہوا۔

میلکم ایکس اسٹیج پر آئے اور اس نے مخصوص انداز میں تقریر سے قبل ”میری بہنوں اور بھائیو۔ السلام علیکم!“ کہا جس کے جواب میں حاضرین نے بھی ”السلام علیکم“ کہا۔ اچانک سامنے سے تقریباً آٹھویں قطار میں کچھ بے چینی پیدا ہوئی اور کسی نے اونچی آواز میں دوسرے شخص سے کہا ”اپنا ہاتھ میری جیب سے باہر نکالو“ سب لوگ مڑ کر دیکھنے لگے۔ میلکم ایکس نے لوگوں کو پر سکون رہنے کے لیے کہا۔ شاید توجہ پلٹ جانے کے باعث انہوں نے بندوق والے آدمی کو نہیں دیکھا۔ پہلی قطار سے تین آدمی کھڑے ہوئے اور انہوں نے نشانہ باندھ کر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ بیک وقت گولیاں برساتے ہوئے وہ کوئی فائرنگ اسکواڈ لگ رہے تھے۔ میلکم ایکس پیچھے پڑی کرسیوں پر گر گئے۔ چند چشم دید لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک آدمی کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی جبکہ دوسرے کے دونوں ہاتھوں میں ریوالورز تھے۔ تیسرا آدمی بھی گن سے مسلح تھا اور وہ ویسٹرن فلموں کی طرح الٹے پاؤں خارجی دروازے کی طرف بھی بھاگ رہا تھا اور مسلسل فائرنگ بھی کر رہا تھا۔ ہر طرف قیامت کا شور مچا ہوا تھا۔ لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے یا زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔

جب میلکم ایکس کو پہلی گولیاں اور چھرے لگے تو انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ان کے ایک ہاتھ کی درمیانی انگلی اڑ چکی تھی اور اس جگہ سے خون ابل رہا تھا۔

کچھ لوگ اسٹیج کی طرف دوڑے ان میں میلکم ایکس کی بیوی سسٹر بیٹی بھی تھی جسے میلکم ایکس نے خلاف معمول بچوں سمیت اس تقریب میں خاص طور پر بلایا تھا۔ سسٹر بیٹی ایک تربیت یافتہ نرس بھی تھی۔ اسے دیکھ کر میلکم پر جھکے لوگ ایک طرف ہٹ گئے۔ سسٹر بیٹی گھٹنوں کے بل گر پڑی پھر اس نے میلکم ایکس کا گولیوں سے چھلنی سینہ دیکھا اور سسکیاں لیتے ہوئے صرف اتنا کہا: ”انہوں نے اسے مار دیا۔“

بعد میں ڈاکٹروں نے پوسٹ مارٹم کے بعد بتایا کہ میلکم ایکس کے سینے اور دل پر شاٹ گن کے تیرہ زخم تھے جبکہ اس کی ٹانگوں اور رانوں پر .38اور.45کیلبر کی گولیوں کے زخم تھے جن سے لگتا تھا کہ انہیں گرنے کے بعد گولیاں ماری گئی تھیں۔

میلکم ایکس کا جنازہ شیخ الحاج ہشام جابر نے پڑھایا۔ آخری رسوم میں ہزاروں افراد شریک ہوئے جن میں بہت سے سفیدفام بھی تھے۔ اس کے پرستاروں اور پیروکاروں نے سفید گورکنوں کو قبر بنانے سے روک دیا اور خود ہاتھوں اور بیلچوں سے اسے مٹی دینے لگے اور الحاج ملک الشہباز' جسے دنیا میلکم ایکس' میلکم لٹل' بگ ریڈ (BigRed)' شیطان' ھوم بوائے اور جانے کتنے دوسرے ناموں سے پکارتی تھی، اپنی توقع کے عین مطابق جام شہادت نوش کر کے منوں مٹی نیچے جا سویا۔ اس کی قبر کے کتبے پر تحریر تھا:

"الحاج ملک الشہباز

19 مئی 1925__21 فروری 1965"

!!!

نوٹ:

اس کتاب کی ای بک (PDF File) مترجم محترم عمران الحق چوہان صاحب کی اجازت سے فیس بک گروپ "عالمی ادب کے تراجم" کے لیے بالخصوص اور تمام قارئین کے بالعموم بنائی گئی ہے۔ یہ کتاب گروپ میں upload کی گئی ہے۔ جسے گروپ میں Files پر جاکر ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کے قارئین سے گزارش ہے کہ اپنی رائے گروپ پوسٹ پر یا براہِ راست مترجم کی فیس بک ای ڈی پر ضرور دیجئے گا۔ شکریہ

یاسر حبیب

فیس بک گروپ: عالمی ادب کے اردو تراجم

https://www.facebook.com/groups/AAKUT